ترجمان السنۃ

عربی - اردو

جلد: اول

دور حاضر کی ضرورتوں کے مطابق جدید تحقیقات اور قدیم مباحث کے ہمراہ

احادیث طیبہ کا قابل اعتماد و مستند عظیم الشان مجموعہ

تالیف

زبدۃ المحدثین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم مہاجر مدنی قدس سرہ

استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

ادارہ اسلامیات

ناشران و تاجران کتب

انتساب

شیخ الاسلام حضرت علّامہ سید محمد انور شاہ قدس

سرہ کی عشق نبوی اور خدمت حدیث میں ڈوبی ہوئی روح کے

نام جن کے فیض صحبت سے رفقائے ندوۃ المصنفین اس خدمت

گرامی کے لائق ہوئے۔

ندوۃ المصنفین

فہرست مضامین ترجمان السنۃ جلد اول

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

احادیث نبویہ پہلی صدی کے آخر سے لیکر تیسری صدی تک مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف حیثیتوں اور ترتیبوں کے ساتھ باضابطہ جمع ہوتی رہیں اور محدثین کی مساعی جلیلہ وجمیلہ اس سلسلہ میں بلا شبہ اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ فنون حدیث کے لحاظ سے اب کسی نئی تالیف و ترتیب کا تخیل بھی دماغ میں لانا دشوار ہو گیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر زمانہ کے نئے نئے تقاضے اور نئی نئی ضرورتیں ہوتی ہیں اس لئے اس تجدید کی اور تجدد پسندی کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اب کسی تالیف و تصنیف کی جانب جدید اسلوب کے ساتھ قدم اٹھانا بھی جرم سمجھا جائے۔ اس اقدام کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمیں اس باب میں سلف کی بے مثال خدمات کا اعتراف کرنے میں تامل ہے یا ان کے کارناموں کو بے وقعت کرنا چاہتے ہیں بلکہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ارشادات نبویہ کا بیش بہا ذخیرہ جو مختلف ممالک اور مختلف علاقوں کے لاکھوں انسانوں کے سینوں میں بکھرا پڑا ہوا تھا اس کو ایک جگہ بشکل سفینہ قلمبند کر دینا پھر اس کی ہر ہر حدیث کی ایک ایک سند اور تمام مختلف اسانید کو یکجا کرنا اس پر بعض حضرات کا روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کی باریکیوں کو بھی نظر انداز نہ کرنا پھر ان پر صحت و سقم، وقف و ارسال، انقطاع و ارسال، شذوذ و نکارت اور جرح و علل جیسے دقیق مباحث پر تنقید کرتے چلے جانا وہ ان کا عجیب و غریب ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اعتراف نہ کرنا علمی دنیا میں بہت بڑی ناسپاسی و حق ناشناسی ہے۔ الحمد للہ کہ ان کی خدمات کا یہ تمام ذخیرہ آج ہمارے سامنے جوامع و سنن، مسانید و معاجم، مستخرجات، اجزاء و اطراف اور علل وغیرہ کی شکل میں موجود ہے حتیٰ کہ اب دین کے اصول و فروع کے کسی باب میں امت کے لئے نیا ذخیرہ تلاش کرنا ممکن نہیں رہا ہے کوئی قلم اگر کچھ لکھے گا کوئی زبان اگر کوئی بات کہے گی وہ سب ان ہی کی خوشہ چینی کہلائے گی۔ گویا اب ہر تالیف میں اصل سرمایہ اُن کا رہے گا اور صرف نقل و نگارش اور تعبیر و تشکیل کی خدمت ہماری۔

بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو فقہاء و محدثین کے ساتھ مربوط تھا اپنے ضیق اصول فقہ و فہم اور کوتاہ نظری کی وجہ سے ان تصانیف میں وہی کچھ دیکھتا رہا جو اس کے آئینۂ قلب میں نظر آیا تھا اس لئے جب معاملات کا باب شروع ہوتا، جس میں بھی خصوصیت سے وہ حصہ جو مختلف فیہ مسائل سے متعلق ہے تو اس طبقے کے علوم و معارف اور تدقیق و تحقیق کے سمندر میں تلاطم پیدا ہو جاتا، تقریروں میں طول، طبیعت میں روانی اور قلم میں جولانی پیدا ہو جاتی لیکن جب ان ہی کتب میں اجتماعیات و اخلاقیات سیاسیات، معاشیات و تدبیر منزل وغیرہ کے باب آتے تو اس بحر متلاطم میں یک قلم جمود طاری ہو جاتا، لبوں پر مہر سکوت لگ جاتی، زبانوں پر خاموشی کے قفل پڑ جاتے اور طبیعت کا وہ تمام جوش و خروش یا ٹھنڈا پڑ جاتا گویا اس میں حرارت کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔

ان حالات میں اس غلط فہمی کا پیدا ہونا لازمی تھا کہ محدثین کی یہ گراں مایہ تصنیفات یا تو کتب فقہ کی طرح صرف ایک "نظام عباداتی" کا مجموعہ ہیں، یا کتب کلام کی طرح علم کلام کی ورزش گاہوں کا ایک دفتر پارینہ ہے۔ اس انداز بحث و نظر کے خلاف اگر کبھی کسی نے کوئی قدم اٹھایا بھی تو اس کو بے دینی و زندقہ، عدم تقلید، مخالفت سلف صالح اور طرح طرح کی عجیب و غریب تہمتوں سے متہم کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو مذہب کی مبادیات ہی سے مطلق بے خبر یا ارادۃً غافل تھا ایک آتی تہذیب جہل کے ہوئے تھا اس کو خود تو مطالعہ کی توفیق نہ ہوئی، ہاں اس غلط روش سے وہ ایک اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا یعنی یہ کہ ان کتابوں میں عبادات و رسوم یا چند مسائل کلامیہ و فقہیہ کے علاوہ اجتماعیات و معاشیات کا کوئی باب ہی نہیں ہے اور اب آہستہ آہستہ بلکہ غیر شعوری طور پر انسان چند در چند وجوہ کی بنا پر اپنی معاشیات و اقتصادیات کے لئے کوئی دوسرا ماخذ تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں جانب افراط و تفریط کے راستے پر جا رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ صحیح احادیث کی جو خدمت محدثین کر گئے ہیں یا اس کی اہمیت کو کسی وقت اور کسی حیثیت سے بھی کم کرنا یا صرف ان گنے چنے ابواب کی وجہ سے جن پر ان کتب میں کسی وقتی ضرورت سے اہمیت محدود کی گئی تھی، تمام ابواب و تراجم اور مباحث و بیانات کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا یا ان میں موجود جدید اصطلاحی الفاظ نہ دیکھ کر اصل حقائق سے بھی ان کو خالی سمجھ لینا یا محض مخاطب فن سے لاعلمی کی بنا پر خود اس فن کے کام کا انکار کر بیٹھنا حرمان ہوتا علمی دنیا میں ناقابل معافی جرائم ہیں۔

دوسری طرف ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ان کتب میں جو ابواب و تراجم ایک خاص فضا اور خاص ماحول میں باندھے گئے تھے آج بھی ان کو اسی نظر سے دیکھے چلے جانا، بڑی بے حسی کی تعبیر

معتزلہ و خوارج کے ساتھ یہی جھگڑے صفات کے عین و غیر ہونے کے متعلق رہی فلسفیانہ کاوشیں ، پھر
قرآن کریم کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی بحث قدیم مجلس زیر تحقیق لائے چلے جاتا اور ایک ایسی زمین پر
مالکیت و حنفیت کے لئے صف آرائی کرنا جہاں شافعی کی شافعی بنے ، مالکی بطور لنگر کے ان مسائل ہی ہو گئے
ہرگز اقتصار علم نہیں کیا جا سکتا ۔ ذرا اس کا نام احساس ضرورت ہے جو عہد سلف کی صحیح معنی میں اتباع سلف کا
نام دیا جا سکتا ہے ۔ اتباع سلف یہ ہے کہ جس طرح امام بخاری نے اپنے وقت کے فتن کے مقابلہ کے لئے
کتاب الرد علی الجہمیۃ ، حجیت خبر آحاد ، مسائل بدعی اور فتن بلکہ مناسب مناسب عنوانات قائم کئے
تھے ۔ ان کے قدم بقدم چل کر ہم بھی وقتی مسائل کے لئے مناسب عنوانات قائم کریں ۔ ہمیں اس میں ایک لمحہ
کے لئے بھی شبہ نہیں ہے کہ اگر امام بخاری اس زمانہ میں موجود ہوتے تو اپنی مجتہدانہ شان ، بدقت رسی و فقہ
سنجی اور اصابت کی ضمنوں کے متعلق صحیح نبض شناسی اور دردمندی کی وجہ سے علیحدہ باب ، ترجمہ الباب اور
لا شرع جہمیت و اعتزال کی تردید کے بجائے یقیناً ان ہی مسائل کی طرف پھیر دیتے جو ہمارے وقت کے
الجھے ہوئے مسائل کہلاتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی بخاری میں اجتماعیات و اقتصادیات اور دیگر ضروری مسائل کی جانب ایسی اہم
تلمیحات موجود ہیں کہ اگر کوئی ذی علم ان سے استفادہ کرنا چاہے تو بہت کچھ استفادہ کر سکتا ہے اور انہیں بحث
استنباط کی بنیاد قرار دے سکتا ہے ۔ آخر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہند میں ایک محدث ہی تو تھے ،
جنہوں نے اسی قسم کے عنوانات کا احساس کر کے علم و حکمت مباحث کے علاوہ اجتماعیات و اقتصادیات
کے غیر متعارف اور مفید مباحث اپنی تصانیف میں پھیلا دیے ۔ آج حجۃ اللہ البالغہ کو اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو
معلوم ہو جائے گا کہ محدث ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں مسائل نو کی کیا اہمیت حاصل ہے ۔

بہرحال سلف کی خدمات کے پورے اعتراف کے ساتھ اگر صورت حال کو اس نظر سے دیکھا جائے
تو خدمت حدیث کا یہ گوشہ صریحی طور پر خالی نظر آتا ہے اور بلا شبہ وقت کی شدید ترین ضروریات میں یہ
اہم ترین ضرورت باقی ہے کہ اس وقت احادیث نبویہ پر اس نقطہ نظر سے دوبارہ نظر ڈالی جائے کہ بین الاقوامی
اور اجتماعی مسائل میں دین کا مسلک کیا ہے ہدایات کیا ہیں اور فرمودات نبوی میں وقت کے نئے نئے تقاضوں اور
الجھنوں کا کیا حل پیش کیا گیا ہے ۔ کسی زمانہ میں مصلحت کی وجہ سے اگر ترتیب و تدوین احادیث کا یہ
طریقہ محدثین کے ذہن میں نہیں لایا گیا تو اس دور کی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اب چھپے اور دبے ہوئے عنوانات ابھار کر
جائیں ان کو اسلوب جدید کے سانچے میں ڈھالا جائے ۔ اور ایک ایسا جامع اور مرتب متن حدیث سامنے
آ جائے جو حسب ذیل خصوصیات پر مشتمل ہو ۔

متن حدیث

ابھی تک عام طور پر احادیث کا جو ذخیرہ عوام کے سامنے آیا ہے وہ بیشتر صحاح ستہ کی حدیثیں ہیں حالانکہ ان کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث موجود ہیں جو مستقل مجموعوں اور دوسری غیر متداول ضخیم کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ضرورت ان کو اس طرح جمع کرنے کی ہے کہ بجائے بلوغ المرام یا آثار السنن کی طرح صرف شوافع اور احناف کی حدیثوں کا مجموعہ بن کر رہ جائیں بلکہ صحیح معنی میں احادیث نبویہ کا مجموعہ کہلائیں۔ ان میں ہر صحیح یا حسن حدیث لے لی جائے خواہ وہ فقہی مسلک کے لحاظ سے کسی مسلک یا کسی فرقہ سے متعلق ہو۔ مگر اصل مقصد مجموعہ ترتیب احادیث ہو اور فقہی مسلک کی خدمت درجہ ثانوی پر ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ امت کے ہاتھوں میں احادیث صحیحہ کا ایک سب سے بڑا مجموعہ پہنچ جائے گا اور وہ اس قابل ہو جائے گی کہ اپنی جدید ضروریات کے لئے زیادہ سے زیادہ ہدایات حاصل کر سکے اور فروعی مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اپنی اپنی رائے کے متعلق زیادہ روشنی میں فیصلہ کرنے کا موقع مل سکے گا۔

عنوانات

یہی خدمت سب سے اہم خدمت ہے اس کام کے لئے ایک طرف زیادہ سے زیادہ احادیث زیر نظر رہنے کی ضرورت ہے، دوسری طرف مختلف مسائل کا پورا استحضار، پھر ان میں اہم اور غیر اہم کا صحیح انتخاب اور بہت سے حقائق کی تفہیم کے لئے موجودہ اصطلاحات سے واقفیت۔ اس کے لئے ضرورت نہیں ہے کہ ہم قدیم طرز کی پیروی کریں اور اپنی جانب سے کوئی نیا باب یا نیا عنوان قائم کرنا ایک بدعت تصور کرلیں۔ ہمارے لئے اس باب میں امام بخاری کا اسوۂ حسنہ کافی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ احادیث نبویہ کے مخفی اشارات و تلمیحات کو ابھار ابھار کر مستقل عنوانات روشن کرنے کے وہی موجد ہیں جو شخص آئندہ کسی شیخ پر بھی اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھائے گا اس کے لئے لازم ہوگا کہ وہ کتاب بخاری کو اپنے سامنے مشعل راہ تصور کرے اور جس طرح اپنے دور کے مسائل پر انہوں نے نہایت مفید تراجم قائم کئے ہیں اسی طرح وہ اپنے زمانہ کے مسائل پر نئے عنوانات قائم کرتا چلا جائے۔

ترجمہ

عام مسلمانوں اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت کے لئے حدیثوں کا اردو ترجمہ بھی ہو جو نہ تو اتنا بامحاورہ اور تشریحی ہو کہ مستقل تصنیف بن جائے اور نہ ایسا تحت اللفظ کہ مطلب غیر واضح ہو۔ موجودہ ماحول میں اس طرح کے ترجمہ کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔

تشریحی نوٹ

احادیث کی تشریح اور عنوانات کی پوری تفصیل کے علاوہ دیگر امور متعلقہ کے بسط و شرح کے لئے نئے تشریحی نوٹوں کی بھی ضرورت تھی جو نہ تو جدت میں اتنے ڈوبے ہوئے ہوں کہ اسلامی تعلیمات کے اصل مرکز ہی سے ہٹ جائیں اور نہ ان پر قدامت پرستی کا ایسا گہرا رنگ ہو کہ جدید

ارباب نظر ان کو دیکھنا ہی گوارا نہ کریں بلکہ قدیم معلومات جدید قالب میں زیادہ سے زیادہ احتیاط
کے ساتھ پیش کر دی جائیں۔ سیدھی بات کھری ہو اور صاف صاف بلا خوف لومۃ لائم کہدی جائے لیکن
مجادلہ و مناقشہ کا رنگ نہ آنے پائے، کسی کی ایذا دہی یا دل آزاری یا الزام و اسکات ہرگز مقصود نہ ہو
بلکہ صرف احقاق حق اور اصلاح خلق مطمح نظر ہو۔ خلاصہ یہ کہ یہ مجموعہ الفاظ حدیث میں تو موبمو
سلف کے نقش قدم پر ہو لیکن اپنی ترتیب اور عنوانات میں تمام تر آزاد ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اگر ایسا کوئی مجموعہ مکمل طور پر تیار ہوگیا تو وقت کی بہت بڑی اور اہم ضرورت
پوری ہو جائے گی۔ خدام المصنفین کسی وقت بھی اس ضرورت کے احساس اور اس کی طرف عملی اقدام سے
غافل نہیں رہا یہاں تک کہ جب حالات نے کسی درجہ میں بھی مہلت دی تو بہت سی مشکلوں اور دشواریوں
کے باوجود قدم اٹھانے میں پس و پیش نہیں کیا گیا۔ اور جو کام بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کے کرنے کا
تھا اس ادارے نے اپنے ذمہ بہت پہلے لیا۔ اس عظیم الشان خدمت کے لئے جتنا علمی سرمایہ،
جتنی قوت احساس، قوت فکر، قوت عمل درکار ہے ظاہر ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک ہی تصنیف ہے مگر درحقیقت
یہ مستقل چار تصنیفیں ہیں جن میں ہر تصنیف اپنی حیثیت میں بڑی جدوجہد اور محنت کاوش کی محتاج ہے
جدید عنوانات کا انتخاب، ان کے مناسب احادیث کا انتخاب، پھر ان کا ترجمہ، اس پر تشریحی نوٹوں کا
مرحلہ تکمیل تماشہ نہیں ہے اگر کسی کے لئے قدرت یہ تمام سامان مہیا کر دے تو پھر وسعت وقت، اطمینان
قلب اور سکون دماغ کا سوال سامنے رہتا ہے لیکن جب اس خدمت کی تفویض کا وقت آیا تو کاتب
ازل نے میرا نام سامنے کر دیا۔ کسی رسمی معذرت کے بغیر مجھے اس کا برملا اعتراف ہے کہ اس خدمت کے لئے
جتنے ساز و سامان کی ضرورت ہے اس میں ایک سامان بھی پورے طور پر میرے ساتھ نہیں ہے تاہم خدمت
حدیث کے لئے جینا اور اسی میں مر جانا چونکہ میری بھی ایک دلی تمنا ہے اس لئے اسی بے سر و سامانی کے عالم
میں اس کٹھن منزل کے سفر کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔

سفر شروع کرنے کے لئے کچھ زاد راہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ میں نے اپنے مفوضہ کام کی
ابتداء مصر کی جدید تصنیف "التاج" سے کی کہ یہ کتاب حکومت مصر کی جانب سے ان ہی احساسات
کے پیش نظر تصنیف کی گئی تھی لیکن جب اس کتاب کو لیکر چند قدم اٹھا چکا تو معلوم ہوا کہ جس منزل
پر مجھے پہنچنا ہے اس کے لئے یہ روشنی قطعاً ناکافی ہے۔ اس میں احادیث کا ذخیرہ توقع سے بہت کم تھا
عنوانات قطعاً ناکافی نظر آئے اور جو ملے بھی ان میں سوائے تقدیم و تاخیر کے کوئی جدت نہ دیکھی اور اس لئے
اس کتاب پر میری ایک سال کی گراں محنت بے سود ہو گئی۔ اسی غور و فکر میں مسند امام احمد کی جدید

تبویب نظر سے گذری۔ یہ جدید فہرست دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ اب اس کتاب کی مدد سے اپنے سفر کو کسی حد تک کامیاب دیکھ سکوں گا۔ مسند احمد محتاجِ تعارف نہیں ہے اس میں سات سو صحابہؓ کی تقریباً تیس یا چالیس ہزار حدیثیں موجود ہیں اگر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہے۔ یہ کتب ابواب فقہیہ کے ترتیب کی بجائے صحابہ کی ترتیب پر تالیف کی گئی ہے اس لئے اس سے استفادہ بہت مشکل تھا۔ تبویب مسند نے اس مشکل کو حل کر دیا ہے اس بوڑھے شخص کی محنت نے تنقید کی جانفشانی سے بھی سبکدوش کر دیا۔ اسی کے ساتھ مستدرک حاکم علامہ سندھی کی نقد کردہ موجود ہے اور مجمع الزوائد بھی طبع ہو کر آ گئی ہے۔ جدید انتخاب کے لئے یہ ذخیرہ کافی کفایت کرتا ہے۔ کنز العمال کی آٹھ جلدیں ہیں اگرچہ ۴۶۱۸۱ چھیالیس ہزار ایک سو اکیاسی احادیث کا ذخیرہ موجود ہے مگر اس میں صحت و ضعف کا معیار قائم رکھنا مشکل ہے۔ شیخ علی متقی ہندی نے مکرر احادیث حذف کر کے ایک جدید ترتیب سے ان کو مرتب کر دیا ہے اور اس کا نام منتخب کنز العمال رکھا ہے اس میں حدیثوں کی تعداد تیس ہزار باقی رہ گئی ہے اس تصنیف میں یہ کتاب بھی زیرِ نظر رہی ہے۔

معیارِ صحت

جمع حدیث کے لئے معیارِ صحت قائم کرنا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہم نے اپنے مقصد کے پیشِ نظر نہ تو اس میں اتنی شدت اختیار کی ہے کہ اس معیار پر احادیث کا ذخیرہ تلاش کرنا ہی مشکل ہو جائے اور نہ اتنی وسعت کہ احادیثِ موضوعہ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ احادیثِ صحاح کے علاوہ جن حدیثوں پر کسی معتبر حافظِ حدیث نے صحیح یا حسن ہونے کا حکم لگا دیا ہے مگر اس کا مضمون آیاتِ قرآنیہ اور مشہور صحیح احادیث کے خلاف نہیں ہے تو ہم نے اس کو صحیح یا حسن میں شمار کیا ہے خواہ محدثانہ تنقید

۱؎ شیخ تاج الدین سبکی طبقاتِ کبریٰ میں امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کو میں نے پچاس ہزار سات سو احادیث سے بھی زیادہ کے مجموعہ میں سے منتخب کر کے جمع کیا ہے تاکہ جب کسی حدیث کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو تو وہ اس کتاب کی طرف رجوع کریں اگر اس میں پائیں تو خیر ورنہ اس کو قابلِ احتجاج تصور نہ کریں۔

۲؎ حافظ ابن قیمؒ امام احمدؒ کے نظریہ کے اصول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ مرسل احادیث کو لے لیا جائے بلکہ اگر اس باب میں کوئی حدیث معارض نہ ہو تو ضعیف حدیث پر بھی عمل کر لیا جائے۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہاں ضعیف سے مراد وہ حدیث [illegible] نہیں کی مخالفت نہ ہو ایسا ضعیف بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ایک قسم ہے حسن کی جس کے بعد ان کی احادیث پر عمل کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ امام احمد نے بھی ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھا ہے اس سے اسی قسم کی ضعیف حدیث مراد ہے اور اس بات پر اکثر ائمہ کا بھی اتفاق ہے۔ (اعلام الموقعین ص ۲۵)

اس وجہ کی بنا پر ہم نے صرف آخری درجہ کی ضعیف احادیث کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس مسئلہ کے متعلق حجیتِ حدیث کے عنوان میں مزید تفصیل دیکھئے۔

اس میں باقی ہو۔ اہل علم جانتے ہیں کہ علمی نقد سے صحیحین کی احادیث بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکیں پھر یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں کوئی نیا قدم اٹھانا اب مشکل ہے کسی حدیث کے متعلق اگر محدثین کی مختلف آراء دیکھنا ہوں تو اس کے لئے مستقل تصانیف موجود ہیں۔ ہم نے ان اصطلاحی مباحث کو چھیڑنا غیر مفید اور اپنے مخاطبین کی فہم سے بلند سمجھا ہے تاہم بضرورت کہیں کہیں مختصر اشارات کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تائیدی طور پر بعض ابواب میں ضعیف احادیث بھی ذکر کر دی گئی ہیں بشرطیکہ موضوع اور محض بے اصل نہ ہوں یہ وسعت صرف اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ جب ایک مضمون صحیح احادیث سے ثابت ہو چکا ہے تو اب اگر اسی مضمون کی دوسری حدیثوں سے کچھ توضیح ہو سکتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام احمد جیسا مسلم محدث جو کہ حدیث کے نام پر ایک مسند جمع کرتا ہے پھر اس میں اتنی وسعت سے کام لے لیتا ہے کہ اس کی بعض احادیث کے متعلق وضع تک کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ گو حافظ ابن حجرؒ نے اس کو تسلیم نہیں کیا تاہم اس سے ان کی وسعت نظر کا ثبوت ضرور ملتا ہے امام موصوف کے اس طریق کار سے معلوم ہوا کہ جو شخص جمع احادیث کا ارادہ کرے اس کے لئے کسی حد تک وسعت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ ہم نے کسی باب میں مسائل کی بنا اس قسم کی احادیث پر نہیں رکھی ہمیشہ صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ صرف تائیدی طور پر ان کو پیش کیا ہے وہ بھی ایسے ابواب میں جہاں تسامح اختیار کرنا محدثین کے نزدیک عیب شمار نہیں ہوتا۔ احکام اور صرف حلال و حرام کے موقعوں پر نظر اس سے بلند رکھی گئی ہے۔ جن حضرات نے فضائل کا انکار کیا ان کے دلائل خواہ کچھ بھی ہوں مگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ احادیث نبویہ کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے ان کو دست بردار ہو جانا پڑا ہے جن میں معلوم نہیں کتنی قیمتی ہدایات موجود ہیں۔ مگر ہمارے وجدان میں وہ موضوع اور بے اصل نہیں ہیں کہ محض منکرین حدیث سے ڈر کر ان کو ذکر نہ کرنا بالکل صحیح نہیں ہے۔ خود امام بخاریؒ کو دیکھئے ایک طرف ان کی کتاب بخاری موجود ہے اگرچہ اس کا موضوع صرف صحیح احادیث ہیں مگر ان کو بھی ترجمۃ الباب میں اپنی رائے کی تائید لانا پڑا اس کے لئے آثار و تعلیقات ضعیفہ لانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب المفرد اور ان کی دوسری تصانیف میں یہ معیاری رنگ باقی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ کہ ہماری تصنیف کا موضوع صحیحین پر استدراک یا اس معیار کی کوئی کتاب جمع کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جس قسم کی احادیث سے آج تک امت اصولی طور پر استفادہ کرتی چلی آئی ہے۔ اسی قسم کی احادیث سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے اگر ہمارے خیال میں یہ اصول غلط نہیں تو اس جماعت کے اعتراضات سے بھی کیا خوف ہو سکتا ہے جس کے اعتراض سے صحیحین بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکیں۔

ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ بعض بے معیار عقل سے صحیح سے صحیح احادیث کو رد کر کے امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے محروم کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ جن احادیث پر اب تک علماء امت کی نظر نہیں پہنچی اگر وہ موضوع اور بے اصل نہیں ہیں تو ان سے استفادہ کا پورا موقعہ بہم پہنچایا جائے۔ منکرین حدیث کو اگر یہاں کوئی اختلاف ہے تو وہ اصولی ہے ان کے نزدیک احادیث صحیحین بھی دین میں حجیت کے قابل نہیں ہیں ہمیں اُن حضرات کے نقش قدم پر چلنا ہے جن کے ہاتھوں میں امت کی باگ ڈور سمجھی گئی ہے جن کو اپنے رسول کی ایک ایک ہدایت دنیا و مافیہا سے بیش بہا نظر آتی تھی اگر ان حضرات کے نزدیک کسی مسئلہ کی بنا ضعیف حدیث پر قائم کی جا سکتی ہے تو ہمارے یہاں صرف تمہیدی طور پر کسی ضعیف حدیث کا ذکر کرنا جرم کیوں ہو۔

ترتیب احادیث و عنوانات

اصحاب متون نے عام طور پر اپنی کتب کی ابتداء طہارت سے یا طہارت کے بعد عبادات پھر معاملات سے کی ہے۔ صحیحین میں یہ جدت ہے کہ ان کی ابتداء ایمان سے کی گئی ہے پھر امام بخاریؒ نے ایک نیا قدم یہ اٹھایا کہ ایمان پر وحی کو مقدم کر دیا۔ عملی اعتبار سے یہ دونوں قابل داد ہیں لیکن ہم تقاضائے وقت و مصلحت کے لحاظ سے کسی اور نئے قدم اٹھانے کا مشتاق تھا۔ میں نے الفتح الربانی (ترتیب مسند) کی ابتداء معرفت ربوبیت سے دیکھی یہ اپنے مذاق طبیعت اور احساس ضرورت کی بنا پر بے حد پسند آئی اس لئے اس تالیف کی ابتداء بھی اسی عنوان سے کی گئی پھر خدا تعالیٰ کی عظمت اور دیگر صفات کے ساتھ بالخصوص صفت رحمت کا ذکر کر کے آخر میں اسماء باری تعالیٰ پر اس باب کو ختم کر دیا۔ اور باب کے خاتمہ پر احادیث اور تشریحی نوٹوں کی روشنی میں خدا کی ہستی کے متعلق جو تاثرات پیدا ہو سکتے تھے ان کو مکمل مقالہ منضبط کر دیا۔ یہ باب اس سے کہیں زیادہ پھیل سکتا تھا اور کتاب کے دوسرے ابواب میں بھی اس کا سر رشتہ آ گیا ہے اس کو چند مباحث کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے نمبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت بھی سامنے آتی ہے اس لئے اس پر بھی بہت سے مفید عنوانات قائم کئے گئے ہیں جن میں ختم نبوت کو خصوصیت سے روشن کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت استاذ مرحوم کی یادداشت اور مطبوعہ رسالہ خاتم النبیین سے کافی مدد لی گئی ہے اور پہلے باب کی طرح یہاں بھی جو تاثرات ان احادیث سے پیدا ہو سکتے تھے ان کو مستقل صورت میں آخر میں درج کر دیا گیا ہے امید ہے کہ موجودہ مباحث کے پیش نظر یہ مقالہ بڑی حد تک بصیرت افروز ثابت ہوگا اس کے بعد نبوت کے ابواب سامنے آتے ہیں ان پر بھی اپنی علمی بساط کے بقدر ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے مفید عنوانات قائم کر کے باب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ پر ختم کیا گیا ہے۔ ان احادیث کو دیکھ کر رسول کا نعت

ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے اس کو یہاں ہی بشکل سوال سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کے تصور کی اس تکمیل سے فارغ ہو کر ابوابِ ایمان شروع کئے گئے ہیں۔ اور اس موضوع پر دو مقالے لکھے گئے ہیں ایک قدرے طویل، دوسرا ایک بہت مختصر ان مقالوں میں مسائلِ کلامیہ کو اسلامی اور تبلیغی رنگ میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سلسلہ میں سب سے اہم کتاب حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان ہے۔ ان دو مقالوں کے لئے دیگر کتب کے علاوہ اس کتاب کا تقریباً پانچ مرتبہ مطالعہ کیا گیا ہے اور حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ ان مباحث کو سادہ سے سادہ رنگ میں پیش کیا جائے۔

امید ہے کہ خدا اور رسول کے اس طرح تصور کے بعد کتاب الایمان کی احادیث کا لطف آپ پہلے زیادہ اٹھا سکیں گے اور آپ کو اس کا پورا یقین ہو سکے گا کہ خدا اور رسول پر صحیح معنی میں ایمان لانا صرف مذہب اسلام نے سکھایا ہے۔ دوسرے متدین یا محرف مذاہب صرف ایمان کا لفظ جانتے ہیں اس کی حقیقت سے قطعاً نا آشنا ہیں یہی باب اسلام کی اساس ہے اس لئے اس میں مؤلف نے خود بھی کافی محنت اٹھائی ہے اور قارئین سے بھی یہی درخواست ہے کہ اگر انھیں اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی ہے تو اس باب کو وہ بار بار پڑھیں انشاء اللہ یہ تکرار بے فائدہ نہیں رہے گا۔

تشریحی نوٹ

جس مقصد کے پیشِ نظر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے وہ تبلیغ دین اور اصلاح خلق ہے محض ایک فنی اور علمی خدمت نہیں ہے اس لئے نوٹوں میں بھی زیادہ تر اسی مقاصد کی رعایت کی گئی ہے اصطلاحی مباحث، علمی مناقشات، اور متدین مذاہب کے تذکروں سے مکمل احتراز کیا گیا ہے اور اگر کہیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو ان کو زیادہ سے زیادہ اختصار اور سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کتاب الایمان کے معرکۃ الآراء مباحث بہت کچھ جدوجہد کے بعد بھی اتنے سادہ اور مختصر نہیں رہ سکے۔ ان کو پوری کاوش و تحقیق کے بعد بشکل مقالہ مستقل طور پر علیحدہ کر دیا گیا ہے خاص احادیث ایمان کی تشریح کی سطح ان مباحث سے بلند رکھی گئی ہے۔ بہت سے مقامات پر اجمال بھی کفایت کر سکتا تھا مگر اسی اپنے ایک مقصد کے پیشِ نظر یہاں ارادۃً کچھ زیادہ تفصیل ہو گئی ہے۔ فروعی مسائل میں پورے اعتدال اور انصاف کے ساتھ حنفی مذہب کی تائید ضرور کی گئی ہے مگر دیگر مذاہب کے بالمقابل انکار و تردید نہیں کیا گیا۔

ہمارے پیشِ نظر ہر جگہ رفع تعارض ہے نہ کہ دوسرے پہلو کو مورد الزام بنانا۔ اس کے باوجود جن فروعی مسائل پر دوسری کتابوں میں آپ کی نظر سے اوراق گزرے ہوں گے یہاں چند سطور ہی ملیں گی اور جن اصولی مسائل پر دوسری جگہ سطور ہوں گی یہاں اجزاء و اوراق کے انبار نظر آئیں گے۔

مقدمہ

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں پہلی بحث افتراق امت کی حدیث پر کی گئی ہے
یہ حدیث علمی لحاظ سے بھی ہر زمانہ میں زیر بحث رہی ہے اور اس زمانہ میں بھی زیر بحث ہے
اس کے علاوہ چونکہ فرقِ اسلامیہ کے افتراق کا مرکزی نقطہ بھی قرآن و حدیث ہیں اس لئے یہ ضروری
معلوم ہوا کہ کتاب کے شروع ہی میں ان اسباب و علل پر بھی بحث کر دی جائے جو اس افتراق کا سبب
بن جاتے ہیں تاکہ کتاب کا مطالعہ کرنے والے اس روشنی میں ما انا علیہ واصحابی کا منہاج قویم صاف
صاف طور پر دیکھ لیں اور سُبُلِ متفرقہ سے جتنا بچنا چاہیں بچ سکیں۔ اس بحث میں ضمنی طور پر بہت سے علمی
مسائل کا حل کیا گیا ہے جو اپنی جگہ اچھے ہو سکتے ہیں اگر ان مباحث کو نظر انداز کر دیا جائے تو صرف
مسئلہ افتراق امت کے لحاظ سے کتاب مکمل تھا لیکن ان مقاصد و فوائد کے پیشِ نظر جن کی بناء پر کہ اس
بحث کو مقدمہ میں درج کیا گیا ہے حذف کرنا تو درکنار قصداً زیر بحث لانا ضروری تھا اس کے بعد
حجیتِ حدیث کی بحث بھی ہمارے وقت کی اہم بحث ہے اس پر بھی جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ منکرین
حدیث کے لئے خواہ ناکافی ہو مگر نفسِ مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔

فہرست ماخذ کتب

یہ فہرست کتاب ختم ہو جانے کے بعد زیادہ مکمل اور صحیح طور پر مرتب ہو سکے گی۔ ابھی
نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ تالیف میں کن کن کتابوں کی اور ضرورت ہوگی البتہ یقینی
امر ہے کہ یہ فہرست سو کتابوں سے زیادہ پر مشتمل ہوگی صرف اس پہلے جزء میں بھی کافی مراجعت کی گئی ہے
جن کے حوالجات موقعہ بموقعہ درج کر دیئے گئے ہیں۔

اس ضمن میں حضرت استاذ مرحوم کے علوم و معارف کا وہ ذخیرہ بھی جو اس کتاب کے موضوع کے
مناسب ہے پیش کیا جائے گا اگرچہ حق یہ ہے کہ جس انداز فکر سے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے وہ تمام تر
حضرت استاذ مرحوم ہی کا پیدا کردہ ہے لیکن وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس دعوے میں میرے ہم آہنگ
ہو سکتے ہیں۔ سلسلۂ تلامذہ کا بڑا طبقہ وہی ہے جو سال دو سال شریک درس رہا اور سند لیکر رخصت ہو گیا
جو شخص استاذ مرحوم کے جلوت و خلوت کا شریک رہا ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ محدث جو امت میں
صرف امام بخاریؒ کی طرح فنِ حدیث میں اپنی شہرت رکھتا تھا وہ امت کی اصلاح کے لئے کتنی دلسوزی
اور اس کی ہمدردی کے لئے کتنا مضطرب تھا۔

ایک ضروری تنبیہ

۔ فنِ حدیث میں مرجع اصول کی مراجعت نہیں کی گئی بلکہ کتب حدیث کے اعتماد پر
نقل در نقل پر کفایت کر لی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ ایک عیب ہے مگر جو عیب کہ تصانیف کا
جزء لاینفک بن چکا ہے وہ خلاف الامر تحقیق کے قاعدہ کے موافق عیب نہیں رہا۔ یہ تنبیہ اس لئے ضروری تھی

کہ بعض مقامات پر جب اصول کی مراجعت کی گئی تو اصل و نقل میں کچھ معمولی سا فرق نظر آیا مثلاً مشکوٰۃ شریف
باب احتجاج میں صحیحین کی ایک روایت دیکھی جب اس کا اصل متن سے مقابلہ کیا تو ایک دو لفظوں کا
فرق ملا۔ اس بحث و تحقیق میں پڑنا اس لئے بے سود سمجھا گیا کہ اول تو ایک حدیث صحیح بخاری میں ہی کئی کئی
جگہ مذکور ہوئی ہے پھر اصحاب نسخ کے لحاظ سے خود بخاری میں بھی الفاظ کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ فن حدیث
کے لحاظ سے اگرچہ اس کو اہمیت بیشک ہے مگر اصل موضوع کے لحاظ سے شاید اس کا فائدہ اتنا نہ ہو پھر
اس کے لئے جتنی مدت درکار ہے وہ اہل علم ہی جان سکتے ہیں۔ ایک علمی تحقیق کے پیچھے ارشاد و تبلیغ کے
اہم مقصد کو تاخیر میں ڈال دینا مناسب نہ تھا۔ ادھر ان کتب پر اعتماد کر لینا کچھ ناموزوں بھی نہیں۔ آخر صاحب
مشکوٰۃ کو مصابیح جیسی کتاب کے لفظی اختلافات پر کہیں کہیں تنبیہ کرنا پڑی ہے اس کے باوجود اصل کتاب
کا وزن کچھ کم نہیں ہوا بلکہ اس کو معمولی اختلاف سمجھ کر مختلف معانی پر محمول کر لیا گیا ہے۔

معذرت

تمام خامیوں کے باوجود وقت کی تنگی قدم قدم پر میرے خیالات کو حسب دلخواہ عملی جامہ پہنانے
میں مانع رہی۔ ایک طرف میری یہ ایک سالہ خدمت رائگاں جا چکی تھی دوسری طرف ندوۃ المصنفین
اسی سال اس کتاب کے پیش کرنے کا اعلان کر چکا تھا اس لئے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی۔ دن بھر میں جتنا
مسودہ تیار ہو جاتا کاتب کے حوالہ کر دیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں عنوانات و احادیث کی تلاش کے ساتھ
تمام گزشتہ عنوانات کا استحضار بہت مشکل تھا۔ اس لئے عنوانات میں جتنا حسن ترتیب قائم رہنا چاہئے تھا قائم
نہیں رہ سکا۔ بسا اوقات کسی مضمون کے متعلق کوئی مفید حدیث خیال میں آئی لیکن اس کا اصل موقعہ ہاتھ سے
نکل چکا تھا اس لئے دوسرے باب میں کسی دوسرے عنوان کے تحت میں اس کو درج کرنا پڑا مثلاً جس حدیث پر
الاستشفاع بالرسول کا باب قائم کیا گیا ہے اس کا اصل محل عظمت باری کا باب تھا لیکن اس وقت اس حدیث
کی طرف ذہن منتقل نہیں ہو سکا جب مجبوری اس کو رسالت کے باب میں ایک دوسرے عنوان سے درج کیا
گیا اسی طرح ہر ہر قدم پر مختلف تصنیفی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے جن کی وجہ سے ندوۃ المصنفین کے قائم
کئے ہوئے تخیل کا صحیح خاکہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اس عجلت میں اس خدمت کا جو نقش بھی آپ کے سامنے
آرہا ہے وہ کتاب کے اندازے اور مولف کی کاوش کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

آخر میں با ادب گزارش ہے کہ جو دماغ فلسفہ و سائنس کے دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے سے
نہیں گھبراتے وہ احادیث نبویہ کے اس ذخیرہ کو دیکھ کر پہلے سے پہلے ہی گھبرا نہ جائیں بلکہ اس کو دیکھیں اور
پھر دیکھیں اس پر بھی اگر کچھ اشکال باقی رہ جائے تو اس میں کوتاہی مولف کے ساتھ اس فن کی اجنبیت اور اپنے
مذاق طبیعت کے اختلاف کا دخل بھی تصور فرمائیں۔ اگر اتنا کچھ تلخی برداشت کر لی گئی اور ذرا زیادہ ہو کر

کتاب کو چھوڑا نہیں گیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اتنی مناسبت پیدا ہو جائے گی کہ پھر وہ تکلف چھوڑنا بھی چاہیں تو چھوڑ نہ سکیں گے۔

ارباب علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا تدارک کیا جائے۔ اللھم تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم

آمین

محمد بدر عالم عفا اللہ عنہ

حدیث افتراق امت

اور

اس کی اسناد پر ایک نظر

امام ترمذیؒ نے حدیث افتراق امت روایت کرنے والوں میں چار صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت ابوہریرہؓ و عبداللہ بن عمروؓ کی روایت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور حضرت سعدؓ و عوف بن مالکؓ کا صرف حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے پھر اول الذکر صحابی کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا ہے اور ثانی الذکر کی حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

ابوہریرہؓ کی حدیث

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال تفرقت الیہود علی احدی وسبعین او ثنتین وسبعین فرقۃ والنصاری مثل ذلک وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ (ترمذی)

ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں منقسم ہوگئے اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوجائے گی۔

حافظ سخاویؒ نے بھی مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے اور شیخ محمد طاہرؒ نے تذکرۃ الموضوعات میں ان سے نقل فرما کر کوئی اختلاف رائے ظاہر نہیں کیا۔ امام شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں ابوہریرہؓ کی حدیث پر کئی جگہ صحت کا حکم لگایا ہے۔ [۱]

حدیث افتراق کے چند طریقوں کے نام

شارح سفر السعادۃ نے امام ترمذی کے پیش کردہ ناموں پر کچھ اور صحابہ کا اضافہ کیا ہے۔
انس، جابر، ابوامامہ، ابن مسعود، علی، عمرو بن عوف، عویمر ابوالدرداء، معاویہ، ابن عمر

---

[۱] حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن زیاد افریقی ہے وہ ضعیف ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸)
سنن ابن ماجہ ص ۲۹۲ و ص ۲۹۳ و ص ۲۹۵ — اور الاعتصام ج ۲ ص ۱۹۰۔ حاکم نے حدیث مذکور کو دو جگہ روایت کیا ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۰ و ۱۲۸) اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث علی شرط مسلم صحیح ہے اور حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔
[۲] مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسند احمد و ابوداؤد معاویہؓ کا نام ساتھ ہی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ حدیث بیان کرنے میں الفاظ کی روایت مل جاتی تو تعیین بہتر ہوتی کہ یہاں راوی سعد ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کنز العمال میں بھی راوی کا نام سعد ہے بحوالہ مسند احمد طبرانی، مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸ مستدرک میں بھی معاویہ ہے۔ (ملاحظہ ہو ج ۱ ص ۱۲۸)

وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین. اس طرح اس حدیث کے رواۃ کی تعداد ۹ تک پہنچ جاتی ہے جن میں ابوہریرہؓ
کی روایت کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے کسی نے کوئی قابلِ ذکر رد و قدح نہیں کی. بعض دوسرے صحابہ
کی روایات میں البتہ کچھ کلام کیا گیا ہے جو مختصراً حسبِ ذیل ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت | شیخ جلال الدین سیوطی حضرت انسؓ کی روایت عقیلی و دارقطنی کے حوالے سے پیش کرکے تحریر
فرماتے ہیں: والحدیث المعروف واحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ (یعنی معروف حدیث کے الفاظ
یہ ہیں ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ مسلمانوں کی جماعت ہوگی) پھر بطریق ابن عمر کی نقل کرکے لکھتے
ہیں: والمحفوظ فی المتن (یعنی اس متن کے جو الفاظ محفوظ کہے جاتے ہیں) تفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ
کلہا فی النار الا واحدۃ۔[1]

اہلِ علم جانتے ہیں کہ معروف و محفوظ منکر و شاذ کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور شاذ و منکر میں صرف
راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا فرق ہے گویا پہلے الفاظ کے خلاف روایت کرنے والے راوی ثقہ نہیں ہیں یا
دوسرے متن کے خلاف راوی اگرچہ ثقہ ہیں مگر ان کے الفاظ میں تفرد ہے. بہرحال معروف و محفوظ کہہ کر گویا
سیوطی نے حضرت انسؓ کی روایت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔

حافظ نور الدین ہیثمی نے اس مقام پر قدرے مبسوط کلام کیا ہے اور اس حدیث کے طرق سنن مشہورہ
کے علاوہ مسند ابو یعلیٰ، مسند بزار اور طبرانی سے پیش فرما کر ہر صحابی کی روایت پر تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت انسؓ
کی روایت کو بطریق مسند ابو یعلیٰ ایک طویل سیاق کے ساتھ نقل فرما کر لکھتے ہیں۔

وفیہ یزید الرقاشی ضعفہ الجمہور وقد | اس میں ایک راوی یزید رقاشی ہیں جن کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے
وثقہ ابن عدی وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح | اور ابن عدی نے ان کی توثیق کی ہے باقی تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔
ایک جگہ اسی حدیث کا دوسرا طریقہ پیش کرکے اس پر حسبِ ذیل کلام کرتے ہیں۔

رواہ ابو یعلیٰ وفیہ ابو معشر نجیح | اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی
وفیہ ضعف[2] | ابو معشر نجیح ہے اس میں ضعف ہے۔

حضرت ابو امامہؓ کی روایت | حضرت ابو امامہؓ کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں۔

رواہ ابن ماجہ والترمذی باختصار | اس کو ابن ماجہ و ترمذی نے مختصراً روایت کیا ہے اور طبرانی نے
ورواہ الطبرانی ورجالہ ثقات[3] | بھی روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔
ساتویں جلد میں اتنی تفصیل اور مذکور ہے۔

---

[1] اللآلی ص ۱۲۸ ج ۱، ۱۳۱ [2] مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۵۹ [3] ایضاً ج ۷ ص ۲۵۸ [4] ایضاً ج ۷ ص ۲۳۴ ۔

رواه الطبرانی فی الاوسط والکبیر بنحوه وفیه ابو غالب وثقه یحیی بن معین وغیره وبقیة رجال الاوسط ثقات وکذلک احد اسنادی الکبیر ۔ ۳

اس حدیث کو طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور معجم کبیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اس میں ایک راوی ابو غالب ہے جسے یحیی بن معین نے ثقہ قرار دیا ہے جبکہ معجم اوسط کے سب راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر کی بھی ایک اسناد کا حال ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت | حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت مسند بزار سے نقل کر کے لکھتے ہیں۔

رواه البزار وفیه موسی بن عبیدة الربذی وهو ضعیف ۔ ۲

مسند بزار میں اس کو روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ربذی ضعیف ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت | پھر اسی جلد میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے متعلق حسب ذیل ارشاد ہے۔

رواه ابو یعلی وفیه لیث بن ابی سلیم وهو مدلس وبقیة رجاله ثقات ۔ ۵

اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہے جو مدلس ہے۔ بقیہ راوی ثقہ ہیں۔

حضرت ابو الدرداءؓ، ابو امامہؓ، واثلہؓ، انسؓ کی روایت | پھر حضرت ابو الدرداء، ابو امامہ، واثلہ اور انس کی روایات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

رواه الطبرانی وفیه کثیر بن مروان وهو ضعیف جداً ۔ ۶

اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی کثیر بن مروان ہے اور مروان بھی بہت ضعیف ہے۔

حضرت عمرو بن عوفؓ کی روایت | اس کے بعد حضرت عمرو بن عوف کی روایت بحوالہ طبرانی نقل کر کے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

رواه الطبرانی وفیه کثیر بن عبد الله وهو ضعیف وقد حسن الترمذی له حدیثاً وبقیة رجاله ثقات ۔ ۷

اس میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے ترمذی نے اس کی ایک حدیث کی تحسین بھی کی ہے بقیہ تمام راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہیں۔

---

۱ ابو غالب کے نام میں اختلاف ہے کوئی حزور کوئی سعید بن حزور لکھتا ہے تہذیب التہذیب کی بارہویں جلد میں حافظ ابن حجرؒ نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ بعض کتب میں ابو غالب کی بجائے ابن ابی غالب لکھا ہے بلکہ [illegible] اس حدیث کے راوی ابو غالب ہی ہیں۔ اسی طرح کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۲۲ میں [illegible] کی بجائے [illegible] کے ساتھ لکھا ہے وہاں کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ۲ و ۳ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۸۹ ۔

۴ یہ راوی مختلف فیہ ہے اس لیے بعض نے اس کو ثقہ بھی کہا ہے۔

۵ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۸۹ ۔ ۶ ایضاً ج ۱ ص ۱۹۰ و مستدرک ج ۱ ص ۱۲۹ ۔

بلاشبہ کثیر بن عبداللہ کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے اور اسی وجہ سے امام ترمذیؒ کی تحسین کو بھی قابل اعتراض سمجھا گیا ہے مگر اہل علم و تجربہ جانتے ہیں کہ ترمذی اگر ضعیف راویوں کی روایات کی تحسین کرتے ہیں تو بیشتر ایسی جگہ کرتے ہیں جہاں تعامل یا خارجی دلائل سے روایت کی قوت ثابت ہو جاتی ہو صرف اس ضعیف طریقہ ہی پر ان کی نظر نہیں ہوتی۔ بنابریں اگر ابوہریرہؓ کی روایت کی صحت کے بعد اس طریقہ کی بھی تحسین کر دی ہو تو گنجائش نکل سکتی ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت | باب افتراق امت کے خاتمہ پر حافظ نورالدین نے حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث تحریر فرما کر لکھا ہے۔

رواہ الطبرانی باسانید ورجال احدھا رجال الصحیح غیر بکیر بن معروف وثقہ احمد وغیرہ وفیہ ضعف۔

اس حدیث کو طبرانی نے چند سندوں سے روایت کیا ہے جن میں ایک سند کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی ہیں سوائے بکیر بن معروف کے کہ وہ صحیح کا راوی نہیں ہے مگر امام احمد وغیرہ نے اس کی توثیق کی ہے اور اس میں کچھ ضعف ہے۔

حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت | عوف بن مالکؓ کی روایت مستدرک حاکم میں موجود ہے اور اس کے متعلق حاکم کے الفاظ یہ ہیں۔

ھذا الحدیث صحیح علی شرط الشیخین [1] یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

حاکم کی تصحیح کو عام طور پر علماء بنظر اعتبار نہیں دیکھتے مگر یہاں حافظ ذہبی نے بھی سکوت کیا ہے اور ان کے خلاف کوئی نکتہ چینی نہیں کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہبی کو بھی ان سے اتفاق ہے ورنہ حسب عادت یہاں بھی اپنا اختلاف رائے ظاہر کرتے۔

حضرت علیؓ کی حدیث | علامہ شاطبیؒ نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ لا اضمن عھدۃ صحتہ اس کی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا [2] مگر کوئی خاص جرح بھی نہیں فرمائی۔

حدیث معاویہؓ | امیر معاویہؓ کی حدیث نقل کر کے حاکم فرماتے ہیں۔ [3]

ھذہ اسانید تقوم بھا الحجۃ فی تصحیح ھذا الحدیث — یہ اسانید ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے

اتنی بات کو ذہبیؒ نے بھی تسلیم کیا ہے۔

چند صحابہ میں سے تیرہ صحابہ کی احادیث پر علماء کے یہ خیالات ہیں ان میں ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرو، انس، جابر، ابو امامہ، عمرو بن عوف، معاویہ، ابن عمر، عوف بن مالک کی روایات صحیح یا حسن کے درجہ پر آ سکتی

[1] مستدرک ج ۴ ص ۴۳۰ [2] الاعتصام ج ۲ ص ۱۸۹ [3] مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸

ہیں۔ بقیہ روایات کی اسانید اگرچہ ضعیف ہوں مگر تعدد طرق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھی قابل نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔ اب اس مجموعہ روایات کو سامنے رکھکر انصاف کیجئے کہ جو حدیث اتنے صحابہ سے مختلف اور متعدد طریقوں سے مروی ہو کیا محض چند شبہات کی وجہ سے اس سے صرف نظر کر لینا درست ہوگا۔

کسی حدیث پر اجمالی حکم اس کے مجموعۂ طرق پر حکم نہیں ہے

مذکورہ بالا بیان سے مختصر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ایک حدیث کتنے کتنے صحابہ سے روایت کی گئی ہے۔ پھر ایک ایک صحابی کی حدیث کے کتنے کتنے طریقے ہیں۔ اس لئے کسی حدیث کے متعلق ضعف یا صحت کا حکم دیکھ کر پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہئے کہ یہ حکم اس کے تمام طریقوں پر حاوی ہے یا کسی خاص صحابی کی حدیث یا اس کے کسی خاص طریقے سے متعلق ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک ایک حدیث کے تمام طریقے ہر محدث کے پیش نظر ہوں۔

امام ترمذی جیسا جلیل القدر امام حدیث یہاں صرف چار صحابہ کا پتہ دیتا ہے حالانکہ ان کے علاوہ کیارہ صحابہ اور بھی ہیں جو اس کو روایت کرنے والے ہیں۔ پس اگر کوئی محدث کسی حدیث پر کوئی اجمالی حکم لگاتا ہے تو یہ صرف اس کے علمی استحضار کے لحاظ سے ہے۔ اب اگر خارجی ذرائع اور تحقیقات سے کسی خاص طریقہ کا ضعف و صحت ثابت ہو جائے تو یہ اس کے مبہم حکم کے ہرگز معارض نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے علم میں یہ طرق نہ ہوں۔ اگر ان طرق کے علم کے بعد بھی اس کی رائے وہی رہتی ہے تو اب اس کو مخالف یا موافق کہنا درست ہوگا۔ اس کے بعد اختلاف رائے کا مرحلہ پھر زیر بحث رہے گا۔ راویوں یا روایات کے سلسلہ میں تضعیف و توثیق کا مسئلہ اہل علم کے نزدیک دن رات کی بات ہے۔ ایک ناواقف ایک محدث کی رائے نقل کرکے اسے سارے طریقوں پر حاوی سمجھ لیتا ہے اور اس ایک رائے کو سارے محدثین کی رائے سمجھ بیٹھتا ہے اور واقف حال کو تحقیق کے بعد غور کرنا پڑتا ہے کہ دلائل کا پلہ کس طرف بھاری ہے۔ یہی حدیث جس کے متعلق آپ نے یہ تفصیل پڑھی۔ اب آئیے اس کے مخالف آراء کا حال دیکھئے علامہ مجد الدین فیروز آبادی سفر السعادۃ کے خاتمہ پر اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں۔

لم یثبت فیہ شئ — اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی۔

احادیث پر تنقید کرنے میں تعبیرات اور ان کا فرق

ان الفاظ کو دیکھکر بعض لوگ تو یہاں تک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مصنف کے نزدیک یہ حدیث گویا موضوع ہے۔ کاش یہ ان حضرات نے اگر اس کتاب کی ذرا ورق گردانی کی ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مصنف نے احادیث پر حکم لگانے کے لئے مختلف تعبیرات منتخب کی ہیں۔ کہیں "باطل موضوع" اور کہیں "لم یصح فیہ حدیث" اور کہیں "لم یثبت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان تینوں الفاظ میں بڑا فرق ہے پہلی تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ اس مضمون کو حدیث رسول کہنا ہی

غلط ہے اور دوسرا لفظ صرف صحت کی نفی کرتا ہے خواہ کسی کے نزدیک وہ حدیث ثابت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قنوت، جہر بسم اللہ، اشعار، وضو بالنبیذ کی احادیث پر بھی مصنف نے یہی حکم لگایا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب بے اصل ہیں۔ اسی طرح "لم یثبت" کا لفظ ضعیف طرق کی نفی نہیں کرتا۔ اگر ان تعبیرات کے فروق کی رعایت کی جائے تو بہت سے مواضع پر مصنف کے کلام سے اعتراض اٹھ جائے گا۔ ۱؎

۱؎ مولانا عبدالحی صاحب نے رسالہ الرفع والتکمیل میں ان فروق کی اچھی تشریح فرمائی ہے ملاحظہ ہو۔

كثيراً ما يقولون لا يصح ولا يثبت هذا الحديث ويظن منه من لا علم له انه موضوع او ضعيف وهو مبني على جهله بمصطلحاتهم وعدم وقوفه على مصطلحاتهم. فقد قال علي القاري في تذكرة الموضوعات لا يلزم من عدم الثبوت وجود الوضع انتهى. وقال الحافظ ابن حجر في تخريج احاديث الاذكار انه يثبت عن الامام احمد بن حنبل انه قال لا اعلم في التسمية في الوضوء حديثا ثابتا قلت لا يلزم من نفي العلم ثبوت العدم وعلى التنزل لا يلزم من نفي الثبوت ثبوت الضعف لاحتمال ان يراد بالثبوت الصحة فلا ينتفي الحسن وعلى التنزل لا يلزم من نفي الثبوت عن كل فرد نفيه عن المجموع. وقال نور الدين السمهودي قلت لا يلزم من قول احمد في حديث التوسعة على العيال يوم عاشوراء لا يصح ان يكون باطلا فقد يكون غير صحيح وهو صالح للاحتجاج به اذ الحسن رتبة بين الصحيح والضعيف اه. وقال الزركشي في نكت على ابن الصلاح بين قولنا موضوع وبين قولنا لا يصح بون كثير فان الاول اثبات الكذب والاختلاق والثاني اخبار عن عدم الثبوت ولا يلزم منه اثبات العدم وهذا يجيء في كل حديث قال فيه ابن الجوزي لا يصح ونحوه. وقال علي القاري مع ان قول السخاوي لا يصح لا ينافي الضعف والحسن اه. وقال الزرقاني ونقل القسطلاني عن ابن رجب ان ابن حبان

بسا اوقات محدثین لا یصح یا لا یثبت کا لفظ فرماتے ہیں تو ناواقف اس کا مطلب یہ سمجھ لیتا ہے کہ حدیث ان کے نزدیک موضوع یا ضعیف ہے یہ خیال ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ ملا علی قاری تذکرۃ الموضوعات میں فرماتے ہیں کہ عدم ثبوت کے ثبوت سے اس کا موضوع ہونا ضروری نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر تخریج الاذکار میں لکھتے ہیں کہ امام احمد فرماتے کہ میرے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث ثابت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے تو کسی شخص کے نہ جاننے سے اس چیز کا عدم ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر نفی ثبوت سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو ہر ہر فرد کے نفی ثبوت سے مجموعہ کا ثبوت نہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ نورالدین سمہودی فرماتے ہیں کہ امام احمد کے عاشوراء کی حدیث کے متعلق لا یصح فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ باطل ہو، ہو سکتا ہے کہ صحیح نہ ہو مگر قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کے درمیان ایک مرتبہ حسن کا بھی ہے۔ زرکشی نکت ابن صلاح میں فرماتے ہیں کہ ہمارے (موضوع) اور (لا یصح) کہنے میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ موضوع کہنے کا مطلب تو اس کا جھوٹ اور وضع ثابت کرنا ہے اور لا یصح میں صرف عدم ثبوت کی خبر ہے، کوئی ضروری نہیں کہ اس کا عدم ثابت مان لیا جائے۔ یہی بات ان تمام حدیثوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے جن کے بارے میں ابن جوزی نے لا یصح یا اسی طرح کا کوئی اور حکم لگا دیا ہے۔ زرقانی کہتے ہیں کہ قسطلانی نے حافظ ابن رجب سے نقل کیا ہے کہ ا(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

علاوہ ازیں شارح سفر السعادۃ لکھتے ہیں کہ علامہ مجد الدین کا یہ حکم صرف ان الفاظ پر ہے جو یہاں انہوں نے نقل کئے ہیں یعنی ۷۳ فرقوں میں امت کا افتراق۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ لفظ تمام طریقوں کے خلاف ہے۔ حافظ بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے صرف ایک طریقہ میں یہ لفظ پیش کیا ہے بقیہ سب طرق و روایات میں ۷۲ کا لفظ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ سفر السعادۃ کے بعض نسخوں میں اسی کی جگہ تین کا لفظ بھی موجود ہے۔ اس کے متعلق شارح فرماتے ہیں "اگر ایں چنیں است محل سخن است" اگر ۷۳ کی روایت کے متعلق بھی مصنف کی یہی رائے ہے تو اس میں کلام ہے۔

ابن حزم بھی زیر عنوان "والکلام فیمن یکفر ومن لا یکفر" اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں۔

هذان حديثان لا يصحان اصلا من طريق الاسناد[1] یہ دونوں حدیثیں اسنادی لحاظ سے بالکل صحیح نہیں ہیں

یہاں بھی صحت کی نفی ہے اب ان دونوں حضرات کا یہ مجمل حکم دیکھئے اور اس کے مقابلے میں وہ ساری تفصیلات سامنے رکھئے جہاں ایک ایک روایت کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔

ابن حزم کی رائے فیصلہ کن نہیں ہے

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ان حفاظ حدیث کے سامنے وہ سب طرق موجود بھی تھے یا نہیں یا اور اگر موجود بھی تھے تو کیا اصول حدیث کا کوئی ضابطہ ہے کہ جس طرف ابن حزم ہو جائیں بس وہ صواب ہی میں منحصر ہو جائے گی۔ اگر ایک طرف حافظ ابن جوزی کا تشدد امت میں ضرب المثل ہے تو اس کے ساتھ ہی ابن حزم کی زبان کا سیفِ حجاج[2] ہونا بھی مشہور ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فیروز آبادی کا قول ابن رجب

لم يصح في ليلة نصف شعبان شيء الا ان يريد نفي الصحة الاصطلاحية فان حديث معاذ هذا حسن لا صحيح اھ

ابن رجب نے شب نصف شعبان کی فضیلت کی حدیث کے بارے میں جو کہا ہے اس سے ثابت ہوا کہ اس حدیث کے متعلق ابن رجب کا یہ کہنا غلط ہے مگر یہ کہ ان کے کلام میں اصطلاحی صحت کی نفی مراد لی جائے کیونکہ معاذ کی یہ حدیث اصطلاحی طور پر حسن ہے صحیح نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کتاب الفصل ج ۳ ص ۱۳۸۔

[2] اس کی وجہ حافظ ابن حزم نے اپنی تصنیف مداواۃ النفوس میں خود تحریر فرمائی ہے۔

ولقد اصابتني علة شديدة ولدت على ربوا في الطحال شديدا فولد ذلك على من الضجر وضيق الخلق وقلة الصبر والنزق امرا حاسبت نفسي فيه اذ انكرت تبدل خلقي واشتد عجبي من مفارقتي لطبعي۔

[illegible]

مجھ کو ایک شدید بیماری لاحق ہوئی تلی کی وجہ سے بیزاری بہت بڑھ گئی تھی اس سے بیزاری تنگ مزاجی چڑچڑا پن اور بداخلاقی جلد بازی پیدا ہو گئی ہے جب میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میری عادات و اخلاق کس قدر تبدیل ہو گئے ہیں اور میں اپنی اصلی طبیعت سے کتنا دور ہو گیا ہوں۔

بہرحال حدیث کا معاملہ ماورثاہ کے تابع نہیں ہے۔ حدیث کے اب نیا اب بھی موجود ہیں۔ ان مبہم اور مجمل کلمات کو چھوڑ کر ہم ان کے رجال پر تفصیلاً نظر کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد بھی اگر کوئی ابن حزم اور علامہ عبد الرحمٰن کے ساتھ رہتا ہے تو امید کہ ہے[۱] بجز اس کے یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ حافظ ابن حزم اپنی وسعت نظر کے باوجود خود امام ترمذی اور ان کی کتاب الجامع سے ناواقف ہیں اس لئے ان کا تیقن تھا اور بھی بے اثر ہو گیا ہے۔

حدیث کی صحت پر معنوی قرائن

حنیفیہ اور یہودیہ و نصرانیہ کا تقابل

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی دنیا میں دین حنیف کے حریف صرف دو مذہب ہیں یہودیت اور نصرانیت عہد نبوی میں بھی جو لڑائیاں جنگ ان ہی دو کے درمیان نظر آتی ہے اور احادیث صحیحہ بھی ان ہی دو کے درمیان مستقبل میں کشمکش کا پتہ دیتی ہیں۔

آیات ذیل کو بغور پڑھئے اور اس عنوان کا اندازہ کیجئے۔

قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ — کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا نصرانی بن جاؤ تو راہ پاؤ گے آپ کہہ دیجئے بلکہ میں حضرت ابراہیم کی ملت کا متبع ہوں جو ایک طرف ہو جانے والا تھا۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا۔ — حضرت ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ایک طرف ہو کر خدا کے فرمانبردار تھے۔

غیر المغضوب علیہم میں اتباع یہود و نصاریٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ

غالباً اسی لئے قرآن کریم نے صراط مستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے اثباتی پہلو میں منعم علیہم کا اور سلبی پہلو میں مغضوب علیہم اور ضالین کا ذکر کیا ہے اور اس اہتمام سے کیا ہے گویا جب تک یہ سلبی پہلو ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک صرف صراط الذین انعمت علیہم اس کے پورے مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتا پھر ان دعا کے تجویز تعلیم کرنے

۱؎ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ابن حزم اپنی جلالت قدر کے باوجود امام ترمذی جیسے شخص سے بالکل ناآشنا ہیں حتیٰ کہ جب ان کے سامنے ترمذی کا تذکرہ ہوا تو تعجب سے فرمایا: ومن محمد بن عیسیٰ بن سورۃ یعنی محمد بن عیسیٰ کون شخص ہیں۔ (دیکھو الباعث الحثیث فی معرفت علوم حدیث)

حافظ ذہبی امام ترمذی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ وقال ابو محمد بن حزم فانه نادى على نفسه بعدم الاطلاع فقال فی کتاب الفرائض من الایصال محمد بن عیسی بن سورة مجهول۔ ابن حزم کو اس بات کا اقرار ہے کہ وہ محمد بن عیسیٰ (ترمذی) سے واقف نہیں تھا اسی لئے ان کو مجہول لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب)

• علامہ کوثری نے بھی ترمذی کے بارے میں ابن حزم کا قول کہ وہ مجہول شخص ہیں کچھ قابل التفات نہیں ہے کیونکہ ان کو نہ امام ترمذی کی کتاب جامع سے واقفیت ہے اور نہ ان کی کتاب العلل کا علم ہے۔ (مقالات الکوثری)

میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملت حنیفیہ پر سب سے زیادہ خطرہ ہے تو شاید ان مغضوب علیہم اور ضالین کی اتباع کا ہے جن کا دوسرا نام یہودیت ونصرانیت ہے۔

مشرکین یہود کے تعلقات

کتب سیرت کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیت ونصرانیت بھی گو آسمانی دین تھے مگر مشرکین کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات قائم تھے جونہی اسلام نے دنیا میں قدم رکھا سب سے پہلے مشرکین کے ساتھ اس کے مقابلے میں یہودی ونصرانی تھے حالانکہ دین سماوی میں اشتراک کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو دین حنیفی کے ساتھ پوری ہمدردی ہوتی اور بجائے مشرکین کے ان کا رخ اسلام کی طرف ہو جاتا لیکن جیسے جیسے اسلام ترقی کرتا رہا اسی قدر یہودیت ونصرانیت بڑھ بڑھ کر اسی کے مقابلے پر آتی رہی یہاں تک کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو مشرکین عرب نے اسلام کے سامنے سپر ڈال دی اور ادھر کی طرف سے شریعت مطہرہ کو اتنا اطمینان میسر ہوا کہ صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا گیا۔

ان الشیطان قد أیس ان یعبدہ المصلون فی جزیرۃ العرب۔ (مشکوٰۃ شریف) شیطان اب اس بات سے ناامید ہو گیا کہ نمازی مخلوق پھر کبھی جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے۔

پھر اسلام کا یہود ونصاریٰ کی طرف سے خطرہ کا آخری اعلان

لیکن یہودیت ونصرانیت کا علم جنگ اسلام کے بالمقابل برابر لہراتا رہا اور کسی وقت بھی اسلام کو ان کی دسیسہ کاریوں سے اطمینان میسر نہ ہوا حتی کہ صاحب شریعت کے آخری لمحات حیات کی وصیتوں میں ایک اہم بالشان وصیت یہ تھی۔

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب کے بیچ سے باہر نکال دینا

اسی حریفانہ کشمکش کا نتیجہ تھا کہ جب حنیفیت کا زمین پر اقتدار رہا تو یہودیت ونصرانیت مغلوب ہو گئیں اور جب کبھی یہودیت ونصرانیت کا غلبہ ہوا تو حنیفیت کو مغلوب ہو جانا پڑا۔

یہود ونصاریٰ سے جزیہ قبول کرنے کی وجہ

اس سلسلہ میں واضح رہنا چاہیے کہ یہودیت ونصرانیت کے مسخ ہو جانے کے باوجود اسلام نے محض دین سماوی ہونے کے باعث ان کی بڑی رعایت رکھی ہے۔

موافقت اہل کتاب کی حکم سنت فتح مکہ تک تھی

چنانچہ اسلام فتح مکہ سے قبل تک جن امور میں جدید ہدایات نازل نہ ہوتی تھیں کفار کے ان کی موافقت کو ترجیح دیتا رہا لیکن جب اس سلوک کے بعد بھی ان کا دل نہ پسیجا تو یہ ثابت ہو گیا کہ اب ان کے سینہ و کینہ سے اسلام کی عداوت نکلنے والی نہیں ہے اس لئے مخالفت کا حکم دیدیا گیا، اور آئندہ ان تمام مواقع پر جہاں جہاں سے حنیفیت کو یہودیت ونصرانیت سے خطرہ ہو سکتا تھا امت کو خبردار کر دیا گیا۔

مشترکہ مذہبی گمراہی میں اسلام کی خبرداری

روزہ، نماز، شکل وشباہت، دعا وسلام میں غرض جہاں بھی

اسلامی سرحدوں کے وسیع ہونے سے تفرقے نے جو ملت ضعیف کے حامیوں بھر فرقوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ اپنے حدود کی نگرانی رکھیں۔ اس کے باوجود صاحب نبوت کی دور بین نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اس حریف کا ایک دن پھر غلبہ ہوگا اور پھر پیروان ملت حنفی یہودیت و نصرانیت کے پیچھے چل پڑیں گے۔ اسی عہد نا مسعود کا نقشہ صحیح بخاری کی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔

اس امت میں یہود و نصاریٰ کی اتباع کی پیشگوئی

لتتبعن سنن الذين من قبلكم شبرا بشبر وذراعا بذراع حتى لو دخلوا في جحر ضب لاتبعتموه قلنا يا رسول الله اليهود والنصارى قال فمن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ضرور گزشتہ لوگوں کے قدم بقدم چل کر رہو گے حتی کہ اگر ان میں کوئی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوا ہوگا تو تم بھی ضرور داخل ہو گے ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر اور کون۔

دوسرے الفاظ میں اس مجنونانہ اتباع کی غایت بیان کی گئی ہے کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا ہوگا تو تم میں بھی ایسے افراد ہوں گے جو یہ روسیاہی کر کے رہیں گے۔

بعض نو مسلموں کو مشرکین کی نقالی کی تمنا اور آپ کی سرزنش

جب تک اسلام کا ضعیف دور رہا بعض نو مسلموں کے قلوب میں پھر معمولی اور غیر معمولی امور میں یہی جذبۂ اتباع ابھرتا رہا۔

"ابو واقد لیثی فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ خیبر کی سمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئے اس وقت ہم نو مسلم تھے وہاں مشرکین نے ایک درخت اپنے ہتھیار لٹکانے کے لئے مقرر کر رکھا تھا ہم نے اسے دیکھ کر کہا یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی درخت ہتھیار لٹکانے کے لئے مقرر کر دیجئے آپ نے تعجب سے تکبیر کہی اور فرمایا یہ تو وہی بات ہوئی جیسا بنی اسرائیل نے (حضرت موسیٰ سے) بت پرستوں کو پوجا کرتے دیکھ کر کہہ پڑے تھے [illegible] جیسا خدا ان کا ہے ایسے ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی خدا بنا دیجئے۔ تم ضرور یہود و نصاریٰ کی نقالی کر کے رہو گے۔"

لیکن جتنی اسلام کو قوت حاصل ہوتی گئی اس کے یہ جذبات فنا ہوتے رہے حتی کہ کچھ دن بعد ہی اب ان کا نقشہ ہی بدل گیا۔

"حضرت مقداد بن الاسود جنگ بدر کی تیاری کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں کہتے ہیں یا رسول اللہ ہم وہ نہیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ کہیں کہ اے موسیٰ جاؤ تم اور تمہارا رب لڑو۔ ہم تو آپ کے دائیں بائیں آگے اور پیچھے ہو کر آپ کے ساتھ جنگ کریں گے۔" (بخاری شریف)

اب ان دونوں جذبات کا موازنہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی بات یعنی حرص اتباع جو عہد ضعف

میں غیر اختیاری طور پر سنت نکل رہی تھی اب اختیاری قابلِ نفرت رہ جاتی ہے مگر دونوں کا نقطۂ تجاذب وہی بنی اسرائیل ہیں۔ اسلامی دورِ انحطاط میں وہی اتباعِ بنی اسرائیل کا جذبہ پھر لوٹ آئے گا۔ خود بنی اسرائیل کی جو شباہت پہلے اختیاری قابلِ نفرت و حقارت معلوم ہوتی تھی پھر لائقِ رغبت بن جائے گی۔ امتِ محمدیہ کے اسی رجحانِ تقرب کو صحیح بخاری کی حدیثِ بالا میں بیان کیا گیا ہے یعنی وہی بات جو آپ کے زمانہ میں قابلِ تعجب تھی آئندہ دور میں بکثرت طور پر ہونے والی بات ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر یہود و نصاریٰ میں کسی نے ماں سے زنا کیا ہوگا تو اس بے حیائی میں بھی یہ امت ان کی اتباع کر کے رہے گی۔

امتِ محمدیہ صفتِ اتباع کی بدولت صفتِ افتراق میں بھی مبتلا کرے گی

اس شدتِ اتباع سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ یہ امت جب ہر معقول اور نامعقول بات میں ان کے نقشِ قدم پر چلے گی تو یقیناً ضلالت اور گمراہی کی وہ سب راہیں جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کی تھیں یہ بھی اختیار کرے گی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جتنے فرقے ان میں پیدا ہوئے تھے اس میں بھی ضرور ہوں گے لیکن افسوس یہ ہے کہ بلند تر چیز گرتا ہے تو یہاں بھی ضرور رہتا ہے اس لئے امتِ محمدیہ جب دورِ عروج و کمال میں بلند تر تھی تو اپنے دورِ انحطاط میں اسے فروتر بھی رہنا چاہئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وصفِ افتراق میں یہود و نصاریٰ سے آگے آگے نظر آنا چاہئے۔ آخر جو منصبِ اعلیٰ علیین پر جلوہ نما تھا جب ایمان اور عملِ صالح سے محروم ہوا تو اس کا ٹھکانا اسفل السافلین ہی ٹھہرا۔

شدتِ اتباع اور حدیثِ افتراق کا تناسب

غالباً اسی گہری مناسبت کی وجہ سے صحیح بخاری کی اس حدیث کو جامع ترمذی کی حدیثِ افتراق کے لئے بطور مقدمہ ذکر کیا گیا ہے یا بالفاظِ دیگر اس شدید افتراق کو اس عبرتناک شدید اتباع کا ثمرہ اور نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو باتیں بنی اسرائیل میں ہوئی ہیں وہ ٹھیک ٹھیک سب میری امت میں ہوں گی حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی کوئی ایسا بدبخت ہوگا جو اس بے حیائی کا ارتکاب کرے گا اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے (الحدیث)

اس بیان کو پڑھئے اور بغور پڑھئے اور اس کے بعد اس نتیجہ تک پہنچ جائیے جو اس شدید اتباع اور شدید اختلاف کے مابین مستور ہے اگر آپ اس ربط کو پالیں تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ حدیثِ افتراق درحقیقت صحیح بخاری کی حدیثِ اتباع کا ایک تتمہ تھا جو دراصل رہ گیا تھا وہ یہاں ذکر کر دیا گیا ہے بہرحال اگر ہمارے پاس صرف صحیح بخاری کی یہی ایک حدیث ہوتی تو افتراقِ امت کی اجمالی داستان سمجھنے کے لئے کافی تھی۔ حدیثِ افتراق پر بحث کے متعلق آیاتِ قرآنیہ کے کچھ اشارات بھی آپ کے ملاحظہ سے گذریں گے لیکن اس سے قبل ہم مفہومِ اختلاف کو ذرا واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

لفظ اختلاف کی توضیح

ہر یکساں حالت کے بعد جب اس کے خلاف کوئی دوسری حالت رونما ہوتی ہے تو اس کا نام ہم اختلاف رکھتے ہیں اس لحاظ سے اگر اس عالم پر عرش سے لیکر فرش تک نظر ڈالیں تو سارا عالم اسی اختلاف کی آماجگاہ نظر آئے گا یہاں تک کہ اگر اس عالم کی کوئی زیادہ سے زیادہ صحیح تعریف ہو سکتی ہے تو یہی ایک لفظ اختلاف ہے

اختلاف زمان لیل و نہار، صبح و شام، پھر اس میں فصلوں اور موسموں کا ایک اختلاف ہے جسے اختلاف زمان کہنا مناسب ہے اس اختلاف کو آیت ذیل میں ذکر کیا گیا ہے

ولہ اختلاف اللیل والنہار — شب و روز کا یہ اختلاف خدا تعالیٰ ہی کا تصرف ہے

اختلاف اجناس و انواع اس سے آگے بڑھئے تو حیوانات، نباتات و جمادات کا اختلاف پھر ان میں اجناس اور اجناس میں انواع اور انواع میں اصناف اور اصناف میں افراد کا اختلاف ہے پھر ان افراد میں جیسے بولیوں، مزاجوں، رنگوں، صورتوں، باتوں کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے

اختلاف السنتکم والوانکم — تمہاری زبان اور رنگوں کا اختلاف

آفاق و انفس کا یہ اختلاف دیکھ کر صاف طور سے یقین ہو جاتا ہے کہ افتراق و اختلاف اس جہان کی فطرت ہے بلکہ اسی پر اس کی آبادی کا مدار ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن — اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اختلاف ضلالت و ہدایت لیکن اس وقت یہ اختلافات زیر بحث نہیں ہیں بلکہ اس سے بالاتر ضلالت و ہدایت کا ایک اختلاف ہے وہی یہاں امر زیر بحث ہے اس لحاظ سے اگر پورے عالم پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ سے ایک طرف ہی ہدایت رہی ہے دوسری طرف اسی کو حسب ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین — تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر

فہدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا — تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے مومنوں کو ان باتوں میں ہدایت بخشی

فیہ من الحق باذنہ — جن میں ان کے پیشرو اہل کتاب نے اختلاف پیدا کیا تھا۔

اختلافی سوالات میں امت محمد کی کامیابی کے مقامات مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت میں یہ اختلاف ہوا کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی خدائے قدوس نے امت محمد کو ہدایت نصیب فرمائی کہ وہ دونوں خیال غلط ہیں، وہ دین حنیف پر تھے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اختلاف ہوا یہود نے ان کا انکار کیا اور نصاریٰ نے

خدا ٹھیرایا۔ یہاں امت محمدیہ کو ہدایت نصیب ہوئی اور جادۂ مستقیم ان ہی کے لئے مقدر ہو۔

قبلہ کے بارے میں بھی ایک رائے یہی ہے کہ دوسری امتوں کے انتخاب پر رکھا گیا تھا مگر انھوں نے یہاں بھی صحیح انتخاب نہ کیا اور جو اصل قبلہ تھا اس کی ہدایت اسی امت کو نصیب ہوئی۔

جمعہ کا دن بھی اسی اختلاف کی ایک کڑی ہے پہلی امتوں نے یوم التعطیل میں غلطی کی کسی نے یوم السبت اور کسی نے یوم الاحد مقرر کیا۔ امت محمدیہ کو یہاں بھی راہ ہدایت نصیب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

اسی اختلاف کی طرف آیۂ ذیل میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً	اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا
وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ (۱۱۸) إِلَّا	لیکن وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے بجز ان کے جن پر آپ کا پروردگار
مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ہود)	رحم فرمائے اور اسی اختلاف کے لئے انھیں پیدا کیا ہے۔

اختلاف امم علماء اور مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہاں مختلفین سے یہود و نصاریٰ اور مجوس و صابئین کا اختلاف مراد ہے اور الا من رحم ربک سے مراد حنفاء ہیں۔ شاید اسی لئے بھی اس امت کو امت مرحومہ کا خطاب دیا گیا۔

اختلاف امت محمدیہ لیکن اس اختلاف کے علاوہ ایک اور اختلاف ہے جو خود اس امت میں مقدر ہے وہ جماعت اہل حق اور باطل فرقوں کا اختلاف ہے اس بنا پر فرق باطلہ مختلفین کا مصداق رہیں گے اور اہل حق "الا من رحم ربک" کا۔

اختلاف اہل حق اس سے بھی آگے خود جماعت اہل حق کا اختلاف ہے جس پر ہم آئندہ بحث کریں گے

اختلاف تکوینی ہے پہلے آیت کی مراد سنئے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے عالم کو اپنی صفت جلال و جمال کی جلوہ نمائی کا مظہر بنانا تھا اس لئے اس نے انسانوں کو ایسے ہی قوائے فکریہ و عملیہ سے مرکب فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ اسباب سعادت و شقاوت میں اختلاف کرتے ہی نظر آئیں گے اور اسی باہمی کشمکش میں خدائی قہر و مہر کا سامان مہیا ہوتا رہے گا۔ اگر اس دنیا میں یہ اختلاف رونما نہ ہوتا تو یہ مختصر سا عالم خود ذلیل بن جاتا اور یہاں کے بسنے والے یا صرف خدائی مہر کے مظہر ہوتے یا صرف قہر کے لیکن عالم تقدیر کو ایک ناتمام کمال کا مظاہرہ ناپسند تھا اس لئے اس نے اختلاف اس کی بنیاد میں ڈال دیا اور اسباب فطریہ کی پیدائش دنیا جس قدر پھیلتی جائے اختلاف کا دامن بھی اسی قدر وسیع ہوتا چلا جائے حتیٰ کہ یہود اگر اکہتر فرقوں میں بٹے ہوں تو نصاریٰ بہتر فرقوں میں، پھر امت محمدیہ جو آخری اور سب سے بڑی امت ہے وہ تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے۔ تو یہ ہوئی۔ اس آیت میں مختلفین کو "الا من رحم ربک" کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عالم تکوین نے تکوینی طور پر تمام انسانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے (۱) اہل اختلاف (۲) مرحومین۔

اختلاف کرنا رحمت سے محرومی کی علامت ہے

اس تقابل سے مفہوم ہوتا ہے کہ جو اہل اختلاف ہیں وہ رحمت کے تحت نہیں ہیں اور جو رحمت کے نیچے آچکے ہیں وہ قرآن کی نظر میں اہل اختلاف کی فہرست میں داخل نہیں اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نجات صرف اس جماعت کے لئے ہے جو اِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّکَ کی مصداق ہے اور بقیہ اہل اختلاف کے لئے نجات نہیں۔ سورۂ انعام میں اس اختلاف کی مزید تشریح ملتی ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ — میرا سیدھا راستہ یہی ہے اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (انعام) — کہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا کر کے تتر بتر کر دیں گے۔

راہ حق ایک ہے اور گمراہی کے راستے بہت

آیت بالا میں صراط مستقیم کے لئے لفظ مفرد اور بقیہ اہل اختلاف کے لئے "السُّبُل" لفظ جمع اختیار کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راہ مستقیم ایک ہی ہے اور ضلالت و گمراہی کے راستے بہت ہیں۔

صراط مستقیم اور سبل متفرقہ کا نقشہ

مسند احمد اور نسائی وغیرہ میں ہے کہ اس معنوی افتراق و تشتت کو محسوس طور پر سمجھانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں بائیں اور بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا دیکھو یہ سیدھا خط تو صراط مستقیم ہے اور اس کے دائیں بائیں جو خطوط ہیں سبل متفرقہ یعنی وہ راہیں ہیں جن کی طرف شیاطین دعوت دیتے ہیں اس کے بعد آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

قرآن کریم میں حدیث افتراق کی طرف اشارہ ہے

اب اگر سورۂ ہود اور سورۂ انعام کی ان ہر دو آیات کے نتائج کو ملاؤ تو حدیث افتراق امت کا پورا پورا مفہوم سامنے آجاتا ہے صرف فرق باطلہ کی تعداد کا عدم تحدید کا فرق باقی رہتا ہے اور اگر دونوں آیتوں کے نتائج کا تجزیہ کرو تو حسب ذیل ہوگا۔

آیت انعام۔ (۱) صراط مستقیم صرف ایک ہے۔ (۲) سُبل متفرقہ بہت ہیں۔
سورۂ ہود۔ (۳) نجات صرف ایک جماعت کے لئے ہے۔ (۴) اہل اختلاف کے لئے نجات نہیں۔

یہی حاصل اس حدیث افتراق کا مفہوم ہے اور یہی ضلالت و ہدایت کے اس اختلاف کو سورۂ بقرہ میں بھی حسب ذیل پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ — سب لوگ ایک ہی دین پر تھے پھر انہوں نے
النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ — دین میں اختلاف ڈالا، تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری
مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ — سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان کے
بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ۔ — ساتھ سچی کتاب اتاری تاکہ وہ باتوں میں لوگوں کے
(بقرہ) — اختلافات کا فیصلہ کرے

رسول دنیا میں نامروا اختلافات کو مٹانے کے لئے آتے ہیں۔

انبیی قدرسیہ قدوس نے تو رسولوں کو اس لئے بھیجا تھا کہ نامروا اختلاف ختم کر دیا جاتا اور یک جہتی کے ساتھ اس قانون پر عمل کیا جاتا جو "الکتاب" کے نام سے اتارا گیا تھا مگر افسوس کہ عاقبت نااندیشوں نے اس سامان وحدت کو بھی سامان اختلاف بنا لیا اور اس طرح بعثت انبیاء اور تنزیل صحف کا جو اصل منشا تھا اسی کو برباد کر ڈالا۔ اس کے تفصیلی ذکر کو سورۂ ہود کی آیت ولذلک خلقھم، میں سمجھایا گیا تھا جس کی طرف ہم مضمون کے شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔

قرآن کریم سے لفظ اختلاف کی توضیح

اب اس اختلاف کی حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے آیات ذیل پر غور کیجئے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (انعام)	جنہوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سی پارٹیاں بن گئے آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔
مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ (روم)	اور ان لوگوں میں سے مت ہو جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالا اور ٹولیاں بن گئے ہر پارٹی اپنے خیال میں مست ہے۔
أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ۔ (انعام)	خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اگر چاہے تو تمہاری پارٹیاں بنا دے اور تم کو آپس ہی میں لڑا دے۔

عذاب افتراق عذاب استیصال کا بدل ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ آپ کی امت پہلی امتوں کی طرح ہلاک نہ ہو، وہ دعا مستجاب ہوئی اور عذاب استیصال ہمیشہ کے لئے اٹھا لیا گیا مگر آپس کے افتراق و تشتت کا متعدد عذاب پھر بھی باقی رہا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پارٹیوں سے اہل اہواء کا اختلاف مراد ہے اور آپس میں لڑانے کا مصداق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہہ کر جنگ شروع کر دے جیسا کہ خوارجؓ نے حضرت علیؓ کے ساتھ کیا تھا (الاعتصام ج۲ ص۲۹)

افتراق مذموم کی صورت

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں جو افتراق مذموم ہے وہ یہ ہے کہ ملت کی حیثیت اجتماعیہ پارہ پارہ ہو جائے، محبت و مودت، تعاون و تناصر، ہمدردی و سازگاری کے سارے رشتے ٹوٹ جائیں اور جماعتی شیرازہ اوراق پریشان کی طرح منتشر ہو جائے۔

دین میں پارٹی بندی برداشت نہیں

یہ اختلاف، یہ پارٹی بندی دین میں ایک لمحہ کے لئے قابل برداشت نہیں۔ اسی لئے فرمایا: لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ "ایسی مفسد جماعت سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا" گویا یہ مکمل بائیکاٹ کا اعلان ہے۔

اب سوال صرف یہ رہتا ہے کہ وہ کونسا اختلاف ہے جو بم کی طرح پھٹ کر ملت کی وحدت کو

پارہ پارہ کردیتا ہے۔ دورِ صحابہ میں بھی نہ تھی۔ اختلافات نظر آتے ہیں وہ خلافت راشدہ ہی کے زمانہ میں
فرقہ بندیوں کے نشانات کا پتہ چلتا ہے۔ تو کیا یہ مقدس قرآن بھی اس اختلاف کا مصداق ٹھہرایا جا سکتا ہے؟
اس شبہ کا جواب ہمیں خود قرآن کریم سے ہی ملتا ہے لیکن بطور مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ خلاف اختلاف
کی ضد ہے جس کے معنی باہمی الفت و محبت کے ہیں اگر اختلاف کے ساتھ اختلاف ہو تو درحقیقت یہ اختلاف ہی نہیں

اختلاف دین و ملت

حقیقی اختلاف دینوں کا اختلاف ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ دو دین اور ملت کا
اختلاف ظاہر ہے کہ قدرت نے بنی نوع انسان کے لئے ایک ہی دین اتارا تھا۔ نوع انسانی پر واجب تھا کہ
وہ یک جہتی کے ساتھ یک زبان ہو کر صدق دل سے اس کو اختیار کرتی لیکن وہ باز نہ آئی اور طرح طرح کی بہانہ بازیوں
اور حیلہ سازیوں سے اس کے قبول کرنے میں پس و پیش شروع کیا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ وحدت
کی دعوت پر پارٹیاں اور اجتماع کی آواز پر افتراق و تشتت پیدا ہوتا رہا۔ ان پارٹیوں میں ہمیشہ آتش بغض و
عناد بھڑکتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک ملک، ایک شہر، ایک خطہ اور ایک قبیلہ و خاندان کے ہو کر ایسے جدا ہوئے
کہ کسی وصف میں گویا ایک دوسرے کے شریک ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ معاشرت و تمدن کا کوئی گوشہ نہ رہا
جس میں یکجہتی کی کوئی جھلک نظر آتی۔ شکل و شباہت، چال ڈھال، نشست و برخاست کے طریقے، مراسم طعام و لباس کے
طریقے جدا جدا ہو گئے۔ جب ایک جماعت دوسرے کے ساتھ یہ اختلاف پیدا کر لیتی ہے تو اصطلاح میں ایسی دو
مختلف پارٹیوں میں ایک کو مسلم اور دوسرے کو کافر کا لقب دیا جاتا ہے اور اب یہ اختلاف خطرۂ انسانی ہو گئے
ایسا تباہ کن اختلاف ہو جاتا ہے کہ اگر قدرت اپنے غیبی ہاتھ سے اس بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا نہ کرتی رہے تو
عالم فنا ہو جائے۔ عجیب بات ہے کہ اس عالم اختلاف کی بقا کا سبب بھی یہی اختلاف ہے اور اس کے فنا
کا سبب بھی یہی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے　　　اور میری زندگانی کا یہی سامان بھی ہے

اس کا نام اختلاف ملت اور اختلاف دین ہے۔

ایک ملت میں اصول و کلیات کا اختلاف

دوسرا[2] اختلاف یہ ہے کہ ایک ملت ایک دین سے وابستہ ہو کر پھر اس میں اندرونی اختلاف
پیدا ہو جائے اب اگر یہ اختلاف صرف جزئیات کی حد تک ہے تب بھی یہ کوئی قابل ذکر
اختلاف نہیں نہ اس اختلاف سے قلوب میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تنافر پیدا ہوتا ہے نہ الفت و محبت
کے رشتوں پر اثر پڑتا ہے۔ ہاں اگر یہ جزئی اختلافات بھی اس کثرت سے پیدا ہو جائیں کہ اصول و کلیات کی
جگہ لے لیں تو نتیجہ اس کا بھی وہی ہو گا۔

تعریف حصول موجب اتفاق ہے اور اگر دین میں اشتراک کے باوجود اس کے بعض اصول و کلیات میں اختلاف

ہو جائے تو یہ خلاف البتہ اختلاف ملت و دین کی طرح افتراقِ قلوب کا موجب بن جاتا ہے۔ دیکھو معتزلہ خوارج، مرجئہ، اہلِ سنت، سب ایک ہی ملت اور ایک ہی دین سے وابستہ ہیں مگر بعض اصول و کلیات میں اختلاف کی وجہ سے اس طرح گروہ اندر گروہ ہو گئے ہیں کہ جو عداوت و بغض اختلافِ ملت کا ثمرہ تھا وہی ان اختلافات کا نتیجہ بن گیا ہے۔

فروعی اختلاف اختلاف نہیں

اب ہم قرآن سے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ اس کی نظر میں اصول و کلیات کے اتفاق کے بعد فروع کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا	مقرر کیا تمہارے لئے دین میں ان ہی باتوں کی راہ
وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ	دی ہے جس کا حضرت نوح کو حکم دیا تھا اور جو حکم کر بھیجے
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا	آپ کو بھیجا اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ
الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (شوریٰ ع ۲)	دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

ادیانِ سابقہ میں اختلاف نہیں

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک شریعتوں اور مناہج کا کھلا ہوا اختلاف رہا۔ مگر پھر بھی قرآنِ کریم نے اس کو ایک ہی دین قرار دیا ہے اور شرائع کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدتِ دین کے خلاف نہیں سمجھا۔ اگر فروعی اختلاف بھی افتراق و اختلاف کی حد میں آ سکتے تو اس افتراق کے ہوتے ہوئے پھر وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (دین میں افتراق مت پھیلاؤ) کا خطاب کیونکر درست ہو سکتا تھا۔ جس طرح شرائع سابقہ اور صحفِ انبیاء علیہم السلام فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی دین کہلائے ایک کا مصدق دوسرے کا مصدق رہا اور ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتۂ اتحاد و اخوت میں منسلک رہے۔ تحزب و تعصب اور بغض و عناد کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی لئے وہ کانوا شیعا کی حد میں نہیں آئے۔ اسی طرح ایک دینِ حنیف کے اندر فروعی اختلافات اس کی شانِ اجتماع و وحدت میں خلل انداز نہیں ہوتے۔

اجتہاد بھی دین کا ایک اصل ہے

اجتہاد کے موقع میں اجتہاد کرنا بھی دین کی ایک مسلّمہ اصولی بات ہے اور اسی کا قائم کردہ اصول ہے تو پھر دین میں اختلاف کیونکر کہا جا سکتا ہے اختلاف یہ ہے کہ اس کے کسی مقرر کردہ اصول یا کسی تصریح کردہ جزئی کا خلاف کیا جائے لیکن جہاں اس نے سکوت کیا ہے اور یہ سکوت قصداً کیا گیا ہے وہاں ہر مجتہد کو اس کی اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنی بہترین جد و جہد اور منشاءِ شریعت کا لحاظ رکھ کر اپنی اجتہادی صلاحیتوں کے ساتھ ماخذِ دین سے اس کا حکم معلوم کرے۔

صحابہ کرام کا اختلاف

اب آپ صحابہؓ کے اختلافات کو دیکھیں۔ حدوثِ قدمِ عالم، صفات کے عین و غیر

علہ دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۳

اور جو بقدر یک بال دقیق مسائل میں قدم رکھنا تو اُن کا اصول ہی نہ تھا اس لئے ان چیزوں میں اختلاف کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا وہاں سوال تھا تو صرف امتثال واطاعت، فرمانبرداری اور وفاشعاری کے طریقوں میں تھا اس بنا پر اگر اختلاف تھا تو یہی کہ فلاں چیز سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ تیمم وضو کا قائم مقام کب ہو سکتا ہے کون آمین زور سے کہنا پسند کرتا تھا کون آہستہ۔ کوئی رکوع کو جاتے اور آتے ہاتھ اٹھا لیتا تھا۔ پھر یہ اختلافی رنگ بھی اس قدر پھیکا تھا کہ ان اختلافات کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہی مسجد میں نمازیں ادا کر لیتے بلکہ خوشی خوشی ایک دوسرے کے پیچھے اقتدا بھی کر لیا کرتے تھے خصومت وجدل تو درکنار موافقت ومخالفت کے تصور سے بھی ان کے دماغ خالی تھے اس لئے اخوت اسلامی، نصح وخیر خواہی، محبت ووحدت کی ایسی مثال تاریخ کبھی کسی دوسری جماعت میں نہیں دکھا سکتی۔

ایسی حالت میں ان فروعی اور جزوی اختلافات کو ان کے یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا سکتی۔ ہاں خلافت کے دور ثالث ورابع میں جو کچھ ہنگامہ آرائیاں ہوئیں ان میں تعصب وتحزب کا وجود ناقابل انکار حقیقت ہے مگر الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو اس کا جواب بھی ان ہی آیات میں موجود ہے۔ سورۂ انعام اور سورۂ روم کی مذکورہ بالا آیات کو ایک بار پھر پڑھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن یہاں جس فرقہ بندی کی مخالفت کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دین میں اختلاف برپا کر کے اس کو مختلف دینوں کی طرح بنا دیا جائے یا اختلاف اس کے اصول وکلیات میں اختلاف ہی کے بعد ہو سکتا ہے۔ آیت ذیل کو غور سے ملاحظہ کیجئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا جنھوں نے اپنے دین میں جدائی نکالی اور بہت سی پارٹیاں بن گئے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ان پارٹیوں کا ذکر ہے جن کی گروہ بندی کی بنیاد عقائد واعمال کا اختلاف ہو ایسی اختلاف کو اختلاف فی الدین کہا جا سکتا ہے۔

صحابہ کا اختلاف آئینی کا فروعات تھا نہ کہ دینی کا

اب اسی معیار کے مطابق ان پارٹیوں کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عقائد واعمال کا اُن کے درمیان کوئی ذکر ہی نہ تھا وہ ایک ہی عقیدے، یکساں عمل اور ایک ہی دین کے حامل تھے اور اسی ایک متحدہ دین کی خاطر ہی ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔ ان میں اگر اختلاف تھا تو یہ تھا کہ اس متحدہ دین کا اس وقت علمبردار کون ہے؟ پس جس فرقہ بندی کی مذمت آیات مذکورہ بالا میں کی گئی ہے ان حضرات کا اختلاف اس سے بہت دور تھا۔

یہاں ان شکوک وشبہات کی جواب دہی مقصود نہیں ہے جو عرصہ دراز سے غلط تصور کے باعث دماغوں میں راسخ ہو چکے ہیں بلکہ صرف اسی حقیقت کو واشگاف کرنا ہے کہ کیا صحابہ کے دور کا اختلاف ہمارے زیر بحث اختلاف کا مصداق بن سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک صحابہ کرام کے مشاجرات ہرگز اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ

کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر الفاظ قرآنیہ کو خواہ مخواہ اپنے مقصد کے لئے دست و گریبان مشاجرات کو داخل کر کے ہی منظور ہو تو بعید بھی نہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام میں اگر اجتہادی و فروعی اختلافات تھے تو اس بنیاد پر ان میں کوئی گروہ بندی نہیں تھی۔ اور جب پارٹیاں نہیں تو ان کی بنیاد عقائد و اعمال یعنی تفرق فی الدین بھی نہ تھی۔ آگے چل کر ہم اس کو واضح کریں گے کہ قرآن و حدیث میں ہماری گروہ بندیاں زیر بحث نہیں۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف ہی سمجھئے یا اختلاف مذموم سے جدا کیجئے۔ جیسا کہ پہلا مشرب کے معلوم ہوتے ہیں ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك کی تفسیر میں فرماتے ہیں فان اهل الحق ليس بينهم اختلاف[1] اہل حق میں کوئی اختلاف نہیں اور جن کا دوسرا مشرب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں فان اهل رحمته لا يختلفون اختلافا يضرهم[2] یعنی اہل رحمت ایسا اختلاف نہیں کرتے جو ان کو مضرت رساں ہو کیونکہ یہ اختلاف ان ہی مسائل میں ہے جہاں کوئی نص نہیں ہے۔

دین میں اختلاف کے رفع کا اصول

ان مسائل میں شریعت نے خود اپنی جانب سے اختلافات دور کرنے کا حسب ذیل ضابطہ مقرر کر دیا ہے۔

فان تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول۔ پھر اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے خدا اور رسول کی طرف پھیر دو۔

مذہبی قانون اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ دینی اختلاف اختلاف نہ رہے بلکہ رد الی اللہ والرسول کی وجہ سے حکم منصوص ہی کا رنگ اختیار کر لے۔ اور اسی طرح اس اختلاف میں پھر ایک شان وحدت پیدا ہو جائے۔

آیت فان تنازعتم کی امام کی تفسیر

امام ابو اسحٰق شاطبیؒ نے موافقات میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس طرح اصول شریعت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اسی طرح اس کے فروع میں بھی کوئی اختلاف نہیں اور اسی سلسلہ میں آیۃ فان تنازعتم کی تقریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رفع تنازع و اختلاف ہی کے لئے تو رد الی اللہ والرسول کا حکم دیا جاتا ہے اگر کتاب و سنت میں ہی اصول و فروع میں اختلاف تسلیم کر لیا جائے تو اس رد کا فائدہ کیا ہوگا۔ اختلاف پھر اپنی جگہ بحال رہے گا۔ ایک اختلاف دوسرے اختلافی آئین سے ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس آئین سے ختم ہو سکتا ہے جس میں خود کوئی اختلاف نہ ہو۔[3]

محقق حجاب علی محشی موافقات کو اس دعویٰ میں کچھ تردد ہے ہمارے نزدیک امام شاطبیؒ کا دعویٰ بالکل درست ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اصول شریعت میں کوئی اختلاف نہیں

اس کا حاصل یہ ہے کہ مقصد شریعت نہ اصول میں مختلف ہے نہ فروع میں

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۳۹۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۵۴۔ [3] ج ۴ ص ۱۱۹ اور اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۱۔

بلکہ اتحادِ اصول کے بعد فروعات میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ فروع اصول کے ہمیشہ تابع رہتے ہیں۔ اس لئے جب اصول میں اختلاف نہیں تو فروع میں کیسے ممکن ہے۔ لیکن آیت میں اس امر کا دعویٰ نہیں ہے کہ رد الی اللہ و الرسول کے بعد ہر شخص کو وہ حکم نصِ شارع کے مطابق حاصل بھی ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ بعض مرتبہ ایک جزئی میں اصول متعدد صادق آنے کی صلاحیت ہوتی ہے ہر مجتہد اپنے اپنے خیال کے موافق اُسے ایک اصل کے ماتحت داخل کرتا ہے اور اس اصل کے مطابق اس کا حکم اخذ کرتا ہے اس لئے اجتہاد و آراء کے اس تجاذب کی وجہ سے فروع میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ مختلف حکم خود شریعت کے بیان کردہ نہیں ہیں۔ اس نے ایک ہی قانون بنایا ہے اور اس کے مطابق اس کا ایک ہی حکم ہونا چاہئے حتیٰ کہ اگر عہدِ نبوت ہوتا اور آپ سے براہِ راست اس جزئی کے متعلق سوال کیا جاتا تو اس کا ایک ہی جواب ملتا لیکن بعد میں جب راہِ صواب کا انکشاف صرف افہام پر موقوف رہ گیا تو اب اختلافِ افہام و عقول کی وجہ سے مجتہد فیہ جزئیات میں اختلاف ضروری ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ شریعت نے مجتہدین سے قانونِ یسر کے موافق یہاں خطا و صواب دونوں صورتوں میں اجر کا وعدہ کر لیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درحقیقت اس کے آئین میں بھی اس جزئی کے لئے دو حکم ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف موجود تھے۔

مفہومِ اختلاف کی اس توضیح کے بعد مناسب ہے کہ اب اس کے اسباب پر بحث کی جائے۔

اسبابِ اختلاف و تفرق

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہاں پر ہمارا مطلب اختلاف سے بعض اصول و کلیات کا اختلاف ہے اس لئے اسی کے اسباب پر ہمیں غور کرنا ہے۔ جہاں تک استقراء اور تلاش سے دریافت ہو سکتا ہے اس کے تین اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) ناقص اور سطحی علم۔ (۲) اتباعِ ہویٰ و خواہشِ نفس (۳) اتباعِ رسوم و عادات۔

ان اسباب پر غور کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ جس وقت مذہب کی سطح پر اختلاف کا کوئی چھوٹا سا نشان بھی ہویدا نظر نہیں آتا پھر وہ کیا اسباب و وسائل ہوئے کہ یہ متعدد فتنے متحرک ہوا اور ایسا متحرک ہوا کہ اس کی امواج صورۂ عالم کو محیط ہو گئیں۔

(۱) ناقص طریقِ تحصیلِ علم | غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی قوم جس کو قرآن کریم نے اُمّی ہونے کا لقب دیا ہے اور جس کو خود بھی اپنے اُمّی ہونے پر فخر تھا تحصیلِ علم کے لئے جس پہلی درسگاہ میں داخل ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ مبارک تھی یہاں نہ کسی رسمی درسگاہ کا نشان تھا نہ مسلمانوں کو مدرسی نصاب تھا نہ کوئی مرتب کتاب ان کے سامنے تھی صرف ان ہی میں کا ایک اُمّی انسان ان کے پیشِ نظر تھا جسے وہ خدا کا رسول تسلیم کر چکے تھے اور بس۔

عہدِ اولیٰ میں اختلاف نہ ہونے کے اسباب

اسی بنا پر اس کی نشست و برخاست، نطق و سکوت، طعام و لباس، غرضکہ جملہ معاملات و عبادات کی جزو جزو دیکھتے تھے اس کو اپنا دستور العمل بنا لیتے جو کچھ بتائے خدا کا حکم تصور کرتے تھے اور جو کرتا تھا اسے رضائے الٰہی کا یقینی ذریعہ سمجھتے خلاصہ یہ کہ آپ کے کلمات طیبات کا حفظ اور یاد کرنا ہی ان کا سبق تھا اور اپنے عمل کو آپ کے عمل کے مطابق بنانے میں لگا رہنا ہی ان کا عمل تھا اسی لئے ان کی سادہ فطرت اور سادہ دماغ میں جو پہلا نقش قائم ہوا وہ حق ہی حق تھا وہ صواب ہی صواب تھا۔ مزید برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیر صحبت سے ان نفوس قدسیہ میں ایسا رسوخ اور ایسی نورانیت پیدا کر دی تھی کہ وہ خود ایک معیار حق و باطل بن گئے تھے اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت ان کے سامنے اتری تھی اور وہ اس کی صحیح سے صحیح تفسیر آپ کے طرز عمل میں پڑھتے رہتے۔ یہاں تک کہ تمام کا تمام دین انہوں نے نہایت سہولت اور صحت کے ساتھ اس طرح سیکھ لیا جس طرح ایک بچہ بلا کسی تکلف و تکلیف اپنے والدین کے بول چال کے ڈھنگ اور طور طریق سیکھ لیتا ہے ایسے ماحول میں اختلاف و افتراق کا کیا گذر ہو سکتا تھا۔

قرآن کریم کی اس عملی تفسیر کے روپوش ہو جانے کے بعد گو تحصیل دین میں اب وہ سہولت تو باقی نہیں رہی تھی مگر چونکہ اصل کی عکسی تصاویر بکثرت چلتی پھرتی موجود تھیں اس لئے قرآن پڑھنے والے اگر کہیں رکتے تو ان عکسی تصویروں سے ان کا حل کر لیتے لیکن جب یہ عکسی تصاویر بھی نظر سے گم ہو گئیں اور ادھر اسلام عرب سے نکل کر مختلف سمتوں میں پھیل گیا تو یہ طرز تعلیم و تعلم بھی بدل گیا۔

دوسرے دور کا طریقہ ذہنی انتشار اور ماحول کا اختلاف نیم علمی میں حل ہو گیا

تعلیم رسالت کی بجائے کثرت اختلاط کی وجہ سے ذہن منتشر ہو گئے اسلئے فکر بدل گیا قرآن کریم کے صرف الفاظ سامنے رہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات و تفصیلات کا جو ذخیرہ تھا وہ بھی بالکل الفاظ بن گیا اس لئے جن جن حضرات کو اسلام و فہم کا دعویٰ تھا کمال کیا استعداد نے اپنی عقل کے بھروسہ پر اور بعض نے اپنا عالم ہونے کی غلط فہمی میں دین کو تختہ مشق بنا لیا اور غیر شعوری اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے جن کی بنیاد خطاء فہمی تھی اور جن کو دین کا اختلاف کہا جا سکتا تھا۔

فتنوں کا ظہور

اور اب وہ وقت قریب ہو گیا کہ آیت "او یلبسکم شیعا" کی تاویل دنیا نے بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یعنی اچانک خلافت راشدہ کے دور ہی میں ایک طوفان بدتمیزی اٹھا۔ ایک جماعت قرآن ہاتھ میں لئے ہوئے جو سجدہ کے نشانات اس کی پیشانیوں پر تھے اور وہ خلیفۂ وقت پر جو علی کے اس لئے حملہ آور ہوئی ہے کہ اس کے نزدیک وہ کافر ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کون ہے جسے یہ بدبخت دائرہ اسلام سے خارج کر رہے ہیں؟ وہ کہ جس کی شمشیر اور جس کی تقریر نے نہ معلوم کتنے کافروں کو مسلمان

ان کے اقوال و عقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درک حقائق، فہم معانی، استنباط مسائل کا ان میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا انہیں بہت شوق تھا مگر اس کے معانی کی انہیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن ان کی زبانوں پر تھا مگر ان کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے۔ ان کی اسی خوبی کی طرف حدیث کے الفاظ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یقرؤن القرآن لا یجاوز حناجرھم یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف ان کی زبانوں پر ہوگا ان کے قلوب میں علم و فہم کا کوئی ذرہ تک نہ ہوگا۔

دوسری علامت ان کے علم و جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان بت پرستوں کو چھوڑ کر اہل اسلام کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور نفس میں تقشف پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جب ان سے مناظرہ کے لئے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ انہوں نے فرمایا ہے وہ یہ تھا میں ایسی جماعت کے پاس سے آیا ہوں جن میں یہ قرآن اترا ہے اور جو براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے۔

قرآن خوان اور قرآن دان کا فرق

اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں۔ اگر انصاف کیجئے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کے صحیح مراد وہ لوگ زیادہ جانتے تھے جن میں سب سے پہلے قرآن اترا اور جنہوں نے براہ راست صاحب کتاب سے اس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اس پر عمل کا طریقہ دیکھا یا تم جو ان میں سے کسی ایک بات میں بھی ان کے شریک و سہیم نہیں، نہ تم قرآن کے نزول کے حالات سے واقف ہو اور نہ اس کی مراد دریافت کرنے کا کوئی صحیح معیار تمہارے سامنے ہے صرف ایک سطحی علم، ایک جاہلانہ رائے اور ایک جہل آلود مزاج ہے۔ اس پر یہ دعویٰ ہے کہ مخلص بھی تم ہی ہو، قرآن کو بھی تم ہی سمجھے ہو اور تم ہی اس پر عمل کرتے ہو۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتاؤ حضرت عائشہؓ تمہاری ماں تھیں یا نہیں، اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز رکھتے ہیں اگر اس کا اقرار کرتے ہو تو بھی کافر ہو۔ کہو اب بتاؤ کوئی اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا اب تیسری بات کا جواب سنو۔ صلح حدیبیہ میں ابوسفیان و سہیل کے اصرار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے "محمد رسول اللہ" کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا پھر اگر حضرت علیؓ نے اپنا نام امامت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا۔

سوال و جواب کے بعد ان میں دو ہزار اشخاص تو تائب ہو گئے اور جو بچ گئے وہ قتل کر دیے گئے۔

(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۰۳)

اسباب اختلاف حضرت ابن عباسؓ کی نظر میں

اسی لئے جب ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے دریافت فرمایا کہ اس امت کا جب نبی ایک، قبلہ ایک، کتاب ایک ہے تو پھر اس میں اختلاف کیونکر پیدا ہوگا تو حضرت ابن عباسؓ نے یہی جواب دیا تھا کہ اے امیر المومنین قرآن ہمارے سامنے اترا ہے، ہم تو اس کے موارد نزول کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں، لیکن آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر انھیں صحیح طور پر اس کے موارد و مصادر کا علم نہ ہوگا پھر اس میں اپنی طرف سے رائے زنی شروع کریں گے نا واقفی کے تیر چلائیں گے۔ اس لئے ان میں اختلاف ہو جائے گا اور جب اختلاف ہوگا تو لڑائیاں ہوں گی۔ شروع میں تو حضرت عمرؓ نے اس خیال سے اتفاق رائے نہ کیا لیکن غور کرنے کے بعد انھیں بھی ابن عباسؓ سے متفق رائے کرنا پڑا۔ [1]

حضرت ابن عباسؓ کے اس صواب دید کی اس سے زیادہ شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام میں ایک خوفناک گروہ بندی کی جب بنیاد پڑتی ہے تو وہ اسی نا واقفی و جہل کی بدولت نظر آتی ہے چنانچہ خوارج کا نقطۂ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں انھیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انھیں کافر قرار دیتے پھر اس جاہلانہ بنیاد پر ان سے آمادۂ جنگ ہو جاتے تھے۔

سلف کی یہ دقت نظر قابل داد ہے جنھیں ہر دینی معاملے میں سب سے پہلے یہی تلاش ہوا کرتی تھی کہ اس میں صحابۂ کرام کا طریقہ کیا تھا اور جب ان کی کوئی ایک رائے معلوم ہو جاتی تو اسی کو اپنے لئے اسوہ بنا لیتے اور اختلاف دیکھتے تو ان ہی آراء میں سے کسی کا اتباع کر لیتے اور ان سے باہر قدم نکالنا ضلالت و گمراہی تصور کرتے [2]

---

[1] الاعتصام ص ۱۵۶

[2] حافظ ابن عبد البر اندلسی سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شاگرد یحییٰ بن ایوب سے فرمایا

یا یحیی العلم ما جاء عن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم وما لم یجئ عنهم فلیس بعلم [3]	اے یحییٰ علم تو یہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔
قال الشعبی ما حدثوك عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخذ به وما قالوا فيه برأيهم فبل عليه [4]	عامر شعبی کہتے ہیں لوگ جو باتیں تمہارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی جانب سے نقل کریں تو انھیں لے لیا کرو اور جو اپنی رائے سے کہیں انھیں نفرت کے ساتھ چھوڑ دو۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

لا یزال الناس بخیر ما اتاهم العلم من قبل اکابرهم فاذا اتاهم من قبل اصاغرهم هلکوا [5]	جب تک لوگوں کے سامنے بڑے بڑے علماء کا علم رہے گا وہ دین میں ترقی پاتے رہیں گے اور جب نا واقفوں کا علم شروع ہوگا تو برباد ہو جائیں گے۔

ابن مبارک فرماتے ہیں اصاغر سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں اپنی رائے لڑاتے ہیں۔ ابو عبید فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کی مراد یہ ہے کہ جو لوگ صحابہ کے بعد ہیں ان کا علم حاصل کیا جائے اور صحابہ کے علم کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دی جائے۔ [6]

---

[3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹ [4] ایضاً ج ۲ ص ۳۲ [5] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۱ [6] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۹

آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اس کو ان میں سے کسی بات کی بھی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑا تجربہ اس کا اپنا مشاہدہ ہے جس سے جو یقین اس کو حاصل ہے وہ بعد کے شخص کو عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہو سکتا چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا۔ افتمارونہ علی ما یری۔ کیا تم اس رسول سے اس کی آنکھوں دیکھی باتوں میں جھگڑتے ہو بہرحال جب دین کے علم اور دین کے مسائل پر بحث ہوگی تو سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اس باب میں صحابہ اور سلف[1] کی رائے کیا تھی اور ان کی رائے کے بالمقابل دوسری سب رائیں اسی طرح ٹھکرا دینے کے قابل ہوں گی جس طرح ہائی کورٹ کے مقابلہ میں دوسری عدالتوں کے فیصلے ٹھکرا دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ دین کا ہائی کورٹ تھے۔ ورنہ ان سے زیادہ صحیح مراد حاصل کرنا عقلاً تو ممکن ہے مگر واقعات کے دائرہ میں ممکن نہیں۔ اس کے سوا جو علم بھی ہے گو اس میں طول و عرض نظر آئے اور اس میں تعمق کا بھی گمان ہو تو بہر صورت وہ سب مخفی علوم ہیں اور ان کا اتباع یقیناً دینی افتراق کا باعث ہو کر رہے گا۔[2]

اسی کی طرف حدیث ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

---

[1] حضرت حسن صحابہ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ جماعت پوری امت میں سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرے علم کی مالک اور سب سے زیادہ بے تکلف جماعت تھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کی رفاقت کے لئے اسے چن لیا تھا تو آپ کے اخلاق اور آپ کے طریقوں سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کیا کرو کیونکہ تھی اس لئے ان کی تم اسی کی تلاش میں تم رہو اس کعبہ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ جماعت صراط مستقیم پر گامزن تھی۔ (الموافقات ج ۴ ص ۷۷)

حضرت ابن مسعودؓ کی تعبیر اس سے بھی زیادہ صاف، شاندار اور مکمل ہے۔

من کان منکم متاسیا فلیتاس باصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فانہم کانوا ابر ھذہ الامۃ قلوبا واعمقہا علما واقلہا تکلفا واقومہا ھدیا واحسنہا حالا قوما اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ واقامۃ دینہ فاعرفوا لہم فضلہم واتبعوھم فی آثارھم فانہم کانوا علی الہدی المستقیم (رزین)	تم میں جس کو اقتدا کرنا ہو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی اقتدا کرے کیونکہ یہ نیک دلی میں سب سے زیادہ علم میں سب سے گہرے، بناوٹ میں سب سے کم، اخلاق اور سیرت اچھے حالات کے لوگ تھے اسی لئے خدا تعالیٰ نے اس بہترین جماعت کو اپنے بہترین رسول کی صحبت اور دین کی حفاظت کے لئے انتخاب کیا تھا اس لئے تم بھی ان کی زندگی پہچانو اور ان کے ہی نقش قدم پر چلو کیونکہ یہ سیدھے راہ پر ڈالے گئے تھے

صحابہ کی صفات اور ان کے کمال پر یہ متعلق الفاظ کا یہ تواتر؟ تعجب ہے کہ ان میں جو اوصاف اس قدر عیاں تھے کہ جو شخص بھی ان کو دیکھتا تھا وہ ان اوصاف کو سب سے پہلے ان میں دیکھ لیتا تھا اس لئے قرآن کے سامنے سرنگوں ہو جاتا۔ اب ان اوصاف کو بھی سمجھنے کے لئے مجبور ہوتے کے زمانہ کے بعد ان میں جو ان کا چشم خود مشاہدہ کرنے والے تھے یا اس سے قریب تر زمانہ میں تھے ان کی اسی غلو ہے رجحان دو صفتوں سے محروم ہیں اگر کوئی اعتراض ہے تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔

[2] دیکھو اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۲۰ و ج ۲ ص ۱۱۳ و ۱۲۹

لا یقبض اللہ العلم انتزاعاً ینتزعہ من الناس ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالماً اتخذ الناس رؤساً جہالاً فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔

اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے ایک دم نہیں نکالے گا بلکہ علماء کو ایک ایک کرکے اٹھالے گا یہاں تک کہ جب کوئی صحیح عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے وہ فتوے دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

عالم ربانی فتنہ نہیں ہوتا جاہل پر عالم کا گمان کر لیا جاتا ہے

بعض علماء نے اس حدیث سے خوب استنباط فرمایا ہے کہ علماء ربانی کبھی منشاء ضلالت نہیں ہوتے بلکہ منشاء ضلالت ہمیشہ جاہل ہوتا ہے پھر اس کے اتباع میں گمراہی پھیلتی ہے مگر فتن جب لوٹتے ہیں تو ایک تاریکی لے کر نہیں لوٹتے اپنے گرد و پیش میں اتنی تاریکیاں لے کر آتے ہیں کہ اس وقت عالم و غیر عالم کی شناخت بھی ممکن نہیں رہتی۔ غیر عالم ہی منشاء ضلالت ہوتا ہے اور یہ ٹھیکہ علماء کے نام پر مفت لگ جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک امین انسان کبھی خیانت نہیں کرتا لیکن غلطی سے کبھی امین کے دھوکہ میں امانت خائن کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ وہ خیانت کرتا ہے پھر مشہور یہ ہوتا ہے کہ فلاں امین نے خیانت کی ہے اسی طرح ایک عالم متقی راسخ العلم کبھی منشاء ضلالت نہیں ہوتا۔ یوں زلت و لغزش انسانی فطرت ہے وہ اس وقت زیر بحث نہیں۔ فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا جذبہ ہمیشہ جاہلوں ہی سے ابھرتا ہے مگر بدنامی علماء کے نام پر باقی رہ جاتی ہے۔ آج بھی اگر ہندوستان کی فرقہ بندیوں پر نظر ڈالو گے تو ان کے مختلف عناصر میں ایک بڑا عنصر یہی بے علمی ہے یا وہ فرزانگی جس کی بلند پروازیوں کے لئے حدود اور غیر حدود کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

سطحی اور عمیق علم کا فرق

بحث تشنہ رہ جائے گی اگر اس موقعہ پر سطحی علم اور عمیق علم کی مناسب وضاحت نہ کی جائے صاحب موافقات نے اپنی کتاب کے شروع میں تیرہ مقدمات تحریر فرمائے ہیں ان میں ہر مقدمہ اپنی جگہ اہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ ہمارے مضمون کے لحاظ سے اور بھی زیادہ اہم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ہمیشہ محقق اور راسخ العلم شخص سے حاصل کرنا چاہئے کیونکہ مشہور ہے کہ از کاملے کامل نیز آید۔ اس کی علامت تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ راسخ العلم کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی اور ان کی تربیت میں رہ کر حاصل کیا ہو تاکہ ان کے فیض صحبت سے اس کا رسوخ بھی حاصل ہو جائے صحبت اور ملازمت شیخ کو رسوخ علم میں بڑا دخل ہے۔ صحابہ کا علم اسی طریق پر تھا یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک "قل ہو اللہ" پڑھنے والا صحابی جس خوبی اور پختگی سے توحید اسلام سمجھا ہوا تھا آج تیس پاروں کا حافظ بھی اس کا عشر عشیر سمجھا ہوا نہیں۔

صرف مطالعہ کا علم افادے سے پاک نہیں ہوتا

بات یہ ہے کہ الفاظ میں اشتراک وترادف، حقیقت ومجاز اور عموم وخصوص کے احتمالات بیٹھتے چلے جاتے ہیں اس لئے محض لفظوں کی الٹ پلٹ سے جہاں تک رسائی نہیں ہوتی، معلم کی ایک کھری کھری مراد متعلم کو بتا دیتا ہے پھر یہ کچھ قدرتی انتظام بھی ہے کہ جب ایک جماعت تشنہ لب دست حاجت دراز کئے ہوئے تحصیل علم کے لئے آتی ہے تو اس اجتماع میں کچھ عجیب برکت پیدا ہو جاتی ہے یعنی معلم میں قوت افادہ اور متعلم میں ویسے ہی طور پر قوت استفادہ کچھ اس طرح پیدا ہو جاتی ہے کہ علوم جو بالواسطہ بیان کئے جاتے ہیں صرف اپنے مطالعہ سے نہیں کھلتے۔ آخر یہ کیا بات تھی کہ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دن کے بعد ہی اپنے قلوب میں ایک تغیر محسوس کیا تھا، حضرت حنظلہ جب اپنے گھر آئے تو ان کے قلب میں وہ یقین کی جو کیفیت آپ کی صحبت میں ہوتی بدل جاتی۔ یہ انشراح ویقین سب اسی ملازمت نبی کا کرشمہ ہی تو تھا۔

تربیت علم کی تاثیرات

اس تربیت وصحبت کی تاثیر بعض مستعد حضرات پر تو بہ عجیب حیرت انگیز طریقے سے ہوئی ان کی قوت استعداد اتنی ترقی کر گئی کہ بعض مرتبہ نزول وحی سے پہلے ہی وہ بجلی کی طرح دوڑ کر اس کو بھانپ لیتے، کسی کو خیال بھی نہ ہوتا کہ وحی الٰہی کا فیصلہ کل کیا ہوگا۔ مگر فیض نبوت کا یہ تربیت یافتہ، اقوال صحبت سے لبریز قلب میں بول اٹھتا اور جو وہ بول اٹھتا تمام وحی اس کے موافق نازل ہو جاتی، صلاحیت مطلب رسی کی یہی وہ آخری منزل تھی جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو گیا ہوتا تو یہ خلعت اسی کو پہنا دیا جاتا۔ یہ وہی ہے جس کو دنیا عمر فاروقؓ کے نام سے پکارتی ہے۔ صحاح کی روایات میں گو موافقات عمرؓ کی تعداد تین ہی بتائی گئی ہے مگر موافقات عمرؓ اس سے کہیں زیادہ ہیں بہرحال اگر عمرؓ اس ماحول سے سوا قرآن کریم کا مطالعہ کہیں اور کرتے تو کیا یہ صواب رسی یہ توفیق ان کو میسر آتا۔

صلح حدیبیہ میں صحابہ کے اضطراب اور پھر سکون میں ایک تعلیمی سبق

دیکھئے صلح حدیبیہ کا واقعہ ان کے اور دیگر صحابہ کے لئے کتنا مشکل سبق تھا، ناکام زیارت دیکھتے ہوئے معترضانہ شرائط کو منظور کر لینا اور ان کو قبول کر لینا کتنی کٹھن منزل تھی۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ وحی الٰہی نازل ہوئی اور اس نے اس واقعہ کا نام فتح رکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروقؓ کو جو اس معاملہ میں سب سے زیادہ الجھن میں پڑے ہوئے تھے بلایا اور وحی الٰہی کو پڑھ کر سنا دیا۔ آپ کا پڑھ کر سنانا تھا کہ یا ابھی وہ بے چینی و اضطراب تھا کہ طبیعت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی یا اب صلح حدیبیہ کا فتح ہونا ان کی رگ رگ میں سما چکا تھا کہ تمام اضطراب بے چینی کی بجائے سکون ہی سکون و اطمینان ہی اطمینان تھا۔

حادثۂ وفات پر صحابہ کرام کا دوسرا اضطراب وسکون

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات نے جو

ہیجان ان کے سینہ میں برپا کر دیا تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی موت کے نام لینے والے کا جواب شمشیر سے
دینا چاہتے تھے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا آیت وما محمد الا رسول کا پڑھنا تھا کہ یہ ہیجان سکون کے
ساتھ بدل گیا بہت سے مدہوش صحابہ ہوش میں آگئے صحبت میں رہ کر جو علوم حاصل کئے جاتے ہیں ان میں اول تو شبہات
پیدا نہیں ہوتے اور جو پیدا ہوتے ہیں وہ اسی طرح ظاہری و باطنی اثرات سے کافور ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ

جب ایک متعلم اس طرح علم پڑھتا اور لیتا ہے تو اس کا قلیل علم بھی قلیل نہیں ہوتا اب	علم پڑھنا بھی کتنا چاہئے

اس کا نام علم نہیں رہتا بلکہ قرآنی الفاظ میں شاید حکمت ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جس
حکمت کو حضرت لقمان کا بڑا علم بتلا دیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ہم نے لقمان کو حکمت مرحمت
فرمائی تھی۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ پڑھایا کرتے تھے وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

حکمت کا مفہوم اگرچہ مفسرین نے حکمت کی تفسیر سنت کی ہے مگر یہاں اور بھی بہت سے اقوال موجود ہیں
تعلیم کتاب کے ساتھ جب حکمت کی تعلیم نہیں رہتی تو کوئی اصل مدعا کا پتہ نہیں رہتا اس لئے اس کی تاثیر
میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ معلم حقیقی کتاب کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ دوسری چیز
ہوتا ہے۔ یہ حکمت کتب کی شکل میں کوئی دوسری کتاب نہیں ہوتی بلکہ اس کتاب کو سبق پڑھنے کے وہ
اثرات ہوتے ہیں جو مستعد شخص کی ذہنیت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ صحیح فہم و فراست اس کے لئے
ملکۂ نفس بن جاتی ہے اس کے خیالات و عقائد خود پاکیزہ اور دوسروں کو بھی پاکیزہ بنا دیتے ہیں۔ غلطیات کو
اس کا نفس قبول نہیں کرتا اور صحیح حقیقت قبول کر لیتا ہے اسے کچھ تردد نہیں رہتا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

الحکمۃ والعلم نور یہدی بہ اللہ من یشاء — حکمت اور علم ایک نور ہے جس کو اللہ چاہتا ہے دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسب کا ثمرہ نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے کسی نصیب والے کو مل جاتی ہے جو کتاب
کے ساتھ جب یہ حکمت نہیں ہوتی تو تمام علم بے نمک فلسفہ بن جاتا ہے غالباً اقبال مرحوم نے اسی کے لئے شعر کہا ہے

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی — رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

امام مالکؒ جب مسائل اجتہادیہ اپنے طلبہ کے سامنے بیان فرماتے تو طلبہ ان سے لکھنے کی اجازت
طلب کرتے تھے آپ منع فرما دیتے اور کہتے کہ یہ مسائل اگر دنیا میں پھیل گئے پھر کل ان کے متعلق میری رائے بدل
گئی تو اس کی تلافی مشکل ہو جائے گی اس لئے لکھو مت۔ انہوں نے عرض کیا پھر کیا کریں تو فرمایا

تعقلون وتفہمون حتی تستنیر — جب تم ان کو یاد رکھو اور انہیں خوب سمجھو یہاں تک کہ جب ان سے تمہارے
قلوبکم فلا تحتاجون الی الکتابۃ — دل منور ہو جائیں گے تو اس کے بعد لکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

دوسری جگہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔

لیس العلم بکثرۃ الروایۃ انما هو نور یجعله اللّٰه فی القلوب	علم کثرتِ روایت کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے۔

پھر اس کی علامت بیان فرماتے ہیں۔

ولکن علیه علامة ظاهرة وهو التجافی عن دار الغرور والانابة الی دار الخلود	اس کی ایک کھلی علامت دنیا سے نفرت اور آخرت کی طرف توجہ ہے۔

علم ایک نور کا نام ہے

امام مالکؒ جیسا شخص یہ بتا رہا ہے کہ علم کثرتِ روایت اور طول و عرض کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کے بعد دماغ رٹنے کا محتاج نہیں رہتا اس کی روشنی میں حقائقِ اشیاء اسی طرح نظر آنے لگتی ہیں جیسا کہ آفتاب کی روشنی میں سیاہ و سفید۔

علم کے متعلق اشراقیین کی رائے

اشراقیین کا یہ طبقہ علم کی حقیقت بھی اشراقِ نوری قرار دیتا ہے۔ علم درحقیقت اسی نور کا نام ہے جب تک یہ نور پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک مسائل خواہ معلوم ہوں لیکن وہ بہ یک وقت بھی اپنی پوری حقیقت کے ساتھ منکشف نہیں ہوتے وہ قرآن کی سورتیں کی سورتیں پڑھ جاتا ہے حدیثوں کے انبار کے انبار پڑھتا ہے لیکن اس کے قلب میں یہ حقیقت علم کی تہہ تک کا ایسا علم و فہم کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا اسی لئے خوارج کے متعلق آپ نے فرمایا تھا۔ یقرؤن القرآن لا یجاوز حناجرھم علم کی حقیقت سے نا آشنا آیات و احادیث کا یہ طول و عرض الفاظ کا یہ طمطراق دیکھ کر مرعوب ہو جاتا ہے مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ علم خوش نما الفاظ کا صرف ایک انبار ہے جس کی حقیقت قاعدہ بغدادی کے صرف انتیس حروف ہیں اور بس اس کے برخلاف جو علوم تاثیرِ صحبت سے راسخ ہو کر نور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ گو کتنے ہی مختصر ہوں ان کا حامل کتنا ہی کم سواد ہو مگر قدر شناس خوب پہچان لیتا ہے کہ یہ گدڑی ہی میں لعل ہے۔

نور علم بلا عقیدت و اتباع منتقل نہیں ہوتا

یہ علم صرف مشائخ کرام اور علماء کبار کی زیرِ تربیت ہی حاصل ہوتا ہے اور اسی لئے جب تک متعلم ان کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق نہ رکھے ان کے رنگ میں رنگین نہ ہو اس وقت تک علم کا یہ نور کبھی اس کے سینہ میں منتقل نہیں ہوتا۔ وہ حرف شناس ہو کر حافظ ہو سکتا ہے اور فقرہ باز بن کر بھی چلایا جا سکتا ہے اب جتنا چاہے اس پر ناز کرے۔

غالباً اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ علم سے ہمارا کیا مطلب تھا اور صحابہ کے علم کو ہم نے صرف حسن اعتقاد سے نہیں بلکہ حقیقت کی بنا پر صحیح کہا تھا۔ اب یہ علم اگر کسی سینہ میں سرایت کر جائے تو کیا آپ کے نزدیک اس پر مقاصدِ شریعت مخفی رہ سکتے ہیں۔ گو علم کے مختلف حاملین ایک ہی منبع سے فیض یاب ہوں جہاں کوئی

اختلاف نہیں تو کیا ان میں اختلاف پیدا ہونے کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد راسخ فی العلم کی دوسری علامت یہ تحریر فرمائی ہے کہ اس کا علم و عمل حال و قال ایک دوسرے سے مطابق ہو۔

علم صحیح عمل کی دعوت دیتا ہے مذکورہ بالا تفصیل کے سبب یہ نتیجہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ صحیح عالم بے عمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ صحیح علم بے عمل قائم رہ سکتا ہے۔ علم صحیح کا تقاضا اور اس کی باطنی تاثیر اپنے حامل کو اس کے آگے جھکا دیتی ہے کہ وہ اس کے مقتضا پر عمل کرے۔ کچھ دن عالم اور علم میں یہ کشمکش رہتی ہے پھر بالآخر عالم کو اقتضائے علم کے تابع ہونا پڑتا ہے ورنہ علم خود اس سے کنارہ کش ہو کر اپنی جگہ ویران چھوڑ جاتا ہے۔

علمائے سوء کی علامت فاضل مؤلف نے آٹھویں مقدمے کے آخر میں ایسے علماء کا نام علمائے سوء رکھا ہے اور اس کی شہادت میں اکابر صحابہ و علماء کے اہم بیانات نقل کئے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اے گروہ علماء اپنے علم پر عمل کیا کرو کیونکہ عالم وہ ہے جو پہلے علم حاصل کرے پھر اس پر عمل بھی کرے اس کا علم و عمل یکساں نظر آئے۔ آئندہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے جو علم حاصل کریں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہ اترے گا۔ ان کا باطن ان کے ظاہر کے خلاف اور ان کا علم ان کے عمل کے برخلاف ہوگا۔ حلقے بنا بنا کر بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں گے یہاں تک کہ اپنے شاگرد پر کوئی تو اس سے ناراض ہوگا کہ اسے چھوڑ کر دوسرے کے حلقۂ درس میں کیوں جا بیٹھا۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال قبول نہ ہوں گے۔

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ عالم تو وہ ہے جو اپنے علم کے موافق عمل بھی کرے لیکن جس کا علم و عمل مخالف ہو وہ کیسا عالم ہے۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علماء وہ لوگ ہیں کہ جب علم حاصل کر لیتے ہیں تو اس پر عمل کرنے میں اور جب عمل کرتے ہیں تو اسی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب مشغول ہو جاتے ہیں تو لوگوں کی نظروں سے گم ہو جاتے ہیں اور جب نظر نہیں آتے تو ان کی تلاش ہوتی ہے جب تلاش ہوتی ہے تو مخلوق سے بھاگتے ہیں۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے جو شخص لوگوں سے علم میں برتر ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ عمل میں بھی سب سے بڑھ کر ہو۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علم جب آتا ہے تو عمل کو آواز دیتا ہے اگر وہ بھی آگیا تو ٹھہر جاتا ہے ورنہ رخصت ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آثار میں علم و عمل کا وہ ربط جو ان حضرات کی رو سے ان کی نظروں میں تجربے کے بعد ثابت ہوا ہے ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صاحب موافقات لکھتے ہیں کہ علم میں لگے رہنے سے ایک دن عمل کے لئے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔

سے آئیں لوگ ان کا مقابلہ کریں اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو سکیں تو اس کا یقین کر لیں کہ وہ ضرور کسی ایسی حکومت کی طرف سے آئے ہیں جو ان ساری حکومتوں سے قوی تر اور بالاتر ہے اسی کا نام معجزہ ہے جس کے بعد وہ ان کے سامنے ایک دستور العمل رکھتے ہیں اور سب لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

انسان کا قدرت کے ساتھ ایک فطری عیب

شکست خوردہ انسان اگر اس قدرتی طاقت کے بالمقابل کبھی کبھی سرنگوں ہو جائے بہ مجبوری ہو جاتا ہے مگر اندر ہی اندر کوشش کیا کرتا ہے کہ اس عالم قانون کو بھی اپنی ہی گرفت میں لے آئے بالکل تو یوں صاف انکار کر دیتا ہے اس سے تو یہ صورت بہتر ہی نہیں۔ ایک فرد بشر اور بھی اس موقع پر حق حاکمیت دینے کو تیار نہیں تا اور ایک صحیح بات کی آڑ لے کر اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور یہی کرتا ہے کہ اس آئین کو معقول تر آئین ثابت کرے مگر یہاں فریب یہ ہے کہ اس معقولیت کا معیار اپنی عقل کو بنا لیتا ہے اور اس لئے اس خیر خواہی میں وہ شریعت سماوی کی گردن توڑتا مروڑتا رہتا ہے حکم یہ تھا کہ ہر اختلاف میں اسی قانون کو حکم اور فیصل بناؤ اور عمل یہ ہے کہ اس قانون کو اپنی عقل کے مطابق کرنے کی سعی ہو رہی ہے اسی کا نام اتباع ہویٰ ہے۔

اتباع ہدیٰ اور اتباع ہویٰ متضاد حقیقتیں ہیں

قرآن کریم اتباع ہویٰ اور اتباع ہدیٰ کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو تابع ہویٰ ہے وہ سماوی ہدیٰ کا تابع نہیں ہو سکتا اور جو آسمانی ہدایت کا تابع ہے وہ ہویٰ کے پیچھے نہیں جا سکتا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا — پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر کھڑا کیا ہے تو

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ — آپ اسی پر چلئے اور بے علموں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلئے۔

یعنی اتباع ہدیٰ کو اتباع ہویٰ کا ترک لازم ہے۔ ہدیٰ اور ہویٰ دونوں اپنی اپنی جگہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں، قدرت نے دونوں انسان کے سامنے رکھ دیئے ہیں وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ انسان دونوں راستوں میں ایک راستہ پر چلنے کا حکم اور دوسرے سے احتراز کا حکم دیا جاتا ہے۔

ہدیٰ اور ہویٰ کے نزاع میں ہر انسان کا امتحان

اسی دوراہے پر کھڑا کر کے انسان کا امتحان لیا گیا ہے۔ ہدیٰ پکارتی ہے کہ راہ یہ ہے اسی پر چلو مگر ہویٰ چلانے لگتی ہے اور سو طرح کی رنگا رنگی سامنے لے آتی ہے ہدیٰ ایک آسمانی آئین ہے اس کے اتباع میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور ہویٰ اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکمیت کا مزا آتا ہے اس لئے یہاں ایک نیک بخت انسان بڑی حماقت یہ کرتا ہے کہ ہدیٰ اور ہویٰ کے درمیان اتفاق و سازگاری کی سعی کرنے لگتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

گمراہی کی ذات حاصل ہے قرآن نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ یہ دونوں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں ایک کا سرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور دوسری کا سرا شیطان کے ہاتھ میں ہے ایک کا منتہیٰ جنت ہے اور دوسری کا دوزخ

اتباع ہویٰ میں سکون کا راز

یاد رکھنا چاہئے کہ خواہشات و اہواء کا مرکب چونکہ خود نفس انسانی ہے اس لئے وہ جسم انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کئے ہوئی ہوتی ہیں ان کا ضعف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ جسم کو جان کا۔ ان میں اسی طرح فطری موزونیت ہوتی ہے جیسا کہ ہونا ہے اور متعالجین میں اول جب کبھی ان پر قرآن و سنت کا ملمع چڑھ جاتا ہے تو اب وہی ہویٰ ٹھیک ہدیٰ کی صورت نظر آنے لگتی ہے اور ہدیٰ اور ہویٰ کے اس توافق کے بعد جو اطمینان و انشراح قلب میسر آتا ہے وہ گناہ و ثواب کے شعور کو ماؤف سا کر دیتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اپنے اندر اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ پھر تلاش حق کا لفظ صفحہ ذہن سے بھی گویا مٹ ہو جاتا۔ اسی لئے سورۂ الجاثیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق امتنان ارشاد فرمایا گیا تھا کہ دیکھئے اتباع ہویٰ کی اس گرم بازاری کے زمانہ میں ہم نے آپ کو ہدیٰ پر قائم رکھا ہے یہ کتنا بڑا احسان ہے، تو اب آپ ان بے عقلوں کی ہویٰ کا سا تصور کریں۔ ہویٰ کے ان غیر معمولی اثرات اور برقی تاثیر و تعدیہ کا حال حدیث افتراق کے آخری جملوں میں یوں ادا کیا گیا ہے۔

وانه سيخرج في امتي اقوام تجارى بهم ۔۔۔ آئندہ میری امت میں کچھ لوگ آئیں گے جن میں یہ بدعات و خواہشات

تلك الاهواء كما يتجارى الكلب بصاحبه ۔۔۔ اس طرح سرایت کر جائیں گی جیسا کہ کتے کے کاٹنے کے جسم میں

لا يبقى منه عرق ولا مفصل الا دخله ۔۔۔ کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس کا ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری گھس جاتی ہو

تشبیہات انبیاء علیہم السلام اور تشبیہات شعراء میں فرق

یاد رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تشبیہات میں شاعروں اور افسانہ نگاروں کے استعارات نہیں ہوتیں اس لئے یہاں صرف تشبیہی اور لطف ادبی مقصود نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تصویر کشی سے صحیح ترجمانی مد نظر ہوتی ہے۔ کتے کاٹنے کی بیماری پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو دو باتیں نظر آئیں گی۔ ایک تو یہ کہ یہ بیماری ایک ایک جوڑ میں سرایت کر جاتی ہے اس لئے لاعلاج ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ جس طرح یہ بیماری بذات خود پاگل کتے میں موجود ہوتی ہے لیکن جب وہ کسی کو کاٹ لیتا ہے تو اس کو بھی اسی بری طرح لگ جاتی ہے کہ پھر یہ شخص بھی کتے کی طرح خوفناک اور قابل احتراز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر یہ کسی تیسرے انسان کو کاٹ لے تو اس پر بھی وہی اثر ظاہر ہو جاتا ہے جو دیوانے کتے کے کاٹنے سے ہوتا۔

اصحاب ہویٰ کو ترغیب تو بہ میسر آنا مشکل ہے

ان خصوصیات کے بعد اب اگر آپ اہل ہویٰ کے حالات کا موازنہ کریں تو اس تشبیہ میں آپ کو نبوت کا ایک اعجاز نظر آئے گا۔ ہویٰ کا حال بھی یہی ہے کہ جب وہ انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر وہی انسان کو "شکل" بری نظر آنے لگتی ہے اس لئے یہاں تو یہ کی

سیدھی نہیں رہتی۔ توبہ کی توفیق اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ قلب کا کوئی گوشہ ہوی سے خالی ہو مگر جب رگ رگ میں ہوی سرایت کر جائے تو پھر توبہ کی توفیق کہاں سے آئے اسی لئے سورۂ جاثیہ میں فرمایا ہے ۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ	بھلا دیکھئے تو جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود ٹھہرا لیا
اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ	اور علم رکھنے کے باوجود خدا نے اس کو راہ سے بھٹکا دیا اور
وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ	اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا
مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (الجاثیہ)	تو اب اس کو خدا کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے کیا تم اس پر غور نہیں کرتے

علم کی گمراہی جہل کی گمراہی سے بدتر ہے

آیت بالا میں چند اہم فوائد بتلائے گئے ہیں بتلایا گیا کہ جس طرح بے علمی گمراہی کا سبب بنتی ہے اسی طرح کبھی علم بھی گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے مگر جو گمراہی علم کی راہ سے آتی ہے اس کا نتیجہ بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ گویا یہ تاریکی کی گمراہی نہیں بلکہ روشنی کی گمراہی ہے جہل کی نہیں، علم کی گمراہی ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں پر اسباب ہدایت سب معطل ہو جاتے ہیں۔ نہ کان کچھ سنتے ہیں اور نہ آنکھیں غور و فکر کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں اور قلب میں تو حکومت ہوی کی وجہ سے حق بینی اور حق فہمی کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی اس لئے یہاں ہدایت و توبہ کی کوئی توقع نہیں رہتی۔ مگر خدا ہی یا اسباب ظاہر سے بالاتر طریقہ پر ہدایت نصیب فرمائے تو یہ دوسری بات ہے۔ اسی کو دوسری آیت میں لفظ طبع سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ	یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور
وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (محمد)	اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں جس بدنصیبی کو لفظ ختم سے تعبیر فرمایا تھا یہاں لفظ طبع سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ دونوں لفظوں کا حاصل وہی محرومی اور شقاوت ہے۔

ہوی پرست کو خدا پرستی کا مغالطہ

دوسری بات یہ کہ ہوی پرست کو اتباع ہوی میں وہ مزہ آتا ہے جو خدا پرست کو عبادت میں کیونکہ جب اس نے اپنی ہوا ہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے تو پھر اسی کی فرمانبرداری اس کو خدا کی فرمانبرداری نظر آنی چاہئے اس لئے جتنا ایک خدا پرست ہدی کے اتباع کی سعی کرتا ہے اس سے زیادہ ایک ہوی پرست اپنی ہوی کے اتباع کے پیچھے رہتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ راستے کے اس اختلاف کے باوجود دونوں کے خیال میں مقصد پھر ایک ہی ہوتا ہے یعنی خدائے قدوس کی فرمانبرداری اس اشتباہ کے بعد متبع ہوی سے توبہ کی توقع ایسی ہے جیسی کہ ایک متبع ہدی سے کفر کی توقع۔ نہ وہ اپنے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے نہ یہ اپنی ہوی کو اس کا نتیجہ پھر وہی توبہ سے محرومی نکلتا ہے۔

اتباع ہوی کو گمراہی لازم ہے

تیسری بات یہ کہ اتباع ہوی اور ضلالت لازم و ملزوم ہیں اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ

اتباعِ ہدیٰ اور اتباعِ ہویٰ دو متضاد نقطے ہیں۔ اس کا حاصل یہی تھا کہ اتباعِ ہویٰ کا نتیجہ ضلالت و گمراہی ہے اسی کو آیت ذیل میں بیان فرمایا گیا ہے۔

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ	اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تو مخلوق میں
فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ	حق کا فیصلہ کیجئے اور خواہش ہویٰ کی اتباع نہ کیجئے۔
الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ	کہ یہ چیز خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

خلافتِ حق اتباعِ ہویٰ کے منافی ہے

اس آیت میں بھی اسی مضمون کو جتلایا جا رہا ہے کہ آپ خلیفہ ہیں آپ کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام نافذ کریں یہی خدائی خلافت کا حق ہے۔ لیکن اگر آپ نے ہویٰ اور اپنی خواہش کی پیروی کی تو پھر خدا کی راہ آپ کو نظر نہیں آسکتی اور کیسے نظر آسکتی ہے جبکہ اس کی خاصیت ہی سبیلِ ہدیٰ کا تعطل ہے۔

دوم اس آیت سے جہاں ہویٰ اور ضلالت کا ربط معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ ہویٰ شانِ خلافت کے بھی منافی ہے۔ خدا کا خلیفہ دنیا میں اس لئے آتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اسی کے راستے پر لگائے نہ اس لئے کہ خود ہی گم کردہ راہ بن جائے

اتباعِ ہویٰ شریعت اور سیاست دونوں کے لئے مضر ہے

تیسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح مسائلِ شریعت کی تعمیر میں مخل ہوتی ہے اسی طرح حکومت عدل و انصاف سیاستِ ملکی کے لئے بھی مہلک ہے چونکہ خلیفہ کا تعلق دونوں شعبوں سے ہوتا ہے اس لئے اس مرکزی نقطہ پر متنبہ ہونے کی اس کو پوری ہدایت کی گئی ہے۔ اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ	اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین
السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ	فاسد ہو جاتے۔

معلوم ہوا کہ اتباعِ ہویٰ جس طرح نظامِ مذہب میں مخل ہے اسی طرح نظامِ عالم کو بھی درہم برہم کرنے والا ہے۔ اسی لئے صاحبِ موافقات نے اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ شریعت داعیۂ ہویٰ کو ختم کرنے کے لئے ہی آئی ہے۔

مذمتِ ہویٰ میں سلف کے اقوال

مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں ہم سلف کے چند آثار بھی نقل کر دیں کہ ہمارے نزدیک علم ہو جائے سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی خوش اعتقادی میں بولا "انا علیٰ ھواک" میں تو آپ کی ہویٰ (خواہش) کا تابع ہوں۔ اس پر ابن عباسؓ نے جواب دیا "الھویٰ کلہ ضلالۃ" ہویٰ (خواہشات) سب گمراہی ہے پھر طرفہ ترکیب درمیان فرمایا "ای شیء انا"

علی ھواہ' انا علی ھواہ کیا چیز ہے یعنی کچھ نہیں۔ ابن وہب حضرت طاؤس سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے جہاں ہویٰ کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی مذمت ہی فرمائی ہے۔[1] اب آیات ذیل کو بغور پڑھئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جہاں ہویٰ کا ذکر آیا ہے مذمت ہی کے سلسلے میں آیا ہے۔

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ	صرف ظنون اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں

آیت بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباع ہویٰ اور اتباع ظن و تخمین یہ ایک ہی نوع کی باتیں ہیں واقعات اور حقائق سے دونوں دور رہتے ہیں۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ	بھلا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلے رستہ پر
كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا	ہو ان کے برابر ہو سکتے ہیں جن کی نظروں میں اپنے اعمال بد
أَهْوَاءَهُمْ (محمد)	مزین ہوں اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے چلیں۔
وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ	جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا
عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (النازعات)	اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکتا رہا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احتراز ہویٰ موجب خوف ہے اور اتباع ہویٰ موجب بے خوفی۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا	وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ صرف خدا کی وحی
وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم)	ہوتی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔

یہاں آپ کا نطق وحی ہی میں حصر کر دیا گیا ہے یعنی وحی اور ہویٰ کے سوا اس کی کوئی احتمال نہیں۔ اسی لئے جب ہویٰ آپ کے کلام سے منفی ہے تو صرف اس کا وحی ہونا متعین ہے۔ معلوم ہوا کہ ہویٰ اور وحی دو متقابل چیزیں ہیں۔ اگر ان چند آیات پر بھی غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہویٰ صرف ظنون یعنی اٹکل اور تخمین کا نام ہے کوئی سماوی روشنی اس کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اپنے اعمال کے بہتری کو بھی صورت میں دیکھنا اور خدا سے بے خوفی اس کا واحد منشا ہوتا ہے۔ وحی سماوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ضلالت و گمراہی اس کو لازم ہے غرض نظام معیشت اور نظام مذہب دونوں کے لئے تباہ کن ہے اور شخصی حیثیت کے لحاظ سے اس کا اثر انسان کے لئے اس کے اسباب ہدایت کا کلی تعطل ہے اسی لئے اس پر ایک طرح توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور اس کے شفایاب ہونے کی اسی طرح توقع نہیں جیسی باولے کتے کے کاٹے شخص کی۔

ہویٰ جس کو مرض بتایا گیا ہے اس کا دوسرا جز تعدد ہے آپ کے نزدیک تو یہ صرف مجازی استعارہ ہوگا مگر آپ سلف کو دیکھئے کہ انہوں نے کیا سمجھا تھا۔

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۲۱۳ و ۱۱۵۔

عن ابن مسعود قال من احب ان یکرم دینہ فلیعتزل مخالطۃ الشیطان ومجالسۃ اصحاب الاھواء فان مجالستھم الصق من الجرب۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص تم میں اپنے دین کی تکریم چاہتا ہے شیطانی اختلاط اور اصحاب ہوا سے علیحدہ رہنا چاہئے کیونکہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی بیماری خارش سے زیادہ لگتی ہے۔

وہبؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص ابن سیرینؒ کے پاس گیا اور بولا اے ابوبکر ان کی نسبت سے میں آپ کے سامنے قرآن کی صرف ایک آیت تلاوت کرنا چاہتا ہوں بات پڑھ کر میں فوراً چلا جاؤں گا۔ ابن سیرینؒ نے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور فرمایا اگر تو مسلمان ہے تو میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں ابھی میرے گھر سے چلا جا اس نے کہا اے ابوبکر میں آیت پڑھنے کے سوا اور کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ انہوں نے فرمایا جا بس تو چلا ہی جا۔ جب وہ چلا گیا تو فرمایا خدا کی قسم اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرا دل ایسا ہی مطمئن رہے گا جیسا کہ اب ہے تو میں اسے آیت پڑھنے کی اجازت دے دیتا لیکن مجھے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں وہ آیت پڑھ کر میرے دل میں کوئی ایسا شبہ پیدا نہ کر دے جسے میں جتنا بھی نکالنا چاہوں باہر نہ نکال سکوں۔[1] امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ صاحب بدعت سے بات چیت مت کرو ورنہ اس سے جھگڑا کرو گے وہ تمہارے دل میں فتنہ کا بیج ڈال دے گا۔[2]

ان آثار سے معلوم ہو گیا کہ صاحب شریعت کی تشبیہ کس قدر پُرمغز اور حقیقت سے کتنی قریب تر تھی۔

ہوی کی جاذبیت اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہوی معنوی صورت میں اپنے اندر کچھ ایسی جاذبیت رکھتی ہے کہ اس کے آثار بعض مرتبہ غیر اختیاری ہو جاتے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ یہ چیز ناحق ہے مگر پھر اس کے باطل اثرات گھن کی طرح اندر ہی اندر اس کے ایمان کو کھاتے جاتے ہیں جیسا کہ جبر و قدر اور مشاجرات صحابہ کے مسائل۔ ایک اچھا خاصا دیانتدار شخص بھی جب اس وادی میں قدم رکھتا ہے تو کچھ دور چل کر شبہات اور وساوس کی جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود اس کا ایمان زخمی ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے صاحب شریعت نے اس پُرخار وادی میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی ہے مگر حیرت تو یہ ہے کہ جتنا ادھر سے ممانعت کی تاکید ہوتی رہی اتنی ہی یہاں اس کی سیر و سیاحت کا شوق بڑھا۔ حضرت ابن مسعودؓ کے الفاظ میں یہ دلیری اور ایمان کی پختگی کی بات نہیں بلکہ اپنے دین کے اکرام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ہوی میں اتنی جاذبیت نہ ہوتی تو اس میں فرقہ بندی کی یہ طاقت بھی نہ ہوتی۔

قرآن و سنت عقل کے لئے روشنی ہیں نہ کہ عقل قرآن و سنت کے لئے ایک جماعت نے جب اپنی اہواء و خواہشات کی روشنی میں قرآن و سنت کا مطالعہ شروع کیا تو سوا حیرت انہیں اپنی عقل ہی نظر آئی۔ پھر جو آیات اور

---

[1] الاعتصام ج ۲ ص ۲۳۱ ۔ [2] ایضاً

حدیث جو اس معیار کے موافق اتری اس کو تسلیم کر لیا ورنہ تاویل یا انکار کا راستہ اختیار کیا اور اس معصیت کا عذر گناہ بدتر از گناہ یہ تراشا کہ جب شریعت کا کلام عقل کے مخالف ہو ہی نہیں سکتا یہ اصل درست تھا لیکن اصول یہ ہے کہ اس عقل کا بھی کوئی معیار ہونا چاہئے۔ خلاف عقل کہنے کا بھی کوئی ضابطہ ہونا چاہئے ان مراحل پر بحث کے بغیر غلط مقدمے جوڑ کر بس وہ تو وہی منزل تھی جس کا سامنا ہو گیا اور وہیں تحقیق ختم ہو گئی کی آگے اساطیر الاولین کہکر محتاج تعدیل نہ سمجھا گیا چنانچہ حشر جسمانی، معراج، میزان اعمال، جسمانی عذاب و ثواب رؤیت باری تعالیٰ، جنت و جہنم اسی قسم کے اور بہت سے امور چونکہ عقل سے بالاتر تھے، سب کا گو صاف انکار تو نہیں کیا گیا مگر اس طرح تسلیم کیا جس کو درحقیقت ایک تسلیم نما انکار ہی کہنا چاہئے۔ بلاشبہ اگر مذکورہ بالا مسائل کو صرف عقل کے ذریعے طے کیا جائے تو یہ مشکل ہے، وہ بدوں حس کے تجربہ و دریافت ہوئے اور نہ صفت ایمان کے بغیر وہ حد یقین تک آسکتے ہیں۔

آخر کار اس غلط بنیاد کی وجہ سے دین میں عقائد و اصول کا دوسرا اختلاف پڑ گیا اور جس طرح کہ پہلے اختلافات کی بنیاد جہل پر قائم ہوئی تھی اس اختلاف کا قلعہ عقل پر تعمیر ہو گیا اسی کی طرف حدیث افتراق امت کے بعض طرق میں یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔

للذین یقیسون الامور برأیهم فیحلون الحرام ویحرمون الحلال۔ — یعنی وہ لوگ جو پیش آمدہ مسائل میں صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیتے ہیں۔

ابن عبد البر کہتے ہیں کہ ابن معین نے اس زیادتی کو بے اصل قرار دیا ہے مگر صاحب الاعتصام بعض علماء کا نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے ابن معین کا یہ حکم تسلیم نہیں کیا وہ کہتا ہے کہ یہ ثقہ اور معتبر راویوں سے بھی منقول ہے لہٰذا اس کی اسناد بے غبار ہے۔ ہاں اگر ان کے علم میں اس کے سوا کوئی دوسری علت ہے تو دوسری بات ہے۔

مذموم قیاس آرائی کیا ہے؟

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ الفاظ مذکورہ بالا میں اس قیاس آرائی کی مذمت ہوئی ہے جو دین کی حقیقت میں دخل دے کر اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے۔ غیر منصوص جزئیات کے احکام اصول شریعت کے مطابق حاصل کرنا پھر ان کے اسباب و علل پر بحث کرنا مذموم قیاس آرائی میں داخل نہیں بلکہ اہل علم کے لئے ضروری ہے اس لئے یہ سمجھنا نافہمی ہے کہ ہم نے دین کو بلاوجہ ایک معمہ بنانے کی دعوت دی ہے، غور و فکر کی راہ معطل کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ تعریض ہمارا ہرگز مقصد نہیں۔ قرآن جگہ جگہ تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے طرح طرح سے واقعات ماضیہ بیان کر کے ان سے عبرت پذیری کی ترغیب دیتا ہے آیات آفاقی و انفسی کا بغور مطالعہ کرنا شیوۂ مومنین قرار دیتا ہے اور حلال و حرام کے مسائل میں بھی اس حد تک غور و فکر کی ممانعت نہیں کرتا۔ ہاں شارع کے احکام کی تبدیلی و ترمیم نہ یہ کہ ان میں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر آپ

کی عقل نارسا اس کے سمجھنے میں احکام کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز ہے تو ان کو توڑ مروڑ کر اپنی عقل کے سانچے میں ڈھال لینا یہی اتباع ہویٰ ہے۔ اتباع ہدیٰ یہ ہے کہ شریعت کو حاکم اور عقل کو محکوم، شریعت کو متبوع اور اس کو تابع بنایا جائے۔ اور اتباع ہویٰ یہ ہے کہ عقل کو حاکم اور شریعت کو اس کا محکوم بنا دیا جائے۔ قرآن سنت کی روشنی میں عقل سے کام لینا حق ہے اور عقل کے حدود میں قرآن وسنت کو محدود کر دینا اتباع ہویٰ ہے

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے غور و تفکر پر کوئی چوکی پہرہ قائم نہیں کرتا مقصد صرف یہ ہے کہ عقل کو عقل کی حد پر رکھئے اور اس کو دوسرے زنجیر کی طرح آزاد نہ بنائیے ؎

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

اختلاف و افتراق کا تیسرا سبب اتباع عادت ہے

قومی، ملکی یا خاندانی عادات اور رسم و رواج کچھ اتنی بری چیز بھی نہیں ہیں کہ ان کی اصولاً مذمت ہی کی جائے بلکہ اگر غور کیجئے تو یہ انسانی اصلاح معیشت کا ایک فطری دستور العمل بھی ہے بہت سی وہ اصلاحات جو انسان آئینی طور پر قبول کرنا پسند نہیں کرتا اپنی خاندانی یا ملکی عادات کی وجہ سے خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے اسی لئے شریعت حنیفہ نے اس کا بڑا لحاظ کیا ہے۔ بلکہ قانون تیسیر کا یہ ایک بڑا اصول ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانوں میں کوئی فاسد عنصر ظلم و تعدی اور بعض اپنے جہل و بے علمی کی وجہ سے کوئی بات کر گذرتا ہے، اس کے دست نگر تو اس کے خوف کے سبب سے علانیہ جرح نہیں کر سکتے۔ اہل علم اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے اغماض کر لیتے ہیں لیکن جب اسی حال پر کچھ زمانہ گذر جاتا ہے اور کوئی سماوی یا ارضی طاقت اس میں انقلاب پیدا نہیں کرتی تو پھر یہی عام عادت بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اہل مذہب اس کو اپنے مذہب کا جزو قرار دے دیتے ہیں۔ بعض مزارات پر بھنگ نوشی اور سجادہ نشینی کے لئے عزوبت کی زندگی گویا شرط سجادگی تھی۔ آخر ایک دور آیا اور آنکھ کھلی تو اس کے خلاف آواز بلند کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہنچا۔ جب مدعیٰ سے اس کا ثبوت طلب کیا گیا تو ان کے پاس بجز اس کے کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ اس درگاہ کی قدیم رسم ہے۔

اسی طرح فاسد عادات کچھ زمانہ کے بعد مذہبیت کا رنگ پیدا کر لیتی ہیں اور دین میں بعض اس رسم بد کی وجہ سے فرقہ بندی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ شب برات کی آتش بازی اور عرسوں میں طرب و قمار بازی مذہب کی تعلیم نہیں لیکن یہی عادات ہیں جن کو مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے یہ عادات بعض جہلاء میں تو اتنی راسخ ہو چکی ہیں کہ ان کے خلاف آواز اٹھانا گویا علم جہاد بلند کرنا ہے اسی کا نام اندھی تقلید ہے۔

اندھی تقلید کیا ہے؟

قرآن کریم نے جہاں کہیں مذمت کی ہے اسی قسم کی تقلید کی ہے جب کبھی قرآن نے معاندین سے بے تکی اور نامعقول باتوں پر دلائل کا مطالبہ کیا ہے تو ان کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ — کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک روش پر دیکھا ہے اس لئے ہم ان ہی کے نقش قدم پر چلیں گے۔

اس پر قرآن کریم نے جو اعتراض کیا وہ یہ نہیں تھا کہ آباء و اجداد کی تقلید کرنا غلط ہے بلکہ یہ تھا کہ

اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ۔ — یعنی اگر تمہارے باپ دادا عقل و ہدایت کا کچھ بھی نہ رکھتے ہوں تم ان ہی کی تقلید کے پیچھے جاؤ گے۔

دوسری جگہ زیادہ اس سے نرم لہجہ میں ارشاد ہے۔

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ اٰبَآءَکُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ۔ — آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ میں تمہارے سامنے وہ ہدایت لے آؤں اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا انہوں نے جواب دیا کہ جو طریق تم لے کر بھیجے گئے ہو ہم تو اس کو نہیں مانتے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان کے آباء و اجداد میں عقل کی روشنی یا نور ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں کورانہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے عقلی کی تقلید کی جائے خواہ پھر اس کے ساتھ ہزار دلائل بھی کیوں نہ ہوں اس کے بالمقابل روشن خیالی یہ ہے کہ ہدایت اور عقل کی بات کی پیروی کی جائے خواہ وہ کتنی ہی خاموشی اور کتنی ہی سکوت کے ساتھ ہو۔ ہمارے موجودہ دور میں یا تو تقلید اور جمود کا مفہوم ہی غلط سمجھا گیا ہے۔ عالم غیب کی جتنی بلند حقائق الٰہیات کے یقین سے حقیقی معارف اور اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی ان تمام باتوں کو ان کے اعتماد پر مان لینا حتیٰ کہ ان کی نگاہوں نے خود دیکھا یا فہم سلیم نے خوب سمجھا ہے کورانہ تقلید کہلاتا ہے۔ اور یورپ کے فلاسفروں کی ناتمام اور ادھوری تحقیقات کو پورے یقین کے ساتھ مان لینا روشن خیالی کے نام سے موسوم ہے۔ اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو اختلاف حائل بے دلیل ہونے کا نہیں بلکہ اعتماد و بے اعتمادی کا ہے۔ عصر حاضر کے مرعوبین یورپ کو جو یورپ پر اعتماد حاصل ہے، اس سے ان کی باتیں بدلیل یا بے دلیل ماننا سب روشن خیالی میں شمار ہے اور انبیاء علیہم السلام پر جو کسی طرح بھی یہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لئے یہاں تصدیق کے لئے ان کے فرمان سے بھی بڑھ کر کسی اور دلیل کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کی باتیں بے دلیل ماننا اندھی تقلید نظر آتی ہے۔ حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سب علوم ہدایت کھلے اور اتنے صاف ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کَمَنْ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (محمد) — بھلا جو شخص اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر چلتا ہو وہ اس کے برابر ہو سکتا ہے جن کو اپنا برا کام بھلا نظر آتا ہے اور اپنی خواہشات پر چلتے ہیں۔

(۱) أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهِ (زمر) — بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کے لئے کھول دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی میں ہے۔

(۲) أَفَمَنْ يَّعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمٰى (رعد) — بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر اترا وہ حق ہے اس کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس راستہ کی دعوت دیتے ہیں وہ تو ایک کشادہ اور کھلا ہوا راستہ ہوتا ہے، ان کے مقابل جو عقول پرستی ہو اس کی یہ کشادگی اس لئے پوشیدہ رہتی ہے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال بد مزین ہوتے ہیں، ان کے اہواء و خواہشات خود ان کی آنکھوں کا حجاب بنی ہوئی ہیں اور رفتہ رفتہ نورِ بصیرت ان سے اس طرح سلب ہو جاتا ہے کہ پھر وہ ایک نابینا انسان کی طرح ہو جاتے ہیں۔ اب انصاف کرو کہ ذہنی تصفیہ کس کا ہے، ان انبیاء علیہم السلام کا جن کو خود شرح صدر حاصل ہے۔ ان کے علوم سراپا نور ہیں ان کا راستہ صاف و مستقیم اور کھلا ہوا راستہ ہے یا ان کا جو خود نابینا ہیں، جن کی آنکھوں پر اہواء و خواہشات کے تو بہ تو حجابات پڑے ہوئے ہیں اور اس لئے انھیں اپنی ہر گمراہی بھی ہدایت نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح سطحی علم اور اتباعِ ہوا فرقہ بندی کا سبب ہو جاتے ہیں اسی طرح اتباعِ عادات و رسوم بھی اس کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ تینوں اسباب ایک جگہ جمع بھی ہو سکتے ہیں اور جدا جدا بھی ہو سکتے ہیں اور وقت کی مساعدت اور ماحول کی مناسبت پر ان جراثیم کے گھٹنے بڑھنے، پیدا ہونے اور فنا ہونے کا مدار رہتا ہے۔ بعید نہیں ہے کہ خدا کے یہاں افتراق و تشتت کے لئے ان امور کا سبب ہونے میں دلائل ہوں، مگر جو بات ہر دور میں عقدۂ لاینحل بن کر رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی فرقہ کے علم کو سطحی کہہ دینا یا اس کو تبعِ ہویٰ قرار دینا یا کسی رسم کو رسمِ جاہلیت ٹھیرا دینا آسان بات نہیں۔ ہر فرقہ اپنے علم کو عمیق اور اپنے طریق کو اتباعِ سنت اور اپنے رسم و رواج کو طریقِ سلف کہتا ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے سے عقل کے ناخن عاجز ہیں۔ یا ایک فرقہ کا فیصلہ دوسرے کے حق میں حجت نہیں ہو سکتا اور اس مرحلہ پر پہنچ کر خدا کی اس تقدیر پر راضی ہونا پڑتا ہے جس کی طرف اس نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے ولذلک خلقھم۔ ہم نے اس تماشا گاہ کو اختلاف ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی ہنگامۂ اختلافات میں انبیاء علیہم السلام وحدت و اتحاد کی دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور شیطان کی یہی آواز پر اختلاف و تشتت بڑھتا رہا ہے۔ اسی کشاکش میں دنیا کی حیات کا راز مضمر ہے۔ اگر خیر و شر ایک حرف ہو جائے تو شاید کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے۔

فرقوں کی یہ کثرت جماعتِ محمدیہ کی مقدار کے لئے عجب گرداب حیرت بن سکتی ہے۔ ایک متفکر سوچتا رہتا ہے کہ افتراق و تشتت کی اتنی کثرت میں آنحضرت نے فرمایا کیا ہے۔ جماعتِ محمدیہ کے ۷۲ فرقوں کو دوزخی کہہ دیا اور

صرف ایک فرقہ کو جنتی کہنا اس کے لئے تو یہی مشکل کا سامان بنا ہوا ہے ادھر ایک مورخ صفحات عالم کی ورق گردانی کرکے تھکا جاتا ہے مگر اس کا بیان حدیث کے عدد سے میل نہیں کھاتا۔ جب حساب لگاتا ہے مگر کبھی یہ عدد گھٹ جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے۔ ان الجھنوں سے گھبرا کر جب وہ نظر اوپر اٹھاتا ہے تو اس کو ایک راہ یہی آسان نظر آتی ہے کہ وہ اس حدیث ہی سے دستبردار ہو جائے۔ جس غریب کو یہ بیا موقع پیش آیا ہو اس کا گھبرا جانا کچھ موجب تعجب بھی نہیں۔

احادیث میں مخصوص عدد کی بحث

لیکن ایک محدث جب ان مشکلات پر نظر کرتا ہے تو دنیا کی حیرت اس کے لئے خود حیرت بن جاتی ہے وہ اعداد و شمار کی بحث کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اعداد و شمار صرف وقتی استحضار اور متکلم کے ذہنی اعتبار کی ایک بات ہوتی ہے۔ کبھی وہ ابہام و اجمال کا ارادہ کرتا ہے تو عدد بیان ہی نہیں کرتا، تفصیل اختیار نہیں کرتا اور کبھی تفصیل پر اترتا ہے تو عدد کی بھی تشکیل کرتا ہے پھر حیثیت کے اختراع اور وقت و ماحول کی وسعت کے لحاظ سے دونوں صورتیں اختیار کرنا معقول بات ہے۔ افراد کو انواع اور انواع کو اجناس کے تحت میں داخل کرتے چلے جائیے تو عدد گھٹتا چلا جائے گا اور اس کے برعکس اجناس و انواع کی تحلیل کرتے جائیے تو وہی عدد بڑھتا چلا جائے گا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں سمجھا جاتا۔

اعداد و شمار میں مورخ کا اختلاف نظر

اسی طرح اگر کوئی مورخ فرقہائے عالم کے متعلق کوئی عدد لکھتا ہے تو یہ اس کی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس فرقہ کو کتنی تاریخی اہمیت دینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض معمولی فرقے اس کے نزدیک تاریخی لحاظ سے قلمبند کرنے کے قابل ہوں اور بعض چھوٹے فرقے بے اہمیت نہ سمجھے ہوں۔ ہر مورخ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ معیار کے لحاظ سے جو عدد چاہے ذکر کرے۔ یہاں تطبیق و اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس مورخ کے معیار اور اس کی اہمیت و غیر اہمیت کا اندازہ نہ لگا لیا جائے۔ پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص یا اس کے اس معیار سے اتفاق بھی کر لے۔ ہر شخص کا ذوق اور اس کا نقطہ نظر علیحدہ ہو سکتا ہے اس لئے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی دوسرا معیار مقرر کر لے لیکن معمولی تفاوت پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے[1]۔

---

[1] یہاں ہم آپ کے سامنے اسی نوع کی چند احادیث پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ احادیث میں عدد کی بات کی تعیین میں حدیث کی وضع و صحت کا فیصلہ ان پر نہیں ہو سکتا۔

تطبیق عددی حدیث میں

(۱) احادیث شعب الایمان میں ایمان کے شعبوں کا عدد کہیں ساٹھ اور کہیں ستر سے اوپر [illegible] کہا ہے۔ جو لوگ [illegible] کو حدیث کرتے [illegible] عجیب بات ہے۔

(۲) بعض احادیث میں [illegible] کا بیان [illegible] کہیں اس کے خلاف بتلایا گیا ہے احادیث میں بیان مختلف اختلاف ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

پیشگوئی کی احادیث میں ابہام ناگزیر ہے

فن حدیث پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ نصوص جو مستقبل کے واقعات کی احادیث میں اکثر ایک نوع کا ابہام ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جزئیات کی جب تعیین کی جاتی ہے تو علی العموم وہ الفاظ کلیات کا جامہ پہن چکے ہیں اور اس لئے جب انسان اس کو اپنے محل پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بعض معانی سے اس کا دل چسپاں کرنا جاتا ہے جہاں نہیں کر سکتا مثلاً تھوڑی دیر کے لئے آپ فرض کر لیجئے کہ زید کی شکل و صورت آپ بقید الفاظ لانا چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رنگ یہ ہے، ناک نقشہ یہ ہے اور بہت سے بہت اس کا طول و عرض بتا سکتے ہیں، مگر کیا یہ سب الفاظ آپ کی تعیین پیدا کر سکتے ہیں کہ پھر دوسری صورت پر اس کا صدق کرنا ممکن ہی نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی یہ قیود خود زید ہی کی صورت کی تشخیص میں اور صعوبت پیدا کر دیں جب ایک نادیدہ شخص کی تعیین صرف الفاظ سے پوری نہیں ہو سکتی تو مستقبل کے حوادث کی تعیین باوجود ان کے تنوع اور تشابہ کے کیونکر ہو سکتی ہے۔

شریعت کا ایک اہم نصب العین

وہی تشریع شریعت کے اصل نصب العین کے بھی خلاف ہے وہ اپنے مخاطب و سامعین کو ایسی تربیت دینا چاہتی ہے کہ جو علوم غیبیہ وہ بیان کرے وہ بلا تردد صرف اس کے اعتماد پر قابل یقین ہو جائیں اور اس تسلیم و رضا کی انہیں ایسی عملی مشق حاصل ہو جائے کہ پھر جہاں ان کے سامنے تفصیل کر دی جائے وہاں تفصیل ہی مناسب معلوم ہو اور جہاں اجمال رکھا جائے وہاں اجمال ہی پسندیدہ نظر آنے لگے۔ آپ آثار ذیل میں اس تربیت کے آثار ملاحظہ فرمائیے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ)

اس حدیث سے گمان ہو سکتا ہے کہ شاید تمام امور بیک اجمال کو بتا دئے گئے تھے لیکن حضرت حذیفہ سے مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فتنوں کے سرغنوں کے نام بتلائے ہیں جن کے ساتھ تین سو یا اس سے زیادہ کی جماعت ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مسند ڈٹا بیان کرتے وقت [illegible] ہوگیا ہے جس پر اتفاق سے وہ سب یہیں بیٹھے ہیں، یہ مد سامنے آ گیا ہے [illegible] حضرت حذیفہ کے متعلق ہم بھی سمجھتے تھے کہ ان کو ہر ہر فتنہ کا نام بتلا دیا گیا تھا۔ احادیث فتن میں اس عام ابہام و انتشار کے علاوہ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی روایات احادیث حلال و حرام کی طرح عام صحابہ سے منقول نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کا مخاطب ہر ذی فہم اور غیر ذی فہم بنایا بھی نہیں جا سکتا اس میں خواہ مخواہ ابہام و اجمال پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ ابہام اس لئے مضر نہیں ہوتا کہ فتنے جب سامنے آتے ہیں تو اہل بصیرت پر ان کا فتنہ ہونا مخفی نہیں رہتا اس تشخیص و تعیین کی بھی تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ فتنہ کا فتنہ ہے۔ اسی طرح حدیث زیر بحث میں امت کے افتراق کی جو پیشین گوئی کی گئی ہے [illegible] مقصد اس افتراق [illegible] ہر زمانہ کے دور میں [illegible] کتاب و سنت اچھی طرح [illegible] چھوٹ نہ جائے اسی لئے صحابہ کرام نے اس حدیث کو [illegible] نہیں کیا کہ وہ فرقے کون کون ہیں ان کی علامات کیا ہیں بلکہ یہ بتایا کہ وہ ایک فرقہ ناجیہ کون سا فرقہ ہے [illegible] جب ایک ہی فرقہ ہو تو اس کے سوا جتنے فرقے ہیں وہ [illegible] باطل فرقے ہوں گے اس لئے صحابہ کے نزدیک اس کی [illegible] ایک ناجی فرقہ [illegible]

امتِ محمدیہ کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت

علماء نے اس امت کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت یہ بھی تحریر کی ہے کہ اب خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس امت کی داستانِ عمل بھی پچھلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

جماعتِ منافقین کی ریشہ دوانیوں سے کتبِ سیرت و تاریخ بھری پڑی ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ شریعت کا سلوک یہی شاہد ہے کہ جس نے نمائشی طور پر بھی اسلام کا نقاب ڈال لیا اس کو رسوا نہیں کیا یعنی جو دین کا لباس پہن کر سامنے آ گیا ہو جس نے زبانی اسلام کی شہادت دی بس اسی کی شہادت قبول کر لی گئی۔

ماسوا اس کے افتراق و تشتت، تعصب و نخوت کے دور میں جماعتوں کو نام لے لے کر گمراہ اور دوزخی ٹھیرانا بھڑکتے ہوئے فتنوں کو اور بھڑکانا ہے۔

امام غزالیؒ کی ایک مفید نصیحت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں عوام کی گمراہی کا باعث بعض مرتبہ خود اہلِ حق کا تعصب بن گیا ہے۔ انہوں نے حق کی حمایت میں ناحق جماعت کو نظرِ حقارت و نفرت سے دیکھا جاہلوں نے ضعف ان کی ضد میں اپنے جہل و عناد میں اور شدت اختیار کر لیا شدہ شدہ یہ وقتی ضد دائمی عقائد بن گئے یہاں تک کہ کلام اللہ کے حدوث و قدم کے مباحث میں یہاں تک مبالغہ آمیزیاں ہوئیں کہ جو آواز تمہارے حلقوم سے نکلتی ہے اس کو بھی قدیم کہہ دیا گیا۔ کاش اگر یہ مقابلے اور مناظرے نہ ہوتے تو یہ بے معنی کلمات جو بعد میں عقائد بن گئے شاید کسی مجنوں کی زبان سے بھی نہ نکلتے۔

ہم نے اہلِ سنت کے سوا اگر کہیں کسی جماعت یا فرقہ کا نام لیا ہے تو کسی خاص ہی مصلحت کے لئے جس پر علماء نے اپنی جگہ کافی بحث کر دی ہے اس لئے ان فرقوں کی تعیین پر بحث کرنا قطعاً غیر ضروری ہے تاہم جب اذہان اس طرف متوجہ ہو گئے اور بحث شروع کر دی گئی تو ہم نے بھی کچھ لکھ دینا مناسب سمجھا۔

اس موضوع پر علماء کلام اور علماء اصول دونوں نے اپنی اپنی جگہ گفتگو کی ہے۔ ہمارے نزدیک علامہ طرطوشی کا کلام سب میں منتخب ہے اسی کو علامہ شاطبی نے بھی اختیار فرمایا ہے اس لئے ہم اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حدیث میں زیرِ بحث صرف وہ اختلافات ہیں جو تفرق فی الدین کی حد تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ وہ افتراق ہے جو صراطِ مستقیم سے وابستہ رہ کر انحراف کے نتائج میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام قرآنی اصطلاح میں "السبل" رکھا گیا ہے اس کا حاصل اصل دین سے منسوب رہ کر اس کے بعض اصول و کلیات کے ساتھ اختلاف کرنا ہے اس لئے یہاں اختلاف و افتراق سے امتِ اجابت ہی کا اختلاف یا افتراق مراد ہوگا امتِ دعوت کا اختلاف جس میں کفار بھی داخل ہو جائیں مراد نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی کا انحراف اپنی حد سے تجاوز

کر جائے تو اس کی انتہا کفر بھی ہو سکتی ہے۔

حدیث کے لفظ امتی کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس اختلاف کا بیان ذکر کیا گیا ہے وہ لفظ امت کے تحت ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں امت سے امت دعوت مراد لینا بہت بعید ہے کیونکہ اس امت کے اختلاف کو بنی اسرائیل کے اختلاف کے ساتھ تشبیہ دی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف یہودیت و نصرانیت کے وسیع مفہوم میں داخل ہو کر ہی تھا اسی طرح اس امت کا اختلاف بھی امت اجابت میں رہ کر ہو سکتا ہے کفر اپنے تمام انواع و اقسام کے ساتھ شریعت کی نظر میں ایک ہی ملت قرار دیا گیا ہے اس لئے تشتت و افتراق کی بحث شریعت کیلئے غیر مفید بحث ہے۔ اگر اس کی انتہا کے کفر تک ڈال دیا جائے تو یہی نظر آتا ہے کہ اسلام میں جو مختلف فرقہ بندیاں ہوئیں ہمیشہ وہ اسلام ہی کے نام پر ہوئیں خوارج کی جنگ کی تمام بنیاد یہی تھی کہ وہ اپنا قدم اسلام اور صراط مستقیم پر سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کو دائرہ اسلام سے باہر قرار دیتے تھے۔ معتزلہ و مرجئہ اور دیگر فرق باطلہ سب اپنی اپنی جگہ یہی دعویٰ رکھتے تھے کہ بس وہی مسلمان ہیں باقی سب دوسری جماعتیں منحرف و حق سے کٹی ہوئی جماعتیں ہیں ان وجوہ کی بنا پر ظن غالب ہے کہ ان فرقوں کا ظہور صرف اسلام کے اندر ہی ہے کفر کی جماعتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔

فرقۂ باطلہ کی پہلی علامت بغض و تفرق ہے

ان فرق باطلہ کی تعیین کا سوال اب بھی رہ سکتا ہے کہ ان کی علامات اصولی طور پر بیان کی جائے کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انحراف زیغ و افتراق کی پہلی علامت خود باہم کا اختلاف ہے یہ ہر گز کوئی مسئلہ اسلام میں پیش آتا ہے اور اس کی وجہ سے افتراق و تشتت نہیں ہوتا۔ بغض و عداوت کی جڑ نہیں پکڑتی امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہو جاتا اس کی محبت و مودت ختم نہیں ہوتی تو اس کو اختلاف مذموم نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر اس کا نتیجہ تحزب و تعصب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو اسے افتراق کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ آیت ولا یزالون مختلفین کی تفسیر کے ذیل میں مجاہد فرماتے ہیں کہ مختلفین اہل باطل ہیں اور مرحومین کے متعلق لکھتے ہیں۔

اہل الحق لیس فیہم اختلاف　　　　اہل حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔

حضرت ابن شخیر کہتے ہیں کہ اگر کہیں اہل اہواء میں بھی محبت و اتحاد ہوتا تو دھوکا لگتا کہ شاید یہی لوگ اہل حق ہیں لیکن جب اس نعمت سے وہ محروم ہیں تو اب ہر ذی عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ اہل حق نہیں ہو سکتے کیونکہ اہل حق کی شان اختلاف و افتراق نہیں۔

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ مختلفین اہل اہواء اور مرحومین اہل سنت والجماعت ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اہل رحمت اختلاف نہیں کرتے۔ ؎

؎ کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۲۰۲

یہ اتفاق تو بتا رہے ہیں کہ اس وقت تک اہل حق کے قلوب میں فروعی اختلافات رکھنے کے باوجود کوئی بغض و عناد نہ تھا مگر آج یہ سمجھنا اور سمجھانا دونوں مشکل ہیں کہ فروعی اختلاف کے بعد محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے مگر غور کرو تو معلوم ہوا افتراق کی بنا فروعی اختلافات نہیں ہیں بلکہ قلبی سرد مہری ہے۔ ہاں یہ نہ بتانے کی وجہ مذہب کے سر رکھ دیا جاتا ہے تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اگر منشاء یہی ہو اور آپس کے جھگڑے تحزب و تعصب اختلاف افتراق کی صورت پیدا کرلیں تو ہرگز اس اختلاف کو بھی اہل حق کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔

حافظ ابن قیمؒ قیاس کی مذمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ قیاسات ہی کی بدولت امت کے کلمہ میں تفریق پھیلی اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قیاسات خدا کی مرضی کے برخلاف ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا	اگر قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا
فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔	تو اس میں بڑا اختلاف نظر آتا۔

حضرت ابن عباسؓ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ سفید چہروں کا مصداق اہل سنت و اہل ائتلاف ہیں اور سیاہ چہروں کا مصداق اہل فرقت و اختلاف ہیں۔

اختلاف کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں اختلاف برپا نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ اسی لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے مفہوم میں صحابہؓ کا اختلاف دیکھتے تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا اور آپ پر اتنا غصہ طاری ہوتا کہ آپ کا چہرہ انور لال انگارہ کی طرح سرخ ہو جاتا اور فرماتے کیا اس بات کا تم کو حکم دیا گیا تھا؟ بعثت رسول کا اصل مقصد ہی رفع اختلاف ہے اس لئے جو اختلاف کرتا ہے درحقیقت وہ اس اہم مقصد ہی پر ضرب لگاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد والے اور زیادہ اختلاف کریں گے"۔

ایک دن حضرت عمرؓ کو خبر پہنچی کہ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعودؓ اس مسئلہ میں اختلاف کر رہے ہیں کہ نماز ایک کپڑے میں ادا کرنا سنت ہے یا دو کپڑوں میں، تو انہوں نے منبر پر غضب ہو کر فرمایا "جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو کر ایسے ایسے مسائل میں اختلاف کرو گے تو پھر تمہارے بعد مسلمان کس کے قول کو اختیار کریں گے مگر آج کے بعد میں نے سنا کہ دو شخصوں میں اختلاف ہو رہا ہے تو مجھے کہنا ہے کہ گرفت کروں گا۔"

حضرت علیؓ نے اپنے قاضیوں کو لکھ بھیجا "جیسے تم پہلے فیصلہ کیا کرتے تھے اب بھی اسی کے موافق کرو کیونکہ مجھے اختلاف پسند نہیں، میری تمنا ہے کہ جس طرح میرے پیشرو دنیا سے گذر گئے اسی طرح کسی اختلاف کے بغیر میں بھی گذر جاؤں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "پہلی امتیں اسی عادت کی بدولت ہلاک ہوئیں کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے اختلاف کیا کرتی تھیں۔" اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ "اللہ کی کتاب کے بعض حصہ کو

کہ اختلاف و تشتت بجائے خود ایک عذاب ہے اور اہل باطل کی نشانی ہے۔[1]

دوسری علامت اتباع متشابہات ہے

مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے محکم و متشابہ کی حقیقت ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے:-

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ	خدا ہی نے آپ پر کتاب اتاری ہے جس میں آیات محکمات ہیں
مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ	جو کتاب کا بڑا حصہ ہے اور دوسری آیات متشابہات ہیں۔

عربی میں لفظ اُم کے معنی اصل اور مرجع کے آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کو ام القریٰ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکز و نقطہ اور اس کی اصل یہی ہے جس سے زمین اطراف و جوانب میں پھیلائی گئی ہے۔ سورۂ فاتحہ کو بھی ام الکتاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اصولی کتاب پر حاوی ہے۔ ام الطریق بڑے راستہ کو کہا جاتا ہے وہ بھی چھوٹے راستوں کے بٹنے کی اصل ہوتا ہے۔ وہ اصل ام میں اصل ہونے کے ساتھ اس کے مرجع اور مرکز ہونے کا مفہوم بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ ماں کو عربی میں اسی لئے ام کہتے ہیں کہ وہ اولاد کی اصل اور ان کا مرجع ہوتی ہے یعنی وہ اسی کے اردگرد رہتے ہیں ضرورت کے وقت اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ جنگ کے بڑے جھنڈے کو بھی ام اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لشکر کر و فر کے وقت اسی جگہ لوٹ کر آتا ہے۔[2]

اس بنا پر محکمات کے ام الکتاب ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ قرآن کا بڑا حصہ اور اصل یہ اپنی جگہ قائم رہیں گے اور قرآن کا دوسرا حصہ جو نہ اس کی اصل ہے اور نہ اتنا بڑا ہے وہ انہیں محکمات کے اردگرد گھومتا رہے گا جب ان میں کوئی الجھاؤ پیش آئے گا تو ان ہی محکمات کی طرف لوٹ کر حل کر لیا جائے گا اور ام کی طرح ان کو مستقل حیثیت حاصل نہ ہوگی جب آپ محکم و متشابہ کا فرق سمجھ گئے تو اب سنئے کہ محکمات و متشابہات کی اسی تقسیم ہی نے یہاں خدا کی قہر و مہر کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ مومن راسخ فی العلم کے لئے ہدایت ہے کیونکہ وہ محکمات پر عمل کرتا ہے اور متشابہات پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے برعکس کج طبیعت، بیمار قلب کا تو قرآن کا جو کھلا ہوا حصہ ہے اسے تو متشابہات کی طرح عملاً چھوڑ دیتا ہے اور جو متشابہات ہے اس کو محکمات کی طرح زیر بحث لاتا ہے متشابہات خود کبھی اپنی مراد میں واضح نہیں ہو سکتے اور یہ شخص ام الکتاب کی طرف رجوع نہیں کرتا اس لئے

[1] اگر آپ اختلاف کے صحیح معنی سمجھ گئے ہیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تو برعکس اہل حق میں ہی اختلاف ہے اور اہل باطل میں اتفاق نظر آتا ہے۔

[2] اسی مناسبت سے سورۂ فاتحہ کو ام الکتاب سمجھنے کی یہ لطیف حکمت بھی کہی ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں اپنی جگہ رہتی ہے۔ بقیہ قرآن اس سے آگے لگتا رہتا ہے۔ اب یہ بات بھی حل ہو گئی کہ ہر رکعت میں خاص سورۂ فاتحہ ہی کیوں واجب کی گئی ہے۔ بقیہ سورتوں میں کوئی اور سورت واجب کیوں نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن میں جو سورت ام کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سورۂ فاتحہ ہے اسی لئے اسی کا حق ہے کہ یہ سورت بحیثیت ام اپنی جگہ رہے اور بقیہ قرآن اس سے آگے لگتا رہے۔

(از افادات حضرت استاذ قدس سرہٗ)

جس قدر اس کی مراد حاصل کرنے میں دیر لگاتا ہے اسی قدر منزلِ مقصود سے بعید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ
اگر کہیں جھگڑا اس کی پیاس بجھے مگر اس کی تشنگی زیادہ ہوتی ہے یہ ابتدائی جدوجہد میں اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے اور
نہ اسے ساحلِ مراد ہی نظر آتا ہے نہ اس بدنصیب کا سفر ہی تمام ہوتا ہے۔

خدائے قدوس نے حل و حرمت اور عمل کے جتنے احکام بتلائے ہیں ان میں کوئی ابہام نہیں رکھا اور جہاں
ابہام رکھا ہے اس پر عمل کی دعوت نہیں دی بلکہ صرف ایمان لانے کا امر کیا ہے۔ اب اگر کوئی بدنصیب صحیح راہ
نہیں چلتا اور خود بھٹکتا پھرتا ہے تو یہ قصور اس کا ہے یعنی یہ کہ اتباع متشابہ فتنہ کا راز اسی میں مضمر ہے۔
اسی جگہ مخلص و غیر مخلص، سعید و شقی کا فرق واضح ہوتا ہے۔ شانِ تفویض و تسلیم اور تمرد و سرکشی کا یہی نقطۂ امتحان ہے۔
قرآن کے بہلانے کے پھرنے کا یہی مرجع ہے۔ اس لئے اس پہلو پر پھر تفصیلی نظر ڈال لیجئے۔

محکم و متشابہ کی تعریف

محکم کے دو معنی ہیں ایک عام دوسرا خاص۔ خاص اصطلاح میں محکم منسوخ کے بالمقابل مستعمل ہوتا
ہے۔ اس بنا پر قرآن کی جو آیات منسوخ نہیں وہ سب محکمات کہلائیں گی اور جو منسوخ ہیں ان کو متشابہ
کہا جائے گا۔ محکم کے عام معنی یہ ہیں کہ جو آیات اپنی مراد میں واضح اور کھلی ہوئی ہیں وہ محکمات ہیں۔ اس اصطلاح کے
موافق متشابہات وہ آیات ہوں گی جو اپنی مراد میں واضح نہ ہوں خواہ بحث و تفتیش کے بعد حل ہو سکیں یا نہ ہو سکیں
اس بنا پر متشابہات کی دو قسمیں ہو جائیں گی (۱) حقیقی (۲) اضافی۔ متشابہ حقیقی وہ ہوگا جس کی مراد نہ خود شریعت
نے بتلائی ہو نہ اس کے حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو یعنی تحقیقات کے تمام دروازے بند نظر آئیں اور جو
دروازہ کھلا ہوا ہے وہ صرف ایک ایمان کا دروازہ ہو۔ قرآن کریم میں ایسے متشابہات بہت ہی تھوڑے ہیں اور ان کا مقصد بھی
بجز ایمان لانے کے اور کچھ نہیں ہے آیت بالا میں متشابہات سے یہی معنی مراد ہیں۔[1]

متشابہ اضافی قرآن کریم کا وہ حصہ ہے جس کی تفصیل خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان کر دی ہے۔ مثلاً کسی
عام کی تخصیص یا کسی مطلق کی تقیید لیکن بے علمی یا کج نظری یا اتباعِ ہوی اس تحقیق کی فرصت نہیں دیتی کہ
کلام کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے۔ عام و خاص، مطلق و مقید کے ارتباط کا لحاظ کیا جائے بلکہ صرف یکطرفہ
نظر کر کے قرآن کے خلاف ایک معنی پیدا کر لیتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک شخص نے جابر جعفی سے دریافت کیا کہ
ذیل کی آیت کا کیا مطلب ہے۔

فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۔

اس نے جواب دیا اس آیت کا مصداق ابھی ظاہر نہیں ہوا۔ سفیان نے فرمایا جھوٹ بولتا ہے۔ حمیدی کہتے ہیں
ہم نے سفیان سے دریافت کیا اس شخص کا مطلب کیا تھا فرمایا روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ بادلوں

---

[1] یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔ (تفسیر المنار ج ۳ ص ۱۶۲)

میں پیچھے بیٹھے ہیں۔ جب کبھی ان کو حکم ہوگا تو اپنی اولاد کے ساتھ آسمانوں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ رافضی اس پوری
آیت کو جو بیان کیا جاتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آیت کا تمام بیان و سیاق صاف صاف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے
بارے میں ہے۔ بیان اس میں ہرگز کسی عقیدہ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ مگر اس شخص نے جب آیت کو اپنے
مذہب پر ڈھالنا چاہا تو اس کو اول و آخر سے علیحدہ کر کے صرف درمیان کا حصہ پڑھا۔ اسی طرح خوارج صرف
ان الحکم الا للہ رٹتے گئے اور یہ نہ دیکھا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ انسانوں کی تحکیم موجود ہے۔ جبریہ
کا حال بھی یہی ہے وہ بھی صرف

واللہ خلقکم وما تعملون — اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا

کو لئے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے عمل بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو اب ہمارا اختیار کیا رہا۔ لیکن
اسی قرآن میں جزاءً بما کانوا یکسبون (یہ بدلہ ہے ان کاموں کا جو انہوں نے کئے ہیں) بھی موجود ہے جس سے
صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے افعال اس کے کسب و اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

غرض باطل فرقوں کا یہی دستور ہے کہ پہلے وہ ایک خیال بنا لیتے ہیں پھر اس پر قرآن سے استدلال
قائم کرنے کے لئے کسی آیت کی آڑ تلاش کر لیتے ہیں اور تھوڑی بہت بنی کا رنگ چڑھا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور
اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اسی قرآن میں دوسری جگہ اس کی تشریح ان کے دعوے کے خلاف موجود ہوتی ہے۔
پس متشابہ اضافی بعض کے لحاظ سے تو متشابہ ہو سکتا ہے اور بعض کے لئے محکم ہو سکتا ہے۔ آگے دیکھا جائے کہ جب
خود شریعت نے مبہم کو مفصل، عام کو خاص، مطلق کو مقید کر دیا ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی تشابہ نہیں رہتا
اور اس لئے علماء کو اس پر بحث کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ دوسری ترتیب میں ایک عام فہم کے لئے دوسری
آیت کی طرف رجوع کرنے کا محتاج ہوتا ہے، جس کی اہلیت اس شخص میں موجود نہیں ہوتی تو اس کے لئے یہی
کہا جائے گا کہ جس طرح متشابہات حقیقیہ کی تحقیق علماء کے لئے ممنوع تھی اسی طرح ان آیات محکمات پر بحث
کرنا اس کے لئے ممنوع ہے۔ اب متشابہ حقیقی اور متشابہ اضافی میں فرق یہ ہے کہ متشابہ حقیقی پر بحث و تفتیش کرنا
مطلقاً زیغ کی علامت تھی۔ متشابہ اضافی پر بحث کرنا صرف نااہل اور بے علم کے لئے زیغ کی علامت ہوگی۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ تشابہ کبھی فی نفسہ ہوتا ہے، کبھی اپنے قصور علمی کی وجہ سے نظر آنے لگتا ہے مگر دونوں جگہ
حکم یہ ہے کہ متشابہ حقیقی سب کے لئے متشابہ ہے اس لئے کسی کو بحث کرنے کی اجازت نہیں اور متشابہ اضافی جس کے
حق میں متشابہ ہے خاص اس کے لئے اس پر بحث کی اجازت نہیں۔ لیکن جب جاہل اپنی بے علمی کا ادراک نہیں

---

[1] دیکھو الموافقات ج ۳ ص ۸۸ – ۹۲

ایک لطیف بات یہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ جتنا توازن جتنا اعتدال جتنا اقتصاد اور میانہ روی اس شریعت میں ملحوظ ہے اتنی دوسری شرائع میں نہیں تھا۔ شریعت موسوی و عیسوی کے افراط و تفریط کا حال معلوم ہے اگر وہ اپنے زمانہ کا توازن درست رکھنے کے لئے کتنی ہی معتدل ہوں مگر اس شریعت کے اعتدال کے بالمقابل کبھی نہیں جا سکتیں تھیں وہ معیار اعتدال اور شدید احکام کا جزیہ تھے جیسی شریعت مصطفویہ نے میزان شریعت سے نکال کر اعتدال کی صورت پیدا کی ہے۔ اسی وصف ممتاز کے لحاظ سے اس امت کو امت وسطا کہا گیا ہے اس لئے یہاں ادنیٰ لغزش انحراف بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے سبل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ۔

سہل تستری فرماتے ہیں کہ قصد السبیل یعنی میانہ راستہ طریق سنت ہے اور منہا جائر ملل و نحل متفرقہ ہیں۔ مجاہد نے اس کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے وہ قصد السبیل کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

المقتصد بين الغلو والتقصير وذلك	یعنی میانہ روی یہ ہے کہ انسان میں غلو اور مبالغہ ہو اور نہ کوتاہی
يفيد ان الجائر هو الغالي او المقصر	رہے اس کے مقابل جائر کا مفہوم یہی ہوگا کہ اس میں یا تو
وكلاهما من اوصاف البدع۔ [1]	غلو نظر آئے یا کوتاہی۔ یہ دونوں ہی بدعت کے اوصاف ہیں۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اقتصاد اور اعتدال کتنی کٹھن منزل ہے اگر پلڑا ذرا جھکتا ہے تو غلو ہو جاتا ہے اگر ذرا اٹھتا ہے تو تقصیر کا الزام عائد ہوتا ہے اس لئے اعتدال کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر وقت شریعت پر ترازو کی طرح نگاہ جمی رہے کہیں ڈگمگانے نہ پائیں یہ بوالہوسوں کے نصیب کہاں ؎

ایں شربت عاشقیست خسرو — بے خون جگر چشید نتواں

کلہم فی النار الا واحدۃ

یہاں ایک شبہ یہ بھی پیش آ رہا ہے کہ اس امت کی اکثریت اگر جہنم میں ہو تو امت مرحومہ کیسے ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ سوال ہی غلط ہے یہ فیصلہ ابھی قبل از وقت ہے۔ ان ابتدائی مواطن سے گذر کر جب یہ امت جنت میں داخل ہو جائے اس وقت یہ توازن قائم کرنا چاہیے کہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ امت زیادہ ہے یا کم اس وقت یہ صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ درحقیقت یہ امت مرحومہ ہے یا نہیں [2] نیز یہ بھی تو سوچئے کہ اس امت کی ضرب المثل وحدت اس کی خصوصیت اور امتیاز تھی۔ یہی اس کی جسدی و روحی یہ اس کے عروج کی علامت تھی اس کے برعکس اس کا افتراق و تشتت اس کا تفرق و گروہی یہ اس کے سبب زوال کی داستان ہے۔ کسی قوم کے دور عروج کی تاریخ اس کے دور زوال میں پڑھنے کی سعی کرنا بڑا ظلم ہے

---

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۳۸۔ [2] ترمذی میں روایت ہے کہ اہل جنت کی کل صفیں ایک سو بیس ہوں گی جن میں اسّی اس امت کی اور بقیہ چالیس سب امتوں کی۔

جن احادیث میں اس امت کی خیریت و بہتری کی موجود ہے اُن ہی میں اس کے دورِ انحطاط کا یا افتراق مذکور ہے پھر اس میں تردد و شبہ کی کیا بات ہے۔

کلہم فی النار کی تحقیق

یہاں ایک بڑے عالم محقق نے یہ جواب دیا ہے کہ "کلہم فی النار" درحقیقت ایک محاورہ ہے جو کسی چیز کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ اردو میں کہہ دیتے ہیں کہ اس کو چولھے میں ڈالو۔ یہاں درحقیقت دوزخی ہونا مراد ہی نہیں مگر ہمیں اس جواب میں تردد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے دوسرے الفاظ یہ ہیں "واحدۃ فی الجنۃ" "صرف ایک فرقہ جنت میں ہوگا" موجود ہے۔ لفظ نار اور جنت کا تقابل یہاں اس محاورہ کی گنجائش نہیں دیتا۔

ہمارے نزدیک حدیث کی راجح مراد وہ ہے جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے بیان فرمائی ہے اور جس کو شاہ عبدالعزیزؒ نے جزوی اصلاح کے ساتھ اپنے فتاویٰ میں نقل فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ایک فرقہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو بلا کسی ادنیٰ عذاب کے جنت میں جائے گا اور یہ وہ ہوگا جس میں اعتقادی اور عملی کسی پہلو سے بھی بدعت نے راہ نہ پائی ہوگی مگر بتقاضائے بشریت کوئی عملی کوتاہی اُن سے سرزد بھی ہو گئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے معاف کر دے گی اور عذابِ قبر اور حشر کے شدائد میں کہیں اس کا حساب جاری کر لے گی۔ اس کے بالمقابل جو باطل فرقے ہیں ان کو اپنے افتراق و تشتت کی سزا بھگتنا پڑے گی اس کے بعد وہ بھی جنت میں چلے جائیں گے۔ آخرکار اس امت کا ہر فرقہ کچھ عذاب پا کر یا بلا عذاب جنت میں داخل ہو جائے گا۔ یہی مطلب ہو سکتا ہے ابن عمرؓ کی اس حدیث کا۔

ما من امۃ الا وبعضہا فی النار وبعضہا — ہر ایک امت کے کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ میں جائیں گے مگر صرف
فی الجنۃ الا امتی فانہا کلہا فی الجنۃ — ایک میری امت ہے جو پوری کی پوری جنت میں جائے گی۔

یہ حدیث معجم اوسط اور معجم صغیر میں طبرانیؒ نے روایت کی ہے۔ صاحب مجمع الفوائد فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے تاہم اس کی مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کی ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت کیلئے مدار نجات صرف کلمۂ توحید ہے اور معصیت موجبِ عذاب نہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے مرجیہ کا مذہب ہے۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے اپنی امت کے بعض افراد کو بچشم خود دوزخ میں دیکھا پھر کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام امت بلا عذاب جنت میں داخل ہوگی۔

خلاصہ یہ نکلا ہی ہے کہ ناجی فرقہ سے وہی فرقہ مراد ہے جس نے سنت پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہے بدعت سے وہ ہمیشہ دور اور نفور رہا ہے۔ اس کے اعتقاد و عمل کے دونوں بازو درست ہیں۔ یہی فرقہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا اور لفظ "ما انا علیہ واصحابی" بھی زیادہ اسی پر چسپاں ہوتا ہے۔

صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اگر کسی مسئلہ میں ایک ہی قول ہوتا تو بعض صورتوں میں لوگوں کے لئے عمل میں تنگی کا باعث ہو جاتا لیکن اب ان کے اختلاف سے دین میں عمل کی مختلف راہیں نکل آئیں چونکہ وہ سب مقتدیٰ ہیں اس لئے اب اگر ان میں کسی کا قول اختیار کر لیا جائے تو وہ بھی دین کی ایک سنت پر عمل سمجھا جائیگا۔[1]

اس کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ چونکہ زیر سایہ نبوت تربیت یافتہ تھے، شریعت کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح سمجھنے اور رعایت کرنے والے تھے اس لئے ان کے اختلاف کی وجہ سے ایک عمل کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں وہ سب دین ہی کی راہیں کہلائیں گی اور سب مقبول ہوں گی اگر ان کے اختلاف کی بدولت ہمارے سامنے یہ مختلف صورتیں نہ آتیں اور کسی عمل کی ایک ہی صورت ہوتی تو بعض حالات میں اسی ایک صورت پر عمل کرنا دشواریوں کا موجب بن سکتا تھا۔ اس بناء پر ان کے اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب دین میں عمل کی وسعت ہوگا۔ امام شاطبیؒ کو یہاں ایک اور دشواری پیش آگئی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی کج فہم اس کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ حسب خواہش وہ جب چاہے جس صحابی کا قول چاہے اختیار کر سکتا ہے یہ بالکل غلط ہے اس لئے فرماتے ہیں۔

"یہ بات طے شدہ ہے کہ شریعت کے ہر ہر مسئلہ میں جزئی جزئی مصلحت کے علاوہ ایک کلی مصلحت بھی ہے۔ جزئی مصلحت تو خاص اس مسئلہ کی دلیل اور حکمت سے ظاہر ہوتی ہے لیکن کلی مصلحت یہ ہے کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اعتقادی، قولی، عملی ہر پہلو میں آئین شریعت کا مقید ہو اور ایک سانڈ کی طرح آزاد نہ رہے تاکہ اس کی ہر نقل و حرکت شریعت کے تابع ہو۔"[2]

اس کے بعد پھر قاضی اسمٰعیلؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے اختلاف سے جو وسعت سمجھ کر حاصل ہوئی ہے وہ دین میں اجتہاد کرنے کی وسعت ہے یہ گمان کا اختلاف اس کی دلیل ہے کہ غیر منصوص مسائل میں انہوں نے اجتہاد کیا ہے اور اسی اجتہاد کی وجہ سے ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اختلافات کے رحمت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ کے مختلف اقوال میں ہر شخص کو بے دلیل اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کا حق حاصل ہو گیا ہے۔"[3]

"ابن عبدالبرؒ نے قاضی اسمٰعیلؒ کی رائے پسند کی ہے اور اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔"[4]

قاضی اسمٰعیلؒ کا مطلب یہ ہے کہ گوناگوں واقعات اور مختلف حوادث کے لئے ہمیشہ نص صریح کا ملنا تو دشوار ہے اس لئے امت کے لئے دینی مسائل میں اجتہاد کرنا ایک ناگزیر مسئلہ تھا جس کے لئے متاخرین امت کو ابتدائی قدم اٹھانا بہت مشکل ہو جاتا جب صحابہ کرامؓ میں اختلافات ہوئے اور معلوم ہوا کہ باختلاف

---

[1] الاعتصام ج ۳ ص ۱۷۰، [2] الموافقات ج ۴ ص ۱۴۱۔ [3] ایضاً ج ۴ ص ۱۴۲۔ [4] ج ۲ ص ۸۰ تا ۹۲۔

ان کے اجتہاد کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اب امت کے لئے بھی اجتہاد کا جواز نکل آیا یہی وہ رحمت ہے جس کی طرف اختلاف امتی رحمۃ میں اشارہ کیا گیا ہے اگر ان میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ ثابت ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ بعد کے مجتہدین وائمہ امت نے دین کے باب میں اجتہاد کیا ہے یا نہیں، ان حالات میں ہمارے لئے از سر نو اجتہاد کا دروازہ کھولنا بہت مشکل تھا، دوسرا اجتہاد بڑا مشکل ہے۔ دوسرے جزئی مسئلہ میں نص یا صریح کا ملنا ممکن نہیں پھر دین کی مشکلات حل ہوتیں تو کیونکر ہوتیں۔ صحابہ کرام کے اختلافات نے ہماری یہ مشکل حل کر دی اور نہایت عملی طور پر ہمارے لئے اجتہاد کا اسوۂ حسنہ ثابت ہو گیا۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا یہ مطلب غلط ہے کہ ہر شخص کو اپنی اہواء کے موافق صحابہ کے اقوال میں انتخاب کر لینے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو بالفاظ دیگر یہ ہے کہ شریعت کی کسی پر کوئی گرفت ہی نہیں کیونکہ بعض مرتبہ مسائل فروعیہ میں اختلاف نفی و اثبات کا اختلاف ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی عمل نفی و اثبات کے دائرہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتا پس اس تقدیر پر اگر ہر شخص کو صحابہ کے اقوال میں انتخاب کا حق حاصل ہو جائے تو اس کا جو عمل بھی ہوگا وہ یقیناً شریعت کے دائرہ میں کہلائے گا اور شریعت کا وجود و عدم برابر ہو جائے گا اور آپ معلوم کر چکے ہیں کہ یہ صورت شریعت کے مقصد کلی کے بالکل برخلاف ہے وہ انسان کو اتنا آزاد چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔

ابن حزم کے نزدیک صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا فسق ہے

حافظ ابن حزم اس پر تو اجماع نقل کرتے ہیں کہ شرعی بحث کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔ ۱؎

بہر حال صحابہ کرام کے اختلافات دیکھ کر اختلاف امت کے رحمت ہونے کا مطلب خواہ صرف جواز اجتہاد کی حد تک ہو یا امت کے سامنے ایک عمل کی مختلف صورتوں کی وسعت بھی اس کے مفہوم میں داخل ہو۔ دونوں صورتوں میں صحابہ کرام کے اختلاف کی نوعیت دوسری جماعتوں کے اختلاف کی نوعیت سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ہر شخص کو مختلف اقوال میں سے زعم خود انتخاب کا حق حاصل نہیں اس کے ضوابط و قواعد مستقل ہیں ہماری غرض یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ صحابہ کرام میں اصولاً تو کوئی اختلاف ہی نہ تھا ہاں فروعی اختلاف تھا مگر وہ ہمارے لئے باعث رحمت ہوا نہ کہ باعث تفریق و شکست۔

مجتہدین امت کا اختلاف

مجتہدین کے دور تک عمل کی گاڑی اسی طرح مشترکہ طور پر کھنچتی رہی۔ شدہ شدہ بے علمی کا دور آیا۔ اور بگڑتی طور پر کچھ اہل علم کسی خاص جماعت میں روشناس ہو گئے۔ بے علم جماعتوں نے ان کے مسائل پر جب شروع کئے پھر معاصر علماء نے ان کا علم خود دریافت کیا تو ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اسی طرح ایک تلامذہ کا حلقہ اہل علم و غیر اہل علم کی منتقل اور مستقل دنیا میں ایک غیر معمولی حیثیت ہو گئی ان کے

۱؎ الموافقات ج ۴ ص ۱۳۲۔

فروع و اصول مکمل طور پر قلمبند کئے گئے اور بحث و تمحیص کے تسلسل سے دیگر مجتہدین کے بالمقابل ان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کا مذہب اسی مجموعی صورت میں پھیلتا رہا۔

صحابہ کے دور میں فطری ارتقاء

فطری ارتقاء، اسباب ضرورت اور مقتضیات خدمت کی بنا پر جس طرح قرآن صحف سے مصحف سے مصاحف اور مصاحف سے اعراب و رموز و علامات کے تدریجی ارتقائی سے گزرتا چلا آیا اصل متن ان ارتقائی منازل کے بعد بھی قرآن وہی قرآن تھا جو عہد اول میں موجود تھا۔

سنت میں ارتقاء

اسی طرح سنت کے بھی ارتقائی دور ہیں گو قرآن و سنت کے مراتب کے لحاظ سے عمل انسانی کو یہاں کچھ زیادہ آزادی حاصل ہوئی اس لئے وہ دور صحابہ سے گذر کر دور مجتہدین میں رہ کر منضبط ہوئے پھر اس انضباط میں کچھ اور ترقیات ہوئیں اور ایک زمانہ تک حدیث و فقہ ایک ہی جگہ مدون چلتے رہے۔ اسی احساس ضرورت نے پھر مجبور کیا کہ دونوں فن علیحدہ علیحدہ کر دیئے جائیں۔ شروع میں صرف یہ قدم بھی نیا اور قابل اعتراض معلوم ہوا آخر کار اس کے فوائد کو دیکھ کر تمام دنیا نے اس کو مان لیا اور تمام علماء کی یہی متفقہ پالیسی بن گئی۔

فقہی ارتقاء

اسی فطری ارتقاء اور تکوینی اسباب کے ماتحت لاکھوں اہل علم اور کے سلسلے میں خاندانوں میں یہ دینی حیثیت مجموعی مرکوز ہو جانا بہیں اختیار ہے کہ اس کا نام شافعیت و حنفیت رکھ کر دو مستقل قائم کر دو یا اسے انتظام و سہولت کے لحاظ سے قدرت کی ایک امانت تصور کرو جس نے تمہاری سہولت کے لئے تمہاری ضرورت کے بقدر مرتب شدہ دین تمہارے گھروں تک پہنچا دیا ہے۔

حنفیت و شافعیت کے اختلاف کی حقیقت

حنفیت و شافعیت کا اختلاف بھی دین میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے۔ نہ اختلاف اہواء پر مبنی ہے نہ تباین خیالات کا نتیجہ ہے نہ علم سلف سے بے خبری اس کی بنیاد ہے بلکہ "اختلاف امتی رحمۃ" کا مصداق ہے جو ہر زمانہ میں بقدر ضرورت امت مرحومہ میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اگر انہیں اور سب علوم سے الگ کر کے پارٹی بندی کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ قصور آپ کا ہے۔

ما انا علیہ واصحابی کی تحقیق

اس کے بعد ہمیں عنوان بالا پر غور کرنا ہے۔ بظاہر یہاں آپ کا جواب سوال کے مطابق نظر نہیں آتا۔ صحابہ کا سوال فرقہ ناجیہ کے متعلق تھا آپ کا صاف جواب "انا و اصحابی" ہونا چاہئے تھا یعنی وہ جماعت میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ بلا شبہ اس وقت فرقہ ناجیہ کا مصداق یہی جماعت تھی اور اس سے بڑھ کر کسی تعیین کی بنا نامعتبر تھا۔ تو وہ کتاب و سنت ہے بلکہ "ما انا علیہ واصحابی" کا حاصل بھی یہی ہے پھر آپ کے اسلوب کا طریقہ آپ کے طرز کے سوا کوئی اور طریق نہیں تھا اس کے مستقل طور پر بیان کی کچھ ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ان سوالات کے حل کی طرف جب انسان توجہ کرتا ہے تو اس کو صاحب نبوت کے ایک ایک لفظ کا کمال

کہلاتے چلا جاتا ہے جبکہ متبادر یہی تھا کہ جواب "انا و اصحابی" ہوتا مگر یہاں سائل کا مقصود اس کے زمانہ کی جماعت حق کی تعیین نہ تھی وہ صدیقین میں حق جماعت کی تعیین کا طالب تھا اگر کہتے آپ صرف کتاب و سنت ہی کا سیدھا بتا دیتے تو یہ جواب اس وقت کے مناسب حال نہ ہوتا بلکہ ہر باطل سے باطل فرقہ کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہی کتاب سنت کا عامل ہے اس لئے یہاں آپ نے وہ فیصلہ کن جواب بتانا چاہا ہے جو اس زمانہ کے بھی مناسب حال ہو اور صرف کتاب و سنت نہیں بلکہ اس کی وہ عملی تصویر ہے جو آپ نے اپنے صحابہ کے سامنے بطریق اسوہ پیش فرمائی تھی۔ صحابہ کرام نے اس کے ایک ایک خط و خال کو دیکھا اور ہو بہو اس کی نقل کی۔ اب یاد رہے سو سنت اور اس کا وہ عکس نقشہ تھا پوچھنے والوں کے لئے اس سے زیادہ صاف بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جو صراط مستقیم کو دریافت کرنے آیا اسے آنکھوں سے دکھا دیا جاتا اور زبان سے سمجھا دیا جاتا کہ یہ صراط مستقیم ہے اسی لئے یہاں الفاظ و اسماء کی بحث چھوڑ کر ان اوصاف کو اختیار کیا گیا ہے جو فرقہ ناجیہ کی تعیین میں ہمیشہ کے لئے کام آسکیں۔

الفاظ میں احتمالات باقی رہتے ہیں اس لئے فیصلہ کن صورت عملی ہی ہے

اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرقہ بندی میں کیا کیا تعصب نمودار ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ کی کشمکش ختم کرنے کے لئے صرف الفاظ کافی نہیں ہوتے یہاں حقیقت مجاز، عموم و خصوص کے احتمالات پیدا کر دینے کا میدان باقی رہتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ عمل ہی وہ مکمل پیرایۂ شریعت ہے جس میں یہ احتمالات نہیں چلتے۔ اسی لئے فرقہ بندی کا بنیادی مسئلہ اسی عملی شریعت کا انکار ہوا کرتا ہے قرآن کریم سے عذر اور لوگ حدیث کا انکار کرنے میں یا حدیث سے عذر ہو تو۔

صحابہ کرام پر آپ کا کامل اعتماد

سوال یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سنت کو یہاں مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے تو اس کی وجہ بظاہر اس کامل اعتماد کا اظہار کرنا ہے جو آپ کو اپنے صحابہ کی فہم پر حاصل تھا۔ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کسی خارق العادت امر کا تذکرہ ہوتا جیسے حیوانات کا تکلم تو آپ نے ابوبکر و عمر کی غیر حاضری میں یہ کلمات فرما دیئے ہیں آمنت انا و ابوبکر و عمر میں اور ابوبکر و عمر بھی اس پر ایمان رکھتے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی طرف سے ان کے ایمان کی شہادت دینا ان پر کمال وثوق کی طرف ہی اشارہ تھا۔

صحابہ کے بعض اعمال کی صورت گو بدعت نظر آئے مگر وہ شریعت کے ماتحت ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے بعض اعمال کی صورت گو بدعت میں بھی نظر آئے مگر عامہ شریعت کے لحاظ سے اس کا عین شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے لیکن بعد کے فرقوں میں صحابہ کے متعلق یہ حسن ظن قائم رہنا مشکل ہے اس لئے اس بحث کو ختم کرنے کے لئے ان کے طریق کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ہے مثال کے طور پر تراویح کا مسئلہ ہے کون نہیں جانتا کہ تراویح کی با جماعت صورت جو آج ہمارے دور میں رائج ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نہ تھی۔

حضرت عمرؓ نے اس اجتماعی صورت کو خوب سمجھا۔ اس وقت جماعتیں کتنی سلامتی، کتنا اتحاد، کتنی یکسوئی، کتنا اعتماد تھا کہ سب نے اس کا اتباع کیا اور کوئی اختلافی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ یہ درست تھا کہ تعلیم کا یہ دور آپ کے زمانہ میں بند تھا مگر صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس التزام جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے سے جو بات مانع آئی تھی وہ خشیت تھی کہ ماہ رمضان کا مبارک مہینہ نزول وحی کا دور ہو۔ اس میں صحابہ کرام کا یہ خلوص یا اجتماع اگر اسی طرح مسلسل ہوتا رہتا تو اس کا بہت امکان تھا کہ یہ اجتماعی ہیئت جو اب تک اختیاری تھی آئندہ لازم قرار دے دی جاتی اور جب ان بارہ ہستیوں کا دور ختم ہو تو آئندہ عام وجہ کی یہ گردنیں کہیں بار نہ ہو جائے اس لئے حضرت عمر فاروقؓ کو جب دیگر مہمات اسلامیہ سے فرصت ملی تو فوراً تراویح کے باجماعت ادا کرنے کی ترغیب دی کیونکہ اب وحی بند ہو چکی تھی اور وجوب کا کوئی احتمال باقی نہ رہا تھا۔ اس کی ایک مثال نہیں بہت سی مثالیں ہیں کہ صحابہ کے دور کا کوئی عمل گو صرف اپنی صورت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نظر نہ آئے لیکن حقیقت کے لحاظ سے آپ کے منشاء کے اتنا مطابق ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف فرما ہوتے تو یہی فرماتے۔ یہ ہمارا حسن ظن نہیں بلکہ عہد مبارک ہیں۔

قرآن کا حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب کرنا ان کے دینی مزاج شناسی کی دلیل تھی

خود وحی الٰہی کا حضرت عمرؓ کی بار بار تصویب کرنا اس بات کی کھلی ضمانت تھی کہ آئندہ بھی ان کی اصابت رائے نص کو تسلیم ہونا چاہیے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو موجودہ بے احتیاطیوں کو دیکھ کر عورتوں کا مسجدوں میں آنا بند کر دیتے۔ اس اختلاف صورت اور اتحاد مقصد کے پیش نظر مناسب ہوا کہ ما انا علیہ کے ساتھ ساتھ واصحابی کا لفظ اور اضافہ کر دیا جائے۔

منصب تشریع اور منصب اجتہاد کی تقسیم

خالق نے اپنے رسول کو منصب تشریع سے نوازا تھا۔ اس کے رسول نے اپنے صحابہ کو منصب اجتہاد سے نواز دیا اور اس طرح جو نعمت رسول کے عہد میں آئی تھی اب اس کا بھی ایک حصہ لگ گیا۔

السواد الاعظم اور الجماعۃ کا مصداق

ان الفاظ کی تفسیر میں صاحب معتصم نے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں۔ ہمارے خیال میں حدیث کے گزشتہ الفاظ ہی اس کی تشریح کے لئے کافی ہیں یعنی جماعت اور سواد اعظم سے وہی جماعت اور وہی سواد اعظم مراد ہے جو ما انا علیہ واصحابی (یعنی کتاب و سنت) کی متبع ہے۔ اگر ان مبہم الفاظ کا ظاہر مراد ہو تو یہ ہوگا کہ اہل باطل کی کثرت حق پر ہونے کی علامت ہے۔ وہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو اور صرف وہی جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے طریق کا بھی احترام کرنے والی ہو۔ اگر کوئی جماعت صرف آپ کے طریقہ کا احترام کرتی ہے لیکن صحابہ کے طریق کا احترام نہیں کرتی تو وہ ان الفاظ کے مصداق سے باہر ہے۔ [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپ کے اصحاب کے مابین تفریق کا عقیدہ بھی ظاہر ہو چکا ہے۔

خدا نے تو صرف اپنے اور اپنے رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دی بلکہ رسول نے اپنے اور اپنے صحابہ کے مابین تفریق کو بھی گوارا نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اسی طرح رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ درحقیقت یہ انتہائی نادانی اور گمراہی ہے کہ جو جماعت حق اور اس کے رسول کے درمیان واسطہ ہے۔ اس کے اقوال و افعال کو ہم تک پہنچانے والی ہے، اسی پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اگر خدا کا رسول خود اپنی حیات میں ان پر اعتماد کر چکا ہے۔ بادشاہوں سے مقابل کی خاطر گفت و شنید انہی کی معرفت کی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ امت ان پر اعتماد نہ کرے۔ ایک عالمگیر دین جس جماعت سے نکلتا ہے اگر وہی جماعت ناقابل اعتبار ہے تو پھر آئندہ دور میں اس دین کا خدا حافظ۔

اسوۂ صحابہ کی اہمیت

اسی اہمیت کے پیش نظر مقتضائے بالا میں صحابہ کرام کی سنت کو ایک مستقل حیثیت دی گئی ہے ورنہ جس طرح رسول کا طریقہ خدا تعالیٰ کے طریقے سے جدا نہیں ٹھیک اسی طرح صحابہ کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے علیحدہ نہیں۔ اس لئے فرقہ ناجیہ کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ ان دونوں طریق کی جو بحقیقت ایک ہی ہیں اپنے اپنے مرتبہ میں بزرگی و احترام کی قائل ہو بلکہ اس راہ کا سالک بھی ہو۔ خوارج نے معرفت سنت رسول کو پایا اور صحابہ کی ایک جماعت کو کافر ٹھہرایا۔ یہ ان کے ناجی ہونے کی پہلی علامت تھی اور اسی کی طرف حضرت ابن عباسؓ نے بھی اپنے کلام میں اشارہ فرمایا تھا۔

حواریین اور صحابہ کرام کا مقابلہ

عیسائیوں کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت سے مقابلہ کرنے میں ناکامی رہی ہے اسی طرح حواریین اور آپ کے صحابہ کرام کے مقابلہ میں بھی ناکامی رہی ہے بلکہ ان کو حسرت ہے کہ اگر کہیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواری بھی آپ کے صحابہ کی طرح جانباز اور جاں نثار ہوتے تو اس طرح ان کا دین صدیوں گمنامی کے عالم میں پڑا نہ رہتا۔

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب عروہ قریش کی جانب سے شرائط صلح پر گفتگو کے لئے آتا ہے تو ان الفاظ میں صحابہ کی وفاداری کا نقشہ اس نے خود قریش کے سامنے کھینچا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک کافر کے قلب پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا وہ کہتا ہے۔

"میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن عاشقانہ عقیدت کا منظر یہاں دیکھا کہیں نہیں دیکھا۔ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو گردنیں جھک جاتی ہیں اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ نظر بھر کر کوئی شخص ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔ آپ کے وضو کا پانی اور آپ کا بلغم زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔"

اسی لئے جس قوم کے احساس محمود سی اور وفا شعاری کی داستانیں پڑھنے والے مسلم و کافر اس پر متفق ہیں کہ اس سے زیادہ اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کیا۔

صحابیت کا احترام نجات کی علامت ہے

الغرض چونکہ ایک صحابیت کے احترام ہی کا تو نتیجہ تھا اس لئے فرقہ ناجیہ کی ایک بڑی علامت صحابیت کا وقار و احترام ہی قرار دیا گیا ہے جو ان کا احترام نہیں کرتا وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا احترام نہیں کرتا۔ [1]

شانِ اجتماع حق کی علامت ہے

دوسری علامت جماعت کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتی ہے کہ ان میں شانِ جمعیت و وحدت نمایاں ہونا چاہئے۔ افتراق و تشتت جتنی دعا ان سے دور ہونا چاہئے اور سوادِ اعظم کے لفظ سے یہ سمجھنا ہے کہ وہ افراد بھی موقر ہونا چاہئیں کہ ان کا وجود ایک جماعت کی شکل میں بھاری با شوکت اور بارعب نظر آئے۔ چنانچہ عبداللہ بن مبارک سے جب دریافت ہوا کہ وہ جماعت کون ہے تو جواب میں ابوبکرؓ و عمرؓ سے شروع کر کے محمد بن ثابت اور حسین بن واقد کے دور تک پہنچ گئے جب ان سے کہا گیا کہ ان حضرات کی تو وفات بھی ہو گئی تو فرمایا کہ پھر ابو حمزہ السکری۔ [2]

افراد کی اکثریت معیارِ صداقت نہیں

یہ ایک بہت ہی عامیانہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی اکثریت مراد ہے غور کرنا چاہئے کہ دورِ فتن میں اہلِ حق کی اکثریت کب ہو سکتی ہے پھر اس اکثریت کو ہر حق و باطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دینا اور بھی نا فہمی ہے۔ اگر آج ایک طرف بے دینی و دہریت اور مذہبی حریت، فواحش و منکرات کی اکثریت موجود ہے تو کیا اس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو سوادِ اعظم کا معزز لقب دے کر فرقہ ناجیہ کا مصداق ٹھیرا لے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح اختلاف کی بحث میں بتلایا جا چکا ہے کہ اختلاف سے عقائد کا اصولی اختلاف مراد ہے اسی طرح "ما انا علیہ واصحابی" میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عقائد کے اصول ہی مراد ہیں۔ جو بحث و جدل کے موقعہ پر اس حدیث کو پڑھنا درحقیقت حدیث کی توہین کرنا ہے۔ حدیث لا تجتمع امتی علی ضلالۃ اگر کہا جائے سنداً درست ہو تو اس کی مراد بھی یہی ہے کہ امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ اس میں حق بالکل ہی باقی نہ رہے اور سب گمراہی پر متفق ہو جائیں بلکہ ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ یہاں بھی اکثریت کا فیصلہ مذکور نہیں ہے۔ دنیا میں اکثریت ہمیشہ حق کے خلاف ہوتی ہے مگر اس کی حقانیت کی یہ دلیل ہے کہ غلبہ آخر کار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو صحیح بخاری میں بالفاظ دیگر یوں ارشاد فرمایا ہے۔ لن تزال من امتی امۃ قائمۃ علی الحق لا یضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ۔

---

[1] [illegible] [2] [illegible] ج ۲ ص ۳۲۶۔

حدیث میں تمام امت کا تصور نہیں

روایت بالا میں حذوه الامت کا لفظ ہے مگر عمرو بن ہانی کی روایت میں "طائفة من امتی" اور یزید بن اصم کی روایت میں "عصابة من امتی" کا لفظ ہے جس کا یہ منشا ہے کہ یہ اوصاف جمہور امت کے نہیں بلکہ اس امت میں صرف ایک طائفہ و جماعت کے اوصاف ہیں۔ بلکہ ابن حزم تو یہ کہتا ہے کہ طائفہ لغت عرب میں بعض شے کو کہتے ہیں اس لئے طائفہ کا اطلاق ایک شخص پر بھی آ سکتا ہے۔ والطائفة فی لغة العرب یقع علی الواحد فصاعدًا [1]

امام بخاری جزم کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ طائفہ اہل علم کا طائفہ ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ اہل حدیث ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ امام احمد کی مراد اہل سنت ہیں ان منقول الفاظ کا خلاصہ ایک ہی ہے۔ اہل حدیث اور اہل علم اور اہل سنت ایک ہی معنی کی مختلف تعبیریں ہیں بعض نافہم اس کو بھی اختلاف سمجھ لیتے ہیں۔ صاحب موافقات نے جلد رابع میں اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

اقوال مفسرین اور الفاظ شارحین حدیث میں اکثر اختلاف عبارت ہوتا ہے اسے اختلاف حقیقت نہ سمجھا جانا چاہئے۔

ما کان ظاہرہ الخلاف ولیس فی الحقیقة کذلک	یعنی جو بظاہر میں اختلاف نظر آئے لیکن در حقیقت اس میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ بصورت زیادہ تر کتاب و سنت کی تشریحات میں نظر آتی ہے تم دیکھو گے کہ
واکثر ما یقع ذلک فی تفسیر الکتاب والسنة فتجد للمفسرین ینقلون عن السلف فی معانی الفاظ الکتاب اقوالا مختلفة فی الظاہر فاذا اعتبرتہا وجدتہا تتلاقی۔ [2]	مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کی شرح میں مختلف اقوال نقل کرتے ہیں لیکن جب ان کو بغور ملاحظہ کرو گے تو ان سب کا نقطہ نظر ایک ہی ثابت ہوگا صرف الفاظ مختلف ہوں گے۔

حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کو مفصل لکھا ہے۔ دیکھو توجیہ النظر۔

بہرحال یہ ایک طویل بحث ہے ہم نے یہاں ضمنی فائدہ کے طور پر صرف تنبیہ کر دی ہے کہ اگر اس کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو دین میں اختلافات کا بہت بڑا باب جو ہماری نافہمی سے اختلاف کی صورت میں نظر آ رہا ہے بند ہو جاتا ہے۔ ما انا علیہ واصحابی، الجماعة، السواد الاعظم، اسی سلسلہ کی ایک مثال ہے، یہاں بھی سواد اعظم اور جماعت سے وہی طائفہ مراد ہے جس کو ذکر بالا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس طائفہ کے اوصاف پر غور کرنے سے اس کے سواد اعظم فرمانے کی وجہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حدیث بالا یہ کہتی ہے کہ مخالف کا ولولہ اور ناسازگاری احوال کے باوجود یہ جماعت خدا کے دین پر قائم رہے گی، اور یہ جماعت اپنے عزم و استقلال اور حوصلہ پر اتنی بھاری ہوگی کہ مخالفین کی مخالفت ان کو اپنے جادہ مستقیم سے ہٹا نہ سکے گی گویا اگر ایک طرف

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴، ص ۹۰۔ [2] ج ۴ ص ۲۰

اب سوچو کہ فرقہ ناجیہ کی اس سے زیادہ صاف تشریح اور کیا ہو سکتی تھی اور اسی لئے جب تک عہد نبوت اور عہد صحابہ باقی رہا ایسا اختلافات میں رونما نہ ہوئے لیکن جونہی آپ کا عہد باسعادت اور صحابہ کا دور مسعود ختم ہوا تو "ما انا علیہ و اصحابی" کی وہ کھلی ہوئی بات ایک معمہ بن کر رہ گئی حتی کہ جس قدر اس زمانہ کو بُعد ہوتا گیا اختلافات کی خلیج اسی قدر زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ لہٰذا ہر باطل سے باطل اور منحرف سے منحرف یہ دعوی کر رہا ہے کہ "ما انا علیہ و اصحابی" کا مصداق وہ ہے لیکن اب یہاں نہ صحابہ ہیں نہ ان کے دور کے دیکھنے والے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا۔ ایک جماعت خدا کی صفات کی ہی سرے سے منکر ہے اور وہ اپنی توحید اسی کا نام رکھتی ہے معتزلہ سمجھتی ہیں کہ اہل توحید و عدل وہی لوگ ہیں۔ مشبہ سمجھ رہے ہیں کہ صفات پر صحیح ایمان صرف ان کو حاصل ہے اور ہر ایک کے پاس دلائل ہیں اور وہی قرآن و سنت ہے غرض ہر ایک کا گمان یہی ہے کہ فرقہ ناجیہ اسی میں منحصر ہے۔ بہرحال یہی صورت حال متحقق ہونے کے بعد اب یہ مشترک الفاظ بھی صرف ایک رسہ کشی کا میدان بنے ہوئے ہیں اسی کو سورۂ روم میں ارشاد فرمایا تھا۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ — ہر پارٹی اپنے اپنے حال میں مست ہے۔

منحرف جماعتیں دعوی حقانیت میں دلیر ہوتی ہیں

گویا منحرف جماعتوں کا یہی ایک خاصہ بن کر رہ جاتا ہے کہ غور و تفکر کی بجائے انہیں صرف اپنی حقانیت کا زعم باطل ہو جاتا ہے۔ عالم اختلاف کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ — یعنی یہ اختلاف اسی طرح باقی رہے گا الا ماشاء اللہ عالم کو اسی اختلاف کے لئے پیدا کیا ہے۔

حدیث قرطاس میں ایک اہم تنبیہ

اسی لئے شاید وفات کے وقت کوئی ایسی بات آپ لکھتے لکھتے رہ گئے تھے اگر کہیں وہ لکھ دی جاتی تو امت میں اختلاف کا خطرہ مستقل مٹ جاتا۔

هلموا اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده — لاؤ میں لکھ دوں ایسی بات کہ جس کے بعد پھر کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

اگر کہیں یہ کتاب قید کتابت میں آ جاتی تو ممکن تھا کہ امت کی امت لا یزالون مختلفین سے نکل کر سب الا من رحم ربک کے نیچے داخل ہو جاتی مگر آخر کار تقدیر غالب آئی اور ایسے حالات رونما ہو گئے کہ تحریر ہو ہی نہ سکی[1]

تقدیر ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تمناؤں کا ساتھ نہیں دیتی

ایک مرتبہ آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ شب قدر کا صاف صاف علم بتلا دیا جائے۔ مگر مسجد نبوی میں کچھ شور سا ہو گیا آخر وہ علم بھی اسی طرح مستور ہو گیا یہاں بھی کچھ قصد مبارک تھا کہ کوئی ایسی بات بتلا دی جائے کہ آئندہ تفرقہ کا اندیشہ ہی نہ رہے مگر یہاں بھی کچھ شور ہو گیا آڑے آگیا

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۴۰۔

وہ تو سنت جاریہ کا قانون رہ گیا۔ عالم تقدیر و تکوین کا تماشا بھی قابل دید ہے کہ اگر عالم تدبیر نے کبھی وحدت اجتماعی کے لئے زور لگایا بھی تو اسی وقت پردۂ غیب سے کسی نادیدنی ہاتھ نے اس کا سارا کھیل بگاڑ کر دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر قلم بھی خاموش ہو جاتا ہے۔ قلم اینجا رسید و سر بشکست

تقدیر اسباب کے پیچھے ہے تابع اسباب نہیں

خیر و شر دو متضاد قوتیں ہیں جب ایک ابھرے گی تو دوسری مغلوب ہو جائے گی۔ قدرت خود انہیں تیار کیا کرتی ہے۔ جتنا اسباب یہاں شکست و فتح کی دھن میں لگا رہتا ہے وہاں یہ منظور ہی نہیں کہ میدان کسی فریق کے ہاتھ میں یکطرفہ آجائے اس لئے شکست و فتح کا نزول باری باری کھیلتا ہی رہتا ہے۔ اور یہ بازی اس وقت تک برابر کھیلی جائے گی جب تک کہ عالم اختلاف گرما ہوا رہتا ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض۔

گویا نظام قسمت کی طرح وہ بھی اس کا ایک نظام ہے کہ صوامع و بیع و مساجد کے اختلاف کو باقی عالم پر چلائے رکھے۔ اسے اگر کوئی طاقت اس کے برخلاف ابھرے تو اس کے مقابلہ کے لئے خود سامنے آکر ان کو اپنے مقصد پورے کرے جس کے بعد کسی کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو نہ سکے۔ اس اختلاف کی آبادی کے لئے دنیا مشغول جنگ رہتی ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ جنگ اسباب سے ہوتی ہے قدرت کہتی ہے کہ اسباب بنا لیتی ہے۔ یہاں اگر قدرت کا ہاتھ نہ ہوتا تو لیجئے ایک پارٹی نے غلبہ پا کر دوسری کو فنا کر دیا ہوتا اور چونکہ عالم اختلاف کی فطرت کے خلاف اس کو مٹنے کا حق نہیں ہے اس لئے آج بھی قائم ہو رہا ہے۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ عالم تشریع و عالم تقدیر کے مابین ہمیشہ مطابقت ضروری نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسے بادبان یوسف کو چشم زخم نہ لگنے کی تدابیر کرتے جاتے ہیں مگر تقدیر ہے جس کے مقدر میں جیل خانہ لکھ دیا ہے وہ جیل جا کر رہے گا۔

حدیث کی صاف صاف تشریح کے بعد اختلاف عالم تکوین کے ماتحت ہے

الحاصل اگر ما انا علیہ واصحابی کے صاف صاف ثابت ہونے کا آپ مطلب سمجھتے تھے کہ اس فیصلہ کے بعد اختلاف کا تخم ہی دنیا سے مٹ جائے گا تو آپ نے غلط سمجھا تھا اور اگر شریعت کے سر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ اس نے فرقہ ناجیہ کی کوئی صحیح تفسیر نہیں کی تو یہ اس سے زیادہ غلط سمجھے ہیں۔ عالم تشریع ہمارا یہی کھلی کھلی باتیں آپ کے سامنے بیان کر کے رہیگا مگر عالم تکوین شبہات کے گرد و غبار اڑا کر اس کو تاریک و مکدر بنا دے گا۔ اب سلسلۂ اسباب میں ہمارا حق تلاش کرنے کی جنگ سدا جاری رہے گی۔ اگر آپ کا نام "الا من رحم ربک" میں درج ہو چکا ہے تو ہر راہ سب سے زیادہ صاف آپ کو نظر آنے کی حدیث یہی ما انا علیہ واصحابی کی راہ ہوگی۔ اور اگر خدا نخواستہ اس فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے تو یہ تنگی بھی آپ کو پیارا اسلام ہوگا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ	سو جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ	اس کا سینہ اسلام کے لئے اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے
يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا	کر دیتا ہے اس کے سینہ کو بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے
كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۔	چڑھتا ہے آسمان پر ۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تدبیر کو چھوڑ کر آپ کو تقدیر کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں بلکہ اختلاف کا مفہوم اور اس کے اسباب فرق ہائے متعددہ کی شناخت پر بالتفصیل بحث کر کے آخر میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہاں اختلاف کے ان اسباب ظاہرہ کے ساتھ خاص طور پر اس کا ایک تکوینی سبب بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ولذلک خلقہم سے اشارہ فرمایا ہے اور یہیں سے اس افتراق کو دیکھ کر یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ حدیث کے قصور بیان کا ثمرہ ہے۔ بیان تو اتنا واضح ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے مگر چونکہ خطاب تکلیف علیحدہ ہے اور خطاب تقدیر علیحدہ اس لئے کبھی کبھی ایک صاف راستہ بھی چیستان بن کر رہ جاتی ہے مگر آج بھی کوئی شخص "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ معلوم کرنا چاہے تو اس کے لئے روایات کھلے ہوئے ہیں یہی اشکال یہ نہیں ہے کہ فرقہ ناجیہ مبہم ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے روایت کے جو اسباب ہیں خواہش نفس اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ بقول اکبر مرحوم

اللہ کی راہیں سب پہ کھلی آثار و دلائل سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو بحث بیان کی گئی ہے وہ حدیث کے منطوق کے مطابق کی گئی ہے۔ ایک مورخ کو حق ہے کہ وہ تاریخ کے مطابق اسباب اختلاف بتائے۔ اصحاب تاریخ کا خیال ہے کہ ابتداء میں سیاست و مذہب مدغم تھے اس لئے سیاسی تحریکات سب مذہبی رنگ میں ہی نمایاں ہوتی تھیں اس وقت ان دونوں عناصر کی تحلیل بہت ہی مشکل تھی پھر جب قومیت نے ملکی جذبات کی صورت حاصل کر لی تو اس وقت سے سیاست کو مذہب کا جامہ پہننے کی ضرورت نہ رہی اس لئے مورخین نے مذہبی اختلافات کو سیاسی اختلافات کی بنیاد قرار دیا ہے مگر بنظر غور اگر آپ اس بنیاد کی بھی کوئی بنیاد تلاش کریں گے تو وہ اسباب پائیں گے جن کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔

حجیتِ حدیث

انکارِ حدیث کے فتنہ کا آغاز

اسلام میں تقریباً دو صدی تک صحیح احادیث کو بلا تفصیل متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ معتزلہ[1] ظاہر ہوئے ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا انھوں نے حشر و نشر، رویتِ باری تعالیٰ، صراط، میزان، جنت و جہنم اور اس قسم کی اور احادیث کو قابلِ تسلیم نہ سمجھا اور اپنے اس عقلی فساد کی وجہ سے اخبارِ متواترہ کے سوا تمام احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور بہت سی قرآنی آیات میں جو اپنے مذاق کے خلاف دیکھیں تاویلیں کر ڈالیں۔

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ

"اہلِ سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ تمام فرقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابلِ حجت سمجھتے رہے یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے تو انھوں نے اس اجماع کے خلاف کیا۔"[2]

سب سے پہلے امام شافعی نے رسالہ میں اور کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس خیال کی تردید کی۔ امام احمد نے بھی اطاعتِ رسول کے اثبات میں مستقل ایک جزء تصنیف کیا اور احادیث و قرآن سے مخالفین کی تردید کی جس کا ایک حصہ حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے۔ اس کے بعد امام غزالی، ابن حزم اور حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے المستصفیٰ، الاحکام اور الروض الباسم میں اس کے خلاف مقالات لکھے حتیٰ کہ پھر اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کا یہ ایک مستقل موضوع ہی بن گیا۔ متاخرین میں حافظ سیوطی نے بھی ایک مستقل جزء اس پر تالیف کیا۔

معتزلہ کا یہ فتنہ ایک علمی فتنہ تھا اس لئے انکارِ حدیث میں انھیں بہت کچھ لیپ پوت کرنا پڑا یہاں تک کہ ان میں ایک جماعت نے یہ تصریح کی کہ خبرِ واحد اگر عزیز ہو جائے (یعنی اس کے راوی اول سے آخر تک ہر طبقہ میں دو دو ہوں) تو چونکہ مفیدِ یقین ہو جاتی ہے اس لئے حجت ہو جائے گی۔ حافظ ابن حجر نے ابو علی جبائی معتزلی کا نقل فرمایا کہ حدیث کی صحت کے لئے اس کا عزیز ہونا شرط ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکارِ حدیث سے ان کا

---

[1] علامہ جزائری لکھتے ہیں کہ اگرچہ لوگوں میں یہ بہت مشہور ہے کہ معتزلہ کا مذہب علمِ فلسفہ میں توغل کی وجہ سے پیدا ہوا لیکن یہ قول مہمل ہے کیونکہ ان کا مذہب صحابہ کے آخری عہد ہی میں ظاہر ہو چکا تھا حالانکہ اس وقت تک فلسفہ کی کسی کتاب کا عربی ترجمہ ہو کر منظرِ عام پر [illegible] ہمارے نزدیک اگر یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی فلسفی تربیت کے لئے کتابی ذریعہ کی کوئی ضرورت نہیں [illegible] ان کے خیالات و شبہات [illegible] ہو چکا تھا مگر عام کتب کے ترجمے نہ ہوئے تھے۔ [2] الاحکام ج ۱ ص ۱۰۰۔ [3] ج ۲ ص ۱۴۔

ایک قدم مزید آگے بڑھا جا سکتا ہے مگر صرف اتنی بات تسلیم کر لینے سے حق صداقت ادا نہیں ہوتا۔

ہم نے ہر فریق کے دلائل کو بنظر انصاف دیکھا ہے مگر جہاں تک دعوے کے مثبت پہلو میں کسی فریق کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نظر نہیں آئی۔ البتہ منفی پہلو میں صرف چند شکوک و شبہات ہیں جنہیں ہر فریق نے دلائل کا رنگ دے کر پھیلا دیا ہے۔ زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ شبہات اہل سنت کی کتابوں سے ہی ماخوذ ہیں اور اُن ہی کتابوں میں ان کے جوابات بھی مذکور ہیں مگر منکرین حدیث نے نہ ان کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے اور نہ اُن جوابات کو نقل کر کے کوئی تردید کی ہے۔ مولانا اسلم صاحب اور ان کے دوسرے ہم خیال صاحبان کا یہ طریقہ ایک علمی سرقہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک منکرین حدیث کے تمام طویل و عریض بیانات میں صرف دو باتیں قابل توجہ ہیں اور یہی ہیر پھیر کر ان کے تمام بیانات کا خلاصہ بھی ہیں۔

(۱) قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے اس لئے دینی ہدایت کے لئے خود کافی ہے حدیث کا محتاج نہیں۔

(۲) قطعی دین کی بنیاد ظنیات پر قائم نہیں کی جا سکتی اور احادیث کا تمام ذخیرہ ظنی ہے۔

مولانا اسلم صاحب نے بھی احادیث نبوی کے ظنی اور غیر معتبر ہونے پر "علم حدیث" کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ہمارے نزدیک احادیث کی ظنیت و قطعیت پر مولانا کی یہ بحث ان کے نقطۂ نظر سے ہی غلط بلکہ دوسروں کو بھی مغالطے میں ڈالنے والی بات ہے کیونکہ مولانا موصوف کے نزدیک احادیث موجودہ کا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہی نہیں آپ نے صرف قرآن کی تبلیغ کی ہے اور اسی پر عمل کر کے امت کو دکھلا دیا۔ دین کے یہی دو رکن ہیں جو امت میں دونوں تواتر سے ثابت ہیں۔ اس کے سوا دین کے معاملہ میں آپ نے کبھی کوئی اشارہ نہیں فرمایا۔ اگرچہ یہ خیال بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ جب حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے متعلق قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور ہدایت صادر ہی نہیں ہوئی تھی تو یہ حدیث کی یہ دنیا کہاں سے پیدا ہو گئی۔ امت کے سب سے برگزیدہ اہل علم و فضل، صاحب تقویٰ و دیانت، صاحبان نے احادیث کا یہ سارا لٹریچر صرف ہوا پر کیسے تعمیر کر دیا اور محض ایک قلعہ نہیں بلکہ علمی فن کی بنیاد رکھ دی یہاں تک کہ احادیث اور اسماء الرجال کے حفاظ بن گئے۔ مفت سر درد کیا! اس لئے منکرین حدیث کو دو باتوں میں سے ایک بات صاف طور پر کہہ دینا چاہئے یا تو صاف اقرار کر لینا چاہئے کہ احادیث نبوی نہ تو تشریعی حیثیت رکھتی ہیں نہ تاریخی بلکہ اُن تمام جھوٹوں میں سے وہ بدترین جھوٹ ہیں جو دنیا کے پردہ پر کبھی نہیں بولے گئے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ۔

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ افترا باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کوئی وحی نہیں بھیجی گئی۔

دوسری صورت میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ارشاد فرمایا تھا اور امت نے اسے ضائع کر دیا تو یہ بھی اقرار کرنا چاہئے کہ دین محمدی کا بھی ایک حصہ یہودیت و نصرانیت کی طرح ضائع ہو گیا اور اب اس میں سے صرف قرآن کریم باقی رہ گیا ہے۔ یہ کہنا کہ احادیث چونکہ عہد کے بعد میں مدون ہوئی ہیں اس لئے یقین کو نہیں پہنچیں اور اسی لئے قابل حجت نہیں ہو سکتیں۔ اس کا اقرار کر لینا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احادیث ارشاد تو فرمائی تھیں مگر وہ چند در چند وجوہ سے قابل اعتبار نہیں رہیں۔ یہ مولانا کے مسلک کے خلاف ہے۔ ان کے نزدیک احادیث موجودہ سب اباطیل و مزخرفات کا مجموعہ ہے جسے محدثین نے اور دیگر حفاظ نے محض حسن ظن سے یا عمداً جھوٹ بول کر گھڑ کر ترتیب دے دیا ہے۔ اعاذنا اللہ

قرآن کریم کی جامعیت | تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم ایک جامع اور کامل کتاب ہے قائلین حدیث بھی منکرین حدیث سے بڑھ کر اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن نقطۂ بحث یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کیا احادیث کے ثبوت اور حجیت کے خلاف ہے؟ اس کے صحیح معنی کیا ہیں اس کی جامعیت احادیث نبویہ پر نظر کرنے کے بعد ہی متعین ہوتی ہے۔

قرآن کریم کی جامعیت کا یہ مفہوم تو غالباً کسی کے نزدیک بھی نہ ہو گا کہ وہ تعلیم و توضیح کا محتاج نہیں۔ اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال، کسی عموم میں کوئی تقیید، کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں۔ کہ نماز و وضو کے اسباب و نوافل کی تمام تفصیلات اس میں مذکور ہیں ہر باب کے غیر متناہی جزئیات کا اس نے احاطہ کر لیا ہے۔ فرائض، واجبات، مستحبات سنن کی تمام حدود اس نے قائم کر دی ہیں حتی کہ بحث و نظر کے لئے اب اس نے کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا کسی کتاب کے کامل ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے یا عقلاً ایسا ہونا ممکن بھی ہے اگر جواب نفی میں ہے تو قرآن کی جامعیت کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال کسی عموم میں کوئی تقیید اور کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں رہا حتی کہ وہ اپنے معنی و مراد حاصل کرنے میں رسول کے بیان کا بھی محتاج نہیں۔ اگر درحقیقت قرآن کی جامعیت اور اس کی وضاحت اسی درجہ کی تھی تو رسول کی بعثت بے فائدہ تھی۔ قرآن کریم براہ راست اتار دیا جاتا اور ہر شخص خود اس سے مستفید ہو سکتا۔ لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کے لئے رسول کی بعثت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ رسول کے واسطے کے بغیر کتاب اللہ بھی نہیں مل سکتی خدا کا فرشتہ اس کی کتاب کی پہلے رسول کو تعلیم دیتا ہے پھر رسول کا یہ منصب ہوتا ہے کہ وہ خدائی اور مخلوق کو اس کی تعلیم دے۔ علمه شدید القوی ذو مرة۔ حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بڑا مقصد قرآن کریم کی تلاوت و تعلیم ہی قرار دیا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ	بیشک بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر کہ بھیجا ان میں رسول انہیں میں کا
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	جو پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور عقل کی باتیں۔

بعثت رسول کے تین اہم مقاصد

یہاں رسول کی بعثت کے تین اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں (۱) تلاوت کتاب (۲) تزکیہ (۳) تعلیم۔ تلاوت کتاب بظاہر تو سب سے ہلکا اور ادنیٰ مقصد نظر آتا ہے بالخصوص عرب اہل زبان کے لئے مگر اس کی اہمیت کا اندازہ صرف آپ کی اس دعا سے کیا جا سکتا ہے جو آپ نے تلاوت کی توسیع کے متعلق فرمائی تھی آپ نے فرمایا اے اللہ میری امت امی ہے اگر ان پر قرآن کی تلاوت صرف ایک نہج پر لازم کی گئی تو ابتدائی حالات میں یہ ان کے لئے بڑی دشواری کا موجب ہو جائے گا۔ اس لئے کچھ اور توسیع نازل فرما یہ درخواست آپ نے اس وقت تک برابر جاری رکھی جب تک کہ سات حروف تک تلاوت کرنے کی اجازت حاصل نہ کر لی اگر کہیں رسول نے قرآن کی خود تلاوت کر کے نہ بتایا ہوتا تو معلوم نہیں کہ عرب اور بالخصوص عجم کے تلاوت میں کتنے نقائص باقی رہ جاتے آج امت نے اس کی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم کی صحیح طور پر تلاوت کرنے کے لئے مستقل ایک فن مدون کر دیا ہے۔ منکرین حدیث کو شاید یہ بھی قرآن کی جامعیت اور اس کے تیسیر کے خلاف معلوم ہوتا ہوگا۔

تعلیم و تزکیہ

یہ بات درست ہے کہ قرآن کریم کے اولین مخاطب عرب تھے جو خود اہل زبان تھے مگر کسی کتاب کی مراد سمجھنے کے لئے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی۔ بسا اوقات مصنف کی مراد محاورات کے توسعات، اشتراک و ترادف، مجاز و کنایات کے پردوں میں پوشیدہ رہ جاتی ہے جبکہ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی شرح و بسط کی محتاج سمجھی جاتی ہے۔ دیوان غالب اردو کا ایک دیوان ہے اس کی ادبیت بھی ضرب المثل ہے اس کا مرتب بھی شعراء کی سب سے پہلی صف میں شمار ہوتا ہے لیکن جب غالب دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کے کلام کی مراد بلا واسطہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تو اب ان کا دیوان لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے تختہ مشق بن گیا صوفی مزاج نے یہی چاہا کہ ان کے کلام میں تصوف بھر دیا۔ نہ شرب سے شراب کا لفظ دیکھ کر مستی و کیف کے سامنے نقشے کھینچ دیئے فلسفی مزاج نے تو موشگافیاں ختم کر ڈالیں لیکن غالب کی صحیح مراد کے موافق شاید کوئی شرح بھی نہ لکھی گئی ہو۔ اگر پوچھا جائے تو وہاں سے شاید یہی جواب دیں گے ؎

ہر کس از ظن خود شد یار من وز درون من نجست اسرار من

جب ایک انسان کی تالیف کا حال یہ ہے تو اب انصاف کیجئے کہ اگر قرآن بھی اسی طرح لوگوں کی طبع آزمائی کا میدان بنا دیا جاتا تو اس کا حشر کیا ہوتا۔ عرب اس وقت اگرچہ زبان دانی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر ہونا سے گذر رہا تھا تو قرآن بھی اعجاز کے بلند سے بلند مرتب طے کر کے آیا تھا۔ یہ اعجاز صرف اس کے الفاظ تک محدود نہ تھا اس کے معانی میں بھی موجود تھا۔ وہ ان کے پاس ہدایت کے ایسے علوم لے کر آیا تھا جو نسل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن تھے۔ تاریخی واقعات اور ملی نزاعات میں اس کی حیثیت حکم کی تھی وہ مبدأ و

تو اب اس کی سوا اور کیا صورت تھی کہ خدا کا رسول خود آکر اس کی تعلیم دے پہلے خود پڑھے پھر انھیں پڑھ کر سنائے جب وہ الفاظ کی تصحیح سے فارغ ہو لیں تو اس کے بعد خدا تعالیٰ کی مراد بتلائے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنے کی ایسی مشق بہم پہنچا دے کہ ان کے جوارح جنبشِ عمل کے لئے بے چین ہو جائیں تو اس طرح بہت جلد انھیں اسلام کے پاکیزہ خیالات اور خالص اعمال سے مزین کر کے کفر کی ظلمتوں سے باہر نکال دے۔

اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعہ جلد جلد انھیں تعلیم و تزکیہ کے مراحل سے نہ گزارتا تو یقیناً وہ مدت العمر اس کی مراد حاصل نہ کر سکتے۔ کتاب اللہ جو خالص عمل کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی وہ صرف [illegible] لفظی کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتی اور خدا کی مخلوق ان تمام ترقیات و مدارج سے محروم رہ جاتی جو اعمالِ اسلام کے صلہ میں ان کے لئے موعود تھیں یہ اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا احسان کیا کہ اپنی مراد کی تلاش ان کے ذمے نہیں ڈالی بلکہ ان میں سے ایک رسول بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی پھر اس کتاب کی مراد سمجھنے کا بار بھی ان کے اُمّی دماغوں پر نہیں ڈالا بلکہ عالم کا سب سے بڑا معلم اس کی تعلیم کے لئے بھیجا اُس نے پڑھایا، سمجھایا اور اگر انھیں کوئی شبہ پڑا تو نہایت سہولت سے اسے حل بھی کر دیا اور اس طرح ان کی ہدایت کا راستہ بہت مختصر کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی جد و جہد سے اس پر عمل کرنے کے لئے انھیں مضطر بھی کر دیا اور بہت جلد ان کی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ وہ اپنی آبائی وراثت یعنی جنت سے محروم ہو جانے کے بعد پھر اس کے مستحق و مالک بن گئے۔

آیاتِ قرآنیہ میں صحابہ کے چند شبہات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات

یہاں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی چند خالص علمی مثالیں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ صحابہ کرام کو بھی قرآن مجید میں شبہات پیش آجاتے تھے اگر کہیں وہ دور نہ کئے جاتے تو پھر معلوم کہ کس رنگ میں ..... کسی عالم تک یہ پہنچتے

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ۔ (جو لوگ ایمان لائے پھر انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) تو صحابہ کرام گھبرا گئے اور دربارِ رسالت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہم میں ایسا شخص کون ہے جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی ظلم یا معصیت نہ کی ہو پھر اس آیت کے بموجب تو ہم میں کوئی بھی امن اور ہدایت کا مستحق نہیں رہتا آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے ہر معصیت مراد نہیں ہے بلکہ خاص شرک مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں شرک کو ظلم ہی سے تعبیر فرمایا گیا ہے إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (شرک بہت بڑا ظلم ہے) یہ جواب سن کر صحابہ کے دل مطمئن ہو گئے اور ان کا تردد جاتا رہا۔

(۲) ایک مرتبہ آپ نے فرمایا قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھو کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اس پر ایک بی بی نے عرض کیا یا رسول اللہ قرآن تو کہتا ہے فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ (جس شخص کا اعمالنامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا۔) یہاں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہلاک نہ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا حساب یسیر کے معنی عرض کے ہیں یعنی اعمالنامہ ان کے سامنے رکھ کر ان کو صرف جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر بازپرس نہ ہوگی۔ اس کے سوا اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تھا تو بیشک اس کی خیر نہیں۔ (صحیح بخاری) یہ سن کر ان کا شبہ رفع ہو گیا۔

(۳) جب روزہ کے احکام میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ۔ (کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے) تو عدی بن حاتمؓ نے دو دھاگے ایک سفید اور دوسرا سیاہ لے کر اپنے تکیہ میں رکھ لئے اور شب میں ان دھاگوں کو دیکھتے رہے جب دونوں کا رنگ نظر آنے لگا تو انہوں نے کھانا پینا بند کیا۔ آپ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں یہاں سفید اور سیاہ دھاگے مراد نہیں بلکہ شب کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ اس کے بعد رفع غلطی کے لئے آیت میں مِنَ الْفَجْرِ کا ٹکڑا اور نازل ہو گیا کہ پھر اس غلطی کا اعادہ نہ ہو۔

(۴) بعض صحابہ کو آیت مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (جو شخص کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا) بڑا شبہ ہوا کہ پھر انسان سے کوئی نہ کوئی قصور تو ہو ہی جاتا ہے لہٰذا اس آیت کے موافق ہر شخص کے لئے عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں بدلہ سے جہنم کا عذاب سمجھنا ٹھیک نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو انسان کو دنیا میں پہنچتی ہے وہ بھی اس کی فروگذاشت کا بدلہ بن جاتی ہے۔

ہرچند کہ منکرین حدیث کے سامنے احادیث سے کوئی بات ثابت کرنا بے سود ہے مگر یہاں ہماری غرض ان احکام کا اثبات نہیں بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ صحابہ کرام کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود۔ قرآن کریم میں کچھ شبہات پیش آئے ہیں جنہیں اگر وہ بلاواسطہ صاحب رسالت کو حل نہ کرتے تو نہ معلوم ان آیات کی مراد سمجھنے میں کتنی الجھنیں پیش آتیں۔ کیا کوئی شخص صرف اپنی عقل کی مدد سے یہ تعیین کر سکتا ہے کہ سوال اول میں ظلم سے شرک مراد ہے یا سوال نمبر ۲ میں حساب یسیر کے معنی اعمالنامہ سامنے رکھ دینے کے ہیں یا سوال نمبر ۴ میں جزا سے دنیوی تکالیف مراد ہیں۔ پہلی آیت عقائد دوسری معاد اور تیسری جزا و سزا سے متعلق ہے۔ یہ تینوں باب صرف ایک غلطی کی وجہ سے خدا جانے کتنی تاریکی میں پڑے رہتے۔

مزید براں قرآن فہمی کے لئے یہ مراتب ہیں کہ بعض مرتبہ چھوٹوں کا ذہن ایسی بات کی طرف منتقل ہو جاتا تھا کہ بڑوں کا ذہن اس طرف نہ جاتا تھا مثلاً سورۃ اذا جاء نصر اللہ میں ابن عباسؓ کا یہ سمجھنا کہ اس میں آپ کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے یا ایک عورت کا حضرت عمرؓ کے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کو تسلیم نہ کرنا اور یہ کہنا کہ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا سے معلوم ہوا کہ اگر مہر زیادہ بھی مقرر کیا جائے تو جائز ہے۔ جس قرآن فہمی میں یہ شبہات اور فہم کے یہ مراتب ہوں وہ رسول کے بیان کے بغیر کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگر قرآن کی مراد صرف عقل کے حوالہ کر دی جاتی اور رسول آکر خود اس کو بیان نہ کرتا تو علوم شریعت کا حال کیا بن جاتا۔

سوال نمبر ۳ سے یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ شبہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ منشاء شبہ خود کتاب اللہ میں بھی موجود ہو بلکہ بعض مرتبہ انسانی دماغ کسی مغالطہ میں پھنس کر خود کوئی شبہ پیدا کر لیتا ہے پھر اگر یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہو تو قابل رعایت نہیں ہوتا لیکن کسی حد تک معقول ہو تو اس کا جواب بھی دے دیا جاتا ہے شبہ کے ان مراتب کی تشخیص متکلم کی مرضی پر موقوف ہے اسی لئے قرآن کریم نے بہت سے شبہات کا جواب دے دیا ہے اور بہت سے شبہات کو ناقابل جواب سمجھ کر جواب کی طرف توجہ نہیں کی۔

قرآن کریم کے مضامین کے متعلق بعض تشریحی سوالات

یہ قرآنی مشکلات کی چند مثالیں تھیں جو صحابہ کرام کو قرآن کی نص مراد سمجھنے میں پیش آئیں اب ان مشکلات کی چند مثالیں دیکھئے جو صحابہ نے قرآن کی بعض تفصیلات کے متعلق آپ سے دریافت کیں۔

(۱) قرآن کریم کہتا ہے کہ قیامت میں باری تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ صحابہ اہل زبان تھے رؤیت کا مفہوم ان کو معلوم تھا اس لئے رؤیت کے مفہوم میں انھیں کوئی مغالطہ نہیں ہوا انھوں نے اس کی پوری حقیقت سمجھ لی اور معتزلہ کی طرح اس کی کوئی تاویل بھی نہیں کی لیکن جو کچھ دشواری انھیں پیش آئی وہ صرف اس کی تفصیل سمجھنے میں تھی کیونکہ دنیا میں معمولی اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو باطمینان دیکھنا ممکن نہیں ہوتا، پھر قیامت میں جہاں اولین و آخرین کا بہت بڑا اجتماع ہوگا ایک خدا کی رؤیت کیسے ہوگی۔ بظاہر بہت سی گردنیں بلند کرنی پڑیں گی بہت سے کانٹے چبھ جائیں گے اور پھر بھی شاید سب اہل محشر برابر کی رؤیت سے فیض یاب نہ ہو سکیں۔ یہ تخیلات نہ رؤیت کے ثبوت کے متعلق ہیں نہ اس کی مراد میں بلکہ پورے وثوق کے بعد ان تفصیلات کے معلوم کرنے میں ہیں جن کے لئے ہر ایک مشتاق متلاشی رہا کرتا ہے۔ آپ نے نہایت سادگی سے فرما دیا کہ مخلوقات کے دائرہ میں بھی تم دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے ہیں۔ اس کا نمونہ کم ہی اس کا صرف ایک ہی کی تمام تر کائنات دنیا میں ان کی انتہائی عظمت کے باوصف جس طرح بلا مزاحمت تم ان دونوں کو دیکھا کرتے ہو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ اپنے رب کو محشر میں دیکھو گے جب مخلوقات کے

دائرہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک مثال نہیں بلکہ دو مثالیں ایسی موجود ہیں جہاں تمام عالم کو بیک وقت دیدار میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تو خالق کے دائرہ میں بھی جو اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ذات ہے کوئی دشواری نہ ہوگی۔ آپ کی اس مثال کے بعد آیت وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ اس دن بہت (لوگوں کے) منہ تروتازہ (شگفتہ) ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

(۲) ایک مرتبہ تقدیر کے مسئلہ میں صحابہ کرام کو یہ شبہ ہوا کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ لکھے ہوئے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جد و جہد کرنا بیکار ہے۔ (ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے کیوں نہ رہیں) آپ نے فرمایا اگر تم سعید لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اعمال صالحہ نہ کرو اور اگر خدانخواستہ تمہیں بد بختی کی طرف جا چکی ہے تو اعمال صالحہ کی ہزار کوشش کرو مگر تم کر ہی نہیں سکتے۔ تم سمجھے ہو کہ عمل کی جد و جہد کرنا تقدیر سے باہر بات ہے ایسا نہیں بلکہ تقدیر کا دستور اعظم جہاں جزا و سزا کو مرتب کرتا ہے ایسا ہی عمل خیر اور عمل شر کو بھی مرتب ہو چکا ہے لہٰذا عمل کئے جاؤ تم سے وہی عمل صادر ہوں گے جو تمہاری تقدیر کے موافق ہیں[1]۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۔ یعنی نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ ہی کے تیسیر سے میسر آتا ہے۔

(۴) يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (اس دن جبکہ زمین اپنی حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان دست ایزدی میں لپٹے ہوئے ہوں گے) صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ جب ایک طرف زمین اپنی موجودہ حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی لپیٹ دیئے جائیں گے تو اس وقت خدا کی یہ ساری مخلوق کہاں ہوگی فرمایا پل صراط پر۔

(۵) سورۂ والنجم میں جب اللہ تعالیٰ کے دیدار کا تذکرہ ہے تو صحابہ نے نہایت اشتیاق سے پوچھا یا رسول اللہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا کیسا تھا؟ فرمایا ایک نور تھا۔ عالم قدس کی تعبیر دنیا میں نور کے لفظ سے زیادہ واضح کسی اور لفظ سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اس پر نور کا اطلاق ایسا ہی ہے جیسا وادی ایمن کے نور پر نار کا اطلاق۔ وہ بھی دراصل ایک نور ہی تھا مگر اس وقت شکل نار نظر آ رہا تھا۔

(۶) صحابہ کرام نے جب یہ بار بار سنا کہ مرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ زندہ ہونا ہے تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مٹی ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر بعث سب سے زندگی کیسی ہوگی؟ فرمایا کبھی بارش سے قبل

---

[1] یہ جواب سن کر سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں آج سے عمل میں جتنی کوشش ہو سکتی ہے کروں گا۔ عجیب ہے کہ تقدیر کا مسئلہ سن کر صحابہ نے بجائے کاہلی کے مستعدی پائی۔ بنا بریں ہے۔ حضرت عمر سے بھی اس کے قریب الفاظ منقول ہیں۔

تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے کیسی خشک کیسی بے آب و گیاہ نظر آتی ہے پھر بارش کے بعد کیسی سرسبز و تر و تازہ
ہو جاتی ہے وہ تنکے جو اسی زمین پر مردہ پڑے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑنے کے بعد ہی کیسے اکڑتے ہوئے کھڑے
ہو جاتے ہیں کَذٰلِکَ تُخْرَجُوْنَ۔ اسی طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر جی اٹھو گے۔

(۷) قرآن کریم میں بے شمار آیتوں میں وحی کا لفظ آیا ہے عرب وحی کے لفظ اور اس کی عام شرح سے
تو واقف تھے لیکن وحی رسالت اور وحی نبوت کی تفصیل نہ جانتے تھے اس لئے آپ سے دریافت کیا گیا،
یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے اس کی جو لاثانی صورتیں بتائیں جو صحیح بخاری
کے پہلے ہی صفحہ میں مذکور ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو اس سے بھی بڑھ کر عین حالت وحی میں آپ کو دیکھنے کا
شوق دامنگیر ہوا۔ اس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا انہوں نے موقع پا کر فرمایا آ دیکھ لے۔ وہ آیا اور اس نے عین
وحی کی حالت میں آپ کو دیکھا اور اس طرح نزول وحی کی شدت جو کبھی پہلے سنا ہی کرتا تھا اب اپنی آنکھوں سے
مشاہدہ کر گیا۔

(۸) یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا۔ اس پر بعض اہل کتاب
نے صحابہ سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ہارون علیہ السلام کی بہن کہاں سے آگئیں حضرت
ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کا زمانہ تو ایک ہی زمانہ ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان
بہت بڑی مدت ہے۔ صحابہ سے اس کا جواب نہ آیا۔ آپ سے دریافت کیا آپ نے فرمایا: یہ بھی کوئی اعتراض ہے
ہر قوم اپنے پیغمبروں کے نام پر تبرکاً نام رکھتی چلی آئی ہے یہاں وہ ہارون نبی مراد نہیں بلکہ ان کے ہم نام
اور شخص مراد ہے۔

(۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے دریافت کیا آیت قرآنیہ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ
میں سبا کسی عورت کا نام ہے یا ملک کا۔ آخر تمام صحابہ جغرافیہ داں تو نہ تھے اُمی لوگ تھے ان کے دماغوں
میں یہ سوالات آنا کچھ بعید نہ تھا آپ نے فرمایا: نہ کسی عورت کا نام ہے نہ ملک کا بلکہ ایک شخص کا نام تھا
جس کی طرف عرب کے دس قبائل منسوب ہیں۔

(۱۰) وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔
اس پر بعض نے دریافت کیا شاید یہ اُن لوگوں کا حال ہے جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں اس لئے انہیں عذاب
کا ڈر ہوگا۔ آپ نے فرمایا: بلکہ یہ وہ نیک لوگ ہیں جو اعمال صالحہ کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کہ ان کے
یہ اعمال کہیں قیامت کے دن قبول نہ ہوں۔

(۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یہ تعویذ گنڈے اور مختلف قسم کی دوائیں،

کیا تقدیر الٰہی پلٹ دے سکتی ہیں۔ فرمایا نہیں بلکہ یہ بھی تقدیر کے احاطے میں داخل ہیں۔ جو دوا (ترکیب) ہے اس
متعلق تقدیری احاطے میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ شخص فلاں دوا کرے گا اور اچھا ہو جائے گا۔ اس مختصر جواب سے
یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے کہ کونین خود جراثیم ملیریا کے لئے مہلک ہے اس لئے اس کے استعمال سے بخار چلا جانا
ضروری امر ہے۔ ہر جگہ تقدیر کا مسئلہ اڑا دینا جہالت کی بات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا فرمانا درست ہے
مگر اس مہلک جراثیم کا استعمال کرنا نہ کرنا یہ بھی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس مرتبہ مثلاً وہ
جراثیم ہلاک نہ ہوں گے اس لئے بعض مرتبہ بیسیوں گرین کونین استعمال کر لینے کے بعد بھی یہ جراثیم فنا نہیں ہوتے
اسباب اور تقدیر میں مزاحمت نہیں اسباب کسی حد تک مؤثر ہیں مگر دائرہ تقدیر سے باہر نہیں۔

فروعی مسائل کے متعلق چند سوالات

اس کے بعد ہم یہاں چند مثالیں ایسی بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جو صحابہ کے بعض فروعی سوالات سے متعلق ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ صحابہ کا ایک دستہ جس کا گذران بیشتر سمندر کے کنارے پر تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا
اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ ہم لوگ اکثر سمندر میں سفر کرتے ہیں اور صرف پینے کے لئے تھوڑا سا پانی ہمارے
ساتھ ہوتا ہے اگر اس سے وضو کریں تو پیاسے رہیں کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا
کیوں نہیں اس کا پانی اور مردار دونوں پاک ہیں۔ سوال کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم میں جس پانی کی صفت طہور
بتلائی گئی تھی وہ بارش کا پانی تھا وانزلنا من السماء ماء طهورا (اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا
پانی اتارا ہے) کنویں کا پانی بھی در اصل یہی پانی ہوتا ہے جو جذب ہو کر زمین کی تہ میں محفوظ رہتا ہے۔ سمندر کا
پانی دوسرے قسم کا پانی تھا اس کا ذائقہ جدا اس کا رنگ جدا، پھر اس میں بہت سے جانور بھی مرتے کھپتے رہتے
ہیں اس لئے ابتدائی حالات میں یہ سوال بیجا نہ تھا آپ کے جواب سے وہ مطمئن ہو گئے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک کنواں بیر بضاعہ کے نام سے مشہور تھا اس کے
ذریعے چند کھیتوں کی آب پاشی بھی کی جاتی تھی چونکہ جنگل میں واقع تھا اس لئے جنگل کے کنووں کی طرح وہ
بھی محفوظ نہ رہتا تھا مزید برآں آب پاشی کی وجہ سے اس کا پانی اکثر نکلتا رہتا تھا۔ تاہم نظافت المزاج صحابہ کو
یہ سوال کرنا پڑا کہ وہ ایک ایسا کنواں ہے جس میں طرح طرح کی نجاستوں کا جا پڑنا بہت ہی قرین قیاس ہے
کیا اس کا پانی وضو کے قابل ہے آپ نے فرمایا وضو کرو جب تک نجاست کا اثر پانی میں نظر نہ آئے۔
(غیر محسوس) پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ قدرت نے جب پانی کو پاک پیدا کیا ہے تو جب تک کوئی دلیل ظاہر موجود نہ ہو
اس کے ناپاک کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر محض شبہات کی بنا پر پانی ناپاک کہہ دیا جائے تو عرب جیسی سرزمین پر
یہ حکم بڑی تنگی کا موجب بن جائے۔

(۳) حضرت ام سلمہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ میں اپنے بال سخت گوندھتی ہوں کیا جنابت سے غسل میں مجھے اپنے بال ہر بار کھولنا چاہئے؟ آپ نے فرمایا نہیں صرف تین بار پانی بہا لینا کافی ہے۔

(۴) ایک عورت نے اپنا دامن دراز کیا ہوا تھا جس میں مسجد کا راستہ ناصاف تھا۔ جب مسجد جاتیں تو دامن زمین پر گھسٹتا اس لئے ان کو وہم ہوا کہ شاید ناپاک ہو جاتا ہوگا۔ آپ سے عرض حال کیا۔ آپ نے فرمایا پاک کپڑا زمین پر گھسٹنے سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک اس میں ناپاکی کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔

(۵) ایک مرتبہ گھی میں چوہا گر گیا اور مر گیا۔ اس گھی کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا اگر گھی جما ہوا ہے تو چوہا پھینک دو اور اس کے ارد گرد کا گھی بھی پھینک دو بقیہ گھی استعمال کر لو۔ اور اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اب کھانے کے قابل نہیں رہا۔

(۶) آپ سے مردار کی کھال کے متعلق پوچھا گیا کیا اسے استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں دباغت اسے پاک کر دیتی ہے۔

(۷) آپ نے تین تین بار وضو کر کے فرمایا وضو اس طرح کرنا چاہئے اس سے زیادہ پانی بہانا پانی ضائع کرنا ہے۔

(۸) ایک بادیہ نشین شخص نے دریافت کیا ہم چار چار مہینے ریگستان میں رہتے ہیں پانی نہیں ملتا غسل کے موقعہ پر ہم کیا کریں آپ نے فرمایا تیمم کر لیا کرو تمہارے لئے یہی پاکی ہے۔

(۹) ایک شخص آپ کی خدمت میں نماز کے اوقات دریافت کرنے کے لئے آیا آپ نے فرمایا دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھو پہلے دن تمام نمازیں اول وقت ادا کیں دوسرے دن آخر وقت پھر فرمایا نماز کے اوقات دیکھ لئے یہ ہیں۔

(۱۰) ایک سائل نے پوچھا یا رسول اللہ دن رات میں وہ گھڑی کونسی ہے جس میں بندہ اپنے خداوند کے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے آپ نے فرمایا آخر شب۔

ہم نے مثال کے طور پر یہاں صرف دس دس سوال و جواب ذکر کئے ہیں حافظ ابن قیمؒ نے پورے ایک سو دس صفحات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے سوال و جواب تحریر فرمائے ہیں[1]۔ ان سینکڑوں سوال و جواب کے مرتب اور منضبط سلسلہ کو جو اسانید ثابتہ کے ساتھ روایت ہوتا چلا آیا ہے محض موضوع کہہ دینا منکرین حدیث کے لئے تو بہت آسان ہے لیکن جنہوں نے ابھی تک انکار حدیث کا فیصلہ نہیں کیا ہے ان کو کم از کم اس پر تو غور کرنا چاہئے کہ اگر بالفرض صحابہ کرام کے دلوں میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوئے ہوں، یا آج جب عمل

---

[1] دیکھو اعلام الموقعین ج ۴ ص ۳۰۰ تا ۴۰۹۔

کے لئے قدم اٹھایا جائے اور یہ سوالات پیدا ہونے لگیں تو کیا ان کے جوابات صرف قرآن اور عقل کی مدد سے دیئے جا سکتے ہیں بالخصوص ہماری اس قوم سے جن کو اکثر کتاب استنباط کے طریقوں اور وسائل کے استخراج سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوا۔ اور اگر بالفرض دیئے جا سکتے ہیں تو کیا وہ ایسے ہی مختصر اور حقیقت سے لبریز ہوں گے جیسا کہ تحقیق ہوں گے جو یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سوال و جواب کے اس تمام سلسلے پر انصاف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے تو اس کو بہت جلد یقین کرنا ہوگا کہ یہ جوابات حدیث کی مدد کے بغیر ہرگز براہ راست قرآن سے اخذ نہیں کئے جا سکتے اور اسی لئے قدرے مشترک طور پر مجبور ہوگا کہ ان کی اصلیت اور واقعیت تسلیم کرلے۔ وہ ہرگز یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اس تمام قیمتی اور علمی ذخیرہ کو محض چند شبہات کی بنا پر موضوع کہہ ڈالے۔ اسی کے ساتھ اس کو اس کا بھی پورا پورا احساس ہوگا کہ کتاب اللہ کی جامعیت اور اس کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے یقیناً ایک ایسے معلم کی بھی ضرورت ہے جو اپنی عقل سے نہیں بلکہ منشاء الٰہی کے مطابق حسب ضرورت اس کی تفصیل کرتا ہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ اگر کوئی معلم نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے معلم کے ساتھ کتاب نہ ہو۔ اسی لئے کتاب اللہ کا رشتہ رسول سے ہرگز منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو رشتہ کتاب اللہ اور رسول کے مابین ہے وہی کتاب اللہ اور حدیث رسول کے مابین سمجھنا چاہئے۔

اسوۂ رسول اور کتاب اللہ

یہ امر بھی غور طلب رہنا چاہئے کہ کتاب اللہ صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حل کر لینا ہو۔ وہ نہیں بلکہ وہ افراد و اقوام کا وہ دستور العمل بھی ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبہ میں اترنا ہے اس لئے رسول کی تعلیم کے بعد بھی ایک اہم ضرورت باقی رہتی ہے اور وہ اس کا نقشۂ عمل ہے۔ دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی مشق کے بغیر اول تو سمجھ میں نہیں آ سکتے اور اگر سمجھ میں بھی آ جائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر سمجھے نہیں جا سکتے جب تک کہ اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو جیسے ڈاکٹری کا علم یا سائنس کے دوسرے تجربات کہ ان کا علمی طور پر سمجھنا بھی پہلے ان کے عمل کر دیکھنے پھر خود عملی طور پر ان کو کر لینے پر موقوف ہے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے قطعاً کافی نہیں۔ جب ان معمولی علوم کا حال یہ ہے تو پھر ربانی علوم کی دقیق باتیں اور معاملات و عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے ساتھ انسان کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم اور اس کے کسی صحیح نقشے کے دیکھے ہوئے بغیر کیسے کی جا سکتی ہیں۔

اس لئے ضروری ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس کا صحیح صحیح نقشۂ عمل بھی بھیجا جائے تاکہ تعلیم رسول کے بعد اس میں جو عملی الجھنیں باقی رہ جائیں وہ اس مکمل نقشہ کو دیکھ دیکھ کر حل کرلی جائیں۔ مشیت الٰہی نے یہاں معلّم کتاب کے ساتھ اس کا نقشۂ عمل علیحدہ نہیں بھیجا بلکہ جو معلم تھا خود اسی کو مجسم نقشۂ عمل بنا دیا تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ تمہارے لئے پیغمبر خدا کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے

اس سے معلوم ہوا کہ رسول صرف تبلیغ وحی کے لئے نہیں آتے بلکہ عملی طور پر کتاب اللہ کا نمونہ بھی ہوتے ہیں اس لئے ہر عمل میں ان کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

اسوۂ رسول کی جامعیت

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تمام کتب سماویہ میں سب سے زیادہ جامع کتاب ہے اس لئے اس کا نقشۂ عمل بھی تمام شعبوں میں جامع تر ہونا چاہئے یعنی اگر کتاب اللہ میں عقیدہ، نماز، حج، زکوٰۃ کے احکام مذکور ہیں تو اس کی زندگی میں بھی ان عنوانات کا مکمل نقشہ ملنا چاہئے اور اگر اس میں امارت و امامت، غزوات و جہاد، نظم و نسق اور فصل خصومات کے ابواب بھی موجود ہیں تو ان کا نقشہ بھی اس کی زندگی میں نظر آنا چاہئے۔ اگر اس کی حیات میں قرآن کا ایک ہی پہلو ہو، فصل خصومات اور دیگر انتظامی امور کا نمونہ نہ ہو تو اس نمونہ کو مکمل نمونہ اور وحی نقشہ کو قرآن کریم کا مکمل نقشہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس نمونہ کو جامع اسی وقت کہا جاسکتا ہے جبکہ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی تصویر اس کی شمائلات زندگی میں نظر آئے صرف عبادات و معاملات کی نہیں بلکہ ان فطری عادات کی بھی جہاں شریعت نے کچھ نہ کچھ دخل دیا ہے[1] جیسے بول و براز، طعام و شراب،

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض منافقوں نے طنز کے لہجہ میں صحابہ سے کہا: یہ صاحب تمہارا رسول تو پاخانہ پھرنے اور پیشاب کرنے کا طریقہ بھی بتلاتا ہے گویا ان بیچاروں کے نزدیک انسانی زندگی کے یہ پہلو کسی ہادی کی ہدایت کے محتاج ہی نہیں تھے حالانکہ سوچنے کی بات تو یہی ہے کہ جو گوشے ذلیل گرید سمجھے جاتے ہیں وہی زیادہ قابل اصلاح بھی سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم انسان صرف ایک شعبہ کی تکمیل کو تکمیل سمجھ لیتا ہے لیکن یہ فہم ہوجاتا ہے کہ بعض مرتبہ ان کے غیر اہم گوشوں کی طرف غفلت کرنے سے تمام محنت ہی بیکار ہو جاتی ہے اگر طہارت ہی نہیں تو کیا معلوم نہیں ترغیب کیسے حاصل ہو اور جب طہارت حاصل نہ ہو تو نماز کیا ہو اور جب نماز ہی نہ ہو تو دین کہاں رہ گیا۔ تعجب ہے کہ کل جاہلیت کے دور میں جو اعتراض منافقین کی زبانوں سے نکل رہے تھے وہی اعتراضات آج خود مسلمانوں کی زبانوں سے نکل رہے ہیں وہ ان احادیث پر جو انسانی مستورہ زندگی سے متعلق ہیں وہی اعتراضات کرتے ہیں جو منافقین قضائے حاجت انسانی کی احادیث پر کرتے تھے۔ حالانکہ اس پہلو کی ضرورت تھی کہ ان شعبوں پر خود قرآن کریم نے بھی روشنی ڈالی ہے ہاں اگر قرآن کریم سے ان کے متعلق کچھ ہدایات نازل فرمائی ہیں تو پھر اس کا عملی نمونہ ظاہر ہوگا پھر ایسا ہی کی کوئی ضرورت تھی کہ نزول قرآن کے وقت عام مسائل ہی ان کے متعلق بھی کچھ کرنا ہوا ہو کہ شرعیات ہیں بلکہ حقیقت یہاں بھی انسان اپنی ضرورت میں ہر زمانے میں موجود تھا تو یہاں ان کی اصلاح فرمانا رسول کا فرض منصبی تھا اور کیا یہ ممکن ہے کہ اسی حصہ میں کوئی صحیح نمونہ نظر نہ آتا۔ اس لئے کلام ان گوشوں کی تشریح ہی نہیں کہ اس حصہ میں آپ کی زندگی ہی موجود نہ ہونا چاہئے یہاں معترضین کو ان احادیث کا ہونا گراں ہے لیکن طالب حق کے نزدیک اس حصہ کی تکمیل کے پیش نظر ان کا نہ ہونا موجب ملال ہے۔

اسوۂ رسول اور عرب

جہاں ایک طرف کتاب اللہ کی عملی تشریح کے لئے ایک نمونہ کی ضرورت تھی اسی کے ساتھ عرب کی دماغی حالات کی وجہ سے بھی اسوۂ رسول کی بڑی ضرورت تھی۔ وہ امی قوم تھی نصاب لوح و قلم کے طریقے سے بہت دور تھی۔ اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے وہی طریقہ مناسب تھا جو فطری کہا جا سکتا ہے۔ فطری تعلیم یہی ہے کہ خود عمل کر کے دکھلا دیا جائے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے نہ وہ کچھ کہا جاتا ہے [illegible] جتنا وہ ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے گھر کی زبان۔ اس کا طور و طریق سب سیکھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک انگریز کا بچہ کسی تعلیم کے بغیر ایسی فصیح انگریزی بولنے لگتا ہے جو ایک ہندوستانی کالج میں تعلیم پانے کے بعد بھی نہیں بول سکتا اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ فطری طریقہ پر تعلیم حاصل کرتا ہے وہ اپنے والدین کو بولتا دیکھتا ہے اور جس طرح کسی عمل میں مصروف دیکھتا ہے اسی کی نقالی میں خود بھی مصروف ہو جاتا ہے اس لئے اسے اپنی زبان اور اپنے طور طریق میں کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح صحابہ کرام نے بھی اس کامل دین کا بڑا حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے سیکھا ہے صرف اعمال نہیں بلکہ اقوال بھی۔ نہ صرف اقوال ہی نہیں بلکہ ایک ایک حصہ بھی۔ اسی

دیکھ حاشیہ صفحہ گذشتہ [illegible] واجب التسلیم ہونا چاہئے اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی پوری زندگی آپ کا تمام کا تمام اسوۂ حسنہ حرف بحرف بطریق تواتر منقول ہے یا اس کا ایک حصہ متواتر ہے اور بڑا حصہ غیر متواتر پہلی صورت تو واقعہ کے خلاف ہے دنیا میں کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آپ کے عبادات و معاملات کا بہ ہر پہلو تواتر سے ثابت ہے لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ اس کا ایک حصہ متواتر اور بہت سا غیر متواتر ہے بلکہ بڑا حصہ غیر متواتر ہے مثلاً یہ متواتر ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں کی یہ بھی متواتر ہے کہ چار رکعتیں۔ رکوع سجدہ کئے۔ رکوع پہلے کیا پھر سجدہ۔ قاعدہ آخری بیٹھے اور سلام بھی پھیرا۔ شروع نماز میں ہاتھ اٹھائے تھا اس کے بعد ایک آدھی بات کا اور اضافہ کر لیجئے لیکن صرف ان متواتر امور سے بھی نماز کا پورا نقشہ تو مکمل نہیں ہوتا۔ پھر دین کے اس حصہ کے متعلق مولانا کا فیصلہ کیا ہو گا جو صحابہ کے سامنے اسوۂ رسول میں نظر آنے کی وجہ سے قابل قبول تھا اب تواتر کے ساتھ منقول نہ ہونے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں رہا۔ ان جزئیات کے لئے اب تجویز کیا ہے۔

یہی تو مطلب ہے کہ نماز میں بیسیوں پیش آ سکتے ہیں اس کی تلافی کی صورت اب کیا ہونا چاہئے۔ قرآن کریم ضرور تمام کی حالت میں پڑھا جاتا تھا لیکن [illegible] ہے۔ بہرحال یہاں عملی طور پر بہت سے عمل کے گوشے ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جن کا حکم [illegible] صرف اپنی عقل کے زور سے ان کے جواب سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ جو کچھ اپنی سمجھ میں آ جائے اسی کو قرآنی حکم قرار دے دیا جائے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان کے جوابات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور اسوۂ حسنہ میں تلاش کئے جائیں اور جو جو جزئیات [illegible] ان کو جامع [illegible] بنایا جائے۔ یہ راستہ تو مولانا [illegible] صاحب اختیار کر نہیں سکتے۔ [illegible] کی تفصیل قرآن سے [illegible] نہیں ہوتی تو اسوہ [illegible] کی صورت [illegible] کہ صرف [illegible] متواتر ہے۔ وہ بھی تفصیلات کے لئے کافی ہے مگر کیا اب اجمالی علم سے [illegible] دین کے تفصیلی نقشے تیار ہو سکتے ہیں اور کیا [illegible] کے بعد قرآن کی طرح اسوۂ رسول کی [illegible] ہو سکتے ہیں۔ حدیث کا [illegible] تو آسان ہے مگر [illegible] جو مشکلات سامنے آتی ہیں اس کا [illegible]

عملی تربیت و تعلیم کے کمالات تھے کہ تمام دین ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا جیسا طبعی اخلاق انسانی میں غیر شعوری طور پر سرایت کئے ہوئے ہیں۔ اگر یہ دین صرف زبانی طور پر آج کل کی طرح اسکولوں میں پڑھا دیا جاتا تو عمریں صرف ہو جاتیں اور اس کا ایک حصہ بھی حاصل نہ ہو پاتا۔ اُمّی اور آزاد دماغ لفظوں کے رٹنے میں اور غیر فطری طریقوں سے نقشے بنانے اور جمانے میں اتنا بار محسوس کرتے کہ جس کو زیادہ مدت نبھانا ہی مشکل ہو جاتا۔ اس لئے ان کی دماغی ساخت کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا جس نے اپنے کمالات سے اپنی ذات میں ایسی جاذبیت حاصل کر لی کہ ہر شخص کا منظورِ نظر بن گیا۔ اس کے طور و طریق عادات و عبادات دلوں میں اس طرح گھر کر گئے کہ اس نمونہ کے سوا سب نمونے دلوں سے محو ہو گئے اس لئے دین کے عملی حصے کے سمجھنے میں کسی کو الجھن پیش نہ آئی اور اگر پیش آئی تو حضرات صحابہ سے دور ہو گئیں۔ آج وہی اسوۂ حسنہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں رہا جس کے ساتھ کل تک ہم قرآن کو حل کر لیا کرتے تھے اس لئے قرآن فہمی میں بھی اختلاف آراء پیدا ہو گیا اگر اسوۂ کی یہ تفصیلات بھی ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو خدا ہی جانے معقولات نے کتاب اللہ کا نقشہ صرف اپنے ذہن سے کیا بنا ڈالا ہوتا۔ اس لئے جہاں ایک طرف کتاب اللہ کی تعلیم کے لئے رسول بھیجا گیا تھا اسی کے ساتھ اس کا نقشہ بھی خود اپنی جانب سے مکمل کر کے بھیج دیا گیا تاکہ انسان جس الوہیت خدا کی عبادت کا نقشہ اپنے دماغ سے نہ تراشتا اور اپنی کج فہمی سے چھوٹی چھوٹی حرکت و سکون میں اسی نقشۂ الٰہی کا مو بمو اتباع کر سکے اور اس مختصر راہ پر چل کر خدائے تعالیٰ کی عبودیت کے مقام تک بہت جلد پہنچ جائے۔ جس امت کے لئے جد و جہد کی مدت قلیل رکھی گئی ہو اور تقدیر یہ ہو کہ اس کو تمام امتوں پر فائق رکھا جائے اس کے لئے صورت یہی تھی کہ تھوڑے عرصہ میں اس کو بڑی مسافت طے کرا دی جائے اگر کتاب تشنۂ تعبیر رہ کے رموز کی تفصیلات اس کا عملی نقشہ تمام امت ہی کے عقول کے سپرد کر دیا جاتا تو ایک شخص بھی اپنی تمام عمر صرف کرنے کے بعد یہاں کامیاب نہ ہو سکتا۔

جميع العلم في القرآن لكن — تقاصر عنه افهام الرجال

قرآن کریم کی جامعیت کا اصل مفہوم

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا کہ قرآن پاک کی جامعیت احادیث کے تسلیم کرنے سے مانع نہیں بلکہ اس کی جامعیت ہی اس کو مقتضی ہے کہ اس کے اصول کی تشریح اس کے واضعات کی تفصیل اور اس کے اشارات کی تفہیم کی جائے کیونکہ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام بشکل کلیات بیان کر دیئے گئے ہوں۔ امام شاطبی فرماتے ہیں۔

القرآن على اختصاره جامع ولا يكون جامعاً الا والمجموع فيه امور كليات	قرآن کریم مختصر ہونے کے باوصف پھر جامع کتاب ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں کلیات مذکور ہوں۔

ﺳﮧ الموافقات ج ۳ ص ۳۶۷۔

آتی ہے کہ بڑے سے بڑے عالم شخص بھی اُن کی گہرائی سمجھنے کا گمان کر لیتا ہے۔ اُس کی اسی شان جامعیت
کی وجہ سے ایک جاہل اور ایک عالم ایک فقیر اور ایک بادشاہ اس سے برابر کا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ قلیل العلم
شخص محروم ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کی تہ کو پا لیا اور نہیں جانتا کہ یہ قرآن کی شان جامعیت کا کرشمہ تھا۔ یہاں
ہر شخص اپنی اپنی پیاس اور اپنے اپنے ظرف کے بقدر سیراب ہو جاتا ہے لیکن پیاس بجھانے والا کنوئیں میں پانی کتنا ہے اس
کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ آخر یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ یہ کلام کس کا ہے۔ اگر کسی بڑے شاعر یا کسی بڑے عالم کے کلام میں
اس کی سطح کے علاوہ اس کا کچھ عمق بھی ہوتا ہے تو یہاں خالق کے کلام میں اس کی تلاش کیوں نہیں ہوتی۔ اسی
حدیث میں ارشاد ہے لکل آیۃ ظہر و بطن ہر آیت کی ایک مراد اس کے ظاہر سے ہاتھ لگ جاتی ہے دوسری
مراد اس کے عمق اور گہرائی میں جانے سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر کوئی بدنصیب یہاں صرف اس کے ایک ہی حصہ
پر قناعت کر کے بیٹھ رہے تو یہ اس کا نصیب۔ اُس کو یہ سوچنا چاہئے کہ جس کلام کا متکلم ایسی ذات پاک ہو جس کے
علم کی کوئی نہایت نہیں، تمام عالم کے علوم اس کے بحر علم کا ایک قطرہ بھی نہ ہوں اس کے کلام میں کتنی گہرائی
اور کتنی بلندی ہو سکتی ہے کیا ہر شخص اُن ساری گہرائیوں اور تمام بلندیوں کو حاصل کر لینے کا دعویٰ کر سکتا ہے یا اگر
کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال جتنا حصہ اس کو حاصل ہو گیا ہے کیا اس کے متعلق اسے وثوق کے ساتھ یہ گمان کر لینا چاہئے کہ اس
نے متکلم کی ٹھیک پوری مراد کو پا لیا ہے۔ حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں۔

ان دلالۃ النصوص نوعان حقیقیۃ واضافیۃ	نصوص کی دلالت دو قسم کی ہے حقیقی، اضافی۔ حقیقی دلالت
فالحقیقیۃ تابعۃ لقصد المتکلم وارادتہ	تو متکلم کے قصد اور اس کے ارادہ کے تابع ہوتی ہے۔ اس
وھذہ الدلالۃ لا تختلف والاضافیۃ تابعۃ لفھم السامع	دلالت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اضافی دلالت فہم سامع
وادراکہ وجودۃ فکرہ وقریحتہ وصفاء ذھنہ	اس کی جودت فکر صفائی ذہن الفاظ اور اس کے مراتب کے
ومعرفتہ بالالفاظ ومراتبھا وھذہ الدلالۃ تختلف	شناسائی پر موقوف ہوتی ہے۔ یہ دلالت کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتی
اختلافا متباینا بحسب تباین السامعین فی ذلک[1]	جیسا کہ ان اوصاف میں سامعین کے مراتب مختلف ہیں۔

پس جو دلالت کہ حقیقی ہے وہ تو یہاں متکلم کے ارادہ کے تابع ہے اس کو یقینی طور پر اس وقت تک کیسے معلوم
کیا جا سکتا ہے جب تک کہ خود متکلم ہی اس کو نہ بتلائے۔ رہ گئی دوسری قسم تو اس کے لئے لا تحصی مراتب ہیں کہ
کوئی شخص یہاں یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کہ کلام کی جو مراد اس نے سمجھی ہے اس کے بعد اب اس میں آئندہ کوئی
گنجائش باقی نہیں رہی۔ مگر ایہام نصوص کتاب میں یہی باقی رہے تو ترجمہ کے ساتھ کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے کہ کتاب اللہ کو
اس نے حل کر لیا ہے۔ اس لئے یہاں مراد متکلم بتلانے کے لئے خود متکلم کی جانب سے ایک معلم مقرر کر دیا گیا ہے جس نے

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۰۵

ہوں مگر میں نے تو قرآن میں یہ کہیں نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا اگر تو قرآن سمجھ کر پڑھتی تو یقیناً اس میں دیکھ لیتی کیا قرآن میں یہ نہیں ہے

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا	رسول جو تمہیں دے اُسے قبول کرو اور جس بات سے
نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔	روکے اس سے رک جاؤ۔ ؎

اس اجمالی حکم کے ماتحت وہ سب جزئیات مندرج ہیں اس نے ایک اجمالی قانون بتلا دیا ہے۔ ان تمام

؎ مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کو یہاں عجیب شبہ گذرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ما آتاکم" کی آیت مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا واسطہ ہی نہیں ہے یہاں آتا کے لفظ کو جزء نہی کے بالمقابل واقع ہے لوگوں نے غلط فہمی سے امر قابل تعمیل سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ اس کے معنی دینے ہی کے ہیں۔ بنا بریں یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیثیں یا اقوال ہیں ان کے لئے دینے کا لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ رسول اللہ نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔ انتہی۔

مولانا کو چونکہ قرآن کی جامعیت کا علم ہی نہیں اس لئے یہاں بھی انہوں نے آیت بالا کو صرف مالِ غنیمت سے خاص کر ڈالا ہے۔ حالانکہ محدثین کے نزدیک آیتِ بالا اپنی شان جامعیت کی وجہ سے صرف مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اُن سب ہدایات کو بھی شامل ہے جو آپ نے اپنی امت کو دی ہیں۔ یہ تحقیق بھی عجیب ہے کہ حدیث کے متعلق تو دینے کا لفظ مستعمل نہیں ہو سکتا مگر قرآن کے متعلق ہو سکتا ہے اس پر یہ کہنا کہ "حدیثیں چونکہ اقوال ہیں اس لئے ان کے لئے دینے کا لفظ نہیں کہا جا سکتا" اور بھی مضحکہ خیز ہے کیا قرآن اقوال ہی کا مجموعہ نہیں پھر اگر اقوال کے اس مجموعہ کو دیا جا سکتا ہے تو ارشادات کے دوسرے مجموعہ کو کیوں نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک صرف وحی ہی ہے صرف متلو اور غیر متلو ہونے کا فرق ہے یہاں آیت بالا کے سمجھنے میں ہمیں تو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی البتہ مولانا کو یہ غلط فہمی ضرور ہوئی کہ انہوں نے قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ایک جلد بند مجلد کتابچہ سا تصور کر لیا ہے جو شائع شدہ تورات کی طرح دیا گیا تھا اگر ایسا نہیں ہے بلکہ اس کی متفرق آیتیں نازل ہوتی تھیں اور انہیں آپ صحابہ کے سامنے پڑھ کر سنا دیتے تھے۔ پس کے بارے میں لفظ "آتا" اس پر بولا جا سکتا تھا تو اگر دوسرے وقت آپ اپنی زبانِ مبارک سے کچھ احادیث ارشاد فرما دیتے ہوں تو اس پر یہی لفظ "آتا" کیوں نہیں بولا جا سکتا۔ مولانا کی قرآن دانی کی یہ انتہا ہے کہ انہیں سینکڑوں جگہ میں ایسی کوئی آیت نظر نہیں آئی جہاں یہ لفظ ایسے معنی میں مستعمل ہو جو حدیث پر بھی بولے جا سکیں قرآن کریم میں ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (اللہ تعالیٰ درجہ بلند کرتا ہے مومنین کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا ہے) اگر علم کے لئے یہ لفظ مستعمل ہو سکتا ہے تو کیا حدیث ایک علم ہی نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ۔ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ۔ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا۔ وَاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ ان آیات میں "آتا" کا لفظ کتاب کے لئے، علم کے لئے، حکمت کے لئے، حکم اور نبوت کے لئے، فضائل و کمالات کے لئے اور آخری آیت میں فصل الخطاب یعنی اقوال کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے اس لئے مولانا کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔ یہ چند سطریں مولانا کے دعویٰ کی تردید کے لئے کافی ہیں اس لئے اس مختصر حاشیہ پر ہی کفایت کی جاتی ہے۔

وانحصر فیہ ما فی القرآن نصاً وعیناً	اصل کو جو کہ سنت میں ہیں ایک قرآن کا باب ایسا ہے
فلا تصل لاحتیاج السنة (موافقات ج ۴ ص ۲۰)	جس کی اصل ہی کتاب و سنت دونوں میں نہیں ملی۔

ظاہر ہے قرآن و حدیث دونوں کا منکر ہے گو وہ بھی یہی کہتا ہے کہ تمام ابواب فقہ کے اصول قرآن میں مذکور ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ کے نزدیک بھی قرآن کی جامعیت اصول ہی کے لحاظ سے مسلم تھی۔

امام شاطبی فرماتے ہیں۔

تعریف القرآن بالاحکام الشرعیة	قرآن کریم نے احکام شرعیہ اکثر کلی طور پر بتلائے ہیں اور
اکثرہ کلی لا جزئی وحیث جاء جزئیاً	جہاں جزئی طور پر کوئی حکم بتلایا بھی ہے وہ کسی کلی
فمأخذہ علی الکلیة۔ ؎۱	کے تحت ہے۔
القرآن فیہ بیان کل شیء	قرآن کریم میں ہر چیز کا بیان ہے اس کو سمجھنے والا عالم
فالعالم بہ علی التحقیق عالم بجملة الشریعة	تمام شریعت کا جاننے والا ہے اس طرح پر کہ اس کا کوئی
لا یعوزہ منہا شیء ؎۲	حکم اس سے باقی نہیں چھوٹتا۔

پھر جلد رابع میں لکھتے ہیں۔

لیس فی السنة الا واصلہ فی القرآن ؎۳	حدیث میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصل قرآن میں نہ ہو۔

ان نقول سے ظاہر ہے کہ قائلین حدیث بھی جامعیت قرآن کے معترف ہیں مگر ان کے نزدیک اس کی جامعیت صرف اصولی ہے۔ قرآن کی اسی شان جامعیت پر نظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا حسبنا کتاب اللہ۔ اگر اس کا مطلب وہ ہوتا جو منکرین حدیث سمجھتے ہیں تو احادیث جمع کرنے کے لئے مجلس مشاورت طلب نہ کرتے جس کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔ اپنے وعظوں میں یہ اعلان نہ کرتے ردوا الجہالات الی السنة ؎۴ اور بار بار یہ نہ فرماتے تعلموا الفرائض والسنة کما تعلمون القرآن ؎۵۔ اپنے دین کے فرائض اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اسی طرح دل و شوق سے سیکھو جیسا قرآن سیکھتے ہو۔ جو لوگ کسی کلام کی مراد اپنے ذوق سے سمجھنے لگتے ہیں وہ [illegible] بلاوجہ [illegible] ہے۔ منکرین حدیث کو حضرت عمرؓ کی تمام احادیث میں سے صرف یہی ایک حدیث صحیح نظر آئی ہے اور اسی ایک حدیث کی بنا پر وہ ان کی اس قسم کی تمام احادیث پر موضوع ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہی دلیل موضوعیت کی بن سکتی ہے تو یہ کیوں نہ کہا جا سکتا ہے کہ ان احادیث کے مقابلہ میں یہ ایک حدیث حسبنا کتاب اللہ کی حدیث کو موضوع کیوں نہ کہا جائے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی

؎۱ [illegible] ابن تیمیہ اور [illegible] نے اس کی اصولی بحث کی ہے دیکھو [illegible] ج ۲ ص ۳۳۱ - اور الموافقات ج ۳ ص ۳۶۶ - ؎۲ [illegible] ج ۳ ص ۳۶۶ - ؎۳ [illegible] ج ۴ ص ۲۹۔

؎۴ جامع بیان العلم ج ۲ ص [illegible] ؎۵ بخاری ج ۲ ص [illegible]

تعارض نہیں ہے تعارض صرف اس لئے پیدا ہوگیا ہے کہ ان کے کلام کی مراد کی غلط تعیین کی گئی ہے صحیح مراد وہ ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

قرآن کی تفسیر و بیان صرف رسول کا منصب ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ — ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے خوب واضح کر دیں۔

آیت بالا میں لفظ "تبین" سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اگرچہ خود عیاں ہے لیکن ہر شخص اس بیان کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس قصور کی وجہ سے اس بیان کو واضح کرنے کے لئے رسول بھیجا جاتا ہے پس پیچیدگی قرآن کے قصور بیان کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کے قصور فہم کی وجہ سے ہے۔ یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ جو کلام جس قدر بلند پایہ ہوتا ہے اسی قدر شرح کا زیادہ محتاج ہوتا ہے دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا کی کتاب کی مراد بیان کرنا صرف رسول کا منصب ہے بلکہ اس کی بعثت کی یہ ایک بڑی غایت و غرض ہے۔

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک شخص سے فرمایا تو احمق ہے کیا قرآن میں کہیں ظہر کی چار رکعتیں اور ان میں جہر نہ ہونا مذکور ہے اس کے بعد فرمایا۔

ان کتاب اللہ ابھم ھذا وان السنۃ تفسر ذلک۔[1] — کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا پھر سنت رسول نے اس کی تفسیر کر دی۔

مطرف بن شخیر سے ایک شخص نے کہا آپ ہمارے سامنے قرآن کے سوا کچھ اور مت بیان کیجئے انھوں نے فرمایا۔

واللہ ما نرید بالقرآن بدلاً ولکن نرید من ھو اعلم بالقرآن منا۔[2] — خدا کی قسم ہم قرآن کی بجائے کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم اس کے پیچھے نظر رکھتے ہیں جو قرآن کا ہم سے زیادہ جاننے والا تھا

قرآن و حدیث کا ربط

عمران بن حصین کے بیان سے قرآن و حدیث کا ربط بھی معلوم ہوگیا کاش اگر منکرین حدیث اس ربط کو جانتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث کا انکار ممکن نہیں اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں یہاں ان دونوں میں متن و شرح کی نسبت ہے پھر یہ متن شرح کے اندر اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کا اقرار و انکار بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا قرآن کی طرح اس کا بیان بھی خدا ہی کی طرف سے ہے گویا متن ہی خود شارح بنا ہوا ہے اس لئے ایسی شرح کو متن سے جدا نہیں کیا جا سکتا نہ ایسے بیان کو اصل کتاب سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض و واجب کے مراتب کا تفاوت

اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ قرآن و حدیث کا مرتبہ ایک ہی ہوتا مگر یہاں نوعیت ثبوت کے فرق سے حکم میں تفاوت پیدا ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے ثبوت کی جو نوعیت ہے وہ حدیث کے

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱۔ [2] الموافقات ج ۴ ص ۲۰۔

ثبوت کی نہیں اسی لئے حدیث کا رتبہ قرآن سے کمتر مانا گیا ہے۔ امام شاطبی نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے۔

رتبة السنة التأخر عن الكتاب في الاعتبار[1] — سنت کا مرتبہ قرآن کریم کے بعد ہی ہے۔

اس کے ذیل میں وہ ایک بڑی حقیقت پر متنبہ فرماگئے ہیں اور وہ یہ کہ جب علم شریعت یکساں ہے تو پھر احکام فقہ میں فرض اور واجب کا اختلاف کیسے پیدا ہوگیا۔ سنت، استحباب، بدعت و مکروہ کے مراتب تو دوسروں کے فقہ میں بھی موجود ہیں لیکن واجب کی اصطلاح صرف فقہ حنفی میں ملتی ہے اسی لئے کتب اصول میں مرتبۂ واجب کے اثبات میں بڑی بحث کی گئی ہے۔ امام شاطبی اس عنوان کے ذیل میں اس کے متعلق بھی ایک مفید بات تحریر فرماگئے ہیں۔

وما فرق الحنفية بين الفرض والواجب راجع الى تقدم اعتبار الكتاب على اعتبار السنة وان اعتبار الكتاب اقوى من اعتبار السنة. وقد لا يخالف غيرهم في معنى تلك التفرقة اذ المقطوع به في المسئلة ان السنة ليست كالكتاب في مراتب الاعتبار[2]

حنفیہ نے واجب اور فرض کا جو فرق کیا ہے وہ اسی بات پر مبنی ہے کہ قرآن کو حدیث پر تقدم ہے اور اس بات پر کہ قرآن کا اعتبار سنت سے قوی تر ہے اتنی بات میں دوسروں کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اجمالی طور پر یہ بات یقینی ہے کہ مراتب اعتبار میں حدیث قرآن کے برابر نہیں ہوسکتی۔

امام شاطبیؒ کے اس بیان سے واضح ہوگیا کہ جب دلیل میں کسی وجہ سے ظنیت پیدا ہوجاتی ہے تو حنفیہ اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے اسے قطعی کے برابر نہیں کرتے۔ ارکان و فرائض شئی کی ماہیت ہوتے ہیں پس جو ماہیت قطعی ہو اس کے اجزا ظنی کیسے ہوسکتے ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یہ سب آیات قرآنیہ سے ثابت ہیں لہٰذا جو ان عبادات کے اجزاء اور ارکان ہوں وہ بھی اسی درجہ قطعی دلیل سے ثابت ہونے چاہئیں جیسے قیام، سجدہ، رکوع، قراءت یہ تمام ارکان قرآن سے ثابت ہیں اس کے برخلاف تعدیل ارکان، قعدۂ اولیٰ اور خاص سلام کا لفظ قرآن سے ثابت نہیں بلکہ ظنی احادیث سے ثابت ہیں جو ثبوت میں قرآن سے کمتر ہیں اس لئے حنفیہ نے ان دونوں قسموں کے حکم میں فرق کرنے کے لئے ایک قسم کو فرض اور دوسری کو واجب کہہ دیا ہے۔ دلائل کے قوت و ضعف کے لحاظ سے احکام میں مراتب کا تفاوت قرار دینا بالکل معقول بات ہے۔ حنفیہ کے کتب اصول میں اس فرق کی پوری توضیح و تقریر کی گئی ہے ہمارے نزدیک فرض اور واجب کا فرق صرف اسی حقیقت پر مبنی نہیں اگرچہ یہ بات اپنی جگہ قابل تسلیم ہے کہ قرآن کا مرتبہ حدیث سے مقدم ہے لیکن صرف اتنی بات سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو قرآن سے ثابت ہو اس کو فرض اور جو حدیث سے ثابت ہو اس کو واجب کہہ دیا جائے بلکہ بہت سے مستحبات قرآن سے اور بہت سے فرائض احادیث سے ثابت ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا نوعیت ثبوت کے لحاظ سے جو فرق رہے گا وہ یہ ہوگا کہ

[1] الموافقات ج ۴ ص ۷ – [2] ایضاً ج ۴ ص ۸

وہ مستحبات بلحاظ ثبوت قطعی ہوں گے اور یہ فرائض ظنی۔ قوت و ضعف کے تفاوت سے خود فرض میں بھی مراتب قائم کیے جا سکتے ہیں ایک فرض کو قطعی دوسرے کو ظنی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ فرض ظنی بعینہ واجب ہے [illegible] یہاں شیخ ابن ہمام نے جو بحث فاتحہ خلف الامام کے ضمن میں فرمائی ہے قابل مراجعت ہے۔

فرض و واجب کے مراتب میں بحر العلوم کی تحقیق

ہمارے نزدیک مسئلہ کی پوری حقیقت وہ ہے جو بحر العلوم نے رسائل الارکان میں تحریر فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ماہیت کے اجزاء ماہیت اور غیر ماہیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے ایک درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزاء کہلاتے ہیں مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے یہ تمام اجزاء ایک حیثیت نہیں رکھتے اسی طرح زید میں ہاتھ، پیر، سر، دل، دماغ وغیرہ سب اس کے اجزاء شمار ہوتے ہیں مگر ان اجزاء میں بہت بڑا تفاوت نظر آتا ہے کہ بعض کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹنے سے درخت کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے اور بعض کے کٹنے سے اس کے نمو میں نقصان پیدا ہو جاتا ہے اور بعض کے کٹنے سے درخت کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زید کے اگر ہاتھ پیر قطع کر دیے جائیں تو پھر بھی اس کو زید ہی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی گردن کاٹ دی جائے تو پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ اس کا ایک ڈھانچہ ہو جاتا ہے جس کو اب زید کہنا صرف اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ پہلے اس ڈھانچے پر زید کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا۔ بس جس طرح خارج میں کسی ماہیت کے اجزاء میں حکم کا اتنا تفاوت موجود ہے اسی طرح فقہاء نے شرعی ماہیات کے اجزاء میں بھی یہی فرق سمجھا ہے۔ نماز کے بعض اجزاء وہ ہیں جن کے نقصان سے نماز کی زینت میں فرق آتا ہے اور بعض سے اس کی حقیقت میں نقصان پیدا ہوتا ہے اور بعض سے نماز کا اسم اطلاق کرنا ہی درست نہیں رہتا۔ پہلی قسم مستحبات، دوسری واجبات اور تیسری فرائض و ارکان کہلاتی ہے۔ یہ کہ ان مراتب کا اندازہ کیسے ہو؟ سو یہ اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل سے ہوتا ہے۔ بعض اجزاء کے ترک سے آپ نے اس عمل کو ناقص قابل اعادہ قرار دیا اور بعض کے ترک سے گو ناقص کہا مگر اس کا اعادہ لازم نہیں کیا۔ اور بعض کی وجہ سے اس عمل کا ہونا نہ ہونا برابر سمجھا۔ جب آپ کی زبان میں یہ تفاوت موجود ہے اور ہر قرآن اقیموا الصلوٰۃ کہہ کر نماز کا تقاضہ کر رہا ہے تو لامحالہ فقہاء کو یہ غور کرنا پڑا کہ نماز میں وہ اجزاء کون سے ہیں جن کو ادا کر لینے سے خدا کا مطالبہ پورا ہو جاتا ہے اور وہ کون سے ہیں جن کے ترک سے ناقص ادا ہوتا ہے اور وہ کون سے ہیں جن سے نماز کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے اصل حقیقت فوت نہیں ہوتی۔ فقہاء نے صرف ہماری سہولت کے لئے ان اجزاء کے علیحدہ علیحدہ نام تجویز کر دیے ہیں تاکہ تعلیم و تعلم میں آسانی ہو جائے۔ اگر منکرین حدیث کو ان ناموں سے چڑ ہو تو وہ ان ناموں کا استعمال نہ کریں مگر کیا اس حقیقت سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے اجزاء سب برابر کے اجزاء نہیں۔ پس فرض و واجب کا فرق صرف دلیل کے قطعی یا ظنی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ دراصل خود ان اجزاء کی

حقیقت کی وجہ سے ہے جو چیز واجب ہے وہ درحقیقت اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ فرض۔ اسی طرح جو مستحب ہو وہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ واجب۔ اس لئے صیغۂ امر ایک ہی رہتا ہے مگر مطالبہ کی اہمیت میں خود اس چیز کے اہم اور غیر اہم ہونے کے لحاظ سے فرق پڑ جاتا ہے۔ [1]

خلاصہ یہ کہ جب احکام کی یہ فطری تقسیم تمام کائنات میں موجود ہے تو پھر یہی تقسیم اگر احکامات شرعیہ میں بھی موجود ہو تو اس میں کیا تردد ہے۔ آج بھی روزانہ ہم امر و نہی کے صیغے استعمال کرتے ہیں مگر کیا ہر امر کا اقتضا برابر سمجھا جاتا ہے؟ آج بھی بعض حکم معمولی بعض اس سے زیادہ تاکیدی ہوسکتے ہیں۔ پس جس طرح مراتب کا یہ تفاوت ہمارے عرف میں موجود ہے اسی طرح قرآنی احکام کو سمجھنا چاہئے۔ اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) یہ بھی ایک حکم ہے۔ واذا حللتم فاصطادوا (جب حج کا احرام کھول دو تو شکار کرو) یہ بھی ایک حکم ہے مگر نماز کو فرض کہا جاتا ہے اور شکار کرنا کوئی شخص فرض نہیں کہتا حالانکہ صیغہ امر ایک ہی ہے مگر فرض و جواز کے مراتب اسی ایک امر کے تحت میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان مراتب کے لحاظ کے بعد رسول کے بیان اور احادیث کی اہمیت اور پیدا ہو جاتی ہے۔ منکرین حدیث کو یا تو قرآنی امر و نہی سب یکساں مرتبہ میں ملحوظ رکھنے ہوں گے یا پھر محض اپنی عقل سے ان میں مراتب کا تفاوت پیدا کرنا پڑے گا۔

مولانا اسلم صاحب جس کو اسوۂ رسول کہتے ہیں وہ بواسطہ تو یقیناً حدیث ہی کا ایک جزو ہے جیسا کہ آئندہ واضح کیا جائے گا۔ بہرحال اگر قرآن اپنی جامعیت کے ساتھ اسوۂ رسول کا محتاج ٹھہر سکتا ہے تو اسے حدیث کا محتاج ٹھہرانے میں بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ یہ احتیاج صرف ایسی ہی احتیاج ہے جیسی متن کو شرح کی احتیاج ہوتی ہے۔ اس احتیاج سے شرح کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہاں شرح اور متن کی حیثیت ثابت کرنا مقصود ہوتی ہے۔ اصل فضیلت متن ہی کو ہے اگر متن نہ ہوتا تو شرح کس پر لکھی جاتی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اگر شرح نہ ہوتی تو ہر شخص اس متن کو اس سہولت کے ساتھ کس طرح سمجھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا تعزیرات ہند کی دفعات اور قوانین کی دوسری کتابیں گورنمنٹ کی جانب سے یہ قوانین مکمل الفاظ میں مدون ہو کر شائع ہوگئے ہیں۔ اب علماء قانون اس کی مختلف مرادیں بیان کرتے رہتے ہیں مگر اس کی صحیح مراد وہی سمجھی جاتی ہے جو ہائی کورٹ بیان کرتا ہے اسی لئے اس کے فیصلے نظائر بن کر نقل کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن بھی ایک قانون کی کتاب ہے اس کی مراد متعین کرنے کے لئے صرف رسول کا بیان معتبر ہے۔ اگر قرآن رسول کی اس ذمہ داری کی تصریح نہ بھی کرتا جب بھی ہمارا فرض ہوتا کہ ہم اس بیان کو تلاش کریں جو رسول سے تو بغیر ذمہ داری کے طور پر قرآن کی تشریح میں پیش کیا گیا ہے۔ چہ جائیکہ جب وہ اس کا ذمہ دار بھی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے رسول نے صرف قرآن کے الفاظ کو دہرا دیا ہوگا نہ دہرانے کو کوئی شخص بیان کہہ سکتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نے صرف الفاظ کے ترجمہ

[1] اس تحقیق سے اس شخص کا بھی جواب ہو گیا جس نے ایک مناظرہ میں اہمیت کے ساتھ یہ سوال اٹھایا تھا کہ جب قرآن میں امر و نہی کا ایک ہی صیغہ ہے تو پھر کیا

کفایت بھی نہ کی ہوگی کیونکہ اہل زبان کے لئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر آج قرآن کی مراد سمجھنے میں کچھ مشکلات حائل ہو سکتی ہیں تو یقیناً اس وقت بھی حائل ہوتی ہوں گی ہاں قلت و کثرت کا فرق ہو سکتا ہے اور شبہات کی نوعیت کا فرق بھی ممکن ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ تمام قرآن میں کبھی کسی کو شبہ کا موقع نہ آیا ہو۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ المنتفق کی آمد کے واقعات کے سلسلہ میں ان کا ایک سوال تحریر فرماتے ہیں۔

جب ہمیں ہوائیں اور درندے متفرق کر دیں گے اور ہم بوسیدہ ہو جائیں گے اور خاک کر کے منتشر کر دیں گے تو ہم
کہاں اور کیسے جمع کئے جائیں گے؟[1]

اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کا یہ خیال ہے کہ آپ کے دور میں چپ چاپ عمل کر لینے کے سوا کبھی حقائق و شبہات کے متعلق کوئی حرف بھی منہ سے نہیں نکالا گیا یہ سراسر غلط ہے اور اسی طرح یہ بھی ایک خیال خام ہے کہ متکلمین وغیرہ دین کے علمی حصہ کو ان سے کچھ زیادہ سمجھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔

وقد دليل على انهم كانوا يرجعون في حل المشكل الى النبي صلى الله	اس واقعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو جو شبہات پیش
عليه وسلم ما يشكل عليهم من الاسئلة والشبهات	آتے وہ بار بار انھیں آپ کے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ ان کی
فيجيبهم عنها بما يثلج صدورهم وقد اوردوا عليه	تشفی کر دینے والے جوابات انہیں مرحمت فرمایا کرتے تھے یہاں تک
صلى الله عليه وسلم الاسئلة اعداؤه واصحابه	وہ دشمن کا فریق تو صرف سوال کرتا اور سب ہی کو جواب
اعداؤه تعنتا والمغالبة واصحابه للفهم و	دیا جاتا فرق صرف یہ تھا کہ دشمن جھگڑا کرتے اور صحابہ سمجھنے
البيان وزيادة الايمان وهو يجيب كلا عن سؤاله	کی فکر میں رہتے سو آپ کے صحابہ دین کی باتیں سمجھنے اور ایمان
الا ما لا جواب عنه كسؤال عن وقت الساعة[2]	سے زیادہ یقین حاصل کرنے کی فکر میں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی زبان سے کیف تحیی الموتیٰ (تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے) کا سوال ممکن ہے تو کسی کی زبان سے یہ بھی ادا ہو سکتا ہے۔ انّیٰ یحیی هٰذه اللّٰه بعد موتها (بھلا اس بستی کی اس طرح بربادی کے بعد اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ کہاں زندہ کرے گا) تو غریب صحابہ کرام کے سوالات پر کیا اچنبھا ہے۔ یہی وہ کس قدر ضروری ہے کہ ہم ان تمام شبہات کو پیش نظر رکھیں اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کلمات کو تلاش کریں جو حل ہوئے ان شبہات کے جواب میں یا خود قرآن کی مراد سمجھنے میں ذمہ دارانہ طور پر ادا فرمائے گئے[3]۔ جب ہم اس حیثیت پر غور کرتے ہوئے ہیں ایسی قدر حدیث کی ضرورت ہمیں اور عیاں ہو جاتی ہے

---

[1] زاد المعاد ج ۳ ص ۴۵۔

[3] مولانا آزاد صاحب رسول کے بیان کی اس اہمیت کو کم کرنے کے لئے تحریر فرماتے ہیں: حقیقت یہ ہے کہ قرآن خود مبین اور مفصل کتاب ہے جس کو اس کے اولین مخاطب یعنی صحابہ کرام بے تکلف سمجھتے تھے ۔ ۔ ۔ کل زمانۂ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہ نے جس قدر باتیں پوچھیں وہ امام رازی کے بیان کے مطابق ۱۴ اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کئے گئے ہیں۔ (دیباچہ حاشیہ ترجمان القرآن)

علیٰ ما جاء الرسول صلی اللہ علیہ وسلم و بیّنت المقصود منه لا انها معترضة علیه۔ کون السنة قاضیة علی الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ جب سنت کتاب اللہ کی مراد بیان کر دے تو اب کتاب اللہ کے اجمال یا لفظی احتمالات پر عمل نہ کیا جائے گا۔ ہم اس کی مزید توضیح کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔

مثلاً قرآن کریم نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا مقرر فرمائی ہے مگر یہ بیان نہیں فرمایا کہ کتنے مال چرانے کی یہ سزا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تفصیل نہیں کی کہ کتنا ہاتھ کاٹا جائے۔ ان احتمالات کو سنت نے صاف کر کے بتلا دیا کہ جس مال کی چوری سے ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے وہ مثلاً کم از کم دس درہم کی مقدار ہونا چاہئے نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال محفوظ ہو تاکہ چوری کا لفظ اس پر صادق آئے۔ اس کے بعد جب ہاتھ کاٹا جائے تو صرف پہنچے پر سے کاٹنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ احکام حدیث سے ثابت کئے گئے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ یہ احکام خود قرآن سے ثابت شدہ ہیں۔ مگر حدیث نے صرف یہ بتلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہاں مراد یہی تھی۔ جیسا کسی آیت کا مطلب اگر ہم امام مالکؒ سے دریافت کر لیں اور ان کے بیان کے موافق اس پر عمل کر لیں تو یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہم نے امام مالکؒ کے قول پر عمل کیا ہے بلکہ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ ہم نے قرآن پر عمل کیا ہے۔ پس جس طرح یہاں اصل حجت قرآن کریم ہی سمجھا جاتا ہے اور امام مالکؒ کو صرف مفسر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن و حدیث کا معاملہ ہے۔ یہاں بھی حدیث کی تفصیل کو مستقل کہنا غلط ہے بلکہ حدیث صرف یہ بیان کر دیتی ہے کہ یہاں قرآن کریم کی مراد یہ ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:

فکان السنة بمنزلة التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب (ج ۴ ص ۱۰)	گویا سنت، کتاب اللہ کے احکام کے لئے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے۔

حدیث کی یہی حیثیت امام اوزاعیؒ نے حسان بن عطیہ سے نقل فرمائی ہے اور یہی حیثیت عمران بن حصین رضی کے الفاظ میں آپ کے ملاحظہ سے گزر چکی ہیں۔ پس سلف اور خلف کے ان متفقہ الفاظ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث میں متن و شرح کا رشتہ ہے۔ ان میں ایک دوسرے کا مخالف نہیں بلکہ مبیّن و شارح ہے۔ کتاب اللہ بمنزلہ متن ہے اور حدیث اس کے لئے بمنزلہ شرح۔ اسی کی طرف آیت مذکورہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

---

[1] امام اوزاعیؒ کے کلام کی تشریح آپ پڑھ چکے اور مولانا اسلم صاحب کی زبان سے یہ بھی سن لیا ہے کہ وہ حقیقت حدیث کو قرآن پر فوقیت دیتے ہیں مگر مولانا اسلم صاحب نے جن کتابوں سے یہ مقولہ نقل فرمایا ہے ان میں سے کسی کا یہ مطلب بھی نظر نہیں آتا۔ مگر ہم یہ لکھتا ہے "آخر کار حدیث کا غلبہ بالخصوص یہ کہ قرآن کریم کے ساتھ اس کی اہمیت بڑھا دی گئی" (ص ۶)
اس کے جواب میں ہم صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ جیسا آپ نے فرمایا ہے حدیث نے قرآن کی حیثیت بڑھا دی نہ یہ کہ ہم نے رسول کے ایک بیان کی اور اہمیت بڑھا دی، مگر وہ اہمیت قرآن کے مخالف نہیں تو پھر کیا ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب لتبین للناس ما نزل الیھم۔ رسول کی یہی خدمت و فرض کہ یہاں بیان کیا گیا ہے اسی کا دوسرا نام حدیث ہے۔

احادیث رسول کے بیان ہونے کی تفصیل

احادیث میں قرآن کے مجمل احکام کی تشریح

اس ربط کی تشریح[1] کے لئے ہمیں قدرے اور تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں کہ سنت کیا ہے؟ وہ درحقیقت قرآن ہی کی دوسری ایک مفصل شکل ہے۔ یہ اس کے مجملات کی تفصیل، اس کی مشکلات کا بیان، اور اس کے مختصر اشارات کی شرح ہے۔ مجملات کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں روزہ، نماز، حج، زکوۃ بلکہ تمام عبادات و معاملات کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی۔ سنت نے اس اجمال کی تفصیل کی ہے۔ قرآن نے اگر نماز کا حکم دیا ہے تو سنت نے اس کی ایک ایک جزئی کی تفصیل کی ہے مثلاً شروع میں ہاتھ اٹھائے تو کس طرح، ہتھیلیوں کا رخ کس جانب رہے گا، کہاں تک اٹھائے، اٹھاتے وقت کیا کہے، پھر ہاتھ چھوڑ دے یا باندھے۔ اگر باندھے تو کہاں باندھے، بہرکیف عمل کے لئے ان تمام سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔ یہاں منکر حدیث تو ان سوالات میں کسی ایک کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ قرآن نے ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ مولوی اسلم صاحب البتہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرمائیں گے کہ اسوۂ رسول ان تمام تفصیلات کے جواب کے لئے کافی ہے مگر آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ جواب بھی قطعاً غیر تشفی بخش ہے۔ یہ امتیاز صرف اہل سنت کو حاصل ہے کہ وہ حدیث رسول کی مدد سے چھوٹی سی چھوٹی بات کا جواب دے سکتے ہیں وہ بھی تاریکی میں نہیں بلکہ پوری روشنی میں وہ اپنے ہر دعوی کے لئے اصولی طور پر ایک حدیث بلکہ ہر حدیث کے لئے سند اور ہر سند کے راوی اور ہر راوی کی پوری تاریخ پیش کر سکتے ہیں۔ گویا اس ذریعہ سے

---

[1] حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ احادیث کے ترتیب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو تین قسم کی حدیث نظر آتی ہیں (۱) بعض احادیث وہ ہیں جن میں بعینہ وہی حکم مذکور ہے جو قرآن میں مذکور کیا گیا ہے (۲) بعض میں کسی مجمل مضمون یا کسی لفظ کی تفسیر مذکور ہوتی ہے۔ ان دونوں قسموں میں آپ کی اطاعت کا کوئی خاص مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اگر احادیث یہی دو ہوتیں جب بھی یہ احکام قرآن میں مذکور ہونے کی وجہ سے واجب الاطاعت تھے پس یہ اطیعوا اللہ کے زمرہ کی اطاعت کہے جا سکتی ہیں۔

(۳) بعض احادیث میں جن میں وجوب و حرمت کے ایسے احکام مذکور ہیں جن سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے۔ ان ہی احکام کے ماننے کے لئے واطیعوا الرسول کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر یہ تیسری قسم واجب الاطاعت نہ ہو تو پھر خاص اطاعت رسول کا کوئی مصداق ہی نہیں نکلتا۔ خلاصہ یہ کہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کی پوری آیت پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب ہر دو قسم کی اطاعت کی جائے۔ قرآن کریم نے رسول کی مستقل اطاعت کو بھی خدا کی اطاعت کی دوسری شکل قرار دیا ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ رسول کی اطاعت ایک لحاظ سے خدا ہی کی اطاعت ہے۔

(اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲)

وہ اسوۂ رسول کو آج بھی دنیا کو دکھا سکتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ رسول نے قرآن کے اس اجمال پر کس طرح عمل کر کے دکھلایا تھا۔ حدیث کا ایک حصہ تو یہ ہے۔

احادیث میں مشکلات قرآن کا حل

اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں قرآنی مشکلات کا خود صاحبِ رسالت نے حل فرما دیا ہے اس کی چند مثالیں پہلے گذر چکی ہیں یہاں ایک مثال اور پیش کی جاتی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ — جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسکو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انکو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے

صحابہ کو سن کر بہت فکر ہوئی کیونکہ ان میں اگرچہ بیشتر غریب تھے لیکن کچھ مالدار بھی تھے ان کے پاس سونا اور چاندی کا جمع بھی رہتا تھا اور قرآن کی اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو سخت عذاب ہوگا اس لئے انھوں نے آپ سے استفسار کیا آپ نے فرمایا کہ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھے ہو، جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نہ دی جائے جس مال کی زکوٰۃ دی جائے وہ کنز اور خزانہ کی تعریف میں نہیں آتا، اور ان کی مزید تسلی کے لئے فرمایا۔

ان اللہ لم یفرض الزکوٰۃ الا لیطیب بھا ما بقی من اموالکم۔ — اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ اسی لئے تو لازم کی ہے تاکہ تمہارا باقی مال پاک و صاف ہو جائے۔

اگر شریعت میں مطلقاً مال جمع کرنا حرام ہوتا تو میراث کی آیت کا مطلب کیا ہوتا جب قرآن نے میت کے مال تقسیم کرنے کا قانون خود بتایا ہے تو یہ اس کی صاف دلیل ہے کہ اس نے کسی حد تک مال جمع کرنا بھی جائز قرار دیا ہے کیونکہ مال کی تقسیم کا قانون اسی وقت نافذ ہو سکتا ہے جب پہلے مال موجود ہو، اگر مال نہ ہو تو تقسیم کس چیز کی کی جائے گی۔ یہ سن کر صحابہ کرام کا شبہ حل ہو گیا اور مال جمع کرنے کے حدود بھی انھیں معلوم ہو گئے اگر سنت نہ ہوتی تو یہ بیان کہاں سے آتا۔ حدیث کی دوسری قسم یہ تھی۔

احادیث میں قرآن کی تفسیر

تیسری قسم ان اشارات کی تفصیل ہے جو نظم قرآنی میں متفرق موجود ہیں جیسے (۱) وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا (وہ تین شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ جنگ میں شامل نہ ہونے سے پیچھے رہ گئے تھے) یا اور اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جو قصص میں جب تک وہ پورا واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا پورا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا حدیث میں ان قصوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔ قصوں کے علاوہ بعض تفسیری اجزاء بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جن کے بغیر قرآن کا پورا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں تفسیری اجزاء سے ہماری مراد حسب ذیل امور ہیں۔

(۲) فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ (جنھوں نے ظلم کیا تھا انھوں نے جو کلمات

کہنا انھیں بتائے گئے تھے وہ بدل ڈالے) قرآن میں وہ کلمات مذکور نہیں جن کے کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ۔ جب دروازہ میں داخل ہو تو حطۃ کہنا (اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے) لیکن حدیث میں آکر جو بدل اور گستاخانہ کلمات انھوں نے کہے وہ اس قابل کب تھے کہ قرآن ان جہالات کو بھی نقل کرتا۔ رسول نے ان کو بیان کر کے اس اس قوم کے تمرد اور سرکشی کا اظہار فرمایا ہے۔ قالوا حبۃ فی شعرۃ یعنی حطہ کی بجائے انھوں نے حبۃ فی شعرۃ کا مہمل کلمہ کہنا شروع کیا۔

(۳) مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور تمہارا رسول تمہارے لئے گواہی دے) قرآن کی یہ آیت واقعی طلب ہے حدیث نے اس کی تشریح کی کہ جب قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں آئیں گی تو اس وقت انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ دین کا سوال کیا جائیگا ان کی قوم جھوٹ بول دے گی اور کہے گی۔

مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ — ہمارے پاس تو نہ کوئی خوشخبری سنانے والا آیا نہ ڈرانے والا۔

رسولوں سے پوچھا جائے گا تمہارا کوئی گواہ ہے وہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت۔ اس وقت یہ امت آکر ان رسولوں کے لئے گواہی دے گی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی امت کے لئے گواہی دیں گے۔

(۴) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (ہم نے آپ کو سبع مثانی مرحمت کیں اور قرآن عظیم دیا) حدیث نے تفسیر کی کہ سبع مثانی سورۂ فاتحہ ہے۔

(۵) حدیث کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس سے قرآن کریم کا شان نزول معلوم ہوتا ہے اگر وہ معلوم نہ ہو تو قرآن کریم کی مراد ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ خوارج کا تمام مذہب اسی سوء فہم پر مبنی تھا وہ ان سب آیات کو جو کفار کے حق میں تھیں مسلمانوں پر چسپاں کر کے ان سے جہاد کرنا لازم سمجھتے تھے۔ ہم یہاں اس کی ایک مثال لکھتے ہیں۔ مروان نے اپنے ایک خادم کو حضرت ابن عباس کی خدمت میں بھیجا اور ان سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا

وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا — اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کئے اس پر ان کی مدح سرائی کی جائے۔

اور یہ اشکال یہ ہے کہ اگر بعض ہی خصلت پر عذاب ہونا لازم ہو تو غالباً ہر انسان کے دل میں پوشیدہ طور پر یہ خواہش موجود ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ بہت سے وہ کام جو وہ نہیں کرتا لوگ سمجھیں کہ وہ کرتا ہے اور اس پہلو کی تعریف کا متمنی رہتا ہے۔ اس لحاظ سے تو اکثر لوگ عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم لوگوں کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں اتری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تورات کی کوئی بات دریافت کی انھوں نے انتہائی شرارت سے اس کو چھپا لیا اور دوسری بات آپ کو بتلا کر یہ امید کی کہ آپ ہمارے مشکور رہیں گے اور ہماری تعریف کریں گے اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوگئی اور ان کا فریب اور دھوکا دہی کھول دی گئی۔ [1]

ہمارے مضمون کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو حدیثیں بظاہر قرآن کریم سے باہر کی ہوتی ہیں ان کے متعلق کچھ تشریح کردی جائے۔ یہاں جو بحث سنت سے کتاب اللہ پر زیادتی کے متعلق حافظ ابن قیم نے فرمائی ہے قابل مراجعت ہے۔ [2]

یہ واضح رہنا چاہئے کہ جب قرآن کی حیثیت بلحاظ افادات اصول ہے تو اب یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر جزئی اس میں مذکور ہو۔ اگر ایسا ہو تو نہ حدیث کی ضرورت رہے نہ رسول کی صرف خدا کی کتاب بلا واسطہ اتار دی جائے اور وہی تمام ضروریات کے لئے کافی ہو جائے۔ جب ایسا نہیں کیا گیا بلکہ کتاب کے بیان کے لئے اس کے ساتھ ایک رسول بھی بھیجا گیا تو یہ ضروری ہوا کہ قرآن کو صرف ایک اصولی قانون بنا دیا جائے اور اس کے فروعات کی تشریح رسول کے سپرد کردی جائے یہ تشریحات تمام کی تمام خدا کی مراد کے مطابق ہوں گی مگر سب رسول کی زبان سے ہوں گی۔

احادیث رسول کو بیان کہنے کے چند اصول اور قواعد

ان تمام تشریحات کو قرآن کا بیان سمجھنے کا ایک کلی طریقہ تو وہ تھا جو حضرت ابن مسعود کی زبان مبارک سے آپ نے سنا یعنی جب قرآن میں اجمالاً یہ حکم دیا گیا کہ رسول جو کچھ دے اسے قبول کرو تو اسی ایک قانون میں احادیث صحیحہ کا تمام ذخیرہ آگیا اس لئے جب کسی صحابی کو آپ نے

---

[1] سوال کا منشا صاحب شاید یہ فرمائیں گے کہ یہ سب تاریخی امور ہیں بطور تاریخی امور میں حدیث ہمارے نزدیک بھی حجت ہو سکتی ہے مگر خود سوال یہی ہے کہ اگر ان احادیث کی ساتھ اس درجہ بھی جا سکتی ہیں کہ قرآن کی تفسیر میں پیش کی جا سکیں تو حلال و حرام کی آیات میں وہ اس درجہ کیوں نہیں سمجھی جا سکتیں کہ قطعیت کو مفید ہوں گی حیثیت کو مفید ہو تو آپ کو بھی تسلیم ہے۔ اس تفسیر کم سے کم اتنا تو ثابت ہو ہی جانا چاہئے کہ حلال و حرام کے متعلق بھی آپ نے کچھ نہ کچھ تفصیلات ضرور فرمائی تھیں اس کے ساتھ ہی اگر اس قسم کی تمام احادیث کو آپ ایک جگہ جمع کرلیں تو یہ حدیث اپنی جگہ گو خبر واحد ہوں گی مگر ان سب کے مجموعے سے کیا یہ یقین حاصل نہیں ہوتا کہ حلال و حرام کے متعلق بھی آپ نے کچھ تفصیلات ارشاد فرمائی تھیں پھر ان تمام مجموعے سے جو یقین حاصل ہوتا ہے اس کے رد کرنے کے لئے کیا ایک حدیث کی ظنیت ثابت کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ پھر آپ کو تو ان کی ظنیت کا بھی اقرار نہیں۔ آپ کے نزدیک تو یہ سب احادیث موضوعات کا ذخیرہ ہیں۔ معلوم نہیں کہ جب وہی راوی وہی سند حلال و حرام کے سوا دوسری جگہ آتی ہیں تو مفید ظن ہو جاتی ہیں اور جب حلال و حرام کے باب میں آتی ہیں تو بجائے مفید ظن ہونے کے یقینی موضوع کیسی بن جاتی ہیں۔ کیا یہ انصاف ہے اس لئے انھیں اس کا تو ذرا لحاظ چاہئے کہ حلال و حرام کے بارے میں بھی آپ نے بہت کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ جنھیں ظنی ہونے کی وجہ سے ہم تسلیم نہیں کرتے بغیر انکار کرنا بڑا ظلم ہے۔

[2] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۱۱ تا ۴۴۹

کوئی حکم دیا تو انھوں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ بات قرآن میں کہاں لکھی ہے۔ البتہ زمانۂ نبوت کے دور کے
بعد یہ سوالات ضرور کئے گئے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت تک حدیث متفرق طور پر لوگوں کے پاس تھی
قرآن کی طرح پورے کا پورا ذخیرہ بلا بحث و تفتیش کئے ہر شخص پر واجب التسلیم نہ تھا ہاں جب یہ ثابت ہو جاتا
کہ یہ آپ کا فرمان ہے تو اس کے بعد کبھی کسی کا پس و پیش کرنا ثابت نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان تشریحات کو قرآن کی مجمل آیات کی تشریح یا تفسیر کہا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں کبھی دو قسم کے احکام ہوتے ہیں اور کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس کے متعلق
یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس میں درج کی جائے اس لئے اس کا محل معلوم نہیں ہو سکتا۔ احادیث یہ فیصلہ
کر دیتی ہیں کہ یہ چیز ان دو حکموں میں سے فلاں حکم میں درج ہونے کے قابل ہے اور اس طرح یہ احادیث اس کا
بیان کہی جاتی ہیں مثلاً

تیسرے قاعدہ کی چند مثالیں

قرآن نے حلال و حرام کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ یہ بیان فرمایا ہے کہ جو طیبات ہیں وہ
حلال ہیں اور جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں لیکن اب درندے اور شکاری پرند اور گوشت خور جانور
وغیرہ کے متعلق یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس نوع کو کس حکم میں درج کیا جائے حدیث نے اس کو بیان
کر دیا کہ پہلی قسم خبائث میں داخل ہے اور دوسری طیبات میں۔ اب منکر حدیث تو یہ سمجھتا ہے کہ ذی ناب من
السباع اور ذی مخلب من الطیر کی حدیث قرآن کے مخالف ہے مگر منصف شخص جانتا ہے کہ یہ عین قرآنی
مسئلہ ہی کی تشریح اور اسی کا بیان ہے۔ اگر یہاں طیبات اور خبائث کی تشریح صرف عقل کے سپرد کی جاتی
تو دوام خود عقل کی جماعت تمام خبائث کو طیبات کہہ کہہ کر حلال بنا ڈالے۔ موجودہ دور میں شراب کو بھی کسی معین
مقدار میں بہت مفید صحت سمجھا گیا ہے۔ پھر ایسا حرام کرتا ہے جس میں کوئی نہ کوئی نفع نہ ہو ایسے خوشنما نتیجوں
کے دور میں یہ فیصلہ صرف عقل انسانی پر چھوڑنا مقصد شریعت ہی کو فنا کرنا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے پینے کی چیزوں میں جو مسکر اور نشہ آور نہیں حلال فرمائی ہیں اور جو نشہ آور ہیں حرام کی ہیں
درمیان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو تھوڑی پی جائیں تو نشہ پیدا نہیں کرتیں اور زیادہ مقدار میں استعمال کی جائیں تو
نشہ پیدا کر سکتی ہیں حدیث نے سد باب کرنے کے لئے ان کو پہلی قسم میں درج کر دیا اور فرمایا۔

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ جو بہت نشہ دے تو وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔

(۳) قرآن کریم نے سکھائے ہوئے شکاری کتے کا شکار حلال قرار دیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شکاری نہ ہو
اس کا شکار حرام ہے۔ لیکن اگر شکاری اپنے شکار کو کھا لے تو اس کا کیا حکم ہے یہ تردد ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ کتا
معلم ہو چکا ہے تو اس کا شکار حلال ہونا چاہئے اور اگر اس طرف نظر کی جائے کہ اس کا خود شکار رکھ لینا اس کی

دلیل ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا یا نہیں رہا تو اُسے حرام ہونا چاہئے۔ حدیث نے اس کو واضح کر دیا کہ اس کا شکار حرام ہے کیونکہ اس کا کھانا اس کی دلیل ہے کہ اس کی تعلیم میں قصور ہے۔

(۴) قرآن کریم نے محرم کو مطلقاً شکار کرنے سے منع فرمایا ہے اور جو عمداً شکار کرے اس پر جزاء واجب کی ہے اور غیر محرم شخص کو مطلقاً شکار کی اجازت دی ہے لہٰذا اس پر کوئی جزاء واجب نہیں کی۔ اب اگر کوئی محرم غلطی سے شکار مار دے اس کا حکم زیر بحث ہو گیا۔ سنت نے واضح کر دیا کہ یہاں عمد و خطاء کا کوئی فرق نہیں۔ دونوں صورتوں میں جزا دینا ہے ہاں خطا میں گناہ نہیں۔ امام زہری سے اسی طرح منقول ہے

(۵) قرآن نے دریائی اور سمندر کا شکار حلال قرار دیا ہے مردہ جانور کو حرام فرمایا ہے لیکن اگر سمندر کے شکار میں مچھلی مر جائے تو کیا وہ بھی مردار ہونے کی وجہ سے حرام ہو گی آپ نے فرمایا کہ دریا کے شکار کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس کا شکار مر جائے تو حلال ہے۔

ان تمام مثالوں میں دو مختلف اصول واضح تھے سنت نے صرف یہ بتا دیا ہے کہ یہ جزئی ان دونوں حکموں میں سے کس حکم کے تحت میں مندرج ہونے کے قابل ہے۔ سوچئے کہ اگر ان مقامات پر صرف عقل انسانی کو حکم مقرر کر دیا جاتا تو بہتر تھا یا رسول کی معرفت خدا نے اپنی مراد خود بتا دی یہ بہتر ہوا۔ مالکم کیف تحکمون۔

حدیث رسول کے بیان ہونے کا ایک سلسلہ اور اس کی مثالیں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک حکم کسی علت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے حدیث اس علت کے لحاظ سے کچھ جزئیات اس حکم کے تحت میں اور داخل کر دیتی ہے مثلاً

(۱) قرآن نے ربوا یعنی سود حرام فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں سود کی صورت یہ تھی کہ قرض خواہ قرضدار سے کہتا کہ یا تو قرض ادا کر دو ورنہ مجھے بجائے دس کے پندرہ روپیہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کو قرآن نے اس لئے حرام قرار دیا کہ یہاں بلا وجہ اپنے بھائی سے ایک زیادتی وصول کرنا لازم آتا ہے۔ اسی کے مناسب حدیث نے قرض میں ہر قسم کا نفع حاصل کرنا منع فرما دیا ہے اور اس کو بھی ایک قسم کا سود قرار دیا ہے مثلاً اگر ایک شخص نے کسی کو دو ہزار روپیہ قرض دیا اب اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس دباؤ میں اس کے مکان میں مفت رہا کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اضافہ ہے جو وہ اپنے قرض کے دباؤ میں بلا عوض حاصل کر رہا ہے۔ عقل انسانی یہاں مختلف فیصلے کر سکتی تھی پھر عقل کے ساتھ دوسرے احتمالات کی موجودگی بھی صحیح رائے قائم کرنے میں حائل ہو جاتی ہے اس سے کیا یہ بہتر نہ ہوا کہ رسول نے ایک کھری کھری بات بتا دی۔

(۲) قرآن کریم نے دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے اس کی علت یہ ہے کہ اس وجہ سے ان میں نفرت و قطع رحمی پیدا ہو جائے گی اور دو بہنوں میں جو شرف صلہ رحمی واجب تھی وہ نکاح کے اس علاقہ کے بعد

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو دکھائے۔

رسول کی بات کو یہ رتبہ اس لئے حاصل ہے کہ ہمارے نبی خدا کی طرف سے بھیجا ہوتا ہے پس جو اصول کہ خدا نے بتائے یا اس کے رسول نے اس کی کتاب سے خدا کی ارادے کے بموجب سمجھے وہ کل دو سب خدا ہی کی طرف سے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض تو ان کے الفاظ میں الٰہی الفاظ ہیں اور بعض کے مفہوم خدا و رسول کے ہیں مگر وہ بھی بالآخر خدا تعالیٰ کی منشا کے مطابق اور اس کی ارادے کے تحت ہوتے ہیں۔ دین کی اس طرح تکمیل ہی رسول کے علوم و کمالات کے اظہار کے سوا رشتہ حکمت بھی ہو سکتا۔ دین کا ایک ایک جزء صرف قرآن ہی میں آجاتا تو تمام اجزاء اہمیت میں یکساں ہو جاتے اور شاید یہ قانون کے خلاف ہے وہ چاہتا ہے کہ دین میں سہولت رکھی جائے اس لئے کچھ مسائل تو منصوص ہو گئے اور عمل درجہ سے قطعی سمجھے گئے۔ ان میں کسی کو خلاف کرنے کی گنجائش ہی نہیں دی گئی اس کے بعد دوسرے نمبر کے مسائل حدیث سے ثابت ہوئے وہ قطعیت میں پہلی قسم سے کچھ کم ہو کر انہوں نے اختلافات نے یہاں کچھ اور وسعت پیدا کر دی اس کے بعد احادیث کے اشارات کو جب فقہ نے پھیلایا تو وہ مسائل اجتہادی کہلائے اور چونکہ یہاں خدا کی ارادہ کا رشتہ بھی نہ تھا اس لئے خلاف اور خلاف کو یہاں پوری وسعت مل گئی یہ تینوں مراتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی موجود تھے مگر علم کا خلاف کبھی معاف نہیں کیا گیا اور اجتہادی غلطی پر کبھی گرفت نہیں کی گئی۔ ان اختلاف مراتب کی وجہ سے دین ایک نہایت معتدل صورت میں مکمل ہو گیا ہے اور چھوٹی تمثیل ضرورت پر حاوی بھی ہے پھر اتنی وسعت بھی رکھتا ہے کہ معمولی فروگذاشت انسانی ضعف سب اس میں کھپ سکتا ہے۔ معتزلہ نے دین کو محدود کر کے اپنے خیال میں تمام تر قطعی بنیادوں پر قائم کر دیا مگر نتیجہ کیا ہوا؟ آخر انہیں مرتکب کبیرہ کو دائرہ اسلام سے خارج کہنا پڑا۔ خوارج نے دین کی تمام بنیاد قرآن پر قائم کرنے کا ارادہ کیا آخر انہیں بھی مسلمانوں کو کافر بنانا پڑا۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ تمہارے لئے دین میں کوئی وسعت باقی نہ رہے۔

اتباع قرآن کے مفہوم میں ایک غلط فہمی

مولانا اسلم صاحب کو یہاں چند آیات کے مفہوم سمجھنے میں خواہ مخواہ کے لئے غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے وہ آیات ذیل کے متعلق یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان میں صرف قرآن ہی کو دستور العمل بنانے کا حکم ہے اور اس لئے حدیث پر عمل کرنا ان کے خلاف ہے حالانکہ ان آیات کو حدیث سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ان سب آیات کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خدا کے حکم کو چھوڑ کر خواہشات نفس کی پیروی کرنا یا دوسرے لوگوں کی رائے کی اتباع کرنا نہیں چاہئے۔ مولانا اسلم نے ان کا ترجمہ خواہشات نفس اور عوام کالانعام سے بھر کر خود

ل حافظ ابن قیم نے "بما اراک اللہ" کے لفظ میں ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں "بما رأیت" اسی لئے نہیں فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اصابت صرف خدا اور اس کے رسول ہی کا حق ہے کہ رسول کی زبان پر تو اللہ کی طرف سے کوئی غیر غلط بات اس کی اپنی بھی خدا کی ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

(اعلام ج ۱ ص ۱۴۹)

اللہ تعالیٰ کے رسول ہی کی طرف بھیجی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ — اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے

وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ — اتارا گیا ہے اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

یہاں من دونہ اولیاء میں رسول کو بھی داخل کر لینا قرآن سے انتہائی بیگانگی کی دلیل ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں رسولوں کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ رسول خود اللہ تعالیٰ کے داعی ہوتے ہیں قرآن نے کبھی ان کو مخالف یا بالمقابل میں شمار نہیں کیا اور اسی بات کے صاف کرنے کے لئے کہ رسول کی اطاعت من دون اللہ کی اطاعت نہیں بلکہ اللہ کی ہے صاف طور پر فرما دیا کہ

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ — جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

پس رسول کی اطاعت کو من دون اللہ کی اطاعت کہنا خود قرآن کے صریح خلاف ہے چہ جائے کہ اس پر بنا قرآن سے استدلال کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر غلط فہمی یہ ہے کہ جن آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی اتباع کا امر فرمایا گیا ہے وہ حدیث کی اتباع کے خلاف سمجھی جائیں۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ — اس کی پیروی کیجئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی گئی

یہاں شاید وحی کے لفظ سے صرف قرآن مراد لیا گیا ہے حالانکہ قائلین حدیث حدیث کو بھی ایک قسم کی وحی کہتے ہیں۔ رسولوں پر کتاب اللہ کے علاوہ اور بھی بہت سے قسم کی وحی اترا کرتی ہے حتیٰ کہ بعض انبیاء پر کوئی کتاب نازل ہی نہیں ہوئی اور یقیناً وحی ان پر بھی اتری ہے پس قرآن اور حدیث کے دو مختلف نام اتباع کے طبقہ میں ہیں رسول کے حق میں چونکہ دونوں بذریعہ وحی ہیں اس لئے دونوں ما اوحی الیک من ربک میں داخل ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی بادشاہ نے ایسا نہیں کیا کہ پہلے اپنے کسی معتمد شخص کو اپنا سفیر مقرر کر لیا ہو پھر بحالت سفارت ہی اس کے متعلق ایسے احکام بھی بھیجے ہوں جو اس پر بد اعتمادی کی مہر لگا دیں۔ اگر من دون اللہ کی اطاعت میں رسول بھی داخل مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اپنے رسول پر بھی یہ شبہ ہے کہ وہ دنیا میں جا کر شاید میرے احکام کے سوا اپنی اتباع کی دعوت دے سکتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ سے ایک طرف تو مخلوق کو اپنی اطاعت کے احکام دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تنبیہ کر دیتا ہے کہ رسول کی اتباع مت کرنا کیونکہ وہ من دون اللہ کی اتباع ہوگی اگر درحقیقت رسول کی اطاعت خدا کے مخالف اطاعت ہے تو پھر آیت ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی کا کیا مطلب ہے۔ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی محبت کا معیار قرآن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ رسول کی اتباع کی جائے۔ جو قرآن میں تاکید کے ساتھ رسول کی اتباع کا حکم دے رہا ہے بھلا وہ اسکی اتباع کو من دون اللہ کی اتباع کب کہہ سکتا ہے۔ اگر منکرین حدیث یہ سمجھ لیتے کہ خدا اور رسول کا رشتہ

ناقابل انفصال ہے۔ جہاں اطاعت و معصیت میں تفریق سمجھنا ہی غلط ہے تو حدیث و قرآن میں بھی تفریق پیدا نہ کرنی چاہئے۔ اب آئیے دوسری قسم کی آیات ملاحظہ فرمائیے جو اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ یہ آیات اتباع اہواء سے روکنے کے لئے نازل ہوئی ہیں نہ کہ اتباع رسول سے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا — پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک راستہ پر لگا دیا تو آپ اسی پر چلتے رہئے اور

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ — ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جو علم نہیں رکھتے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اتباع شریعت کا امر لوگوں کی خواہشات کی اتباع سے روکنے کیلئے دیا گیا تھا نہ کہ حدیث کی اتباع سے۔ جو نبی کہ لوگوں کے تمام معاملات میں حکم مقرر کیا گیا ہو اس کے پاس ہر طرح کی قسم کے لوگ ہر اعلیٰ قسم کے مقدمات آتے ہوں، ہر شخص اپنی اپنی چرب زبانی سے اپنے مدعا کی طرف مائل کرنا چاہتا ہو تو اسے ربانی تربیت اسی قسم کے تاکیدی موضوع پر تنبیہ کرتی رہتی تھی کہ خبردار رہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا — اگر یہ لوگ آپ کے کہنے کے مطابق کر کے نہ دکھائیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ صرف

يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ — اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

یہاں حصر کے طور پر بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کا اتباع نہیں کرتے ان کے متعلق یہ یقین کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی خواہشات ہی کا اتباع کرتے ہیں۔ غرض تمام قرآن میں کہیں رسول کی اطاعت کا امر مستقل طور پر دیا گیا ہے کہیں اس کی اطاعت کو عین خدا کی اطاعت کہا گیا ہے اس کے خلاف ایک آیت میں بھی اس کی اطاعت کی ممانعت نہیں کی گئی اور جہاں صرف قرآن یا وحی کے اتباع کا امر کیا گیا ہے وہاں کسی شبہ تردد کے بغیر نفسانی خواہشات اور شیطانی حکم کے خلاف اتباع کرنے کی ممانعت مقصود ہے۔

حدیث کی تشریعی حیثیت

قرآن و حدیث کا ربط معلوم کر لینے کے بعد اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حدیث کی حیثیت صرف تشریعی حیثیت ہے کیونکہ احادیث کا تمام ذخیرہ قرآن کریم کا بیان اجمال کی شرح ہے۔ بس اگر قرآن کی حیثیت تشریعی ہے تو اس کے بیان کی حیثیت بھی تشریعی ہونی چاہئے۔ یہی عقیدہ صحابہ کرام سے لے کر آج تک تمام امت کا ہے۔ حدیث کا انکار اگرچہ ہدایت کا انکار ہے مگر حدیث کو تسلیم کر کے اس کی تشریعی حیثیت کا انکار اس سے بڑھ کر ہدایت کا انکار ہے۔ احادیث کا بڑا حصہ اگرچہ متواتر نہیں مگر یہ عقیدہ بلاشبہ متواتر حیثیت سے ہے کہ مسلمانوں میں حدیث کی حیثیت ہمیشہ تشریعی حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور کوئی فرد مسلمان اس بارے میں دو رائیں نہیں رکھتے۔ کیا یہ کوئی باور کر سکتا ہے کہ سلف و خلف سے لیکر آج تک لیل و نہار حدیث کے حفظ کا یہ شغل صرف ایک تاریخ کی حیثیت سے تھا۔

عہد صحابہ میں حدیث کی حیثیت

اس موضوع کے روشن پہلو یہ واقعات ہیں جن سے صحابہ کے دور میں حدیث کی

تشریعی حیثیت واضح ہوتی ہے اور اس کا دوسرا پہلو یہ واقعات ہیں جن سے اس کے خلاف نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک صحابہ کے دور میں حدیث کی تشریعی حیثیت کا ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر گفتگو کرنا بھی اس کو نظری بنانا ہے۔ ہمارے علم میں ایک واقعہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ان کے نزدیک حدیث کی حیثیت تاریخی حیثیت تھی بلکہ انکار حدیث کا پہلا قدم ہی اس کی دلیل ہے کہ اس وقت حدیث کی تشریعی حیثیت تسلیم کی جاتی تھی۔ اگر حدیث صرف ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی اور دین کے حلال و حرام سے اس کا کوئی سروکار نہ ہوتا تو معتزلہ کو حدیث کے انکار کی کوئی وجہ ہی نہ تھی پھر معتزلہ کی ایک بڑی جماعت نے جب صحیح حدیث کے لئے حجت ہونا شرط کیا تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اگر بحث تھی تو حدیث کی ظنیت و قطعیت کے متعلق تھی نہ کہ تشریعی یا تاریخی حیثیت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف آپ کے دفن کے متعلق ہوا لیکن کیا اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ اس حدیث کے سوا جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے پڑھ کر سنائی کسی اور دلیل سے کیا گیا تھا کیا تاریخ سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ایک آدھ تاریخی حدیث کہ اس فیصلہ کے خلاف اختلاف کی بجائے سب نے اسی کو تسلیم کیا اور اسی کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین عمل میں آئی۔ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ حضرت عمرؓ چونکہ مدینہ سے باہر رہتے تھے اس لئے انہوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ ایک دن وہ خود آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور آپ سے احادیث سنتے دوسرے دن اپنے ایک پڑوسی کو بھیجتے وہ آتا اور اس دن کی احادیث سن کر حضرت عمرؓ کو پہنچا دیتا۔ کیا یہ اہتمام ایک معمولی تاریخ کی حفاظت کے لئے ہی کیا گیا تھا اس کے علاوہ خلیفہ اول سے لیکر خلفاء کے آخری دور تک جب کبھی فقہی اور سیاسی نزاع پیش آئے تو ہمیشہ جانبین سے قرآن و حدیث ہی پیش کی گئی ہیں حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ میں بھی دونوں طرف سے اپنی اپنی حقانیت میں حدیثیں ہی پڑھی گئی ہیں۔

صحابہ کی نظر میں احادیث کی اہمیت کی چند مثالیں

(۱) حضرت صدیق اکبرؓ نے جب مانعین زکوٰۃ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ اس میں مانع ہوئے اور ان کے خلاف میں حدیث ہی سے استدلال فرمایا حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس کے سامنے گردن تسلیم خم کر دی۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے پوتے کے ترکہ میں حصہ مانگنے لگی انھوں نے فرمایا کہ میں تیرا حصہ کتاب اللہ میں نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا ہے فرمایا کہ تمہارے اس قول پر کوئی شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے دادی کو چھٹا دلوایا ہے آپ نے ان کی شہادت پر فیصلہ کر دیا۔

(۳) حضرت عثمان غنیؓ نے ....

فریعہ بنت مالک بن سنان کے پاس آدمی بھیج کر ان سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا حکم دیا تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ آپ نے اسی گھر میں عدت گذارنے کا حکم دیا تھا تو اسی کے موافق انہوں نے بھی فیصلہ صادر کردیا۔

(۴) حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہیں ملنی چاہیے لیکن جب ضحاک بن سفیان نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت زوج سے بھی وراثت دلوائی ہے تو اپنے قول سے رجوع فرمایا۔

(۵) مجوس سے جزیہ لینے کے متعلق حضرت عمرؓ کو تردد تھا لیکن جب عبدالرحمن بن عوف نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس ہجر سے جزیہ لیا ہے تو انہوں نے اپنے خیال سے رجوع فرمایا۔

(۶) طاؤس روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر پیٹ میں کسی عورت کا حمل ساقط ہوجائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہیے تو حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ دو عورتوں میں لڑائی ہوئی ایک نے دوسرے کے خیمہ کی چوب ماری جس کے صدمہ سے دوسری عورت کا حمل ساقط ہوگیا۔ مقدمہ آپ کے سامنے آیا آپ نے اس پر ایک مولود کو بطور دیت لازم فرمایا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔

(۷) حضرت ابن عمرؓ مخابرہ (مزارعت کی ایک صورت ہے) کیا کرتے تھے جب رافع بن خدیجؓ نے اس کی ممانعت روایت کی تو انہوں نے مخابرہ کرنا چھوڑ دیا۔

(۸) حضرت زید بن ثابتؓ حائضہ کے لیے بھی طواف صدر کرنا واجب سمجھتے تھے لیکن جب ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف صدر ترک کرنے کی اجازت دی ہے تو اپنے قول سے رجوع کرلیا۔

(۹) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں ایک غلام فروخت ہوا بعد میں مشتری کو اس میں کوئی عیب نظر آیا اس نے واپسی کا دعویٰ کیا تو مشتری نے یہ کہا کہ غلام کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوئی اس میں جھگڑا ہوا تو عمر بن عبدالعزیزؒ کی رائے یہ ہوئی کہ وہ آمدنی بائع کو دی جائے لیکن جب حضرت عروہؓ نے اسی قسم کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ نقل کیا کہ آمدنی مشتری کو ملنی چاہیے کیونکہ اس درمیان میں اگر غلام مرجاتا تو نقصان مشتری کا ہوتا لہٰذا جس کا نقصان ہو نفع بھی اسی کو ملنا چاہیے۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی رائے سے رجوع کیا۔

یہ تمام واقعات کتب سنن مشہورہ میں موجود ہیں اور امام شافعیؒ نے ان کو بہ سند روایت کیا ہے۔ چونکہ ان کی

غرض یہاں ان مسائل کا اثبات نہیں صرف تاریخی حیثیت سے بتانا ہے کہ صحابہ کے درمیان حدیث کی حیثیت کیا سمجھی جاتی تھی اس لئے ہم نے ان کی سند کے متعلق کلام کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اگر محدثین نے یہ واقعات کسی ایک باب کے تحت میں شمار کئے ہوتے یا یہ واقعات ایک ہی صحابی سے ہوتے تو شاید یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ عمداً اسی مقصد کے پیش نظر کسی نے وضع کر دیئے ہوں مگر جب قتال، حج، جنایت، بیع، وراثت، عدت، مزارعت، غرضکہ شریعت کے تمام ابواب میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن سے حدیث کی حیثیت صرف تشریعی ثابت ہوتی ہے پھر کسی ایک دور میں نہیں بلکہ ہر دور میں یہی عقیدہ ثابت ہوتا ہے حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت تک ہر دور میں حلال و حرام کے مسائل میں ہمیشہ حدیثیں ہی پیش کی گئیں تو اب حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار آنکھوں میں خاک جھونکنا نہیں تو اور کیا ہے۔

(۱۰) بلال حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ان کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے عورتوں کو مسجد میں نماز کے لئے جانے سے روکنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ لیکن اب زمانہ نازک ہے میں تو اپنی بی بی کو روک دوں گا۔ ابن عمرؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور تین مرتبہ لعنک اللہ فرمایا کہ تیرے کان میں یہ نہیں پڑا میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تو یہ جواب دیتا ہے بعض روایات میں ہے کہ پھر ان سے ابن عمرؓ نے عمر بھر بات نہیں کی۔

(۱۱) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے۔ عروہ نے عرض کیا کہ شیخین تو تمتع کی ممانعت کرتے تھے اس پر حضرت ابن عباسؓ کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام لیتے ہو میرا گمان ہے کہ ان باتوں سے تباہی آئے گی۔

(۱۲) ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ مجھے امیر معاویہؓ کے بارے میں کون معذور رکھے گا کہ میں ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث روایت کرتا ہوں وہ دوسرے مجھے اپنی رائے بتاتے ہیں جہاں وہ رہیں اب میں اس سرزمین پر رہنا بھی پسند نہیں کرتا۔[1]

اگر اس قسم کی احادیث جمع کی جائیں تو مستقل ایک تصنیف بن سکتی ہے مگر ہم نے صرف چند واقعات اس لئے پیش کئے ہیں کہ مولوی اسلم صاحب کا یہ سمجھنا کہ صحابہ کے دور میں بھی حدیث کی حیثیت تاریخی ہی سمجھی جاتی تھی صحابہ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ ان کی تاریخ کا ایک ایک ورق اس کی تردید کرتا ہے۔

حدیث کی تشریعی حیثیت کا ایک اور ثبوت

اس کے علاوہ ابو عمرؓ نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے کہ بعض تابعین بے وضو روایت حدیث نامناسب سمجھتے تھے۔ ضرار بن مرہ فرماتے ہیں ہمارے زمانہ میں دستور یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وضو کے بغیر بیان کرنا مکروہ سمجھا جاتا تھا۔ اعمش کا طریقہ یہ تھا کہ اگر انہیں بے وضو حدیث

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۲۔

بیان کرنے کی نوبت آئی تو تیمم کر لیجئے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ بلا وضو نماز میں حدیث بیان کرنے کے لئے وضو کرنا مستحب سمجھا جاتا تھا۔ شعبہ فرماتے ہیں کہ قتادہ وضو کئے بغیر حدیث کی روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جعفر بن محمد جب حدیث کی روایت کرتے تو باوضو کرتے۔ ابو مصعب فرماتے ہیں کہ خود امام مالکؒ کا طریقہ بھی یہی تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابی الزناد فرماتے ہیں کہ ایک دن سعید بن المسیب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ اس وقت بیمار تھے اور لیٹے ہوئے تھے فرمایا مجھے بٹھاؤ لیٹے لیٹے حدیث بیان کرنا مجھے بہت گراں معلوم ہوتا ہے۔

یہ وہ جماعت ہے جس نے خود صحابہ سے ہی علم حاصل کیا ہے ان کے طور و طریق کو دیکھا ہے اگر ان کے علم میں صحابہ کے نزدیک حدیث کی حیثیت صرف ایک تاریخ کی ہوتی تو کیا وہ اس کا یہ احترام کرتے۔ امام زہری جیسے جیسے تابعین میں شمار ہوتے ہیں فرماتے ہیں کہ ہمیں اہل علم صحابہ سے یہی عقیدہ معلوم ہوا ہے۔

الاعتصام بالسنن نجاة جه — سنت پر عمل کرنا نجات اسی میں ہے

درحقیقت حدیث کو محض تاریخ کے برابر سمجھنا اس کی سب سے بڑی تلبیس ہے اور اس کی نہیں بلکہ اس کے قائل کی توہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کو رسول کی حیثیت بھی ایک امیر کے برابر کر دینا پڑی ہے میرے خیال میں یہ بھی اس تواتر کے خلاف ہے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلم اور کافر میں مشترک ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سمجھی گئی وہ امیر کی حیثیت نہ تھی بلکہ صرف ایک رسول کی حیثیت بلکہ رسولوں میں بھی سب سے افضل رسول کی حیثیت تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حدیث کی حیثیت کا انکار اور رسول کی حیثیت کا انکار دو مسئلے نہ سمجھنا چاہئیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی مسئلہ ہے۔ جو شخص حدیث کی تشریعی حیثیت تسلیم نہیں کرتا اس کو رسول کی تشریعی حیثیت سے انکار کرنا بھی لازم ہے۔ اسی لئے منکرین حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن پر ختم ہو جاتا ہے گویا آپ کی حیثیت ایک پوسٹ مین سے زیادہ حیثیت نہ تھی (العیاذ باللہ) اس لئے ہمیں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن میں رسول کی حیثیت کیا ہے۔

قرآن میں رسول کی حیثیت

رسولوں کا تقرر خدا خود فرماتا ہے امیر و حکام کی طرح ان کا تقرر مخلوق نہیں کرتی نہ مخلوق کے مشوروں کو اس میں کوئی رعایت کی جاتی ہے۔ اس کا اختیار خدا کو سمجھا جاتا ہے۔

(۱) اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔ — اللہ تعالیٰ فرشتوں میں اور انسانوں میں رسول اپنے ہی منصب سے بناتا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ یہ منصب براہ راست خدا کے انتخاب پر موقوف ہے، بندوں کے سپرد نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منصب کے لئے تمام مخلوقات میں صرف دو نوع کا انتخاب عمل میں آیا ہے فرشتے اور

له جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱ — ۲ے سیوطی ۲

انسانوں میں سے بظاہر جنات میں کوئی رسول نہیں ہوا۔ شاید اس معاملہ میں بھی وہ انسانوں کے تابع رہتے ہیں۔
غرض رسالت کا معاملہ رزق کی طرح صرف خدا کی تقسیم پر موقوف ہے اسی لئے جب کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں اپنی ماننے نہ ماننے کی شرط کی تو جوابات تحسین کے لہجہ میں یہ کہکر ان کو خاموش کر دیا گیا۔
أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ۔ یعنی نبوت و رسالت رزق کی طرح ربوبیت کا حق ہے جب رزق کی تقسیم اس نے کسی کے حوالہ نہیں کی اپنے ذمہ رکھی ہے تو نبوت کی تقسیم بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے۔ پھر یہ کہ نبوت ایک رحمت ہے اور رحمت کی تقسیم کا حق رحمٰن ہی کو ہو سکتا ہے جو خود رحمت کے محتاج ہوں وہ نبوت جیسی بڑی رحمت کی تقسیم کے ٹھیکیدار کیسے بن سکتے ہیں۔

(۲) اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ۔ یہ بات خدا ہی خوب جانتا ہے کہ کسے اپنا رسول کیا جاتا ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ آیت بالا سے معلوم ہوا کہ رسالت صرف وہبی ہے کسبی نہیں۔ یعنی عبادات و ریاضات سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے نبوت و رسالت کی اہلیت رکھ دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصب رسالت و نبوت جن خصوصیات کی بنا پر مرحمت ہوتا ہے اُن کا علم بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ اور اُن کا انتخاب کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ امام اور اس کی خصوصیات اور شرائط معلوم ہیں اس لئے امام کا انتخاب بھی مسلمانوں کے سپرد ہے اور اسی لئے ان کے عزل کر دینے سے وہ معزول بھی ہو سکتا ہے۔

(۳) چونکہ قدرت خود ان کا انتخاب کرتی ہے اس لئے خود ہی ان کی تعلیم کا انتظام بھی کرتی ہے۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ ہاں پڑھئے اس پروردگار کے نام کی برکت سے پڑھئے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے۔

(۴) وہ پڑھا کر خود انھیں یاد کراتی ہے اگر اس میں کچھ حصہ وہ بھول جاتے ہیں تو وہ بھی اسی کی مشیت کے ماتحت ہوتا ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ۔ ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے مگر جو خدا چاہے۔

(۵) اس وحی کے بیان کی بھی وہ خود ہی متکفل ہوتی ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

(۶) جس طرح وہ ان کی تعلیمی تربیت کرتی ہے اسی طرح اُن کی اخلاقی تربیت بھی خصوصی کرتی ہے اسی لئے عین بچپن اور لڑکپن کے دور میں وہ ایسے بلند اخلاق کے مالک ہوتے ہیں جہاں دنیا اپنے پورے عروج کے بعد بھی نہیں پہنچتی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔	لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کیجئے اور زمین پر اترا کر نہ چلئے۔
وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ	جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں ان کو بھی برا نہ کہئے
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	نیکی کے ساتھ بدی برابر نہیں ہو سکتی۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۔	مومنوں کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئیے۔
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ	حیات دنیا کی چمک دمک جو مختلف قسم کے لوگوں کو صرف
أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	ہم نے برتنے کے لئے دی ہے اس کی طرف نظر نہ کیجیے۔
وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ	نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن کی طرف بندھا ہوا رکھئے نہ اس کو بالکل
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ۔	کھولئے کہ خرچ کرنے میں بیجا روانی رکھئے۔

(ح) جس طرح وہ ان کی تعلیمی اور اخلاقی نگہبانی کرتی ہے اسی طرح کبھی اس کی جسمانی حفاظت کی ذمہ داری خود ہی ہو جاتی ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۔ آپ فکر نہ کیجئے کسی قسم کے خطرہ کا لوگوں سے آپ کی حفاظت کریگا اللہ تعالیٰ۔ حدیث میں ہے کہ اس سے پہلے شب میں آپ کی پہرہ داری کی جاتی تھی۔ اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے پہرہ موقوف کر دیا اور خیمہ سے باہر نکل کر فرمایا کہ جاؤ میری حفاظت کا اللہ تعالیٰ کفیل ہو چکا ہے اب مجھے کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی۔

(ط) اس سے بھی بڑھ کر وہ ان کے عواطف و میلانات قلبی کی بھی نگران رہتی ہے۔

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ	اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف
تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۔	جھک ہی جاتے۔

چونکہ انبیاء علیہم السلام کے عزائم اور افعال تحریکات و قلبی خطرات بھی قدرت الٰہیہ کے زیر نگرانی رہتے ہیں اس لئے امت ان کے متعلق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے یہ عصمت صرف نبی و رسول کی ہے کسی امیر و حاکم کے متعلق عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

(ی) وہ اسی خصوصیت کا اعلان کرنے کے لئے یہ بتا دیتی ہے کہ ان کی نقل عام انسانوں کے ہاتھ نہیں ہوتی اگر وہ خدا کے متعلق ایک بات بھی جھوٹ کہیں تو نہایت بیدردی سے ان کو ہلاک کر دیا جائے غلط بیانی کے دوسرے جھوٹوں کی طرح کبھی ان کو مہلت نہ دی جائے لیکن کسی امیر و حاکم کے متعلق یہ شدت نہیں کی گئی اسی لئے رسولوں میں کوئی جھوٹا نہیں گذرا اور سینکڑوں حاکم جھوٹے اور ظالم گذر چکے ہیں۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا	اگر یہ ترمیم کر کے ہماری طرف کوئی بات بھی اپنی طرف سے لگاتے
مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ	تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ کر ان کی رگ جان کاٹ ڈالتے۔

(ک) اس ربانی تربیت و تعلیم عصمت اور ہر وقت نگرانی کی وجہ سے اس کی ہر بات ہوتی ہے خواہش نفس سے پاک اور صادق ہوتی ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (شعراء)

شاید آپ اپنی جان ہلاک کر دیں گے اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ)

تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک رسول آیا جو بڑا مہربان کریم ہے تمہیں تکلیف پہنچنا اس پر بھاری ہے تمہاری بھلائی کا لالچی ہے اور مومنین پر بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

(۹) اس امت پر اس کا احترام اتنا واجب ہوتا ہے کہ اس کی بیبیاں ان کی ماؤں کے برابر سمجھی جاتی ہیں جیسا اپنی ماں سے نکاح درست نہیں ہوتا ایسے ہی نبی کی وفات کے بعد اس کی ازواج سے نکاح کرنا درست نہیں ہوتا۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ (احزاب)

نبی کو مومنین سے ان کی جانوں سے زیادہ تعلق ہے اور اس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں۔

اس کے سامنے آگے بڑھ کر کوئی بات کہنا منع ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ (حجرات)

اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

اس کے سامنے اونچی آواز سے بولنا اس کو عام انسانوں کی طرح آواز دینا حبط عمل کا موجب ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (حجرات)

اے ایمان والو اونچی نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اور اس سے نہ بولو زور سے جیسے ایک دوسرے کے سامنے زور سے بولا کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا (نور)

رسول کو آپس میں اس طرح مت پکارو جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (حجرات)

جو لوگ آپ کو دیوار کے باہر سے پکارتے ہیں وہ اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

اگر وہ اتنی دیر انتظار کر لیتے کہ آپ باہر آجائیں تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ رسول کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرنا جب عمل کو اکارت کر دیتا ہے تو اس کے احکام کے سامنے اپنی رائے کو مقدم کر لینا اعمال صالحہ کے لئے کیونکر تباہ کن نہ ہوگا۔ (احکام ج ۱ ص ۲۴)

(۱۱) اس کے ساتھ محبت کرنا عبادت میں شمار ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (سورۃ الفتح) — جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔

(۱۶) ان کی اطاعت اور ان کی جنگ خدا کی اطاعت اور جنگ بن جاتی ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ — جو رسول کا حکم مانے اس نے خدا ہی کا حکم مانا۔

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ — (جو سود باقی رہ گیا) اگر تم نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔

(۱۷) خدا کی محبت کا دعویٰ ان کی اتباع کے بغیر قابل تسلیم نہیں ہوتا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي — آپ کہہ دیجئے اگر تمہیں اللہ سے واقعی محبت ہے تو میری اتباع کرو۔

(۱۸) رسول مجلس مشاورت کی رائے کا تابع نہیں ہوتا دوسرے لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ — جب آپ کسی بات کا پختہ ارادہ کر لیں تو پھر خدا پر بھروسہ کیجئے

امام بخاریؒ نے رسول کی مشاورت پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

باب قول الله وامرهم شورى بينهم. وشاورهم في الامر وان المشاورة قبل العزم والتبين لقوله فاذا عزمت فتوكل على الله. فاذا عزم الرسول لم يكن لبشر التقدم على الله ورسوله وشاور النبي صلى الله عليه وسلم اصحابه يوم احد في المقام والخروج فرأوا له الخروج فلما لبس لامته وعزم قالوا اقم فلم يمل اليهم بعد العزم وقال لا ينبغي لنبي يلبس لامته فيضعها حتى يحكم الله وشاور عليا واسامة فيما رمى به اهل الافك عائشة فسمع منهما حتى نزل القرآن فجلد الرامين ولم يلتفت الى تنازعهم ولكن حكم بما امره الله. وكانت الائمة

قرآن کریم نے انہیں کے لئے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ ان کے معاملات ان کے باہمی مشوروں سے طے پا جایا کریں مگر رسول کے لئے بھی مشورہ کا حکم دیا ہے لیکن یہاں مشورہ کا حکم اس کے عزم کرنے سے پہلے ہے جب رسول نے عزم کر لیا تو خدا کی وحی صاف آ جائے تو اب مشورہ کا کچھ لحاظ نہیں بلکہ اب اس کے خلاف مشورہ دینا خدا و رسول کے سامنے تقدم یعنی پیش دستی شمار ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں جنگ کرنے کے لئے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا لیکن جب آپ نے جنگ کا پختہ ارادہ فرما لیا اور زرہ پہن لی تو بعض لوگوں نے باہر مدینہ ہی میں رہنے کا مشورہ دیا آپ نے فرمایا کہ یہ بات نبی کی شان سے بعید ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ زرہ پہن لے تو جب تک خدا کا حکم نہ ہو اس کو اتارے اسی طرح حضرت عائشہؓ کی تہمت کے قصہ میں بھی آپ نے حضرت علیؓ اور اسامہؓ سے مشورہ فرمایا ان کے مشورے کو سنا لیکن جب قرآن نازل ہو گیا اور مسئلہ صاف واضح ہو گیا تو

سکون سے لبریز تھا وہ صرف قرآن ہی کی تھی۔

آیات بالا میں پہلے تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھنے کی ہدایتوں کا علم ہو گیا ہے اور اس کا ذمہ لیا گیا ہے کہ وہ جو پڑھ کر سنائیں گے پھر اس کی توضیح و بیان کریں گے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی جو کلمہ زبان سے نکلیں گے وہ خواہشات نفس سے منزہ پاک ہوگا۔ قرآن میں جو جامع ربط ہے وہ بھی خدا کی پیدا کردہ ہوگی حتیٰ کہ ان کے دل میں جو خطرات بھی گذریں گے وہ بھی قدرت کی حفاظت کے نیچے رہیں گے اس کے بعد یہ حق کسی کو ہو سکتا ہے کہ وہ رسول کے کلام میں اپنی جانب سے یہ تفریق پیدا کرے کہ جو اس نے قرآن کہہ کر سنایا وہ تو واجب الاطاعت ہے لیکن جو اس نے اس کی مراد بتلائی یا جو اس نے خود فرمایا وہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ اس کو شرعی کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں۔ رسول بذات خود ایک شرعی منصب ہے وہ اس لئے آتے ہیں کہ دنیا کو ہدایت اور خدا کی رضامندی کی راہ دکھلائیں اس لئے اس بارے میں وہ جو کہتے ہیں وہ سب رب العزت کی رسالت کی حیثیت سے کہتے ہیں جو پہنچاتے ہیں وہ خدا ہی کا حکم ہوتا ہے۔ اگر قرآن پہنچانا رسالت میں داخل ہے تو اس کی مراد بیان کرنا اس کی تفصیلات سمجھانا یا دین کے بارے میں اپنی جانب سے قرآنی آیات کے ماتحت کچھ اور احکام صادر کرنا رسالت کا جزو کیوں نہیں۔ قرآن کی کسی ایک آیت میں اس طرف کوئی معمولی سا بھی اشارہ نہیں ملتا کہ رسول کی یہ تمام صفات صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں حتیٰ کہ وہ جب دین کے معاملہ میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے تو اس کی حفاظت نہیں کی جاتی اس میں خواہش نفس کا دخل ہو سکتا ہے اور یہاں اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں رہتی۔

اب ایک طرف آپ یہ آیات قرآنی پڑھئے، دوسری طرف رسول کے متعلق مولانا اسلم صاحب کا یہ تصور دیکھئے کہ صرف قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ رسالت کا حق صرف یہ ہے کہ جو قرآن انھوں نے پڑھ کر سنا دیا ہے بس اس کو ان کے کہنے پر اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ لیا جائے اس کے بعد اب وہ ہم برابر ہیں جیسا ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جیسا وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں۔ دین کے معاملات میں ان کی رائے کا درجہ وہی ہے جو ہماری رائے کا۔ خلاصہ یہ کہ اتباع اور اطاعت میں ان کا ایک ذرہ بھی حق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ رسول اپنی زندگی کے طویل و عریض اوقات میں بہت ہی مختصر لمحات کے لئے منصب رسالت پر فائز ہوتا ہے بقیہ زندگی میں اس کی حیثیت بھی وہی ہو جاتی ہے جو عام انسانوں کی ہے لیکن ان آیات سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے حق میں یہ آداب و تعظیم کسی وقت کے ساتھ خاص ہیں بلکہ اس کا جو احترام تبلیغ قرآن کے وقت واجب ہے اپنی تدبیر معاملات اور نجی خصوصیات اور صحت کے دوسرے نظم و نسق کے وقت واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ جب وہ اپنے عمر سے پردہ فرما جائے اور بستر خواب پر ہو اس وقت بھی اس کا یہی احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے بلکہ منکرین حدیث کو چھوڑ کر تمام امت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اس کے ان آداب میں آج بعد از وفات بھی سر مو فرق

فرق نہیں ہے۔ پس جب اس کا احترام ہر وقت واجب ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ ہر وقت رسول ہے اور جب وہ ہر وقت رسول ہے تو دین کے معاملہ میں اس کا جو حکم ہے وہ ہر وقت واجب الاطاعت ہے۔

مولانا اسلم صاحب کا کہ آپ کی ذات میں دو حیثیتیں ہوا کرتی تھیں، تبلیغ قرآن کے وقت آپ کو رسول اور فصل خصومات کے وقت آپ کو صرف ایک امام سمجھنا قرآن کے قطعاً مخالف ہے۔ اگر قرآن کی نظر میں آپ کی یہ دو حیثیتیں ہوتیں تو ضرور قرآن کریم ان کو جدا جدا بیان کرتا، ان کے جدا جدا حقوق بتلاتا، لوگ آپ کے ساتھ ان حیثیتوں کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ معاملات کرتے۔ ایک وقت آپ کے سامنے آواز بلند کرنا حبط عمل کا موجب سمجھتے، دوسرے وقت آپ سے منازعت کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ لیکن تمام قرآن میں، آپ کی تمام حیات میں، صحابہ کے تمام تذکروں میں کہیں آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات ثابت نہیں ہوتے اور ذخیرۂ نقل میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کبھی کبھی آپ منصب رسالت سے اس طرح علیحدہ ہو جاتے تھے جیسا ایک پوسٹ مین ڈاک تقسیم کر کے اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام دعاوی قرآن کے خلاف اور اس کی صریح تحریف ہیں۔ پس حق صرف یہی ایک بات ہے کہ آپ ہر وقت رسول ہیں اور ہر وقت آپ کی اطاعت اور اتباع لازم ہے۔ مطلق اطاعت و اتباع نہیں بلکہ شرعی و دینی اتباع اور ایسی اتباع نہیں جو ختم ہونے والی ہو بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی، وہ اتباع نہیں جس میں ہمارا اختیار ہو بلکہ وہ اتباع جو سب سے بڑھ کر ہم پر فرض ہے اور ہمارا اس میں کوئی اختیار نہیں۔

قرآن میں رسول کی اطاعت

رسول کی اطاعت مستقل حیثیت سے بھی واجب ہوتی ہے۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ۔

فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں حکم کے مالک ہیں، پھر اگر تم کسی بات میں جھگڑ پڑو تو اسے خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو۔

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے پیش کرنے کا مطلب اس کی کتاب کے سامنے پیش کرنا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے سامنے پیش کرنے کا مطلب آپ کی سنت اور احادیث کے سامنے پیش کرنا ہے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اطاعتیں واجب فرمائی ہیں، دو مستقل اور ایک غیر مستقل۔ اللہ اور رسول کی اطاعت تو مستقل واجب کی گئی ہے اور اولوالامر کی تیسری اطاعت ان دو اطاعتوں کے ماتحت درج کی گئی ہے، اسی لئے پہلی دو اطاعتوں کے لئے لفظ اطیعوا (فرمانبرداری کرو) کو مکرر استعمال کیا گیا ہے اور تیسری اطاعت کے لئے جداگانہ امر نہیں فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت ان اطاعتوں کی طرح

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۷۔

مستقل حیثیت نہیں ہے لیکن یہی وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کے عصر کے بعد صحابہ نے کبھی آپ کی
اس پر قرآن سے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہو اس کے برعکس رسول کو ہمیشہ بنفسہٖ اطاعت کے لئے قرآن و
حدیث پیش کرتے رہے ہیں بلکہ بعض مرتبہ آپ قول سے رجوع بھی کر لیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی امر کی تشریحی حیثیت
کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے اس لئے بیان رسول کی اطاعت بھی صرف تشریحی حیثیت سے واجب ہوگی نہ
کسی اور حیثیت سے۔ بعض منکرین حدیث کو یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ وہ رواۃ حدیث کی وجہ سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ
رسول مطاع بھی دو ہو گئے اس لئے یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ واقع میں واجب ہونے کی وجہ سے مطاع دو نہیں ہوتے
وہاں مطاع دو نہیں بلکہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے۔ رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع خدا کی ذات پاک نہیں ہوتی
بڑی غلط فہمی اور قرآن سے ناواقفی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ — جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

گویا رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے یہاں اطاعت کے تعدد سے مطاع
میں تعدد سمجھنا چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا بیان بھی ہوتا ہے کہ جس تفصیل سے قرآن میں مذکور نہیں ہوتا
ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس اعتبار سے یہاں مطاع بظاہر اس کی ذات معلوم ہوتی ہے اور اگر
یہ لحاظ کیا جائے کہ یہ تمام تفصیل بعینہٖ قرآن کے اجمال کی مراد ہوتی ہے تو اس کی حیثیت کوئی مستقل حیثیت نہیں

سلہ حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں کہ اطاعت رسول کے مستقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہر حکم ماننا چاہئے خواہ اس کی اصل
بعینہٖ قرآن میں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکتا ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض حدیثوں کی اصل قرآن میں موجود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ
رسول کی اطاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے۔ اولو الامر کی اطاعت
اس طرح واجب نہیں ہے وہ کتاب اللہ و سنت رسول کے ماتحت ہے اس لئے جب تک احکام قرآنیہ اور سنت رسول کی مرضی کے مطابق
حکم دیں ان کی اطاعت کی جائے گی اور جب ان کا خلاف کریں واجب الاطاعت نہ رہیں گے۔ صحیح حدیث میں ہے لا طاعة
لمخلوق فی معصیة الخالق۔ رسول کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔ انما الطاعة فی المعروف اطاعت
صرف اچھی بات میں کرنی چاہئے (ایک مرتبہ سلطان کے امیر نے اپنی فوج کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ آگ میں گھس جائیں۔ اس حکم
کی تعمیل میں بعض نے تامل کیا جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا لو دخلوها ما خرجوا منها اگر یہ لوگ آگ میں چلے جاتے
تو پھر نہیں نکل سکتے کیونکہ یہ حکم سراسر شریعت کے خلاف تھا۔ اس لئے کسی امیر و حاکم کی اطاعت واجب نہیں)
حافظ ابن قیم کے اس بیان سے اطاعت رسول کے مستقل ہونے اور اولو الامر کی اطاعت غیر مستقل ہونے کا مفہوم واضح ہو گیا (دیکھو
اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۸) پھر یہی مصنف اسی کتاب کی جلد ۲ ص ۲۳۲ پر فرماتے ہیں کہ اگر رسول کی اطاعت صرف ان احکام تک محدود
رہے جو قرآن کریم میں بھی صاف صاف موجود ہیں تو پھر اطیعوا الرسول کی بحث کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا۔ اطیعوا اللہ و
اطیعوا الرسول میں اطاعت کی تکرار اسی لئے ہے اور یہی آیت بتاتی ہے کہ خدا کے علاوہ رسول کی اطاعت بھی ایک
مستقل چیز ہے۔ جیسا کہ آنحضرت نے اطاعت رسول کو اطیعوا کے ساتھ بیان کیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کی براہ راست اطاعت کرنا
بھی ضروری ہے جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ خدا کی اطاعت بھی نہیں کرتا۔

یعنی اس پہلو سے بھی اصل مطاع خدا ہی کی ذات ہو جاتی ہے۔ پس احادیث رسول پر عمل کرنے والا بلحاظ بیان تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے اور بلحاظ امر و نہی خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والا خدا کے الفاظ پر بھی عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے۔ اس بنا پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع درحقیقت ایک ہی رہتا ہے۔ [1]

خلاصہ آیت یہ ہے کہ خدا کا اصل قانون تو صرف خدا کی کتاب ہے، اس کی مراد کو واضح کرنے والی احادیث رسول ہیں اور اس مفصل قانون کو قیامت چلانے والے اولی الامر ہیں۔ اگر کبھی ان میں کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو رفع نزاع کے لئے بھی اصل مرجع وہی اللہ اور رسول ہیں۔

آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول الخ کے متعلق مولانا اسلم صاحب کی تفسیر

مولوی اسلم صاحب نے جو تعبیر اور نظم اسلامی کی جو تشریح یہاں لکھی ہے وہ صرف ان کے دماغ کی تراشیدہ ہے۔ قرآن کریم سے اس کو دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہم یہاں ان کے الفاظ بعینہٖ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر تبصرہ کیا جائے گا۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ (۱) پیغمبری یعنی پیغامات الٰہی کو لوگوں کے پاس پہنچانا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے دعویٰ پر ایمان لانا ضروری کیا گیا۔

(۲) امامت۔ یعنی امت کا انتظام اس کو قرآن کے مطابق چلانا، اس کی شیرازہ بندی، اس کے باہمی قضایا کے فیصلے، تعمیر ملت، جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور، ان کی قیادت اور نظم معاشی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کے لئے قائم ہوئی قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے ہمیشہ رہنی چاہئے۔ قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں وہ آپ کی ذات گرامی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے ان کی ذات اقدس کی اطاعت تھی (اور یہ امت ہمیشہ آپ ہی کی امت رہے گی کیونکہ آپ کے اوپر قرآن نازل ہوا) اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔ اور ملت اسلامیہ کے یہی معنی ہیں کہ خدا کی فرمانبرداری اور رسول کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے جو کچھ بھی کہے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں۔ یہ ذہنیت امت میں اسی وقت پیدا ہوئی جب کہ

---

[1] دیکھو اعتراضات۔ ج ۲ ص ۱۰۔

صحیح خلیفۂ رسول نہیں رہا اور دستبرداری سے مرکز پر تغلب حاصل کر کے امت کو اپنا غلام بنا لیا اور ان کی دینی قیادت چھوڑ دی جو علما اور صوفیا اور محدثین نے لے لی۔ جس دن سے امت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہو گئی ہے جب سے عملاً حدیث قرآن کی طرح امام وقت کی اطاعت سے جدا ہو گئی ہیں۔ جب تک امت کے منتخب افراد مل کر پھر کسی ایسے شخص کو منصب امامت پر فائز نہ کریں جو قرآن کے مطابق چلائے گا اس وقت تک دوسرا مرکز قائم رہے گا اور متفرق ہو گئے تھے۔ الغرض قرآن امام وقت ہی کے ساتھ امت کی نجات اور کامیابی کا ذریعہ ہے۔ احادیث کی حیثیت صرف تاریخی ہے ان میں سے جو قرآن کے مطابق ہوں گی قبول کی جائیں گی۔[1]

مولانا اسلم صاحب کی تفسیر پر تنقیدی نظر

مولانا موصوف نے اطاعت خدا اور رسول کے معنی بیان کرنے میں تقریباً ایک صفحہ سے زیادہ خرچ کیا ہے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ مذہب اسلام صرف مولانا کی دماغی تجویز پر موقوف نہیں ہے بلکہ تیرہ سو سال سے اس پر مسلسل عمل ہوتا چلا آیا ہے جن باتوں کا تحریر مذکور میں دعویٰ کیا ہے ان کے متعلق علمی طور پر ثبوت پیش کرنا مولانا کے ذمہ ہے کہ آج تک اسلامی نظام کی بنیاد درحقیقت اسی نقشے کے مطابق رکھی گئی ہے؟ کیا عہد نبوت اور صحابہ و تابعین میں بھی رکھی گئی تھی لہٰذا تحریر صرف ایک دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔

(۱) مولانا نے پہلا دعویٰ یہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ رسالت اور امامت۔ رسالت کی حیثیت سے آپ پر صرف ایمان لانا ضروری تھا اور آپ کی اطاعت کرنا بحیثیت امامت تھا نہ کہ بحیثیت رسالت۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں واقعات کے بھی خلاف ہیں اور خود قرآن کے بھی خلاف ہیں۔ یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں ذہنی اعتبارات سے دو حیثیتیں کیا اس سے زیادہ بھی حیثیات قائم کی جا سکتی ہیں مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو قرآن نے کہیں جدا جدا اعتبار کیا ہے یعنی کسی جگہ حیثیت رسالت کی اور کسی جگہ حیثیت امامت آپ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں۔ پھر کیا صحابہ کرام نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات کیے ہیں؟ پھر امت مسلمہ نے اپنے تواتر کے باوجود کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو سمجھا ہے؟ میں پورے وثوق کے ساتھ ان تینوں سوالات کے جوابات نفی میں سمجھتا ہوں۔ رسول کی ذات میں یہ حیثیتیں قائم کرنا بالکل ایک منطقی اختراع ہے جس کا خارج میں کہیں وجود نہیں۔ قرآن کریم نے ہمیشہ آپ کی حیثیت صرف ایک رسالت کی حیثیت بیان کی ہے اور ہمیشہ آپ کو رسول ہی کے لفظ سے پکارا ہے صحابہ نے بھی ہمیشہ آپ کو رسول ہی کہہ کر پکارا یہاں تک کہ کفار میں بھی آپ کی جو حیثیت مشہور تھی وہ صرف اللہ کے رسول ہونے کی ایک ہی حیثیت تھی۔

---

[1] مقام حدیث۔ ص ۳۴، ۳۵، ۳۶۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ — اے رسول جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو آپ دوسروں تک پہنچا دیجئے۔

یہاں آپ کو تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے اور رسول ہی کے لفظ سے مخاطب فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ — جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد و عورت کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اس آیت میں بھی آپ کو رسول ہی کہا گیا ہے اور رسول ہی کے فیصلہ کا یہ حق بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا یہ فقرہ نمبر ۱ و نمبر ۲ و نمبر ۳ کی تعریف قرآن کریم کے صریحاً مخالف ہے۔ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا — آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ ایمان دار نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے تنازعات میں آپ ہی کو حکم نہ بنائیں اس کے بعد آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اس کے سامنے سر جھکا دیں۔

ایمان کی تکمیل رسول کی اطاعت کے بغیر نہیں ہوتی

اس آیت سے یہ خوب واضح ہو گیا کہ رسول پر ایمان اور اس کی اطاعت کے بغیر قرآن کے نزدیک ایمان ہی معتبر نہیں ہے کہ انسان صرف ایک لفظ آمنت کہہ کر حقوق رسالت سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا جب تک کہ وہ ہر معاملہ میں رسول کو اپنا حکم نہ بنالے۔ باہمی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ ناطق نہ سمجھے وہی نہیں بلکہ تکمیل ایمان کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اگر یہ فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں اس کی کوئی تنگی محسوس نہ کرے پھر بھی صرف اس منفی پہلو سے ایمان کامل نہیں ہوگا جب تک کہ اثباتی پہلو میں انتہائی تسلیم اس کی رگ رگ میں نہ سما جائے۔

پس مولانا تو یہ فرماتے ہیں کہ منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا وہ صرف ایک ادعا ہوتا ہے نہ کہ ایمان ہوتا ہے دوسری جگہ فرمایا

إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ — جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ایمان کے سلسلہ میں استیذان جیسی معمولی اطاعت بھی مدنظر ہے۔ پس جب آپ کے حکم کے بغیر کہیں جانا بھی درست نہیں تو اپنی رائے سے کوئی شرعی حکم اختیار کرنا کیسے درست ہوگا۔ (اسلام ص ۱۴۰-۱۴۱)

شبہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ان کے نزدیک تصدیق حاصل ہونے کے بعد معصیت کا ارتکاب ممکن ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے درحقیقت اس کو اس پر ایمان ہی نہیں ہوتا کہ گناہِ کبیرہ عذاب کی چیز ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک مرتکبِ کبیرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہی معتزلہ جن کی نقل کا مولانا اسلم صاحب کو بھی اعتراف ہے تصدیق کے ساتھ رسول کی اطاعت کو اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عاصی کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔ اور مولانا اطاعتِ رسول کو اتنا غیر ضروری سمجھے ہوئے ہیں کہ اسے رسول کا حق ہی قرار نہیں دیتے۔ یہاں قرآن کا فیصلہ آیتِ بالا کے بموجب یہ ہے کہ ایمان کے لئے رسول کی اطاعت اتنی ضروری ہے کہ جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ مومن کامل بھی نہیں کہلا سکتا۔ یہ تو رسول کی اطاعت کا پہلو تھا، اب اس کے خلاف کا پہلو سنئے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ	تو جو لوگ اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انہیں ڈرتے
تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ	رہنا چاہئے کہیں کوئی فتنہ یا آفت آ، یا دردناک عذاب پکڑ لے

ان تمام مقامات پر یہ سمجھا جائے گا کہ رسول کے حکم سے مراد امام کا حکم ہے اور رسول کی اطاعت سے مراد بھی امام ہی کی اطاعت ہے۔ قرآن کے صریح الفاظ کو معطل کر دینا ہے اگر ایسی تاویلات جائز بھی ہوں تو پھر قرآن سے کوئی مراد حاصل کرنا بھی مشکل ہو گا اس لئے کہ لفظ سے ذہن اٹھ جائے گا اور ہر شخص من مانی جو چاہے مراد بیان کرے گا۔ رسولوں کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالیٰ کا مستمر قانون ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لئے رسول بنایا گیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم کے
لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔	ماتحت ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔

پس رسولوں کا مطاع ہونا قرآن کے نزدیک حقِ رسالت ہے اور یہ ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا۔ اب مولانا کا یہ فرمانا کہ کبھی کسی رسول کو بحیثیت رسول مطاع نہیں سمجھا گیا، قرآن کے کتنا مخالف دعویٰ ہے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لئے مبعوث ہوا ہے۔ مولانا یہ کہتے ہیں کہ کوئی رسول اطاعت کے لئے نہیں آیا صرف ایمان کے لئے آیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایمان کے لئے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) حتیٰ کہ یہ اوقات بھی گرتی پڑتی ہے۔ اسی طرح پورے یقین کے باوجود بھی خواہشات انسان اس کے نفس پر اتنا غلبہ کر لیتی ہیں کہ اسے توبہ، رحمت وغیرہ کے بھروسہ پر مقتضیٰ یقین کے خلاف کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ بہرحال یہاں تو بحث یہ ہے کہ تصدیق کے بعد اطاعت کرنے کا عزم بھی ایمان کے لئے ضروری ہے یا نہیں، اب آگے اس پر گفتگو محض بے ضرورت ہے۔ یہ اپنے اپنے تعجب کی بات ہے۔ مولانا کے نزدیک تو اطاعت رسول کا حق ہی نہیں۔ یہ حق صرف امام کا ہے۔

اطاعت لازم نہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں ہے۔[۱]

اصل یہ ہے کہ قرآن صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے جس کی ایک صداقت تسلیم کرنے سے دوسری صداقت تسلیم کرنا ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب اس کی ایک صداقت کا انکار کیا جاتا ہے تو دوسری صداقت کا انکار خود بخود سرزد ہو جاتا ہے۔ مولانا نے جب قرآن کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ منصب رسالت کے لئے اطاعت ضروری نہیں ہے تو ان کو یہ بھی ماننا پڑا کہ رسول کو صرف زبان سے مان لینے کا نام ایمان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایک شخص آپ کی تصدیق کرتا ہے مگر آپ کے احکام نہیں مانتا وہ بھی مومن کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ امام وقت کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے اس کو فاسق وغیرہ کہہ دیا جائے۔ اور اگر کافر کہا جائے تو ہر امام کی اطاعت نہ کرنے سے کفر لازم آئے گا۔ رسول کی پھر کوئی خصوصیت نہ رہے گی۔ ان سب اختلافات کی بنیاد یہ ہے کہ منکرین حدیث کے نزدیک رسول کی وہ حیثیت ہی نہیں جو قرآن نے بتلائی ہے اس لئے وہ اس کو جتنا ہلکا بنا سکتے ہیں بنا دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جب یہ ثابت ہے کہ رسول کی حیثیت امام کی حیثیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے وہ معصوم ہوتا ہے اس کے لئے عصمت ضروری نہیں ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ امام کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں تو یہ کیسے معقول ہے کہ امامت کے لئے تو اطاعت لازم قرار دی جائے اور رسالت کے لئے لازم قرار نہ دی جائے۔ یہ بھی عجیب فلسفہ ہے کہ جس پر ایمان لانا وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو اس کی اطاعت کوئی ضروری امر نہ ہو۔ درحقیقت یہ تمام شاخسانے رسول اور ایمان کی حقیقت سے ناواقفی کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔

کتاب اللہ یا اطاعت رسول کا مطلب

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی کی اطاعت کا مطلب اس کی ذات کی اطاعت نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے احکام کی اطاعت ہی ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن کی اطاعت کے معنی اس کی کتاب کی اطاعت ہیں۔ اسی طرح رسول کی اطاعت کے معنی بھی اس کے احکام کی اطاعت ہونا چاہئیں یہاں حیات و وفات میں اگر کوئی فرق پڑتا ہے تو صرف اتنا کہ حالت حیات میں آپ ہمارے سامنے موجود تھے اب دوسرے جہان میں موجود ہیں تو کیا اطاعت کے لئے مطاع کا سامنے موجود ہونا شرط ہے؟ آپ کی حیات میں بھی لوگ دیگر ممالک میں رہ کر آپ کے اسی طرح حکم بجا لاتے جیسا مدینہ میں آپ کے احکام کی اطاعت کرنے والے۔

غرض تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رسول کی اطاعت کا لفظ امام وقت کی اطاعت کے طفیل ہی صادق کرنا چاہتے ہیں اور قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام وقت کی اطاعت رسول کے طفیل ہی ہے اگر رسول کی اطاعت واجب نہ ہوتی تو کسی امام کی اطاعت بھی واجب نہ ہوتی۔ مامورین کی اطاعت اسی لئے ضروری ہے کہ اصل میں رسول

---

[۱] پس اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ منصب رسالت کے لئے صرف ایمان لانا ضروری ہے پھر بھی رسول کی اطاعت ضروری ٹھہرتی ہے کیونکہ اطاعت کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا۔

کی اطاعت واجب ہو چکی ہے اور یہ اس کے جانشین ہیں کہ اسی کی اطاعت کی طرف بلاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کی
دعوت کا رخ خدا اور رسول کی طرف ہے۔ قرآن کی اطاعت بھی واجب نہیں رہتی۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ جب مولانا
کے نزدیک آپ کی اطاعت بحیثیت رسالت ضروری نہ تھی بلکہ جو اطاعت بحیثیت امامت واجب تھی وہ بعد وفات
ختم ہو گئی اس لئے کہ مولانا کے نزدیک اطاعت عربی میں صرف زندہ کی فرمانبرداری کو کہتے ہیں تو مولانا صاف یہ اعلان
کیوں نہیں کر دیتے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہی نہیں رہی اور کیوں خواہ مخواہ ان کے جانشینوں
کے پردہ میں اس کو مستور رکھنا چاہتے ہیں۔ پھر فقرہ نمبر ۵ میں یہ کیوں لکھ دیتے ہیں کہ خلفاء کی اطاعت رسول کی اطاعت
ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ خلفاء کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کہنا ہی غلط ہے اولاً تو
اس لئے کہ مولانا کے نزدیک رسول کی اطاعت ہی واجب نہیں۔ پھر فقرہ نمبر ۱ میں مولانا نے یہ وضاحت کر دی ہے
کہ دین کی ضروریات صرف قرآن کی اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ یہاں مولانا نے
اطاعت رسول کو درمیان سے صاف حذف کر ڈالا ہے۔ لہٰذا ہر زمانہ میں ہر امام کی اطاعت اسی طرح مستقل
اطاعت ہے جیسا کہ آپ کے زمانہ امامت میں آپ کی اطاعت۔ اس کو رسول کی اطاعت کہنا ایک بے معنی بات ہے
رسول بھی اپنی عقل سے سمجھ کر قرآن کے تحت میں فیصلے کرتا تھا۔ امام بھی اسی طرح اپنی عقل سے سمجھ کر فیصلے دے گا۔
بلکہ اس امام کے سامنے رسول کے فیصلوں کی وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو ماتحت عدالتوں کے نزدیک ہائی کورٹ کے
فیصلوں کی ہوتی ہے۔ وہ اس کے ماننے پر مجبور ہیں یہ مجبور نہیں۔ [illegible]

ہمارے نزدیک قرآن میں ہر جگہ اطاعت رسول کی مستقل حیثیت کو ختم کرنا اور اطاعت امام کی غیر مستقل مرکز کو مستقل
حیثیت دے کر چلانا قرآنی آیات کی صریح تحریف ہے۔ اگر نظم شریعت اس نقشے کے مطابق ہوتا جو فقرہ نمبر ۶ میں مولانا
نے ذکر کیا ہے تو آیت بالا میں اطاعت کا امر اس طرح ہوتا۔ اطیعوا اللہ واولی الامر منکم اور اطاعت رسول کا
ذکر ہی نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو اس کو مستقل حیثیت اور اولوالامر کی اطاعت کو غیر مستقل حیثیت نہ دی جاتی۔ فقرہ نمبر ۳ میں
آیت بالا کی اس سے بڑھ کر ایک اور تحریف یہ کی گئی ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم
دیا گیا ہے۔ اس سے مراد امام وقت کی ... اطاعت ہے۔

امام کی اطاعت کا وہ مقام نہیں ہو سکتا جو اللہ و رسول کی اطاعت کا ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے تو آیت بالا میں دو اطاعتوں کی بجائے صرف ایک ہی اطاعت
باقی رہ جاتی ہے۔ پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد اولوالامر یعنی امام کی
اطاعت کا دوبارہ حکم دینا بے معنی تکرار بن جاتا ہے۔ نیز پہلے اولوالامر کا ذکر آجانے کے باوجود آخر آیت "فان تنازعتم"
میں مرجع نزاع اللہ و رسول کو ٹھہرانا اور فردوہ الیہم کی بجائے فردوہ الی اللہ والرسول فرمانا اور بار بار یہ تصریح بتانا
ہے بلکہ صاف فردوہ الی الامام یا اولی الامر ہونا چاہئے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ و رسول اور اولوالامر کی

علی ہٰذا جہاں کہیں جو معنی ہیں۔ اللہ و رسول اور امام یہ تینوں الفاظ عربی زبان کے لفظ ہیں۔ اللہ و رسول کے لفظ سے امام کا لفظ مراد لینا کون سا محاورہ اور کونسی لغت ہے۔ اگر اس قیاس کی کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن میں ایک آیت اس مضمون کی بھی ضرور ہوتی۔ من یطع الامام فقد اطاع اللہ والرسول (جس نے امام کی طاعت کی اس نے اللہ و رسول کی اطاعت کی) جیسا کہ یہ فرمایا ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ — جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

بس یہ کہنا کہ اللہ اور رسول کے لفظ سے قرآن میں امام وقت کی اطاعت مراد لی گئی ہے سب سے بڑھ کر قرآن کی تحریف ہے۔ یہاں منکرین حدیث کا مفسرین کی عبارتوں سے مدد لینا نہایت تعجب ہے جو لوگ حدیث رسول کو حجت نہیں مانتے وہ مفسرین کی آراء سے مدد لیتا ہو کیونکر سمجھتے ہیں۔ انہیں جو دعویٰ کرنا ہے اسے قرآن سے ہی ثابت کرنا چاہئے۔ مقروشی میں مولانا نے اتباع قرآن کو دکھایا ہے مگر اس آیت کو فراموش کر دیا

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي — آپ کہہ دیجئے اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ — جو لوگ رسول نبی امی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی کہ اللہ تو دنیا اور آخرت کی رحمت میرے اور میری امت کے حصہ میں ڈال دے تو یہ جواب ملا کہ خدا کی رحمت کسی فرقے کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتی وہ آئندہ ہر اس شخص کے نصیب میں آ سکتی ہے جو محمد عربی اور وصاف کے نبی امی کی اتباع کرے گا۔ اس کے بعد پھر قرآن نے آپ کی دائمی اتباع کی دعوت دی ہے۔ کس قدر صریح ظلم ہے کہ جہاں جہاں رسول کی اطاعت اور صرف رسول ہی کی اتباع کا ذکر ہے اس کو صاف حذف کر دیا جائے یا اس سے امام کی حیثیت مراد لے لی جائے۔

امام کی اطاعت کو بعینہٖ خدا اور رسول کی اطاعت کہا جاتا ہے

اس کے بعد یہ بتلاتے ہیں کہ رسول کی اطاعت چونکہ خدا کے بیان اس کی تعمیل وحی کے بعد ہوتی ہے اس لئے اس کو بعینہٖ خدا کی اطاعت کہا جاتا ہے۔ امام پر چونکہ وحی نہیں آتی ہے نہ خدا کی طرف سے اس کی صواب دید کی کوئی ضمانت دی گئی ہے۔ وہ جو حکم دیتا ہے اپنی صوابدید، اپنی فہم، اپنے علم کے مطابق دیتا ہے۔ اس لئے امام کی طاعت کو بعینہٖ خدا اور رسول کی طاعت کہنا غلط ہے۔ ہاں اگر اس معنی سے کہا جا سکتا ہے کہ امام کی اطاعت خدا اور رسول کے حکم سے کی جاتی ہے تو جائز و درست ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت بریدہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو یہ فرمایا دیکھو جب دشمن کا محاصرہ کرو اور وہ محاصرہ توڑنے کی نوبت آئے تو خدا کے فیصلہ پر محاصرہ توڑنا بلکہ یہ کہنا کہ میں اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے فیصلے کے مطابق تمہارے ساتھ صلح کرتا ہوں۔ اگر تم خدا کا نام درمیان میں لاؤ گے تو تم اس

اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان کے بارے میں جو خدا کا فیصلہ ہے وہ یقینی تمہارے سمجھ میں بھی آ ہی جائے گا (وحی تم پر آتی نہیں، عصمت تمہاری صفت نہیں، حفاظت ربانی تمہاری ضامن نہیں) اس لئے تم اپنے ہی فیصلہ کا حوالہ دینا۔ اس میں دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر تمہیں اس فیصلہ کا توڑنا قرین مصلحت معلوم ہو تو بآسانی توڑ بھی سکتے ہو کیونکہ خدا کا فیصلہ کہہ کر توڑنا تو آسان بات نہیں ہے ہاں اپنا فیصلہ جیسا پہلے ایک طرف تھا اب دوسری طرف بھی بآسانی بدلا جا سکتا ہے۔

اس واقعہ سے ثابت ہے کہ امام کی اطاعت کو جب تک اللہ اور رسول کی اطاعت کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا تا کہ قرآن میں ہر جگہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لی جا سکے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے منشی نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر الفاظ لکھ دیئے "ھذا ما اری اللہ امیر المؤمنین عمرؓ" (یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین عمرؓ کے دل میں ڈالا ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ یوں مت لکھو بلکہ یہ لکھو ھذا ما رأی امیر المؤمنین عمرؓ (یہ وہ فیصلہ ہے جو امیر المؤمنین عمرؓ نے خود اپنے خیال کے مطابق صادر کیا ہے)[1] ایک مرتبہ منبر پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ایھا الناس ان ھذا الرأی انما کان من	لوگو! یہ جو آنحضرتؐ کی رائے دینی معاملے کے بارے میں اس لئے صواب ہوتی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا لان اللہ	تھی کہ وہ خدا کی طرف سے ہوا کرتی تھی ہماری جانب سے جو رائے ہو تو وہ
کان یریہ وانما ھو منا الظن والتکلف[2]	صرف ایک ظن ہوتی ہے جو قابل اعتبار نہیں۔

اطاعت رسول کی دس خصوصیات

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن کریم سے جو خصائص ہمیں اطاعت رسول کے معلوم ہوئے ہیں وہ اطاعت امام کے ثابت نہیں ہو سکتے۔

(۱) اپنے ہر معاملہ کو رسول کے سپرد کر دینا پھر اس کے ہر فیصلہ کو حق سمجھنا اور اس پر ایسی خوشی سے راضی ہو جانا کہ خلاف ہونے کی صورت میں دل کے اندر بھی کوئی تنگی محسوس نہ ہو۔

(۲) اس کے فیصلہ کا کہیں اپیل نہ ہونا۔

(۳) اس کے فیصلہ پر رضامندی شرط ایمان ہونا۔

(۴) اس کا ہر فیصلہ ناطق ہونا۔

(۵) اس کی اطاعت میں ہدایت منحصر ہونا۔ وان تطیعوہ تھتدوا۔ (اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو یقیناً راہ ہدایت پاؤ گے۔

(۶) اس کی اطاعت کا بعینہٖ خدا کی اطاعت ہونا۔

[1] اعلام الموقعین، ج ۱، ص ۴۲ - [2] ایضاً۔ ج ۱، ص ۵۴۔

(۸) اس کی اتباع میں خدا کی محبت اور گناہوں کی مغفرت کا یقینی حاصل ہونا۔
(۹) کسی خاص شخص کی مجلس میں اس سے استیذان لازم ہونا اور اس سے اجازت کا سبب کمال ایمان ہونا۔
(۱۰) اس کی اطاعت کے لئے کسی دلیل کا محتاج نہ ہونا۔

یہ وہ خصوصیات ہیں جو قرآن کریم سے صرف رسول کے اطاعت کی ثابت ہوتی ہیں۔ امام کے اطاعت کی یہ خصوصیات نہیں اس لئے قرآن کریم میں جہاں جہاں جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لینا صحیح نہیں۔ نیز اطاعت رسول کی ان تاکیدی آیات سے مولانا کے دوسرے خیال کی بھی تردید ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مقام رسالت کا حق نہیں ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ سب سے بڑھ کر اطاعت کرنا رسول ہی کا حق ہے۔

مذکورہ بالا وجوہات کے سوا یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر اللہ و رسول سے مراد امام وقت ہو تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امام سے مراد امام برحق ہو تو ناحق امام کی اطاعت کو بھی اللہ و رسول کی اطاعت کہا جاسکے گا اور اگر خاص صالح امام مراد لیا جائے تو خلفائے راشدین کے بعد تیرہ سو سال میں خدا و رسول کی اطاعت کا مصداق ہی شاذ و نادر ہوگا پھر جس دور میں مسلمانوں کا کوئی امام ہی نہ ہو اس میں لازم آئے گا کہ خدا اور رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے اور اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کا انعام معطل پڑا رہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی بیشمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اطاعت خدا اور رسول میں منحصر ہے مگر یہاں اطاعت سے مراد امام کی اطاعت ہو تو یقیناً تیرہ سو سال میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ایسا ہی ہے جن کی جماعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکتا۔ مولانا اسلم صاحب کی تفسیر کے مطابق لازم آتا ہے کہ اس تمام دور میں مسلمانوں کے لئے راہ نجات و ہدایت مسدود ہو اور مسلمانوں کے پاس اللہ کی اطاعت تسلیم کرنے کی کوئی صورت ہی موجود نہ ہو گویا دین اسلام ایک ایسا آئین ہو جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہو۔ اب ابھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں مولانا کو منبع شرع خیال کیا ہے کیا وہ اللہ و رسول کی اطاعت میں مصروف ہیں یا امام وقت نہ ہونے کی وجہ سے اس امر کا امتثال کرنے سے معذور ہیں۔

اختلافات کا سبب احادیث نہیں بلکہ ترک احادیث ہے

فقہ و علم میں انفرادیت اور اختلافات کا جو باعث قرار دیا گیا ہے وہ بھی محض بے بنیاد ہے بلکہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو رسول کی اطاعت نہ کرنا ہی اس انتشار کا باعث ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کی مجمل آیات کی تشریح اگر عقل کے ذریعہ کی جائے تو موجب انتشار نہ ہو اور اگر خود رسول کے بیان کے بموجب کی جائے تو انتشار کا سبب بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فہم انسانی کے اختلاف مراتب ہی کی وجہ سے قرآن فہمی کا مدار انسانی عقلوں پر نہیں رکھا تھا بلکہ اپنے رسول کے ذریعہ خود اپنی مراد واضح کر دی تھی تاکہ عبارتی احتمالات کا دائرہ مختصر ہو جائے لیکن مولانا نہایت سادگی سے ضمیمہ بحث کے صفحہ ۱۴۹ پر فرماتے ہیں۔

بے شک آیاتِ قرآنی کے معانی سمجھنے میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ و عبارات کے نہیں ہوں گے بلکہ صرف فہم کے ہوں گے اس لئے مزید غور و فکر سے مٹ جائیں گے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہو سکے گی۔

شاید موصوف کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اسلام میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں ان کی اصل بنیاد قرآن ہی پر ہے۔ معتزلہ، خوارج، مرجیہ، جہمیہ سب کو دیکھ لیجئے سب کے ہاتھوں میں بس قرآن ہے حدیث نہیں ہے بلکہ معتزلہ تو خیر سے حدیث کے منکر ہی تھے پھر حدیث کو بدنام کرنا فضول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ بندی کا باعث نہ قرآن ہے نہ حدیث بلکہ وہ عقل ہے جو صرف اپنے اعتماد پر مذہب کا نقشہ بنا کر رہنا چاہتی ہے چونکہ عقل و فہم کے مراتب احادیث کے الفاظ سے زیادہ مختلف ہیں اس لئے ان کا اختلاف بھی زیادہ ہونا چاہئے مزید غور و فکر سے اختلافات نہ آج تک کبھی ختم ہو سکے نہ ختم ہو سکتے ہیں۔ عقل نقل منکرین حدیث کے لئے تو کافی ہے مگر واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ عقلِ انسانی کی نارسائی اور قصور ہی کی وجہ سے آسمان سے کتابیں آئیں، رسولوں کو ان کو سمجھنے کے لئے بھیجا گیا پھر ان کے ذریعہ سے ان پر عمل کرا کے دکھلا دیا گیا۔ اگر عبادات و معاملات کا نقشہ صرف الفاظِ قرآنی سے تیار ہو سکتا تو رسول کا واسطہ ہی بیکار رہتا۔ یہ افتراق و تشتت کا اصل منشا احادیث نہیں بلکہ وہ راہ کی عقل ہے جب کبھی وہ احادیث کی روشنی کے بغیر ہدایت کا راستہ تلاش کرنے میں بھٹکی اسی وقت افتراق و انفرادیت نمودار ہونے لگی جیسا کہ ہمارے مضمون "افتراق" میں اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ ابو محمد حسن بن دحیل سے نقل کرتے ہیں کہ پہلی امتوں میں افتراق و تشتت اسی وقت پیدا ہوا جبکہ انہوں نے اپنے انبیاء کے آثار و سنن چھوڑ کر رائے کی اتباع کرنا شروع کر دی کہ پھر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ [1]

صحابہ کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت

صحابہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی تلاش کیا کرتے تھے اگر وہ نہ ملتی تو اس کے بعد اپنی جانب سے اجتہاد کر کے کوئی فیصلہ کرتے اور اگر اس کے بعد بھی آپ کی سنت یاد آ جاتی تو اسی کی اتباع کرتے اور اپنے قول سے رجوع کر لیتے جیسا کہ اس کی مثالیں حدیثِ رسول کی حیثیت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اگر بقول مدعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ان کی نظر میں صرف ایک امام کی حیثیت ہوتی تو وہ آپ کی اطاعت صرف آپ کے زمانۂ حیات سے وابستہ سمجھتے اور اس کے بعد ان کے نزدیک آپ کے قضایا اور فیصلوں کی حیثیت ایک عدالت کے فیصلے سے زیادہ نہ تھی۔ مدعا کے نزدیک نظامِ اسلامی کی بنیاد صرف کتاب اللہ ہے پھر ہر شخص اپنی عقل کے مطابق اس کے تحت میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عقل سے سمجھ کر جو فیصلے کئے ان کی حیثیت بس یہی ہے جیسا کہ بعد کے خلفاء نے بھی اپنی اپنی انفرادی عقل سے فیصلے صادر کئے جس طرح ایک خلیفہ کا فیصلہ دوسرے کے لئے حجت

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۵

نہیں ہوتا اس کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ موافقت کرے یا مخالفت۔ یہی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے فیصلوں کی بھی ہے مگر یہیں صحابہ کی تاریخ سے اس کے بالکل برعکس ثابت ہوتا ہے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جہاں کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ سنا ہو اور اس کے ثبوت کے بعد بھی اس کے خلاف فیصلے کرنے کا اپنے دل میں خطرہ بھی محسوس کیا ہو۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے درمیان آپ کی حیثیت آپ کی وفات کے بعد بھی وہی تھی جو آپ کی حیات میں تھی۔ دونوں حالتوں میں وہ آپ ہی کا فیصلہ تلاش کرتے تھے اور جب آپ کا فیصلہ انہیں مل جاتا تھا تو دونوں حالتوں میں اس پر راضی ہو جانا اور اس کے خلاف میں اپنا اختیار باقی نہ رہنا بالکل یکساں سمجھتے تھے۔ یہ ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی آپ کی اطاعت میں زندگی اور وفات کے بعد ایک ذرہ برابر بھی کبھی فرق کیا ہو۔ ان کے نزدیک جس طرح رسول کی وفات سے اس پر ایمان لانے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اسی طرح اس کے احکام کی اطاعت میں بھی کوئی فرق نہیں ہوا۔ یہ ایمان منکرین حدیث ہی کا ایمان ہے جس میں رسول کی وفات کے بعد اس کی اطاعت سے آزادی میسر آجاتی ہے اور اس کی حیثیت ایک امام وقت سے بھی گھٹ جاتی ہے کیونکہ امام وقت کی اطاعت کرنا واجب ہوتی ہے اور رسول کی اطاعت اس کے بعد واجب نہیں رہتی۔ رسول کو امام اور حدیث کو اسلام کی محض ایک تاریخ بتانا اسلامی تعلیمات پر سب سے بڑا بہتان ہے جس کی تردید کے لئے ایک دلیل نہیں بلکہ مسلمانوں اور کفار کا تواتر موجود ہے لیکن جس عہد میں ہر شخص جس کے ہاتھ میں قلم ہے اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد ہو اس میں تواتر کا انکار بھی مشکل نہیں۔

رسالت کی ضرورت

ہم پہلے بتفصیل بتلا چکے ہیں کہ قرآن کریم کو اپنی تلاوت کے ابتدائی مرحلے سے لیکر اپنی مراد کی تعیین اور عمل کی تشکیل کے ایک ایک گوشہ تک رسول کی احتیاج ہے۔ رسول کی ضرورت صرف اتنی بات کے لئے نہیں ہوتی کہ وہ خدا کی کتاب بحفاظت پہنچا دیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس کو سمجھانے، اس پر عمل کر کے دکھلانے اپنی موعظت و نصائح اور صحبت کے غیر معمولی اثرات سے اس پر عمل کی اسپرٹ بھی پیدا کر دینے اور اس راہ میں جو عملی مشکلات ہوں ان کو بھی دور کرنے کی جد و جہد میں لگا رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں یہ سب فرائض یکساں طور پر نظر آتے ہیں اور یوم بعثت سے لیکر یوم وفات کے ایک ایک دن کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ آپ کا منصب معین، اور آپ کا اصل مشن ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس میں دین کے قانون کو خدا کی زمین پر عملاً حکومت قائم کرنا آپ کی بعثت کا وہ نصب العین سمجھا گیا ہے کہ جب تک یہ مقصد پورا نہیں ہو گیا آپ کو عالم قدس کی طرف جانے کی دعوت بھی نہیں دی گئی اور جب خدا کا آئین مکمل کر دیا گیا اس کی تعلیم و عملی تشکیل پورے طور پر کر دی گئی اور خدا کی زمین پر یہ مکمل آئین پوری تمکین و قدرت کے ساتھ نافذ

ہونے لگا تو قرآن نے یہ اعلان کر دیا کہ اب بعثت کا مقصد پورا ہو گیا ہے لہذا اب رسالت کے فرائض کے بجائے صرف خلافت کے فرائض کی انجام دہی باقی ہے اس کو آپ کے خلفاء انجام دیتے رہیں گے اسی کی طرف سورہ النصر میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

منکرین حدیث کی یہ بڑی غلطی ہے کہ رسالت کی ضرورت کو انہوں نے صرف کتاب کی تبلیغ میں منحصر کر دیا اور اس کے بعد اس کے دوسرے اہم گوشوں کو عقل انسانی کے حوالہ کر دیا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر براہ راست قرآن اترا اگر یا خدا قرآن کی حفاظت بھی سماوی طور پر نہ ہوتی رہتی تو بعض بعض مقامات پر ان سے بھی لغزش ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ رسولوں کی عصمت اور اس حفاظت کے باوجود قدم قدم پر انہیں احتیاط اور احتیاط کی تاکیدیں کی جاتی تھیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا

(اے پیغمبر) جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے تم اور وہ لوگ جو کفر و شرک سے توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں اسلام پر قائم رہو اور اعتدال سے نہ بڑھو۔

ہر وقت وحی الٰہی انہیں متنبہ کرتی رہتی تھی کہ کہیں ان کے فیصلوں میں خواہشات نفس کا دخل نہ ہو جائے کامل سے کامل عقل عطا فرما کر ان کو بتایا جاتا تھا کہ یہ علوم صرف خدائی موہبت ہے اس کا انعام میں تمہاری عقل کو کچھ سے بالاتر ہیں۔ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ کبھی کبھی ان کو روکا بھی جاتا تھا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ رسول بھی اپنی ذاتی عقل سے ہمیشہ خدا کی مرضیات نہیں پا سکتا اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اگر کبھی کوئی حرکت ان کے منصب کے خلاف شان سے سرزد ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی فوراً اس پر متنبہ کئے بغیر نہیں رہتی یہ ہیں رسولوں سے عتاب کے نظائر اگر ہو سکتے ہیں تو اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے ہو سکتے ہیں کہ جو امر خلاف وحی الٰہی نہ آئے اس میں رسول کی رائے خدا کا حکم سمجھنا چاہئے۔ سوچئے کہ جب دین کے معاملات میں خود رسول کے حق میں یہ نزاکتیں ہیں تو کیا قرآن فہمی اس کی عملی تشکیل اس کے معانی کی تفسیر عام عقلوں کے سپرد کی جا سکتی ہیں اور جب اس عصمت و حفاظت کے باوجود اس کمال عقل و فراست کے باوصف رسولوں سے لغزش کا امکان ہے تو عام عقول یہاں کتنی تاریکی پیدا کر سکتی ہیں۔ عمل یہ ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اس کی بہت سی کوتاہیاں اس کے ذہنی ضعف کا نتیجہ ہیں۔ مگر قدرت ان کے اثرات سے محفوظ نہ رکھے ذہن کا سنبھلنا ہی کے لئے لازم ہے۔ یہ تصورات تعصبات ذاتی حد تک قابل ملامت نہیں لیکن اگر دین میں یہ تصور داخل ہو جائے تو وہ ذاتی تصور نہیں رہتا بلکہ عالم کے نقصان کا باعث بن جاتا ہے اس لئے کتاب اللہ کے ساتھ رسول کے آسمانی بیان میں کوئی ادنیٰ فروگذاشت برداشت نہیں کی جا سکتی اگر دین سازی میں بھی عام عقول کا دخل ہو تو کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ

اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان و زمین درہم ہو جائیں

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۔ — ان میں جو کچھ ہے سب کا نظام بگڑ جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ — سمجھ لو کہ تم میں خدا کا رسول ہے اگر بہت سی باتوں میں تمہارا

فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ ۔ — اطاعت کرے تو تم بڑی مشقت میں مبتلا ہو جاؤ۔

معلوم ہوا کہ قانونی معاملات میں رائے عامہ کا کوئی دخل نہیں ہے یہ سب تصفیہ بات رسول کے حوالے ہیں مولانا اسلم صاحب رسول کی اس صحیح بات کے مقابلہ میں جمہور کی عقول کو ترجیح دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ کے تمام فیصلوں کی وہی قدر و قیمت ہے جو ایک عدالت کے سامنے دوسری معمولی عدالتوں کے فیصلوں کی قیمت ہوتی ہے مولانا کے نزدیک رسول کی ضرورت صرف قرآن کے لئے ہے جب کہ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں کے لئے رسول کی ضرورت ہے جو شخص رسول کی احادیث سے مستغنی ہو جانا چاہتا ہے اور محض اپنی عقل سے قرآن کی تشریحات کرتا ہے وہ درحقیقت کتاب اللہ کے ساتھ آئین سازی میں شرکت کا مدعی ہے اور جو شخص اپنے فیصلوں کو رسول کے فیصلوں کے ہم پلہ سمجھتا ہے وہ درحقیقت رسول کا منکر ہے بلکہ رسالت کی ضرورت ہی کا منکر ہے۔ قرآن کریم سے رسالت کی جو ضرورت ثابت ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ قرآن کی تبلیغ نہیں بلکہ اس کی تعلیم، اس کا بیان، خدا کی مرضی کی تشکیل بھی اس کے فرائض میں ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ حدیث یعنی بیان رسول کا انکار اور رسول کا انکار ایک ہی مسئلہ ہے۔ یہ بات فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جو شخص رسول کا صحیح مقام نہیں پہچانتا اس کی عظمت اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا وہ بھی رسولوں کے منکرین ہی کی صف میں شامل ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک صاف منکر ہے اور ایک تاویلاً منکر ہے۔

رسول کی رسالت اور امامت کی دو حیثیتیں نہیں ہوتیں

اسی لئے منکرین حدیث کو رسول کی عظمت ختم کرتے کرتے اس کو صرف ایک پوسٹ مین کی حیثیت دینی پڑتی ہے وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ ڈاک کا تھیلا اس کے بغل میں ہو جونہی کہ وہ تبلیغ رسالت سے فارغ ہوا اس کے بعد پھر وہ عام انسانوں کی صف میں آ کر شامل ہو جاتا ہے اس کی رسالت کے تمام حقوق اس سے مسلوب ہو جاتے ہیں اور وہ عام اماموں کی طرح ایک امام بن جاتا ہے مگر یہ کیا ہوا کہ ساری عمر بھی اس کو بیس دن بھی اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہوئی جب تک وہ امامت کے فرائض انجام دیتے امام سمجھا جاتا ہو اور جب اس سے بھی فارغ ہوئے تو پھر رسول اور امام دونوں حیثیتوں سے نکل کر عام انسانوں کی صف میں آنا پڑتا ہو۔ کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن بھر میں صرف چند ساعت کے لئے تو بحیثیت رسول سمجھے جاتے تھے پھر کچھ وقت کے لئے بحیثیت امام اس کے بعد عام حیثیات میں صرف معمولی انسانوں کی حیثیت میں سمجھے جاتے تھے اگر منبر اور مصلیٰ میدان جنگ اور مدینہ محفل اور بستر ہر جگہ آپ کی ایک ہی حیثیت سمجھی گئی ہے

تو پھر معلوم نہیں کہ مولانا نے ان حیثیات کی تقسیم از خود کہاں سے پیدا کرلی۔ پھر امامت و رسالت کے حقوق بھی متضاد
حقوق ہیں۔ رسول پر بقول مولانا صرف ایمان لانا واجب ہے مگر امام پر ایمان لانا ضروری ہے۔ آپ بیک وقت
لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے تھے اور اسی وقت اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے مگر کبھی یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ
آپ نے اپنے ان متضاد حقوق کو اپنے دو مختلف منصبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی متنبہ کیا ہو
پھر اس وقت اُن ابتدائی مخاطبین کے لئے منصبوں سے متعلق کا کوئی پہلو سمجھنے کے لئے جو کوئی رسالہ بھی نہیں پڑھا تھا یہ تقسیم کرنا
کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ جدا جدا طور پر دیکھیں جب محمد عربی
صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رسول ظاہر ہوں تو اُن پر فوراً ایمان لے آئیں اور جب بحیثیت امام نمودار ہوں تو
ان کا انکار کر دیں اور کہہ دیں کہ یہ انکار بحیثیت امامت ہے نہ بحیثیت رسالت۔ یا یہ اطاعت بحیثیت امامت ہے
نہ بحیثیت رسالت۔ یہی حق بات یہ ہے کہ آپ کی ذات میں ذہنی لحاظ سے خواہ کتنی ہی حیثیات پیدا کر دی جائیں
مگر آپ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے یوم وفات تک ایک لمحہ کو بھی حیثیت رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے
جیسا آپ پر ایمان آپ کی اطاعت آپ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اور آج بھی آپ پر ایمان آپ
کی اطاعت اور آپ کا احترام اسی منصب رسالت کے اعتبار سے ہے اور تا قیامت اسی حیثیت سے کیا جاتا
رہے گا اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے۔

اسوۂ رسول کی حیثیت

یہ سوال بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ رسالت علیٰ امامت کی دو حیثیتوں کی تقسیم کے بعد
یہ بتایا جائے کہ اسوۂ رسول کی پیروی کس حیثیت سے ہے اگر حیثیت رسالت سے ہے تو اطاعت اس کا حق
نہیں اس حیثیت سے رسول کا حق صرف اس پر ایمان لانا ہے اور اگر حیثیت امامت تو پھر اسوۂ رسول
ہی کی خصوصیت کیا ہے ہر امام اسوۂ حجت بن سکے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسوۂ رسول بعینہ قرآن پاک ہے لہٰذا
اس کی اطاعت قرآن کی اطاعت میں داخل ہے تو یہ بتانا چاہئے کہ جب کتاب اللہ اور اسوۂ رسول میں کوئی
فرق ہی نہ تھا تو پھر قرآن کے بعد اسوۂ رسول کی ضرورت کیا تھی اور اگر اس اسوہ میں کچھ تفصیلات قرآن سے زیادہ
تھیں تو پھر اس زیادتی میں رسول کی اطاعت کا جواب دیا جائے کہ وہ کس حیثیت سے ہے۔ رسالت کی حیثیت
سے اطاعت واجب ہو نہیں سکتی اور امامت کی حیثیت اسوہ بننے کے قابل نہیں۔ مولانا اسلم صاحب ایک طرف
تو رسول کے مطاع ہونے کا انکار کرتے جاتے ہیں دوسری طرف اسوۂ رسول کو متواتر کہہ کر اس کی پیروی کرنا بھی
لازم قرار دیتے جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ انھوں نے اسوۂ رسول کو متواتر کہہ کر ماخذ کی نوعیت صاف کر دی ہے
حالانکہ یہاں سوال تواتر کا نہیں ہے بلکہ یہ سوال ہے کہ اگر رسول اصولاً مطاع ہوتا ہی نہیں تو پھر اس کے اسوہ
کی پیروی کیسے لازم ہو سکتی ہے۔ دیکھئے امامت کا حق اگر ایمان نہیں تھا تو کسی زمانہ کے اسوہ کے متواتر ہونے کو

کیا اس پر ایمان لانا اس کا حق ثابت ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر رسول خود مطاع نہیں ہوتا تو اس کا اسوہ متواتر ہو یا غیر متواتر
کیسے مطاع ہو سکتا ہے۔ اور اگر پہلے اطاعت رسول کا حق تسلیم کر لیا جائے تو پھر بعض امور کی اطاعت اور بعض
کی اطاعت نہ کرنے میں تواتر یا غیر تواتر کا عذر پیش کرنا معقول ہو سکتا ہے۔ پھر اسوۂ رسول کو حجت تسلیم کر لینا اس کا
اقرار کر لینا ہے کہ رسول مطاع ہوتا ہے بلکہ مطاعوں میں بھی وہ مطاع ہوتا ہے جس کی اطاعت سب سے بڑھ کر ہو۔
پس اسوۂ رسول کو تسلیم کر کے اطاعت رسول سے انکار کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں مولانا نے اس پر
غور ہی نہیں فرمایا کہ اسوۂ رسول کی اتباع کا اقرار کر لینا ان کے حق میں اتنی بڑی اطاعت کا اقرار کر لینا ہے جو
کسی امام کے لئے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولوں کا علی الاطلاق اسوہ ہونا ان کی عصمت کا نتیجہ
ہوتا ہے جو ہر گناہ سے منزہ اور ہر معصیت سے مبرا ہوتی ہے۔ اس کے خطرات بھی خدا تعالیٰ کے زیر نگرانی ہوں،
اس کی کوئی بات اپنی خواہش نفس سے نہ ہو۔ وہی اس قابل ہے کہ اس کی ذات کو علی الاطلاق نمونہ کہہ دیا جائے
اسی کا ہر عمل مستقل ہر قول حق اور ہر ادا مستوجب ہو سکتی ہے اور وہی اس قابل بن سکتا ہے کہ تمام مخلوق کو آنکھ میچ کر
اس کے اتباع کی دعوت دی جائے۔ اس حیثیت کو تسلیم کر کے مولانا اسلم صاحب کا یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت کسی
مسئلہ جزئی میں بھی واجب نہیں ہے کتنا عجیب دعویٰ ہے۔

اسوۂ رسول اور حدیث

اسوۂ رسول کو حدیث سے بالکل ایک جدا شے سمجھنا بھی بڑی غلطی ہے۔ اس غلطی کا اصل سبب یہ ہے
کہ مولانا اسلم صاحب نے خود بخود یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ تمام اسوۂ رسول متواتر ہے اب چونکہ
حدیث کا متواتر ہونا وہ تسلیم نہیں کرتے اس لئے انہوں نے اسوۂ رسول کو حدیث سے ایک جدا چیز سمجھ لیا ہے۔
شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث صرف اس حصہ کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے متعلق ہو یعنی
آپ کے اعمال حدیث میں شمار نہیں کرتے۔ حالانکہ آپ کا ہر قول اور آپ کا ہر عمل سب حدیث کا جزء ہے۔ اسی
طرح اسوۂ رسول صرف عمل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ کا قول و فعل جو کچھ بھی ہے وہ سب امت کے لئے نمونہ
ہے کچھ نماز روزہ اور حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں بلکہ رسول کی ذات جس طرح عبادات کے بارے میں اسوہ ہے اسی طرح
فصل خصومات، امت کے نظم و نسق اور دیگر سیاسیات میں بھی اسوہ ہے حتیٰ کہ ذاتی جیسی نجی اور دوسرے بہت سے
حصص اخلاق میں بھی قرآن کریم نے ان اولی تفصیل کے بغیر تمام امور میں آپ کی ذات کو اسوہ کہا ہے اور کسی مخصوص
سے مخصوص شمار کیا اس طرف نہیں کیا کہ نماز روزہ یا عبادات کی تشریح کے سوا جتنے امور ہیں آپ کی ذات اسوہ
نہیں ہے یہ لوگوں نے بیان کی تفصیل کی ہے وہ قرآن سے خود ان کی ایجاد کردہ ہے اور وہ خود ہی اس کے
ذمہ دار ہیں۔ قرآن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا اسلم صاحب اسوۂ حسنہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"چونکہ قرآن کریم سے ان تعبدات کی توضیح و تفصیل پوری نہیں ہوتی اس لئے عملی شکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے سپرد کر دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کل نوع بسلسلۂ حوائج جو آپ میں اور بالکل یقینی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور اب

آپ کی تعلیم و تبیین دینی ہے لیکن وہ دینی عمل تشریع یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا۔ (ختم مرتب ص ۱۴۶)

صحابہ کے دور میں اسوۂ حسنہ کا مفہوم

(۱) عبداللہ بن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا گیا۔ ایک شخص نے یہ نذر کی ہے کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھا کرے گا۔ اتفاق وقت کہ اس کے بعد ہی عید الاضحی یا عید الفطر آگئی کیا وہ ان ایام میں بھی روزہ رکھے فرمایا نہیں اور یہ آیت پڑھی لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ آنحضرت ہر عید اور عید الفطر میں نہ خود روزہ رکھتے تھے نہ روزہ رکھنا پسند کرتے تھے۔ ؎

(۲) سعید بن جبیر کہتے ہیں اگر ایک شخص اپنے نفس پر کوئی چیز حرام کر لے تو اسے کفارہ یمین ادا کرنا چاہئے اس کے بعد ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ ؎

(۳) عمرو بن دینار کہتے ہیں ہم نے ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق مسئلہ دریافت کیا جس نے عمرہ کا طواف تو کر لیا ہے مگر ابھی صفا و مروہ کی سعی نہیں کی کیا وہ اپنی بیوی سے صحبت کر سکتا ہے فرمایا نہیں (کیونکہ جب آپ مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے تو آپ نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعتیں طواف ادا فرمائیں (مگر درمیان میں حلال نہیں ہوئے) اس کے بعد صفا و مروہ کی سات مرتبہ سعی کی اور یہ آیت پڑھی۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ ؎

(۴) نافع کہتے ہیں ابن عمرؓ نے عبداللہ بن الزبیر کی شہادت کے سال حج کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے عرض کیا ہمیں اس سال جنگ کا اندیشہ ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ آپ کو حج ادا کرنے سے روک دیں آپ نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ اگر انھوں نے مجھے روکا تو میں وہی عمل کر لوں گا جو ایسے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور یہ آیت پڑھی لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ ؎

(۵) زیاد بن جبیرؓ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابن عمرؓ ایک شخص کے پاس آئے وہ اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا فرمایا اسے کھڑا کر کے نحر کر سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اسی طرح تھا۔ ؎

(۶) عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے اگر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز بوسہ نہ دیتا۔ ؎

(۷) ایک شخص نے حجر اسود کے استلام کے متعلق ابن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا انھوں نے فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے اس نے کہا اگر بھیڑ ہو اگر ہو تو کیا کروں فرمایا اگر مگر کو یمن میں پھینک دو میں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے۔ ؎

؎ بخاری ص ۳۹۲ ۔ ؎ ابن ماجہ ص ۱۵۱ ؎ بخاری ص ۲۲۰ ۔ ؎ بخاری ص ۲۳۱ ۔ ؎ ایضاً ۲۳۱ ۔ ؎ بخاری ص ۲۰۸ ؎ ۲۱۸

پہلے چار واقعات میں صراحت کے ساتھ صحابہ نے اسوۂ حسنہ کی آیت پیش کی ہے اور آخری تین مواقع میں اگرچہ اس آیت کو تلاوت نہیں کیا مگر یہاں بھی اسی کے ہم معنی الفاظ ادا فرمائے ہیں۔ ان ساتوں واقعات سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ اختلافی معاملات پر کبھی کسی نے اسوۂ حسنہ کو صرف قرآنی احکام یا اسوہ جو اس کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا بلکہ سب کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فعل ثابت ہو گیا وہ ان کے یہاں اسی اسوۂ حسنہ کا جزو سمجھا گیا یہاں اگر کوئی بحث پیدا ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ اس فعل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کیا تھا مگر ایک واقعہ میں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسوۂ حسنہ کے مصداق میں صحابہ کے درمیان کوئی اختلاف ہوا تھا اس لئے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سلف کے دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے اقوال اسوۂ حسنہ کے جزو شمار ہوتے تھے خواہ قرآن کریم نے ان کی صراحت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اسوۂ رسول کا تواتر

یہاں سوال یہ ہے کہ دین احکام کی تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی تھی وہ شریعت کے کسی خاص باب سے متعلق تھی یا تمام ابواب سے، پہلی صورت میں بقیہ ابواب کی تشکیل کس کے سپرد کی اور جن ابواب کی تشکیل آپ نے کی یا وہ تمام تشکیل بطریق تواتر ہم تک منقول ہے اگر ہم تک تمام منقول نہیں تو جو رہ گئی اس کی تکمیل کی اب کیا صورت ہے۔ دوسری صورت میں اگر تمام ابواب کی تشکیل آپ ہی کے سپرد تھی تو یقیناً اس کو تواتر کے طور پر منقول ہونا چاہئے۔ ہمارے نزدیک شریعت کے ہر باب کی عملی تشکیل کے تواتر کا ثبوت بہت زیادہ تامل کا محتاج ہے۔ تمام ابواب تو درکنار ایک نماز ہی کو لیجئے اس کی کسی ایک صورت عمل کے متعلق بھی تواتر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان چونکہ اکثر حنفی مذہب رکھتا ہے اس لئے اگرچہ یہاں اس کی ایک ہی صورت عمل نظر آتی ہے اور اس لئے یہ مغالطہ لگ سکتا ہے کہ نماز کی یہی صورت شاید متواتر ہو لیکن جب آپ بلاد مغرب اور حجاز پر بھی نظر ڈالیں گے جہاں اکثر مالکی اور شافعی آباد ہیں تو وہاں آپ کو نماز کی شکل ہندوستان سے بالکل مختلف نظر آئے گی اور کسی ایک صورت پر بھی آپ تواتر کا حکم نہ لگا سکیں گے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف مولانا موصوف اسوۂ حسنہ کے عملاً مسلسل اور متواتر ہونے کا دعویٰ کرتے جاتے ہیں اور دوسری طرف امت کے موجودہ عمل کو قرآن کے خلاف بھی کہتے جاتے ہیں۔ اگر حقیقتاً نماز کی جو موجودہ تشکیل ہے وہ قرآن اور اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ہے تو پھر اس کے خلاف جو تشکیل ہے وہ جانی پہچانی کیا ہے اور کیا اس پر تواتر کے ساتھ عمل ہو رہا ہے۔ اگر نماز کی ان سب صورتوں میں سے کسی قدر مشترک صورت کو مولانا متواتر فرمائیں تو پھر بھی مولانا کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اتنی بات سے نماز کے اجزا کا تواتر تو ثابت ہو سکتا ہے مگر نماز کی کسی ایک مجموعی صورت کا تواتر ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ شاید مولانا نے

تو اس کا نقصان ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ تک محدود رہے گا۔ مگر یہاں تذکرہ کسی ایسی ہستی کا نہیں ہے جس کی علمی یادگار سکی پراگندگی سے صرف کسی ایک کتاب کے چند اوراق پراگندہ ہوتے ہیں یا صرف کسی ایک جلیل القدر ہستی کی تاریخ زندگی گم ہوتی ہے یا کسی خاص قوم یا جماعت کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ یہاں اس کا تذکرہ ہے جس کے تذکرہ کے گم ہونے سے کتاب ہستی ہی کے اوراق پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے کہ جب کسی شخص کی ہمہ صفتی اور ہمہ رنگی زندگی کو اس استیعاب کے ساتھ دیکھنے کا قصد کیا جائے تو اس کے لئے بہت بڑی جد و جہد کی حاجت ہوا کرتی ہے۔ مگر جس کی زندگی کو عالم کے لئے اسوہ حسنہ بنا دیا گیا تھا اس کو قدرت نے خود کچھ اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص اسے دیکھنا چاہے تو بلاشک و شبہ دیکھ سکتا ہے، صرف اس کی عبادات و معاملات ہی کا پہلو نہیں، صرف اس کی گفتگو و غصہ و مسکراہٹ نہیں بلکہ ہر گفتگو کا انداز بھی اور غصہ و مسکراہٹ کی ایک ایک ادا بھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس موقعہ پر تاریخ کے اوراق تلاش کئے جائیں اور آپ کی زندگی کو دنیا کے مشاہیر فردی زندگی سے علیحدہ کیا جائے۔ پھر آپ کی زندگی کے حالات میں صحیح و غلط کو چھانٹا جائے پھر بعض قیاسات کے ذریعہ آپ کی زندگی کے واقعات کو اس طرح ترتیب دے لیا جائے جیسا کہ دنیا کی دوسری شخصیتوں کے واقعات ترتیب دے لئے گئے ہیں بلکہ یہاں آپ ہی کے سامنے آپ کی زندگی مرتب ہوئی ایک ایک دن کے واقعات محفوظ کئے گئے اور محض تاریخ کے طور پر نہیں بلکہ آئین حیات اور زندگی کے دستور العمل کے طور پر اس کے بعد آپ نے صحابہ پر یہ بھی لازم کر دیا تھا کہ وہ اس زندگی کو بے کم و کاست غائبین تک پہنچا دیں تاکہ آپ کا اسوہ حسنہ پورے استیعاب کے ساتھ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا جائے اور جو فائدہ موجودین کو پہنچا تھا وہی غائبین کو بھی پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات میں جب آپ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پھر اجتماعی زندگی میں بہت بڑی جماعت اور محض چند افراد کے درمیان کی زندگی بھی شامل ہے تو لازمی طور پر آپ کی حیات طیبہ کے بعض واقعات بڑی جماعتوں سے منقول ہوں گے اور بعض محض چند افراد یا ایک فرد سے مثلاً حج کا سفر جسے ہزاروں نے دیکھا اس کے ناقلین بھی بکثرت ہونے چاہئیں یہاں ناقلین کی قلت یقیناً شبہ پیدا کر سکتی ہے کہ جو واقعہ اتنی بڑی جماعت کے ساتھ پیش آیا ہے اس کے نقل کرنے والے صرف ایک یا دو افراد کیوں ہیں لیکن جو آپ کی انفرادی زندگی ہے یا اسلام کے ابتدائی دور کے واقعات ہیں یا کسی ایک شخص کے استفسار پر اس کو علیحدہ جواب دیا گیا ہے یا تہجد کے وقت کسی خاص خادم کے ساتھ کوئی گفتگو ہوئی ہے یا صحبت انسانی کو جاتے وقت کسی سے آپ نے کچھ فرمایا ہے اور اسی قسم کے سیکڑوں واقعات ہو سکتے ہیں جن کے سننے والی بہت جماعتیں نہیں ہوئیں۔ آپ کی یہ زندگی انفرادی فرد واحد ہی کے ذریعہ سے جماعتوں تک پہنچی ہے اس سے آگے وہ واقعات ہیں جن کا

دیکھنے والا ایک شخص بھی نہ تھا یعنی ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کا اسوۂ حسنہ شب کے تاریک گوشوں میں آپ کی
آہ و زاری، آپ کا نالہ و بکا، آپ کی طویل نمازیں، آپ کی لمبی لمبی قراءتیں، رو رو کر قرآن پڑھنا اور گڑگڑا کر
امت کے لئے دعائیں کرنا یہ سب امہات المومنین کے ذریعہ امت کو پہنچا ہے حتیٰ کہ آپ کے تہجد کی رکعات
اور اس کے رکوع و سجود کی کیفیت، درمیانی وقفے، اوقات کی تقسیم، اس کے طول و قصر کے حالات جتنے بسط
شرح کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں شاید ہی کسی اور صحابی سے مروی ہوں۔ اگر درحقیقت آپ کا
اسوۂ حسنہ ان سب واقعات کو حاوی ہے اور حاوی ہونا چاہیے تو یہاں تواتر کی قید لگا کر کونسا صحیح احساس کیا
جا سکتا ہے۔ جہاں اصل خبر اور اس کی ابتدا ہی فرد واحد سے شروع ہو اس کے لئے تواتر کا مطالبہ کرنا کہاں تک
معقول ہے اس قید کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالہا سال حیات میں سے آپ کی
خلوتیں۔ آپ کے گھر کے قیام اور آپ کے دوسرے اندرونی واقعات سننا ہی نہیں چاہتے، اور چلئے اگر
آپ کو قبل از نبوت کے واقعات سے دلچسپی نہیں ہے تو نبوت کے بعد کے واقعات میں بھی آپ صرف وہی
واقعات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو اتنے کثیر مجمع میں پیش آئے ہوں جن کو تواتر کی مقدار کہا جا سکتا ہو پھر اس پر
بھی آپ راضی نہیں ہیں جب تک کہ ہر زمانہ میں اس کے ناقلین اسی قدر موجود نہ ہوں کیا قرآن نے عالم کے
سامنے آپ کا جو اسوۂ حسنہ پیش کیا تھا وہ صرف ان ہی چند واقعات کا مجموعہ تھا جو آج ہم تک بطریق تواتر
پہنچا ہے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے دیکھنے والوں کے لئے بھی ظن و یقین کی کوئی بحث
تھی؟ جتنے واقعات جن کے سامنے گزرے وہ اس کے نزدیک ہر تواتر سے بڑھ کر قابل یقین تھے پھر جب ان
کے سامنے آپ کی زندگی سب کی سب اسوۂ حسنہ تھی تو ہمیں بھی اس پورے اسوۂ حسنہ کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہاں
تواتر کی قید لگانا دوسرے لفظوں میں اسوۂ حسنہ سے انکار کرنا ہے کیونکہ تواتر کے لحاظ سے آپ کے اسوۂ حسنہ
کا جو حصہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ نہ ہماری ضروریات کے لئے کافی ہے نہ قرآن کے ایضاح و بیان کے لئے
اس لئے اس قید سے ہمارا شرعی نقصان ہی نہیں ہے تاریخی بھی۔ اور صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمام نسل انسانی کا
کیونکہ اس کی سب سے بڑی محرومی یہ ہوگی کہ جو انسان اس کے شعبۂ حیات مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا صرف
اپنے قول سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کے اکثر صفحات زندگی اس سے پوشیدہ رہ جائیں اور جتنے کچھ پائے
ثبوت کو پہنچیں اگر ان کو چھانٹے ..... بغیر سب کو متواتر تسلیم کر لیا جائے تو وہ بھی اس کی بہت ہی محدود زندگی
کے بہت محدود شعبے ہوں۔ یہاں یہ جواب دینا کہ غیر متواتر اسوۂ حسنہ کو تاریخی طور پر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں بہت غلط
ہے کیونکہ ہماری بحث اس وقت اس اسوۂ حسنہ سے ہے جو قرآن پڑھنے والے صحابہ کے سامنے بحیثیت شرعی حجت
کیا تھا یعنی وہ تواتر اور غیر تواتر کی بحث سے بالاتر تھا اور یہاں شبہ اس میں تشریعی حیثیت کے سوا صرف تاریخی

حیثیت نہ تھی۔ آپ کی ذات مجسم قرآن کے مشابہ بنا دی گئی تھی وہ سب کی سب مومن کے لئے اسوہ قرار دی گئی
تھی اور اوقات کی قید سے اس تمام اسوہ کا صرف وہی حصہ باقی رہ جاتا ہے جس میں ثبوت کی شرط پائی جائیں
یہ مقدار اصل سنت حسنہ کی نسبت عشر عشیر بھی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک قرآن ہی کے لئے
صرف عقل کافی ہے جیسا کہ وہ عبارات مذکورہ بالا میں کو بہت صفائی کے ساتھ لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ قرآن کریم
نے لفظاً اسوہ کو بہت تاکید کے طور پر ذکر کیا ہے اس لئے بادل ناخواستہ اسے بھی مولانا کو تسلیم کرنا پڑا ہے ورنہ عملاً دل
سے ان کے نزدیک اسوہ رسول کی حاجت ہی نہیں ہے۔ جب رسول کے کلام سے ان کو استغنا ہو سکتا ہے تو
اس کے افعال کی احتیاج چہ معنی دارد۔ ان کے خیال میں رسول قرآن پہنچا کر اپنے منصب سے علیحدہ ہو گیا۔
اب وہ عام آدمی ہے جو چاہے کرے۔ پس اس کے شخصی افعال و اقوال ہیں جن کا اسلام میں بطور ثبوت صرف
اتنا ہی احترام ہو سکتا ہے جتنا کہ تاریخ کا۔ ہمارے خیال میں اس آخری حصے کے تمام منصف مورخین بھی قائل ہیں۔
بس اگر منکرین حدیث بھی اس کی حیثیت اتنی ہی سمجھتے ہیں تو اس میں مسلم و کافر کی بھی کوئی تقسیم نہیں ہے بلکہ
دیگر مورخین تو اسلام کی اس ابتدائی جد و جہد سے بہت متاثر بھی نظر آتے ہیں مگر مولانا اس تاریخی جد و جہد
سے متاثر بھی نہیں بلکہ اپنی تصنیف علم حدیث میں اس پر لکھا کیا ان کی وجہ یہی[1] جس سے پتا چل سکتا ہے کہ
کہ مولانا موصوف کے باطن میں بحیثیت تاریخ بھی کتب حدیث کا احترام ہے۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر اسپرنگر نے کہا ہے کہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح
اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے!
ڈاکٹر اسپرنگر کے اس قول سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا شغف فن حدیث سے صرف تاریخی ہی
تھا یا تشریعی حد تک۔ اب مولانا کا ارشاد سنئے۔

• مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے بیشتر حضرات کے حالات محض استنباط کرنے کی باطل کوشش کا سبب
کی بیعت کے متعلق جن کا علم ہو سکے روایت کی گئی ہے اور کچھ نہ تھا۔ یہ دریافت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا ان کی کنیت کیا تھی ان کے
کون کون استاد تھے اور کن کن کون شاگرد ان کی کس نسبت سے تھی اور کس حد تک ثقہ و غیر ثقہ وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ضروری یا قابل فخر
کارنامہ نہیں ہے بلکہ ملت کے لئے ایک قسم کی دماغی تفریح ہے جو دراصل پستی کے سبب ہی ہے۔ (علم حدیث ص ۹۲)
اسی کتاب میں آپ دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: محدثین میں تشریعات سے بڑھ کر جزئیات سے گفتگو ... استغنا کا
سے ہی یا لاتعداد قسم کے ہیں جن کا ملت کی اصلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکر افضل
ہیں یا حضرت علی۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماء دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے۔ قیام نماز
میں ہاتھ کہاں باندھنا چاہئے یا نہیں۔ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ وغیرہ وغیرہ!
ان عبارات سے آپ کو صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا موصوف کے قلب میں حدیث کا کیا مقام ہے۔ حدیث کو
تشریعی یا تاریخی حیثیت سے بحث کرنا جیسا اہل سنت کا مسلک ہے وقت برباد کرنا ہے۔

سند صرف مسلمانوں کی خصوصیت ہے

علامہ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی امتوں میں سے کسی کو یہ توفیق میسر نہیں ہوئی کہ اپنے رسول کے کلمات صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کرے۔ یہ صرف اس امت کا طغرائے امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کی صحت اور اتصال سند کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق بخشی گئی ہے۔ آج روئے زمین پر کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے اس کے برخلاف اسلام ہے جو اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک جزئیہ صحت و اتصال کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔

دینی ثبوت کی چھ صورتیں

ابن حزم نے دین کی مستند اور غیر مستند طور پر منتقل ہونے کی کل چھ صورتیں بیان کی ہیں۔

(۱) پہلی صورت میں شرق سے لیکر غرب تک سب مسلمان بلکہ غیر مسلم سب شریک ہیں، یہاں منصف و مخالف کی بھی کوئی تفصیل نہیں ہے جیسا قرآن کریم۔ تمام عالم اس کا شاہد ہے کہ جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہی قرآن ہے جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اسی طرح پنجوقتہ نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ، حج اور اسی قسم کے وہ احکام جو قرآن کریم میں منصوص ہیں سب تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے مذہب میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق ہم اتنا علم بھی ثابت کر سکیں۔ ان کی شریعت کا تمام دار و مدار تورات پر ہے جس کا خود ثبوت ہی ایک مجلس کے ثبات میں ہے جس کا ان کو اعتراف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد عام ارتداد پھیل گیا تھا اور زمانہ دراز تک بت پرستی کی جاتی تھی، انبیاء علیہم السلام کو اپنے وطن سے نکالا جاتا تھا بعض کو قتل بھی کر دیا جاتا تھا۔ غور فرمائیے کہ اس دور میں تورات کی حفاظت کا کیا خیال کیا جا سکتا ہے اس کا تواتر تو درکنار۔

نصاریٰ کا حال یہ ہے کہ ان کے کل مذہب کا بنیادی ماخذ صرف پانچ شخص ہیں جن کا جھوٹ خود ان کے بیان سے ثابت ہے۔ قرآن کریم کے تواتر سے بھلا اس کا کیا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ بھی تواتر ہے مگر اس کا دائرہ پہلے سے کسی قدر تنگ ہے۔ جیسی پہلی صورت میں اہل علم اور بے علم مسلم اور غیر مسلم سب اس میں شریک ہوتے ہیں یہاں صرف ایک محدود دائرہ کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے مگر اس کا اعداد بھی ہزارہا کی تعداد سے متجاوز ہوتا ہے جیسا کہ آپ کے معجزات، مناسک حج، زکوٰۃ کے بعض احکام ان کی خبریں آپ کے اصحاب اور تابعین سے۔ یہود و نصاریٰ کے پاس اس جنس کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والے اگرچہ حد تواتر کو نہیں پہنچتے مگر ثقہ اشخاص ہیں پھر وہ اسی قسم کے دوسرے چند اشخاص سے یا ایک شخص سے ایک بات نقل کریں یا اسی طرح یہ نقل طبقہ بطبقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو جائے۔ یہود و نصاریٰ کے یہاں اس قسم کی بھی کوئی سند نہیں ہے۔ یہ نعمت صرف امت محمدیہ کا ہے کہ اس نے اپنے رسول کا ایک ایک کلمہ ہر قسم سے محکم طریق سے محفوظ کر لیا ہے

اور اس خدمت کے لئے شرق و غرب میں اتنے نفوس ہمارے سامنے موجود ہیں کہ ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج کسی فاسق کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ دین کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا سکے۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ اپنے دین کے کسی ایک مسئلہ کے متعلق بھی وثوق کے ساتھ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ ان کے دین کا جزء ہے۔

(۴) چوتھی صورت مرسل ہے یعنی رسول اور ناقل کے درمیان کا واسطہ مذکور نہ ہو کوئی کہے یہ براہ راست آپ کا قول و فعل نقل کرے۔ یہود و نصاریٰ کے پاس بہت سے بہت اپنے دین کی کوئی سند ہے تو اسی قسم کی مگر پھر اس طریقہ میں بھی زمانۂ نبوت سے جو قرب ہمیں حاصل ہے انہیں حاصل نہیں۔ اس پر ان کے لئے انقطاع اور مجہول حالات کی ناموافقت مزید برآں ہے اس لئے جتنے تردد اور شبہات کے امکانات وہاں پیدا ہو سکتے ہیں یہاں نہیں ہو سکتے۔ ہمارے علم میں یہود و نصاریٰ کے پاس صرف ایک ہی مسئلہ ایسا ہے جس کو ان کے کسی عالم نے بنی اسرائیل کے کسی آخری نبی سے براہ راست سنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تمام دین کے ثبوت کی درمیانی کڑی غائب ہے۔ ہم ان طریقوں میں سے اپنے تمام دین کی بنیاد صرف پہلے تین طریقوں پر قائم کرتے ہیں۔ [1]

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ اس کے بعض مجروح اور غیر ثقہ بھی ہوں۔ ہمارے نزدیک ایسی سند کا اعتبار کرنا مطلقاً نہیں۔

(۶) چھٹی صورت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ہی نہ ہو بلکہ مذکورہ بالا طریق سے کسی صحابی کا قول و فعل ہو۔ اس کے تسلیم کرنے نہ کرنے میں بھی اختلاف ہے ہم اسے واجب التسلیم نہیں سمجھتے۔ [2]

ابن حزم کے اس قول سے معلوم ہوگا کہ تواتر کے علاوہ خبر واحد بھی دین میں حجت ہے۔ دین کی بنیاد صرف تواتر پر قائم کرنا اس کے بہت بڑے حصہ کو ضائع کر دینا ہے کیونکہ تواتر کے ساتھ اس کا جتنا حصہ ثابت ہے وہ تمام دین کے مقابلہ میں اتنا قلیل ہے کہ اس کو نہ ہونے کے برابر کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] مرسل کے قبول و رد کرنے کے متعلق اصول حدیث میں اختلافات نقل کیا گیا ہے۔ فریقین کے دلائل وہاں مذکور ہیں یہاں طوالت کے خوف سے ان کو نقل نہیں کیا گیا۔

[2] قول و فعل صحابی کے متعلق بھی بڑی تفصیل ہے مگر یہاں موضوع سے غیر متعلق ہے اس کی بحث اصول حدیث کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[3] الملل والنحل ج ۲ ص ۹۲، ۹۳۔

خبرِ واحد کی حجیت

اصولِ حدیث کی اصطلاح کے لحاظ سے اجمالی طور پر حدیث کی دو قسمیں ہیں (۱) متواتر۔ (۲) خبرِ واحد۔ ہر اس خبر کو جو متواتر نہ ہو اصطلاحی طور پر خبرِ واحد ہی کہا جاتا ہے۔

لہٰذا خبرِ واحد کے لفظ سے اس کا جو مفہوم دماغ میں پیدا ہوتا ہے اُس کی بنا پر خبرِ واحد کا انحصار نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اگر تواتر کا عدد کسی ایک طبقہ میں بھی فوت ہو جائے تو اس خبر کو خبرِ واحد ہی کہا جاتا ہے خواہ وہ خبر کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو۔ اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس کا روایت کرنے والا ہر دور میں صرف ایک ہی شخص ہو۔ جو لوگ متواتر کے سوا خبرِ واحد کو مطلقاً حجت نہیں مانتے ان کو ذرا اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی حدیث کے راوی صحابہ و تابعین کے دور میں بکثرت موجود ہوں پھر کسی ایک دور میں اساتذہ و تلامذہ کی نقل و حرکت کی قلت و کثرت، احوال کی موافقت یا ناموافقت کی وجہ سے کسی قدر کم ہو جائیں تو کیا ایسی خبر کو بھی رد کر دینا عقلاً مناسب ہے یہی وجہ ہے کہ بعض معتزلہ جو خبرِ واحد کے سب سے پہلے منکر ہیں یہ غور کرتے کرتے اس فیصلہ کے لئے مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر ہر دور میں اس کے راوی دو دو موجود ہوں تو پھر ایسی خبر کو حجت کہہ دیا جائے گا اس کی تردید کی اب کوئی وجہ نہیں رہتی جاتی۔ گو صرف دو راویوں سے کسی خبر کو متواتر نہیں کہا جا سکتا۔ وہ خبرِ واحد ہی رہتی ہے مگر اس کو ایسی قوت ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کو مفیدِ یقین کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ یہ تمام تقسیمیں اس قدر محدود وقت کے اندر ہیں کہ اس میں ذخیرۂ حدیث کو بالکل ساقط الاعتبار قرار دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ تدوینِ حدیث کا دور تیسری صدی تک قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ پہلی صدی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابہ خود موجود تھے اور آپ کی احادیث کا ذخیرہ متفرق طور پر اُن کے پاس محفوظ تھا۔ اس کے بعد دوسری صدی شروع ہونے نہیں پائی کہ تدوینِ حدیث کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔ اتنے قلیل عرصہ میں تمام ذخیرۂ احادیث کا یک قلم مشکوک ہو جانا بہت بعید از قیاس ہے۔

اگر تدوینِ حدیث صحابہ و تابعین کے دور کے بعد شروع ہوتی تو حدیث کے ثبوت میں شبہ کرنا معقول ہوتا لیکن جبکہ نقلِ احادیث کا سلسلہ خود آپ کے زمانے سے برابر متصل طور پر چلا آرہا ہے تو اب اس میں شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں اس پر مستقل ایک مقالہ لکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبرِ واحد کی حجیت ثابت کی ہے۔ ہم یہاں اس کا

مختصر خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ | تحویل قبلہ سے پہلے اہل قبا کا قبلہ بھی بیت مقدس تھا۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد صبح کی نماز میں تحویل قبلہ کی خبر لیکر ان کے پاس پہنچا تو وہ سب نماز کے اندر ہی اپنا رخ بیت المقدس کی طرف سے بدل دیا۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی اور اگر بالفرض ان کا یہ فعل غلط ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلہ پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے قول پر ایک قطعی فریق کو کیسے چھوڑ دیا اور براہ راست میری یہ بیت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا۔ مگر ایسا اعتراض کرنا تو درکنار بنی جانب سے خبر واحد کا بھیجنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ خود صاحب نبوت کے نزدیک بھی دین کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کا قول کافی ہے۔

دوسرا واقعہ | یہ ہے کہ حضرت انس فرماتے ہیں میں ابو عبیدہ، ابو طلحہ، ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعۃً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہو گئی ہے۔ یہ سن کر فوراً ابو طلحہ نے کہا انس اٹھو اور شراب کے مٹکے توڑ ڈالو۔ میں اٹھا اور شراب کے برتن توڑ دیئے۔

ظاہر ہے کہ شراب پہلے شرعاً حلال ہی تھی لیکن یہاں صرف ایک شخص کے بیان پر اس کی حرمت کا یقین کر لیا گیا اور اس کے برتن توڑ ڈالے گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے اتنا تامل بھی نہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ جا کر پوچھ آتا اور نہ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ قبل از تحقیق ہمارا مال شراب بیجا کیوں ضائع کیا گیا۔

تیسرا واقعہ | خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے آپ نے زنا کے ایک مقدمہ میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زنا کرنے کا اقرار کیا تھا اس کے پاس انیس کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو اگر وہ بھی اقرار کر لے تو اس کو رجم کر ڈالو۔ دیکھنا اس شخص کو صداقت اور ثقاہت کو دیکھ کر اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت نہیں رکھی۔ انیس پہنچے اس عورت نے زنا کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم کر دی گئی۔

چوتھا واقعہ | محمد بن سلیم ثقفی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم منیٰ میں تھے کہ یکا یک دیکھتے ہیں کہ حضرت علی اونٹ پر سوار یہ منادی کرتے چلے آتے ہیں کہ یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص ان میں روزہ نہ رکھے۔

پانچواں واقعہ | یزید بن شیبان کہتے ہیں۔ ہم مقام عرفات میں تھے۔ ہمارا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ سے دور تھا۔ اسی درمیان میں بارسے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد یہ پیام لیکر پہنچا کہ تم جہاں مقیم ہو وہیں رہو۔ یہی جگہ بھی ٹھیک ہے۔ وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ میدان عرفات میں

جہاں بھی پیام ہو جائے فریضۂ توقیف ادا ہو جاتا ہے۔

چھٹا واقعہ ہجرت کے نویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا تاکہ فریضۂ حج کو انجام دیں۔ وہاں کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ وہ لوگوں کو سورۂ برأت کی آیات سنا کر ہشیار کر دیں کہ جن لوگوں نے خود بدعہدی کی ہے اب خدا کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔

ان سب احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک شخص کو اپنی جانب سے بھیجنا اور جبکہ آپ کا بنفس نفیس تشریف لیجانا بھی ممکن تھا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ دین میں ایک ثقہ اور صدوق شخص کی خبر حجت گردانی گئی ہے۔

خبر واحد کی حجیت کا ایک اور ثبوت اس کے سوا آپ نے عامل اور قاصد جہاں جہاں بھیجے ہیں ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ قیس بن عاصم، زبرقان بن بدر، ابن نویرہ وغیرہ کو اپنے اپنے قبائل کی طرف روانہ کیا۔ وفد بحرین کے ساتھ ابن سعید بن العاص کو بھیجا۔ اور معاذ بن جبلؓ کو یمن کے بالمقابل بھیجا اور جنگ کے بعد ان کو شریعت کی تعلیم دینے کا حکم دیا لیکن کہیں منقول نہیں کہ آپ کے عاملین کے ساتھ کسی نے پس و پیش کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لئے اس کو صدقات و عشر نہیں دئیے جائیں گے۔

خبر واحد کی حجیت کا تیسرا ثبوت اسی طرح آپ نے دعوت اسلام کے لئے مختلف بلاد میں ایک ایک قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کی رعایت کی کہ ہر سمت میں ایسا شخص بھیجا جائے جو انہی نواح میں متعارف ہو تاکہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ ہو اور ان کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے عاملوں اور قاضیوں کے پاس جب بھی آپ کے خطوط پہنچے تو ہمیشہ انھوں نے فوراً ان کو نافذ کیا اور خواہ مخواہ کے شبہات کو کوئی راہ نہیں دی۔ پھر آپ کے بعد بھی آپ کے خلفاء و عمال کا یہی دستور رہا حتی کہ سلطنتوں میں ہمیشہ ایک ہی خلیفہ، ایک ہی امام، ایک ہی قاضی، ایک ہی امیر ہونا ایک مسلم مسئلہ تھا جس میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خبر واحد کی حجیت کے لئے یہ احادیث بطور نمونہ تو ضرورت کافی ہیں۔ یہ وہ طریقہ ہے جس پر ہم نے ان لوگوں کو پایا ہے جن کو ہم نے دیکھا، یہی طریقہ انھوں نے اپنے پیشروں کا ہم سے بیان کیا ہے۔

خبر واحد کی حجیت کا چوتھا ثبوت ہم نے تو مدینہ میں ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ سعید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو سعید خدری کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں اور اس سے دین کی ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے۔ ابو ہریرہ ایک روایت کرتے ہیں تو اس سے ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک ایک صحابی کے بیان سے

دین کے مسائل میں حجت ثابت ہو رہی تھی یعنی خبر واحد اور مشہور حدیث کا قول ہر شہر میں تسلیم کیا جاتا تھا

ترجمہ امام شافعی لکھتے ہیں کہ میں نے مدینہ، مکہ، یمن، شام اور کوفہ کے محدثین کو دیکھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور صرف اسی ایک صحابی کی حدیث سے ایک سنت ثابت ہو جاتی تھی۔ اہل مدینہ کے چند نام یہ ہیں

محمد بن جبیر، نافع بن جبیر، یزید بن طلحہ، محمد بن طلحہ، نافع بن عجیر، ابو سلمہ بن عبد الرحمن، حمید بن عبد الرحمن، خارجہ بن زید، عبد الرحمن بن کعب، عبد اللہ بن ابی قتادہ، سلیمان بن یسار، عطاء بن یسار وغیرہم اہل مکہ کے چند اسماء حسب ذیل ہیں۔ عطاء، طاؤس، مجاہد، ابن ابی ملیکہ، عکرمہ بن خالد، عبید اللہ بن ابی یزید، عبد اللہ بن باباہ، ابن ابی عمار، محمد بن المنکدر وغیرہم اسی طرح یمن میں وہب بن منبہ اور شام میں مکحول۔ اور بصرہ میں عبد الرحمن بن غنم، حسن اور محمد بن سیرین، کوفہ میں اسود، علقمہ، شعبی، غرض تمام ہی اسلامی ممالک کا یہی عقیدہ رہا ہے کہ خبر واحد حجت ہے۔ اگر علماء کی خاص جماعت سے متعلق کسی کے لئے یہ کہا جائے تو ہو سکتا ہے اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجت کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے مگر ضیاع کے خلاف سمجھ کر نہ مانا پھر بھی کہتا ہوں کہ میرے علم میں فقہاء مسلمین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی چند صورتیں

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کسی کے پاس خبر واحد پہنچی ہو تو اس نے اس پر اس لئے عمل نہ کیا ہو کہ اس کے نزدیک وہ خبر صحت کو نہ پہنچی ہو یا اس حدیث کو دو معنوں کا محتمل ہو، اور اس نے دوسرے معنی پر عمل کر لیا ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ صحیح حدیث اس کے پاس موجود ہو، غرض جب تک وجوہ ترجیح یا اسباب ترک میں سے کوئی سبب اس کے پاس موجود نہ ہو ہرگز کسی کے لئے خبر واحد کا ترک کرنا جائز نہیں۔

خبر واحد کے مراتب

اس کے ساتھ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک حدیث جس پر سب کا اتفاق ہو اور ایک وہ جو کسی خاص مسئلہ کے متعلق صرف ایک راوی سے روایت کی گئی ہو، اس میں مختلف تاویلوں کی گنجائش بھی نہ ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتیں۔ پہلی حدیث کو تسلیم کرنا لازم قطعی ہے اگر اس کا کوئی منکر ہو تو اس سے توبہ کرائی جائے لیکن دوسری قسم کی حدیث اس درجہ کی نہیں اگر اس حدیث میں کوئی شک کرے تو اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا لیکن اس پر بھی عمل کرنا واجب ہوگا جب تک کہ اسباب ترک میں سے کوئی سبب پایا جائے جیسا کہ شاہدوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہاں بھی غلطی، وہم، بھول کا احتمال باقی رہتا ہے لیکن پھر بھی جب تک کہ تحقیق نہ ہو ظاہر حال پر عمل کیا جاتا ہے۔

ظن و علم کے مفہوم پر ایک اہم بحث

خبر واحد کی حجیت کے برخلاف منکرین حدیث کے پاس بڑا استدلال یہ ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہیں اور دین کی بناء ظنیات پر قائم نہیں کی جا سکتی اس لئے ہم یہاں پہلے ظن و علم کے مفہوم کے متعلق تحقیق کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ صحابہ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کا استعمال اسی میں ٹھیک اٹکل کے موقعہ پر کیا کرتے تھے۔ پس جو خیال واقعہ کی تحقیق کے بغیر محض اپنی جانب سے بنا لیا جائے ان کے نزدیک ظن کہا جاتا تھا اب وہ خواہ رجحان کے مرتبہ کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

سلہ مولانا اسلم صاحب نے معلوم نہیں کس مجبوری سے صحابہ کے دور کے ان روایات کی جو ابھی حسب ذیل الفاظ میں کی ہے علاوہ اس کے یہ سیدھی بات بھی کہ انسان تمام واقعات کو [illegible] سے [illegible] جانے مگر آپ [illegible] رہی ہیں۔

مگر عہد صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا اس لئے اس وقت یہ طرز عمل بالکل حق بجانب تھا لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ حکایت کی ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سامعت کے چند افراد جن کی نسبت کوئی شبہ نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ایسا بھی ہو جائے کہ ایک حکم یا عمل کی پابندی عام طور پر کی جاتی ہے اور اس کا بیان بھی بالواسطہ ہوا ہے اس لئے اس کے لئے یہ لازم ہے کہ [illegible] پیش کرے جو آگے بھی دیکھ سکا ہو قرن سے ہمارے سامنے سلسلہ کبھی کی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کے سامنے گواہ ہونا ضروری ہے بیان کے اصول عدالت اور قانون شریعت کے مطابق اس کو قرار تسلیم کے قابل نہیں۔ (مقام حدیث ص ۲۰)

اس طویل اقتباس میں فاضل مقرر نے جو حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ نفس مسئلہ [illegible] صحابہ کے دور میں [illegible] اس سے زیادہ کوئی صحابی کی روایت ہو اس میں سے کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے [illegible] امت کے کسی عمل کی پابندی عائد کرنے کی بنیاد بن گئی ہے سب سے پہلے یہ [illegible] اس دعوی کے لئے دو گواہ لائے مگر دو گواہ نہیں لایا اور دوسرا شخص اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتا اور اس کے بغیر ہی اس کا [illegible] قبول کر لیا جاتا ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ راوی کے نزدیک اصل حدیث [illegible] ایک [illegible] لوگ [illegible] صحیح نہیں کہ صحابہ نے سب روایتیں براہ راست صاحب نبوت سے خود سن کر بیان کی ہیں اس لئے ان کی حیثیت معاً کی حیثیت نہیں بلکہ ان کی روایتوں میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جو انہوں نے خود نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کی ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

ما کل ما نحدثکم به سمعناه من رسول الله صلی الله علیه وسلم ولکن کان یحدث بعضنا بعضا (مستدرک حاکم)

جو حدیث ہم بیان کرتے ہیں وہ تمام ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود نہیں سنی بلکہ ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو ہم میں سے بعض بعض سے روایت کرتا تھا۔

اس بنا پر صحابی کی حیثیت بھی ٹھیک وہی حیثیت ہو گئی جو دوسرے راوی کی ہے اس کے علاوہ یہ بھی مسلم نہیں (باقی صفحہ [illegible] پر)

اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں قرآن میں رائے زنی کی ممانعت کی گئی ہے یعنی محض اپنی عقل سے کسی خبری بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔[1] حضرت ابو موسیٰؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ

من كان عنده علم فليعلمه الناس	جس کسی کے پاس کوئی علم کی بات ہو تو وہ لوگوں کو سکھائے
فان لم يعلم فلا يقولن ما ليس به علم	اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو
فيكون من المتكلفين۔[2]	علم نہیں، تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکلف یہ ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو تو بے علمی کے چھپانے کے لئے اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لی جائے اسی کو ظن کہتے ہیں۔ اسی کو حضرت عمرؓ نے اپنے ان الفاظ میں ادا فرمایا تھا۔ وانما نهينا الظن والتكلف۔ حضرت ابو موسیٰؓ کا اس مختصر بیان میں حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ تھا۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ	اس بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تم کو علم نہیں
قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا	آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا اور
أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ۔	نہ تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں

ما علمك الله في كتابه فاحمد الله به	کتاب اللہ میں جو علم اللہ تعالیٰ نے تجھے مرحمت فرمایا ہے اس پر اللہ
وما استأثر عليك من علم فكله	کی تعریف کر اور اس کا جو علم اس نے خود اپنے ہی لئے رکھا
الى عالمه ولا تتكلف فان الله	جس کو تجھے نہیں بتایا اس کے متعلق تکلف مت کر اور جو اس
عز وجل يقول لنبيه قل ما	کا عالم ہے اس کے حوالہ کر دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے
اسألكم عليه من اجر وما انا	یہی ارشاد فرمایا ہے آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے معاوضہ نہیں
من المتكلفين۔[3]	چاہتا اور میں تکلف کرنے والوں میں نہیں ہوں۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے۔

اتقوا الرأي في دينكم۔[4]	دین میں رائے زنی سے بچو۔

غرض سلف میں جس ظن اور رائے کی جانب سے تحذیر ہے وہ دلیل آرائی کر کے جو رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے تحت مراد نہ لی گئی مختار رائے نہیں کہا جاتا تھا وہ مذموم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے کلام کی

[1] اعلام ج ۱ ص ۴۹۔ [2] مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۰۔ [3] معلوم ج ۱ ص ۱۰ و جامع بیان العلم ج ۲ ص ۵۰ [4] اعلام الموقعین ص ۴۹

اس تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے۔

من احدث شیئاً لیس فی کتاب اللہ ولم	جس نے کوئی ایسی بات ایجاد کی جو قرآن میں نہیں اور نہ
تمض بہ سنۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہوئی ہو تو وہ نہیں جانتا کہ
ما ہو منہ اذا لقی اللہ عز وجل۔ [1]	کل قیامت میں اس کا حشر کیا ہوگا۔

ان الفاظ سے رائے کی دو قسمیں ظاہر ہوتی ہیں ایک وہ جو کتاب اللہ کے ماتحت ہو دوسری وہ جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو اس کے متعلق بھی ظاہر ہی کیا جاتا تھا جو قرآن و حدیث نے بتایا یا صحابہ سے منقول ہو۔ اوزاعی فرماتے ہیں کہ علم صرف وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔ [2]

ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ میں نے عطاء سے ایک مسافر کے متعلق مسئلہ پوچھا کہ اس نے حج کے مہینوں کے سوا کسی اور مہینہ میں عمرہ کیا پھر اس کا خیال ہوا کہ حج کے ایام میں حج کرے کیا وہ متمتع ہو جائے گا فرمایا کہ متمتع نہیں ہو سکتا جب تک کہ شہر میں آ کر پھر میقات پر لوٹ کر نہ آئے میں نے کہا کہ یہ جو آپ نے جواب دیا ہے رائے ہے یا علم۔ [3]

ان کلمات سے ظاہر ہے کہ رائے اور علم اسی طرح ظن اور علم سلف میں دو متقابل چیزیں تھیں واقعی بات کو علم اور تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا۔ تاہم جانب راجح اور مرجوح کی ان کے یہاں کوئی تفصیل نہ تھی یہی اصطلاح قرآن کی بھی ہے۔

(۱) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ	اے ایمان والو بہت گمان کرنے سے بچا کرو کیونکہ بعض
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (حجرات)	خیال و گمان گناہ کی حد تک پہنچے ہیں۔

آیت بالا میں گناہ ہونے کا حکم اس پر نہیں ہے کہ وہ جانب راجح ہے یا مرجوح بلکہ خلاف واقع اور بے تحقیق ہونے پر ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

(۲) وَاِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ	جب کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور قیامت آنے
السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا	میں کوئی شبہ نہیں تو تم نے یہ جواب دیا ہم نہیں جانتے قیامت
نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا	کیا چیز ہے ہم تو بس یوں ہی ایک خیال سا معلوم ہوتا
وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ (جاثیہ)	ہے اور ہم کو اس کا یقین نہیں ہے۔

اسی طرح آیت ذیل میں بھی اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

---

[1] اعلام ج ۱ ص ۴۸ ۔ [2] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹ ۔ [3] ایضاً ج ۲ ص ۳۰

(۳) إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ۔ (النجم)

"صرف اٹکل اور نفس کی خواہشات پر چلتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے۔"

(۴) وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (النجم)

"اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف خیالات پر چلتے ہیں اور خیالات حق کی جگہ کچھ کارآمد نہیں ہوتے۔"

(۵) وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ۔ (حم سجدہ)

"لیکن تم کو خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزیں جو تم کرتے ہو نہیں جانتا اور تمہارے اسی خیال نے جو تم نے اپنے رب کے متعلق قائم کر رکھا تھا تم کو ہلاک کیا اور تم نقصان میں رہ گئے۔"

(۶) يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ۔ (آل عمران)

"وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جاہلوں کے سے جھوٹے خیال رکھتے تھے۔"

(۷) وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا۔ (احزاب)

"اور تم اللہ تعالیٰ کے متعلق طرح طرح کے خیالات کرنے لگے۔"

(۸) وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔ (نساء)

"جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کئی باتیں کہتے ہیں وہ دراصل شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف اپنے خیالات کی پیروی ہے۔"

(۹) وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔ (یونس)

"اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو شریک پکارتے ہیں وہ صرف خیال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔"

(۱۰) وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ۔ (جاثیہ)

"اور کہتے ہیں یہی ہماری زندگی ہے جس میں ہم جیتے اور مرتے ہیں اور ہم کو نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ ان کو کچھ علم نہیں وہ صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔"

(۱۱) وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ۔

"روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کی باتیں مان لیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے وہ صرف خیالات کی پیروی کرتے ہیں۔"

ان تمام آیات میں ظن اور ان خیالات ہی کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیے جائیں خواہ وہ یقین کو پہنچ جائیں یا صرف شک کے مرتبہ میں رہ جائیں پہلی آیت میں ظن سے اجتناب کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ دوسری آیت میں کفار کا قیامت کے متعلق ظن کا اقرار مذکور ہے تیسری آیت میں ظن اور خواہشات نفس کے مقابلہ میں خدا کی ہدایت کو رکھا گیا ہے اسی طرح چوتھی آیت میں علم و ظن کو متقابل قرار دیا گیا ہے آخری آیت

پس اگر ظن ریب ہی قابلِ تردید چیز ہے تو پھر جو ظنی احکام کتاب اللہ سے ثابت ہوں گے ان کے متعلق بھی یہی فیصلہ کرنا لازم ہوگا۔

اصولِ دین قطعی ہوتے ہیں
فروعی مسائل ظنی ہو سکتے ہیں

مولانا اسلم صاحب کو یہاں اصولی غلطی پیش آگئی ہے کہ انھوں نے اصول اور فروع میں فرق نہیں کیا۔ اصولِ دین، دین کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر ظنی ہوں تو بے شک دین کی بنیاد ظنی امور پر قائم ہونا لازم آتا ہے لیکن فروع ہدایت کی بنیاد تو نہیں ہوتی بلکہ وہ اصولِ دین کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں اس لئے قطعیت کا مسئلہ صرف اصول کے ساتھ خاص ہے۔ فروع میں اگر ظنیت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ قانونی دفعات کی بجائے قانون کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی بعض دفعات و تشریحات بسا اوقات ظنی ہوتی ہیں یہی سبب ہے کہ ان میں ہر عدالت کو اختلاف کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ امام شاطبی نے موافقات کتاب کے پہلے مقدمہ میں اسی موضوع پر مفصل بحث کی ہے پس فروعی مسائل کے ظنی ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے نہ ان مسائل کے تسلیم کرنے سے دین کی بنیاد کا ظنی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں امام شاطبی کی ایک اور تحقیق بھی نہایت قابلِ قدر ہے غور سے مطالعہ فرمائیے۔

دلائلِ شرعیہ کی چار قسمیں ہیں (۱) قطعی (۲) ظنی۔ مگر وہ ظنی جو کسی قطعی اصل کے ماتحت ہے جیسے وہ اخبار آحاد جو قرآن کریم کا بیان واقع ہوئی ہیں مثلاً وضو، غسل، نماز، روزہ، حج وغیرہ کی تفصیلات اگرچہ یہ تمام تفصیلات اپنی جگہ ظنی ہیں مگر چونکہ یہ ایک قطعی نص قرآنی کا بیان ہیں اس لئے ان کا اعتبار کرنا بھی ضروری ہے۔ (۳) وہ ظنی دلیل جو کسی قطعی کے معارض ہے اور دوسری کوئی قطعی دلیل اس کے لئے شاہد بھی نہیں۔ ایسی ظنی دلیل یقیناً قابلِ قبول نہیں۔ چنانچہ اسی قاعدہ کے ماتحت حضرت عائشہؓ نے چند ظنی احادیث کا انکار فرمایا ہے۔ (۱) ایک مرتبہ ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ میت کو زندوں کے رونے پیٹنے سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ یعنی یہ حدیث صرف ایک شخص کا بیان ہے اس کی وجہ سے قطعی آیت کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار آنکھیں کسی [illegible]

(۳) حضرت ابن عمرؓ نے روایت فرمائی کہ نحوست تین چیزوں میں ہے۔ گھوڑا، عورت، مکان۔ حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ان الامر کلہ للہ۔ ہر بات ہوتی ہے خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔

اس قسم کے واقعات سے حسبِ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) یہ کہ سلف میں احادیث کی حیثیت تشریعی بھی

(۲) یہ کہ خبرِ واحد حجت ہے اگر حدیث کی یہ حیثیت نہ ہوتی تو خبرِ واحد حجت نہ ہوتی اور شرعی معاملات میں اُن سے
حجت قائم کی جاتی اور نہ حق طلب کو انکار سے کسی دلیل قطعی پیش کرنے کی ضرورت ہوتی۔ (۳) یہ کہ اگر دلیل
قطعی کسی ظنی دلیل کے متعارض ہو جائے تو ظنی دلیل کو رد کر دیا جائے۔ لیکن یہ بحث کہ کہاں معارضہ ثابت
ہے اور کہاں نہیں اختلاف نظر کے تابع ہے۔ ان ہی مذکورہ بالا صورتوں میں حضرت عائشہؓ کے سوا دوسرے
صحابہ نے بیان قطعی اور ظنی کا معارضہ ہی تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ پہلی صورت میں زندوں کے رونے کو میت
کو عذاب اُس وقت ہوتا ہے جبکہ خود ان کے گھر کا دستور ہو اور میت نے اپنی حیات میں اُس سے روکا بھی نہ ہو
ظاہر ہے کہ اب یہ فعل میت ہی کا بن جائے گا اور اس لئے یہ عذاب اس کو ہوگا تو اپنے ہی فعل کا نتیجہ کہلائے گا
نہ کہ دوسرے کے افعال کا۔ اسی طرح رویت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں بعض صحابہ نے آیت قرآنیہ میں مطلق
رویت کی نفی تسلیم نہیں کی بلکہ علی وجہ الاحاطہ رویت کی نفی کی ہے جب دنیا میں کسی بادشاہ کے چہرہ پر
آنکھ بھر کر نظر ڈالی نہیں جا سکتی تو جہاں رب کبریا موجود ہو وہاں بارعب نظروں کے سوا بیباکانہ نظر
کب ڈالی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ابن عمرؓ کی حدیث میں بھی وہ نحوست تسلیم نہیں کی جو جاہلیت کے دور میں مانی
جاتی تھی بلکہ صرف ناموافقت مراد لی ہے اگرچہ ناموافقت ہر چیز میں ہو سکتی ہے مگر جو ناموافقت دائمی
اور زندگی کی تلخ کرنے والی ہو سکتی ہے وہ صرف ان ہی تین چیزوں میں ہے۔ اس کے سوا عرب کے ماحول میں
کوئی اور بھی چیز نہ تھی جس کے ساتھ انھیں اپنی حیات میں زیادہ طویل مصاحبت کی نوبت آتی ہو۔

حضرت عمرؓ کو شام کے سفر میں جب وبا کا حال معلوم ہوا تو آپ نے اپنے رفقاء سے شہر میں داخل ہونے
نہ ہونے کے متعلق مشورہ کیا۔ رائے یہ طے پائی کہ واپس ہو جانا چاہئے اور شہر میں داخل نہ ہونا چاہئے اس پر ابو عبیدہؓ
نے ایک دلیل قطعی سے معارضہ فرمایا اور کہا افرارا من قدر اللہ۔ اے عمرؓ کیا آپ تقدیر سے بھاگتے ہیں حضرت
عمرؓ نے فرمایا ایسی سطحی بات کہنا آپ کے شایان شان نہ تھا نعم نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ بیشک ہم
بھاگتے ہیں مگر خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مثال سے کھول کر سمجھایا کہ اگر ایک جنگل
خشک ہو اور دوسرا سبز تو چرواہا اپنے جانور خشک جنگل کی بجائے سبز جنگل ہی میں لے جائے گا کیا اس کا نام تقدیر سے
فرار رکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کا ارتکاب کرنا بھی تقدیر کے اندر داخل ہے اس لئے بیماری والی بستی
تقدیر سے فرار نہیں ہے بلکہ یہ بھی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔ یہاں ایک ظنی معاملہ میں دو قطعی اصل معارض تھے۔
ایک صحابی کی نظر ایک طرف گئی اور دوسرے کی دوسری طرف۔ اس قسم کے متعلقات پر اختلاف جزوی احکام
کا اختلاف نمایاں ہو جاتا ہے اسی لئے ہم نے کہہ دیا تھا کہ دین کے اصول میں اختلاف نہیں ہو سکتے مگر اس کے فروع مختلف ہو سکتے ہیں
تمام اصول و فروع کے لئے قطعی دلائل تلاش کرنا تعلیم کے خلاف و بے جا ہے۔

العمل بالظن ثابت فی تفاصیل الشریعۃ[1] — شریعت کی تفصیلات میں ظن پر عمل کرنا دین میں ثابت شدہ امر ہے

امام ابو حنیفہ پر حدیث کی مخالفت کا طعن کیوں ہوا

اسی ضمن میں امام شاطبی ایک بڑی الجھن کو حل کر گئے ہیں۔ جس طرح محدثین کے مزاج میں حدیث کا رنگ تفقہ پر غالب تھا بہت سے فروعی مسائل میں امام صاحب پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگا یا ہے چنانچہ ابن عبد البر اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کثیر من اہل الحدیث استجازوا الطعن	بہت سے محدثین نے امام ابو حنیفہ پر اس لئے طعن کیا ہے
علی ابی حنیفۃ لردہ کثیرا من اخبار	کہ انہوں نے بہت سی ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا
الاحاد العدول لانہ کان یذہب	اصل بات یہ کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو
فی ذلک الی عرضہا علی ما اجتمع علیہ	ہر باب کی دوسری احادیث اور قرآن کریم کے عمومی
من الاحادیث ومعانی القرآن فما	مطالب پر رکھ کر دیکھا کرتے تھے اگر اس کا مضمون ان سے مطابقت
شذ من ذلک ردہ وسماہ	کرتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے تھے اس
شاذا۔[2]	کو شاذ حدیث کہتے۔

امام صاحب کا یہ طرز عمل بہادرانہ تھا مگر کیا کیجئے کہ طبائع اور مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے سب کے نزدیک قابل قبول نہ ہوا۔ یہاں منکرین حدیث کو بہت زیادہ غور کرنا چاہئے۔

(۴) دلیل کی چوتھی قسم یہ ہے کہ وہ خود ظنی ہو لیکن نہ اس کی موافقت میں کوئی دلیل قطعی ہاتھ آئے نہ مخالفت میں اس کے متعلق امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں

ولا مستند لہ یدل علی انہ غیر موجود[3] — کہ اس کے بعد اس کو کوئی ظنی دلیل نہیں مل سکی۔

امام شاطبی کی اس مفید تفصیل سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دین کے جن گوشوں میں ظنی دلائل کا اعتبار ہے وہ کس قسم کے ظنیات ہیں یعنی وہ ظنیات ہیں جو کسی قطعی اصل کے ماتحت درج ہیں مگر ان کے لئے کوئی قطعی اصل شہادت نہیں دیتی تو ایسی ظنیات کا دین میں اعتبار نہیں بلکہ ان کا وجود ہی نہیں اب انصاف فرمائیے کہ دین کی بنیاد قطعیات پر قائم کرنے کے لئے یہ راہ معتدل ہے یا یہ کہ صرف قطعی دلائل اور قطعی مسائل کے علاوہ تمام دین کا انکار کر دیا جائے اس بنا پر تو بیسیوں وہ ظنی احکام جو قرآن سے بھی ثابت ہیں قابل انکار ہو جائیں گے۔

خبر متواتر کے مفید علم یقین ہونے میں ایک غلط فہمی

محدثین کے اس بیان سے کہ خبر متواتر علم یقین کو مفید ہوتی ہے اور خبر واحد علم یقین کو مفید نہیں ہوتی یہاں یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ جب خبر واحد مفید علم یقین نہ ہوئی

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۲۹ [2] جامع ج ۲ ص ۱۴۸ [3] ایضاً ج ۳ ص ۲۶

تو یقیناً مفید ظن ہوگی اس لئے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ خبر متواتر کے علاوہ جتنی حدیثیں ہیں وہ سب ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ظن ہی کو مفید ہیں حالانکہ یہ نتیجہ ان کے کلام کو نہ دیکھنے اور نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جس علم کو متواتر کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ صرف علم بدیہی ہے یعنی وہ علم جو کسی دلیل و برہان کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسا کہ آفتاب کے وجود کا علم یہاں ہر مسلم و کافر، جوان و بوڑھا، سمجھدار اور احمق شخص بھی اس کے وجود کا علم رکھتا ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ اس قسم کا علم صرف خبر متواتر کا خاصہ ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف اپنے مشاہدات ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اس کے سوا اگر ہزاروں افراد بھی کسی بات کو نقل کریں تو یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً لاکھوں انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کروڑوں انسان آواگون کے قائل ہیں مگر اتنے انسانوں کی خبر کے بعد بھی یقین تو درکنار اس کا ظن بھی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہاں خبر متواتر کی اور شرطوں کے علاوہ سب سے بڑی یہ شرط مفقود ہے کہ اس کا مبنیٰ امر محسوس نہیں بلکہ امر معقول ہے۔ مولانا اسلم صاحب خود اپنے رسالہ میں تسلیم کرتے ہیں کہ خبر متواتر کی شرطوں میں یہ شرطیں بھی داخل ہیں۔

(۱) خبر متواتر کا مبنیٰ محسوس ہو، اگر غیر محسوس ہو تو متواتر نہ ہوگی مثلاً خدا ایک ہے ...... یہ خبر حق اور یقینی ہوگی۔

(۲) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔[1] (علم حدیث ص ۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خبر واحد کے متعلق جس علم کی اصولیوں نے نفی کی ہے وہ علم بدیہی ہے اور ان کا مطلب یہ ہے کہ خبر واحد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خبر متواتر کی طرح علم بدیہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی ظنی اور کبھی علم نظری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر سے علم حاصل ہونے میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں خواہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن خبر واحد سے علم حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے

---

[1] اب مولانا اسلم صاحب اور ان کی جماعت ذرا بتلائیں کہ اس لحاظ سے تم قرآن کو متواتر کہتے ہو کیا مطلب ہے صرف یہی نا کہ یہ وہی قرآن ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس کے علاوہ جتنے اس کے غیر محسوس احکام ہیں یا جتنے ماوراء عالم غیب کے اسرار و حقائق ہیں کیا وہ سب متواتر کی تعریف میں آتے ہیں پھر ان کے متعلق کیا سماع کرنے کے ساتھ فوراً یقین آ جاتا ہے۔ فرمائیے آج یہ قرآن شرق و غرب میں پھیلا ہوا ہے کیا ہر سامع کو اس سے بے دلیل یقین حاصل ہوا پھر احادیث متواتر نہیں ہیں، کم عقلی کے پیچھے چلنے سے کیا فائدہ ہے۔ قرآن اگر متواتر ہے تو اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ اس کے الفاظ تواتر کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں اس کے علاوہ جب احکام شرعیہ کا مرحلہ آئے گا تو اکثر آیات کا مفہوم غیر محسوس ہونے کی وجہ سے ان کو متواتر نہیں کہا جا سکتا لہٰذا منکرین حدیث کو ان کا بھی صاف انکار کر دینا چاہئے کیونکہ یہ احکام بھی متواتر کی تعریف میں نہیں آتے اس لئے مفید یقین ان کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

جن میں نظر و فکر کی اہلیت موجود ہو۔ یہاں ہر شخص کو یکساں علم حاصل نہیں ہو سکتا اسی لئے خبر متواتر میں سند کی بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور خبر واحد میں یہ ضرورت باقی رہتی ہے۔ [1]

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ اگر تمام دین کی بنیاد علم بدیہی پر قائم کی جائے تو پھر تمام دین کو قطعی طور پر حاصل کرنے کی بجائے پہلے سے زیادہ ہی رسوا ہونا پڑے گا۔ عقائد و اصول، فروع، سمعیات اور دین کے تمام نظری مسائل سب ظنی ہو جائیں گے اور حسب زعم منکرین حدیث قابل اعتبار نہ رہیں گے۔ امام شاطبی فرماتے ہیں

وإنما الأدلة المعتبرة هنا المستقرأة من جملة أدلة ظنية تضافرت على معنى واحد حتى أفادت فيه القطع فإن للاجتماع من القوة ما ليس للافتراق ولأجله أفاد التواتر القطع وهذا نوع منه. فإذا حصل من استقراء أدلة المسألة مجموع يفيد العلم فهو الدليل المطلوب وهو شبيه بالتواتر المعنوي۔ [2]

عام طور پر جو دلائل یہاں معتبر ہیں وہ اس قسم کے ہیں جو ظنیہ ہیں وہ اگرچہ ظنی ہیں مگر کسی ایک معنی میں سب متفق ہو جانے کی وجہ سے خاص اس مسئلہ میں یقین کا فائدہ دینے لگتے ہیں ظاہر ہے کہ جب دلائل کے ملنے کے بعد جو قوت پیدا ہو سکتی ہے وہ ان کی الگ الگ حیثیت میں پیدا نہیں ہو سکتی خبر متواتر بھی اسی اجتماعی قوت کی وجہ سے یقین کا فائدہ دیتی ہے جب کسی ایک مسئلہ کے لئے متفرق دلائل جمع ہو جائیں تو ان کے مجموعہ سے ایک یقین حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کا معنوی تواتر بن جاتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ دین کے ارکان خمسہ بھی اسی طریقے سے ثابت ہیں ورنہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کی فرضیت پر اگر صرف اقیموا الصلوٰۃ وغیرہ سے استدلال کیا جائے تو اس میں کئی وجہ سے تردد ہو سکتا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی لغت میں صرف دعا کے ہیں لیکن اس کے ساتھ اگر خارجی قرائن کو بھی ملایا جائے مثلاً نبی کے عمل اور اہل اسلام کے مجموعی تعامل کو بھی دیکھا جائے تو یہ حکم بدیہی ہو جاتا ہے کہ نص قرآنی میں صلوٰۃ کے لفظ سے یہی معروف نماز مراد ہے ان مجموعی قرائن کے بعد بھی اب یہاں وہی شخص شک کر سکتا ہے جس کو مسلمانوں کے اصل دین ہی میں شک ہے۔ [3]

امام شاطبی کی مذکورہ بالا تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دین کے اکثر مسائل اگرچہ متواتر حدیثوں سے ثابت نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود پھر قطعی اور یقینی کیوں ہیں؟ ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ یقین کا افادہ صرف تواتر میں منحصر نہیں بلکہ جب متفرق دلائل اور خارجی و داخلی قرائن کسی ایک امر کی شہادت دیتے چلے جاتے ہیں تو یہاں بھی لفظی تواتر نہ سہی مگر ایک قسم کا معنوی تواتر پیدا ہو جاتا ہے اور اس مجموعہ سے یقین حاصل

---

[1] ملخص از شرح نخبۃ الفکر مصنفہ حافظ ابن حجرؒ۔ [2] الموافقات ج ۱ ص ۱۰۔ [3] الموافقات ایضاً

ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی بھاری جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔

احادیث صحیحین مفید یقین ہیں

حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لئے کتنے سندوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث واحد علم کو مفید ہو جاتی ہے۔ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی خاص عدد مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں اور ان کے متعلق ہمیں یہ یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ کسی طمع یا خوف کا کوئی مضمون ہے پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں یہ اسی طویل خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے تو ہمیں ان کے صدق کا بدیہی طور پر یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے معاملات میں گھر چکا ہے بارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے کسی کی موت، ولادت، نکاح، معزولی، ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ہاں وہی شخص شک و شبہ پیدا کر سکتا ہے جو اپنے ان دنیوی معاملات کی طرف سے غفلت کرے اور ہمیشہ مردہ کی طرح ان واقعات سے قطع نظر کرلے۔

اگر آپ کسی آدمی سے ایک جھوٹا افسانہ تیار کرنے کے لئے کہیں تو وہ یقیناً ایک لمبا افسانہ گھڑ سکتا ہے لیکن اگر دو مکانوں میں دو شخصوں کو علیحدہ علیحدہ بند کر دیں تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی ایسی حکایت اپنی جانب سے تیار کرلیں جس میں دونوں اول سے آخر تک متحد ہوں۔ ہاں شاذ و نادر کبھی ایسا واقع ہو گیا ہے کہ دو شاعروں کے خیالات ایک آدھ مصرعہ میں اتنے مطابق ہو گئے ہیں کہ ان میں لفظی اتحاد بھی پیدا ہو گیا ہے مگر ہمیں اب تک اپنی عمر میں ایک واقعہ بھی ایسا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا جس میں دو شاعروں کا کسی ایک شعر میں بھی پورا پورا اتفاق ہو گیا ہو اگرچہ لوگوں نے اس بارے میں ایسے کلام کی ایک فہرست پیش کی ہے مگر ہمارے نزدیک وہ اکثر علمی سرقے ہیں جن میں اپنی عیب پوشی کے لئے اتحاد خواطر کے دعوے کر دئے گئے ہیں۔ یہاں کبھی خبر واحد میں ایسے قرائن جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ بھی بدیہی طور پر یقین کو مفید ہو جاتی ہے اور کبھی ایک جماعت کی خبر بھی یقین کا فائدہ نہیں دیتی مثلاً اگر کسی خبر سے کسی شہر کے شہر کا نفع و نقصان متعلق ہو تو عقل کے نزدیک اس تمام شہر کا جھوٹ پر متفق ہو جانا کچھ محال نہیں ہے۔ بہرحال خبر کے مفید یقین ہونے کا کوئی ایک ضابطہ نہیں ہے۔ حالات اور زمانے کے تابع ہے۔

خبر واحد کے مفید یقین ہونے پر قرآن سے ایک استدلال

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں کہ ایک قسم کی حدیث وہ ہے جس کو ثقہ راوی ایک ہی شخص ہے جس سے وہ نقل کرتا ہے وہ بھی ایک ہی شخص ہے اسی طرح ایک ہی ایک راوی کے واسطے سے یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو جاتی ہے اگر یہ واسطے حسب ضابطہ ہے اور

عادل اشخاص ہیں تو اس پر عمل کرنا بھی واجب ہے۔ حارث بن اسد محاسبی، حسین بن علی الکرابیسی کا بھی یہی مذہب تھا۔ ابو سلیمان کا مذہب بھی یہی تھا اور ابن خویز منداد نے بھی امام مالک سے یہی نقل کیا ہے۔ قرآن کریم بھی اس کی صحت کا شاہد ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ	ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ دین
لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ	کی تفہیم کے لئے نکل کھڑا ہوتا کہ جب وہ لوٹ کر اپنی قوم کے
إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔	پاس آتا تو ان کو ڈراتا شاید وہ بھی بری باتوں سے بچتے۔

لغت میں طائفہ کسی چیز کے ایک حصہ کو کہتے ہیں اس لئے اس کا اطلاق ایک شخص سے لیکر جماعت تک کیا جاسکتا ہے لہٰذا آیت بالا کی بموجب ہر جماعت کا فرض ہے کہ جب ایک شخص یا کوئی جماعت ان کو دین کی باتیں پہنچائے تو وہ ان کو قبول کریں اور مانیں۔ منہ

حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس پر مستقل دو صفحات لکھے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ جب ایک واقعہ ایک شخص کی زبانی ہمارے سامنے منقول ہوتا ہے پھر مختلف گوشوں سے مختلف طور پر اس کی مختلف شہادتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں تو اگرچہ ہر ہر شہادت اپنی جگہ خبر واحد ہوتی ہے لیکن ان خبروں کے مجموعہ[2] سے ہمیں یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً صحیح ہے عقل یہ ہرگز باور نہیں کرسکتی کہ مختلف اشخاص ایک دوسرے کی لاعلمی میں کوئی ایک واقعہ نقل کریں اور پھر وہ از اول تا آخر کسی ایک بیان میں متفق ہو جائیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جابرؓ کا ایک واقعہ صحیحین میں موجود ہے کہ ایک سفر میں آپ نے جابرؓ سے اونٹ خریدا مگر اس اونٹ کی قیمت بیان کرنے میں راویوں کا اختلاف ہے لیکن متعدد طریقوں سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے جابرؓ سے اونٹ خریدا تھا پس جب مختلف اشخاص نے ہمارے سامنے اس ایک واقعہ کو بیان کیا ہے دراں حالیکہ ہمارے پاس اس کا بھی کوئی قرینہ نہیں ہے کہ ان اشخاص نے اس سے قبل کہیں بیٹھ کر اس خبر کے بنانے میں کوئی مشورہ کیا تھا یا اس خبر[3] کے بیان کرنے سے ان کی کوئی خاص غرض متعلق تھی۔ اس واقعہ کے یقین کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں رہتا۔ اگر اس کے بعد بھی ہم اس واقعہ میں محض عقلی طور پر شک و تردد کریں تو اس کا نام تحقیق واقعہ نہیں بلکہ وہم پرستی ہے۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۰۹، ۱۱۰۔

[2] علامہ جزائری نے یہاں ایک اور عجیب بات لکھی ہے جس کی ناواقف اصحاب کو محدثین پر اعتراض ہے کہ محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ضعیف حدیثیں بھی جمع کر دی ہیں اس کے جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ محدثین مجہول اور کمزور حافظہ کے اشخاص کی احادیث صرف اس لئے جمع کرتے تھے کہ یہ احادیث کم از کم ایک مضمون کی تقویت اور تائید کا آلہ ہو سکتی ہیں۔ قال احمد قد اکتب حدیث الرجل لاعتبرہ۔ امام احمد فرماتے ہیں میں کبھی ایک شخص کی حدیث اس لئے بھی لکھ لیتا ہوں کہ اس کو متابعت اور شواہد کے طور پر کام میں لاسکوں (توجیہ ص ۱۰۲)۔

[3] توجیہ ص ۱۲۲۔

خبر واحد کے حجت شرعی ہونے پر قرآن کریم کی دوسرا استدلال

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (حجرات)

اے ایمان والو جب کوئی فاسق شخص تمہارے سامنے کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر جا پڑو بعد میں اپنے کئے پر نادم اور شرمندہ ہونا پڑے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے خبر واحد کو قبول کیا ہے اگر ایک شخص کی خبر قابل تسلیم نہ ہوتی تو وہ اس کو تحقیق کی بجائے رد کرنے کا امر کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے خبریں پہنچانے کے لئے بھی جو ذریعہ اختیار فرمایا ہے وہ بھی خبر واحد ہی ہے یعنی اللہ کا رسول ایک ہی ہوتا ہے اگر دین میں بعض لحاظ سے ایک شخص کی خبر قابل قبول نہ ہوتی تو خود رسول تنہا اپنی خبر پر دوسروں کو ایمان لانے کا حکم کیسے دے سکتا تھا۔ قرآن کریم نے جہاں بھی تعداد ہے راوی کی عدالت پر اور اس کے صدق پر زور دیا ہے حتیٰ کہ صرف زنا کے ایک معاملہ کے سوا جان کے معاملہ میں بھی دو شخصوں کا بیان اعتبار کر لیا ہے اور ایک جگہ بھی خبر دل کی تصدیق کے لئے تواتر شرط نہیں کیا۔ اگر دو شخصوں کے بیان پر ایک مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جا سکتا ہے یا ایک چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے۔ یا ایک شخص پر حد قذف لگائی جا سکتی ہے یا لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی مالیت تقسیم کی جا سکتی ہے تو کیا اس بات کا بھی ثبوت نہیں ہے کہ شریعت نے یقین کا سہارا صرف تواتر نہیں ٹھہرایا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ شریعت نے ایک مسلمان کا قتل، ایک معصوم ہاتھ کا قطع، ایک بے گناہ پر حد قذف اور لاکھوں کی مالیت کی تقسیم یقین حاصل ہوئے بغیر محض ظن کی بنا پر جائز قرار دے دی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر زنا جیسے نازک معاملہ کے لئے بھی قرآن کریم نے چار شخصوں کی گواہی بصراحت لازم نہ کی ہوتی تو امت محمدیہ یہاں بھی دو شخصوں کے بیان سے رجم کرنے کا فیصلہ کر دیتی۔ علماء نے اس کی حکمتیں اپنی جگہ مفصل بیان کی ہیں مگر شاید اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو کہ چونکہ زنا کے ایک ہی معاملہ کا تعلق دو جانوں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی دو شخصوں کو اس ایک ہی جرم کے ثبوت میں رجم کرنے کی نوبت آجائے اس لئے یہاں اس جرم کے ثبوت کے لئے وہ شہادت شرط کر دی گئی ہے جو تنہا اعتبار دو جرموں کے لئے شرط کی گئی تھی۔

یہاں یہ عذر ہو کہ دو شخصوں کا بیان ایک مسلمان کے قتل کرانے کے لئے تو کافی ہو سکتا ہے مگر نماز کے ایک واقعہ، آپ کے حج کی ایک صورت، آپ کے روزہ کی ایک سنت نقل کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا قطعاً غیر معقول ہے۔ معتزلہ بھی در اصل منکرین حدیث کے قافلے کے سالار ہیں یہ دیکھ کر خبر واحد کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ دینی ثبوت کے لئے یقین کا مطالبہ تو معقول ہو سکتا ہے مگر تواتر کی شرط لگانا بالکل

بے معنی بات ہے۔ پس منکرینِ حدیث کو دو باتوں میں ایک بات صاف کر دینا چاہئے۔ یہ کہ شریعت نے تواتر کے علاوہ یقین کو یقین ہی نہیں کہا یا خبرِ واحد کسی حال میں مفید یقین ہوتی ہی نہیں۔ اگر ضروری قرائن مل کر کسی خبرِ واحد بھی یقین کا فائدہ دے سکتی ہے اور شریعت کے نزدیک بھی یہ یقین معتبر ہے تو پھر یہ عرض کیا اس قسم کا یقین اور دین کے معاملہ میں معتبر ہے اور اس قسم کا معتبر نہیں محض ایک وہم ہوتی ہے۔

اسلام میں تنقید و تبصرہ

خبرِ واحد کی حجیت کے سلسلے میں یہاں دو غلط فہمیاں اور بھی ہیں ایک یہ کہ محدثین کا گروہ محض ایک جامد گروہ ہے جسے فنِ درایت سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا وہ دنیا کی تمام خبروں کو آنکھ میچ کر مان لینا علم اور دین سمجھتا ہے اور نقد و تبصرہ کو بے دینی تصور کرتا ہے۔ دوم یہ کہ ان لوگوں کا سارا کام صرف روایت ہے جو روایت کو بیان کرتی وہ خود بھی اصل میں غلط فہمی ہی اسی کی ایک فرع ہے۔ ان دو غلط فہمیوں کی وجہ سے بعض ناواقف لوگ حدیث کا رتبہ تاریخ سے بھی کمتر تصور کرتے ہیں اس لئے ہم اس کے متعلق بھی کچھ لکھتے ہیں۔

فنِ تاریخ اور حدیث

دائرۃ المعارف میں بستانی نے تاریخ کے متعلق ارسطو کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔

الشعر احسن من التاریخ لان التاریخ	شعر تاریخ سے بہتر چیز ہے کیونکہ تاریخ واقعات کو جوں کا
یبین الاشیاء کما هی ولکن الشعر یبین کما	توں نقل کرتی ہے اور شعر میں بات کو اس طرح بیان کرتا
یجب ان یکون۔	ہے جیسا انہیں واقع میں ہونا چاہئے۔

ہمارے نزدیک ارسطو کا یہ مقولہ تاریخ کے اس دور تک تو بالکل درست تھا جب تک کہ اس میں نہ درایت کی اہمیت تھی نہ درایت کی بحث۔ لیکن جب علم تاریخ کو کچھ ترقی ہوئی علم سیاست، علم نفسیات اور علم تمدن نے بہت سے واقعات کو نقد و تبصرہ کی روشنی میں چھانٹ ڈالا تو اب علم تاریخ کا پایہ ذرا بلند ہو گیا اور اس کا نام فلسفہ تاریخ رکھا گیا۔ اب علم تاریخ کی مثال صرف اینٹوں کے ایک ڈھیر کی نہیں رہی جس میں کار آمد و بیکار ہر قسم کی اینٹیں ہوتی ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کی وجہ سے اب مورخ کی مثال ایک ماہر معمار کی سی ہو گئی جو ہر تعمیر کی موزونیت کے لحاظ سے کچھ اینٹیں بیکار سمجھ کر پھینک دیتا ہے اور کچھ اپنی تعمیر میں استعمال کر کے ان کو ایک خوبصورت قصر کی شکل پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اسی لئے محقق ابن خلدون لکھتا ہے کہ ایک مورخ کے لئے قواعد سیاست، طبائع موجودات اور علم عمرانیات کا جاننا بھی ضروری ہے، دنیا کے عادات و اخلاق اور مذاہب کے مختلف رنگ ڈھنگ، موجودہ اور ماضی کے حالات کا موازنہ پھر اس کے اتفاق و اختلاف کے اسباب پر

غور و خوض، اصولِ حکمت کی تشخیص اور ان کے اسباب کے ظہور کا علم بھی اس کے فرائض میں داخل ہے اگر
کوئی مورخ ان مراحل سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے تو یقیناً اس کو عزتِ تحقیق پر پہنچنے کا حق حاصل ہے۔ (مقدمہ)

بلاشبہ یہ سب گوشے اپنی جگہ بڑی علمی وسعت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک نقد و تبصرہ کا تعلق ہے وہ تمام تر
اب بھی صرف فنِ روایت پر مبنی رہا اور تاریخ کے اس دور شباب تک بھی اس کا روایتی سرمایہ یا صرف چند مخطوطات
میں جو کہنہ اوراق یا بوسیدہ ہڈیوں کی شکل پر دستیاب ہو گئے یا وہ ملفوظات جو محض سینہ بسینہ افواہ پر بلا کسی سند
کے زیرِ ترتیب آ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی واقعہ اور حادثہ کے ثبوت کے لئے اس کی سند کا مطالبہ سب سے پہلا
سوال ہونا چاہئے تھا۔ مگر یہاں یا اس وقت والے اس سوال کو ذہن سے ایسا نکال دیتے ہیں کہ گویا سند کا فقدان ان
تاریخی واقعات کے ثبوت کے لئے کوئی عیب ہی نہ تھا۔ اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ بے سند واقعات اگر فنِ روایت
کی بدولت کچھ بھی جاتے تو اس کے بعد بھی ان کا رتبہ صرف خیالات کے برابر رہتا لیکن چونکہ دوسری طرف
نقد و تبصرہ اپنی عقل کی روشنی میں ہوتا ہے اس لئے یہاں انسانی دماغ اس کو یقین کا آخری مرتبہ دے دیتا ہے
حتیٰ کہ ایک انسان کو حیوانات کے ساتھ اپنا الحاق کرنے میں کوئی تامل نہیں رہتا۔ وہ یہ اعلان کرتے ہوئے بڑا فخر
محسوس کرنے لگتا ہے کہ انسان درحقیقت حیوانات ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے اور یہ اس بلاسند محض کل
تخمینات کی بنا پر قرآن کریم کے اس بیان کی تکذیب میں ذرا تامل نہیں کرتا جو انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں
خود خالق نے بتلایا ہے۔ سوچئے اور انصاف کیجئے کہ یہاں بنیاد ثبوت کہاں ہے جب کہ نوعیت عقیدت کی ہے مگر پھر بھی۔
بے بنیاد تاریخ قرآن کریم سے بھی کسی ٹکر میں کھا جاتی ہے اور تاریخ پرست دنیا خوشی خوشی قرآن کے بیان میں
یہی شبہ کرتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ حق و یقین کی اس ٹکر کے بعد خود تاریخ کی
شکست تسلیم کرے۔

تاریخ کا ایک دوسرا شعبہ جو سیرت کے نام سے موسوم ہو گیا تھا اس نے اس کے
برعکس روایت کی بحث ختم کر دی اور صرف درایت کا پہلو اپنے سامنے رکھ لیا مگر افسوس کہ وہ بھی اتنا ناتمام تھا
کہ اس میں تسلسل کی کوئی قید تھی نہ افراد و اشخاص کے کیرکٹر پر کوئی بحث۔ ہماری مراد یہاں یہودیت و نصرانیت
ہے۔ احبار و رہبان نے قرآن کو اس بات پر آمادہ پاتا کہ جب وہ حلال کر دیں تو وہ حلال ہے اور جب حرام

لہ مثال کے طور پر ڈاکٹر تسڈل نے قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہوئے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں اپنے نزدیک یہ ثابت کیا ہے کہ گوسالہ
بنانے والا درحقیقت سامری نہ تھا بلکہ وہ خود حضرت ہارون علیہ السلام ہی تھے۔ اس اعتراض کو عیسائیوں نے بڑی
رغبت کی نظر سے دیکھا اور اس کی تائید میں ہمارے تاریخی ثبوت کے ساتھ ایک مقالہ شائع کرایا
حالانکہ اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ قرآنی بیان تاریخی بیانات کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا جب تعلیم یافتہ طبقوں میں
قرآن کا وزن یہ رہ جائے تو حدیث کا کیا ذکر کیا جائے۔

کیونکہ یہ مدعیِ علم گویا اب اصل مذہب کی تاریکی میں ایک تاریکی کا اور اضافہ ہو گیا پہلے تو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صرف ان کتبِ محرفہ کا ہی ایک واسطہ تھا۔ اب مذہب کی جگہ ان احبار و رہبان نے سنبھال لی۔ حالانکہ صدیوں کا منسوخ شدہ مذہب پہلے خود اپنے ثبوت ہی کا محتاج تھا مگر یہاں اس غلط بنیاد پر احبار و رہبانیت کی تہادت نے اور بہت سی غلط بنیادیں قائم کر دیں اور ان کی تعمیر کو دیکھنے میں تو بہت اونچی گئی مگر اس میں صدق و راستی کا عنصر بہت ہی کم باقی رہ گیا تھا۔ اس کا تمام ذخیرہ لٹریچر تھا جو احبار و رہبان نے محض اپنی خواہش کی خاطر خود ترتیب دے لیا تھا۔ اور ہر قوم بنی اسرائیل میں استدلال کلیۃً مفقود تھا جب وہ تحقیق پر آتے تو گو خود پر کلام باری تک بلا واسطہ سن کر سو طرح کے شبہات نکالنے لگتے اور جب تقلید پر آمادہ ہوتے تو جو ان کے احبار و رہبان ان کے سامنے رکھ دیتے اندھوں کی طرح ماننے کے لئے تیار ہو جاتے۔ غرض نقد و تبصرہ اور فہم و فکر کی ان میں کوئی استعداد ہی نہ تھی اسی کو قرآن کریم نے ذیل کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اتخذوا احبارهم ورهبانهم — انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو

اربابا من دون الله۔ — خدا کی جگہ پر سمجھ لیا تھا۔

روایت اور درایت کے اس غیر متوازن دور میں اسلام آیا اور اس نے ان دونوں کا توازن قائم کر کے صحیح تنقید کی راہ دکھلائی اور اس کے لئے ایک ایسا معتدل آئین مرتب فرمایا جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط اس نے بتایا کہ ہر کان پڑی خبر کی طرف دوڑ پڑنا بھی غلط ہے اور تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں بدگمانی کی حد تک پہنچ جانا بھی غلو اور وہم پرستی ہے۔ انسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بے اعتدالی کی حالت میں آنکھ میچ کر تسلیم اور اعتماد کی صورت میں ہر بے دلیل تصدیق کر لیا کرتا ہے مگر قرآن نے یہاں دوست و دشمن اپنے اور پرائے کا فرق ختم کر کے سب کے لئے یکساں تحقیق و تبیین کا قانون مقرر کر دیا ہے اور دوسری طرف وہ تجسس اور تحقیق میں بے بنیاد وہم پرستی اور صرف بدظنی پر جو عمل ہے اس کو بھی روک دیا ہے۔ امام غزالی مستصفیٰ میں لکھتے ہیں کہ:

فرقہ سمنیہ کے نزدیک علم صرف حواس کے مدرکات و محسوسات میں منحصر ہے ان کے نزدیک خبر متواتر بھی مفید علم نہیں ہوتی وہ یہاں بھی دس دس طرح کے شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ (ذنوبہ ص ۴۰)

سوفسطائی ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں انہیں اپنے مدرکات حسی کے اپنے وجود میں بھی شبہ نظر آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب بسا اوقات ہماری چشم و گوش اپنے دائرہ ادراکات میں غلطی کر جاتے ہیں تو پھر ان کے مدرکات کو قطعی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شکوک و اوہام کا دروازہ کھول دیا جائے اور ہر شک کو یقین کی راہ میں حائل تسلیم کر لیا جائے تو پھر عالم میں یقین حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے۔ نہ خبر متواتر اور نہ اپنے حواس۔ اس کا نام تحقیق و تنقید نہیں بلکہ یہ ایک جنون کا شعبہ ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور آخرت کے

تمام معاملات معطل ہو کر رہ جائیں لیکن اگر اس کے برخلاف ہر خبر کو تسلیم کر لیا جائے اور ہر جگہ حسن ظن کا مظاہرہ کیا جانے لگے تو اس کا نتیجہ بھی عالم کے درہم برہم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں اس لئے قرآن نے یہ تعلیم دی کہ ہر خبر کی تحقیق و تبیین کر لیا کرو خواہ وہ دوست شخص ہی کی خبر کیوں نہ ہو۔ مگر چونکہ فاسق آدمی کی خبر رد کر دینے میں بھی مضائقہ نہیں تھا مگر قرآن کسی خبر کا بے دلیل رد کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ فاسق آدمی کی بھی صحیح خبر ہو سکتی ہے پھر اس کی ہر خبر کا رد کر دینا بھی قرین مصلحت اور عدل و انصاف نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (حجرات)

اے ایمان والو جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر حملہ کر دو بعد میں اپنے کئے پر شرمندہ ہونا پڑے۔

دوسری طرف اس نے تجسس یا درپئے ہونے کی بھی ممانعت فرمائی کہ ایسی تحقیق سے بھی نظام عالم برباد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا (حجرات)

اے ایمان والو بہت سی بدگمانیوں سے بچا کرو کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ کی حد تک پہنچ جاتی ہیں اور تجسس یا دوسرے شخص کی ٹوہ نہ کرو لوگوں کے عیوب کی تلاش کوئی اچھی خصلت نہیں ہے۔

تیسرے مقام پر یہ بھی بتایا کہ ہر خبر کی تفتیش کا ہر انسان سلیقہ نہیں رکھتا بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی تفتیش خاص افراد ہی کر سکتے ہیں گویا یہ تفتیش کے محکمہ جات کی طرف اشارہ ہے غرض ہر خبر کی تحقیق کے لئے اہلیت ضروری ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ (النساء)

جب ان کے پاس کوئی امن یا ڈر کی خبر آتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اگر اس کو رسول یا اپنے حاکموں تک پہنچا دیتے تو جو ان میں سے اس کا استنباط رکھنے والے شخص تھے وہ اس کو بہتر طور پر معلوم کر لیتے۔

روایتی پہلو میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے وہ مخبروں اور شاہدوں کا بیان ہے اس لئے ان کو یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے بیان اور گواہی میں پوری احتیاط سے کام لیں جھوٹ یا طرفداری کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ اس لئے جھوٹ بولنے یا کسی دوسرے پر جھوٹا الزام لگانے کی اتنی مذمت کی گئی کہ اس سے بدتر سوسائٹی کا کوئی عیب نہ رہا لعنت کا لفظ عربی زبان میں انتہائی مذمت و نفرت کا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے عام طور پر جھوٹ بولنے والوں پر لعنت کا اعلان کر دیا۔

لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ

جھوٹ بولنے والوں پر خدا کی لعنت ہو۔

دوسری جگہ جھوٹ بولنا خاصیت بتلائی یعنی بے ایمانوں کا شعار قرار دیا۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ۔

خدا پر جھوٹ کی افترا پردازی وہی لوگ کرتے ہیں جو اس کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور اصل میں یہ جھوٹے بھی لوگ ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پاک باز کی عصمت پر تہمت لگا دے تو اس کے لئے دائمی طور پر یہ تعزیر مقرر کی گئی۔

وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا

ان کی گواہی آئندہ کبھی قبول نہ کرو۔

گویا انسانی سوسائٹی میں ہمیشہ کے لئے ان کے قول کی بے وقعتی آئینی طور پر تسلیم کرلی گئی۔ بوقت ضرورت شہادت کو چھپا لینا ایسا گناہ قرار دیا جو انسان کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ

"جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔"

وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ

"اگرچہ وہ شخص اہل قرابت والا ہی ہو۔"

پھر کذب و افترا کی اس عام مذمت پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ یہ خاص طور پر سمجھایا کہ خدا پر افترا پردازی کا نمبر ہر قسم کے جھوٹ اور افترا سے بڑھ کر ہے تاکہ عام طور پر راستبازی کے علاوہ یہاں خاص طور پر بھی اس کا لحاظ رکھا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا۔

اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ افترا کرے۔

آگے چل کر روایت اور درایت کو خوب مرتب اور مہذب کرکے جب اپنے رسول کی خاص وحی کا ذکر کیا تو قانون روایت کے مطابق اس کی سند پھر اس کے راوی کی عدالت بھی خود واضح فرمائی۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ۔

یہ قرآن ایک فرشتہ کی زبانی ہے جو مضبوط طاقت کا مالک ہے، عزت والا ہے، خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے اور وہاں ایک امانت دار فرشتہ ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نطق کے متعلق عام انسانوں سے ایک صفت ممیزہ بیان فرمائی۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔

اپنی خواہش نفس سے وہ کچھ نہیں بولتے جو بات کہتے ہیں وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

آپ نے روایت پر زور دیتے ہوئے مخاطبین کے سامنے اپنی مثال ان الفاظ میں پیش کی۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ

آخر میں دعویٰ نبوت سے پہلے بھی تمہارے اندر ایک عمر کا حصہ گزار چکا ہوں

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۔ گندا ہے دیکھی جھوٹ بولا تو کام اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

اس کے ساتھ ہی پہلی مثال کے لئے قرآن کریم نے رسول کے بارے میں ایک خاص آیت میں بھی ذکر فرمایا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۔ اگر بالفرض آپ ایک بات بھی ہماری طرف اپنی جانب سے
لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا ۔ بنا کر منسوب کرتے تو ہم داہنا ہاتھ پکڑ کر ان کی شہ رگ
مِنْهُ الْوَتِينَ ۔ کاٹ دیتے۔

ان بنیادی اصول کی روشنی میں مذہب اسلام جتنی ترقی کرتا رہا اسی قدر اس کے بنیادی تنقید کے اصول بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے حتی کہ اسناد و جرح و تعدیل، احوال رواۃ، ہر ایک کے لئے جدا جدا مستقل فن مرتب ہو گئے۔ علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلہ میں دو قسم کے علوم بالتفصیل بیان فرمائے ہیں۔ جن کے مطالعہ کے بعد احادیث کے صحیح تعین ہونے میں ایک منٹ کے لئے بھی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ سفسطہ اور سوفسطائیہ کی طرح شبہات نکالے چلے جانے کا تو کسی کے پاس بھی کوئی علاج نہیں ہے لیکن واقعات کی دنیا میں جہاں ذہنی اوہام کی کوئی قیمت نہیں ہے پورے حکم طریق اور پوری سنجیدگی سے احتمال کا لحاظ رکھ کر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق اس کے راویوں کے صدق و کذب اس کے جرح و تعدیل پر نظر کرے گا اس کو ان کی سچائی پر یقین کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی محض چند لمحات کی محنت و مشقت اٹھائے بغیر پہلے سے اس کے انکار کا ارادہ کر لیا جائے اور محدثین کی شب و روز کی ان تھک کوششوں کی تردید کے لئے صرف چند مضحکہ خیز کلمات کو کافی سمجھ لیا جائے۔ علامہ محمد بن ابراہیم وزیر تحریر فرماتے ہیں۔

> یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام کے تمام فرقے ہر طبقہ ہر زمانہ کے اپنے علماء اہل فن کے قول کو دلیل سمجھتے ہیں اگر یہ نہ ہو تو تمام علوم باطل ہو جاتے کیونکہ دوسرے فن کا شخص اوّل تو اس فن سے بحث ہی نہیں کرتا اگر کرتا ہے تو نادانی سے بحث کرتا ہے۔ اگر قرآن و سنت کے لغات اہل عربیت سے حل کئے جائیں، قراءت کا اختلاف اہل فن سے پوچھا جائے، معانی و نحو کے مسائل نحویوں سے اور علم حدیث اسناد کے مباحث محدثین سے دریافت کئے جائیں تو یقیناً تمام علوم درہم برہم ہو جائیں گے اور یقیناً یہ عقل کے بھی خلاف ہوگا [illegible] یہ مقولہ مشہور ہے۔
>
> كُلُّ مَنْ يَدَّعِي بِمَا لَيْسَ فِيهِ كَذَّبَتْهُ شَوَاهِدُ الِامْتِحَانِ ۔ ہر شخص جو وہ بات کا دعویٰ کرے جو اس میں نہیں ہے تو امتحان کی شہادتیں اس کو جھٹلا دیتی ہیں۔

پس خبر واحد پر یقین اگر ہو تو اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ جن کو یہاں شب و روز خرچ کرنے کے بعد یقین حاصل ہو چکا ہے ان کے بیان پر اعتماد کر لیا جائے نہیں تو پھر خود اس جانفشانی کے لئے کمر ہمت کس لی جائے۔

اختیار نہیں کیا۔ خلافت و تبلیغ کی طرح طویل و عریض دعاوی نہیں کئے جو بات حل ہو گئی اس کا جواب دے دیا اور جو حل نہ ہو سکی اس کے متعلق صاف کہہ دیا۔ اگر اپنی رائے کے خلاف کوئی بات ثابت ہو گئی تو اپنی بات پر ضد نہیں کی وہاں [illegible] اپنی رائے سے بڑی صفائی کے ساتھ رجوع کر لیا۔ اگر اسی قابل اعتراض میں تھوڑا نظر اٹھا کر صحابہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے وہاں کتنی بال کی کھال نکالی جاتی تھی۔ قدمت، سمع و بصر، صفت علم و کلام پر کتنی کتنی بسیط بحثیں کی جاتی تھیں۔ افعال عباد کے خلق اور غیر مخلوق ہونے پر کیا کیا تبصرے کئے جاتے تھے۔ اگر محدثین کی خدمتیں درمیان میں نہ ہوتیں تو یقیناً یہ مباحث بھی داخل عقائد ہو جاتے اور وہی عذاب تھا جو محض عقلیت کی بدولت معتزلہ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ منکرین حدیث کے درمیان یہ اعتراض ہمیشہ سے حدیث کے ساتھ چپکا ہوا ہے یہاں تک کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کو اس پر مستقل ایک مضمون لکھنا پڑا اس لئے ہم بھی یہاں اس اعتراض کے چند جوابات میں سے ان کے ایک جواب کا خلاصہ نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

"اگر عقلیات کی مذمت ہم کسی محدث کی زبانی نقل کریں تو یہ کب ممکن ہو گا کہ "الناس اعداء ما جھلوا" لوگ جس فن کو نہیں جانتے اس کی مذمت ہی کیا کرتے ہیں اس لئے ہم یہاں ان علماء کے کلمات پیش کریں گے جو خود عقلیات کے شہسوار تسلیم کئے گئے ہیں۔"

امام غزالی احیاء میں فرماتے ہیں: "یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حقائق اشیاء کے معرفت کی راہ یہ عقلیات نہیں ہیں اس راستہ سے اگر مسائل پر کچھ روشنی پڑ بھی سکتی تھی تو وہ اتنی ہی تھی کہ اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی تھی۔"

المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں: "دلائل کلامیہ مفید یقین نہیں ہو سکتے۔"

التفرقۃ بین الایمان والزندقۃ میں لکھتے ہیں: "اگر ہم مداہنت نہ کریں تو صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ علم کلام میں غلو کرنا حرام ہے۔"

امام رازی فرماتے ہیں میں نے طرق کلامیہ اور فلسفیہ سب کا تجربہ کر دیکھا ہے جو نفع مجھے قرآن عظیم میں نظر آیا کہیں نظر نہ آیا کیونکہ قرآن اس پر زور دیتا ہے کہ تمام جلال و عظمت خدا ہی کے لئے تسلیم کر لی جائے اور اس کے مقابلہ و معارضہ سے احتراز کیا جائے کیونکہ ان تنگ و تاریک راستوں میں عقل انسانی گم ہو جاتی ہے۔ میری وصیت یہ ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اختیار کر چکا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا مجمل ایمان ہی قبول فرمالے اور مجھ سے تفصیل کا مطالبہ نہ کرے۔ اسی مضمون پر امام نے حسب ذیل اشعار کہے ہیں۔

العلم للرحمٰن جل جلاله — علم صرف ایک اللہ جل جلالہ کے لئے ہے
وسواه فی جهلاته يتغمغم — بقیہ سب اپنی جہالتوں میں مبتلا ہیں۔
ما للتراب وللعلوم وانما — اس خاک کے پتلے کو علم سے بھلا کیا واسطہ
يسعى ليعلم انه لا يعلم — وہ صرف کوشش کرتا ہے کہ یہ جان لے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔

امام قرطبی مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے المتکلمین نے اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد اس علم کو چھوڑ دیا ہے چنانچہ ابو المعالی فرماتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کو غرباء اسلام کے لئے چھوڑ کر میں نے ایک بڑے سمندر کا سفر اختیار کیا تھا تاکہ تقلید کی تنگی سے نجات میسر ہو اور تحقیق کی راہ نظر آجائے مگر اب میں نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم بوڑھی عورتوں کا سا سادہ ایمان رکھو اسے اختیار کرو میرا انجام بخیر فرما اس کے بعد حسرت سے فرمایا کہ اے ابو المعالی تیری گذشتہ عمر پر افسوس ہے[1]

امام ابو المعالی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے دیکھو علم کلام کا بہت شغل مت رکھنا اگر مجھے اس کا انجام پہلے معلوم ہوتا تو آج میرا یہ انجام نہ ہوتا۔

احمد بن سنان کہتے ہیں کہ امام ولید بن ابان کرابیسی میرے ماموں تھے جب ان کی نزع روح کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی اولاد سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہارے نزدیک مجھ سے زیادہ عالم کوئی اور شخص ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا میرے متعلق کوئی بدگمانی کرسکتے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا اچھا تو میں تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں مانو گے؟ انھوں نے کہا ضرور۔ فرمایا بس اسی طریقہ پر قائم رہنا جس پر محدثین تھے مجھے اب خوب ثابت ہو چکا ہے کہ حق ان ہی کے ساتھ ہے۔

امام ابو الوفا ابن عقیل فرماتے ہیں میں نے اپنی ساری عمر اصولیوں کی تحقیقات میں خرچ کی ہے آخر تھک کر پھر سیدھے سادے طالبوں کے مذہب پر ہی آنا پڑا۔

شہرستانی علم کلام میں ساری عمر صرف کرنے کے بعد نہایۃ الاقدام میں لکھتا ہے۔

لعمری لقد طفت المعاهد کلها	یعنی جان کی قسم میں نے تمام مقامات پر خوب گھوم کر دیکھا
وسیرت طرفی بین تلک المعالم	نظر کو خوب گھما کر دیکھا مگر جس کو دیکھا اپنی ٹھوڑی کے نیچے
فلم ار الا واضعا کف حائر	ہاتھ رکھے حیرت زدہ دیکھا یا پشیمان شخص کی
علی ذقن او قارعا سن نادم	طرح دانت کریدتا پایا۔

اس کے بعد نصیحت کرتا ہے کہ دیکھو بوڑھی عورتوں کا سا سادہ دین اختیار کئے رہنا۔

ان چند نقول سے متکلمین کے نزدیک محدثین کا مجموعی میلان بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے خود دونوں فریق کے اعیان کا کافی مطالعہ بھی کیا ہے۔ ہم بلا کسی حسن عقیدت کے یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ عقل کی جو گہرائی جیسی محدثین بالخصوص فقہاء محدثین میں نظر آئی اس کا کوئی عشر عشیر فلاسفہ میں نظر آیا اگر یہاں ہم ان کی مثالیں لکھیں تو مضمون بہت زیادہ طویل ہو جائے گا۔

---

[1] الروض الباسم ج ۲ ص ۱۲۔۱۳

حفاظتِ حدیث اور مخالفتِ کتابت

منکرینِ حدیث کو یہ دیکھ کر کہ تدوینِ حدیث کی تاریخ بالعموم پہلی صدی کا آخر حصہ بتلائی گئی ہے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس سے پہلے گویا حدیث کا وجود ہی نہ تھا اور اس کی بنا دوسری صدی کے شروع میں پڑی ہے اسی لئے ہم نے تدوینِ حدیث کا عنوان چھوڑ کر حفظِ حدیث کا عنوان اختیار کیا ہے تاکہ بحث کا مرکزی نقطہ نظروں سے غائب نہ ہونے پائے۔ ہمارے نزدیک اصل بحث یہ ہونا چاہئے کہ تدوینِ حدیث سے پہلے حدیث کا کیا رنگ تھا اگر یہ محفوظ تھی تو پھر اس کی تدوین اگر پہلی صدی میں ہو یا چوتھی صدی میں ہو اس میں چنداں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بعض قاصر الفہم اشخاص نے یہ بے معنی فرق بھی پیدا کیا ہے کہ فلاں صحابی نے حدیث کا کہنے کی مخالفت کی ہے، فلاں نے کتابت کی مخالفت کی ہے، فلاں نے حدیث کے شغل سے روکا ہے۔ مگر ان کے ان ہی بیانات سے دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اسی دور میں حدیث کے شغف کا عالم کیا تھا یعنی بکثرت اس کی روایتیں کی جاتی تھیں، بکثرت انھیں لکھا جاتا تھا اور قرآن کے حفظ کا شغل اتنا غالب تھا کہ کسی کسی کو اعتدال قائم رکھنے کے لئے اس سے روکنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ حدیث کی یہ ساری تاریخ وہ ہے جو خود صاحبِ نبوت اور صحابہ کے دور کی تاریخ ہے پس ان دوسری منزلوں سے منکرینِ حدیث کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، انھیں یہ ثابت کرنا چاہئے کہ پہلی صدی تک حدیث کی کوئی پرواہ بھی نہ کی، کوئی شخص اس کا ایک حرف بھی یاد نہ کرتا تھا۔ اچانک دوسری صدی میں لوگوں نے نئے نئے قصے تدوین کرنا شروع کر دیئے لیکن ایسا ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ولو کان بعضکم لبعض ظہیرا۔

یہاں حدیث کی تدوین کا معاملہ قرآن کی جمع و ترتیب کے معاملہ سے بہت ہی مشابہت رکھتا ہے۔ کیا کوئی عثمان غنی کے دور پر نظر کرنے والا یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قرآن پہلے منتشر تھا پھر ان کے زمانہ میں محفوظ ہوا اور یہ سمجھے کہ خود مدعیانِ اسلام ہی میں ایک جماعت قرآن کریم کے بارے میں بھی بالکل وہی اعتراضات رکھتی ہو جو منکرینِ حدیث، حدیث کے متعلق رکھتے ہیں۔ اگر منکرینِ حدیث کو یہ خیال ہے کہ احادیث محض اپنے اپنے اغراض کے ماتحت بعد میں گھڑ لی گئیں تو منکرینِ قرآن بھی قرآن پر یہی تہمت لگاتے ہیں۔ جوابات دونوں ہی جگہ دیئے گئے ہیں مگر شاید ہر جگہ یہی سمجھا گیا ہے کہ اپنے مقصد کی بات تھی۔

ہمیں یہاں صرف یہ تنبیہ کرنا ہے کہ منکرینِ حدیث جس قسم کے شبہات حدیث میں پیدا کر کے لوگوں کے لئے طریقِ حسنہ میں تغیر لانے کی سعی کر رہے ہیں انھیں ذرا اس پہلو پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ اگر ان ہی تمام اعتراضات کو لے کر خصم نے قرآن کی مخالفت کے مقابلہ میں استعمال کر لیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

دوسری طرف اب اس پہلو پر غور فرمایئے جبکہ صحابہ ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے تھے تو یعنی دیکھنے والوں کا دور تو ختم ہو جاتا تھا اور ان کی جگہ اب ان مشاہدات کو الفاظ کے لباس میں دیکھنے والوں کی باری آرہی تھی جمالِ جہاں آرا کو بے حجاب دیکھنے والوں کے سینوں میں جو حرارتِ عشق کی پیدا ہوئی تھی آپ کے انتقالِ مکانی کا حجاب پڑ جانے سے اس کے شعلوں میں بھی وہ تیزی باقی نہ رہنے کا امکان نظر آنے لگا تھا اس لئے جہاں ہی دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ بے چینی پیدا ہونا شروع ہوگئی کہ کہیں اس محبوبِ عالم کی ادائیں ان کے رخِ انور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہو جانے سے تاریخ کا ایک معتوبِ گزشتہ نہ بن جائیں اس لئے وہ انتظام کرنا چاہئے جو عالم کی تاریکیوں میں ایک یادگار رہ جائے مگر یہ فقط ان کے انتہائی جذبات ہی کا کرشمہ ہوتا اگر رسول اور امتی کے رشتے اس سے پہلے ہی بہت ہو چکے تھے مگر یہاں وہ سب چیزیں ہی ہیر پھیر تھے تبدیلی یا تشکیل اور تھا جس نے اس تمام شیفتگی کو حرکت دے دی تھی جس تقدیر نے آپ کو تمام عالم کے لئے راہنما بنا کر بھیجا تھا وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ آپ کی تصویر بھی آئندہ نسلوں کے سامنے گرد و پیش اور ابر آلود کی صورت کی کہانیوں کی طرح پیش کی جائے ایک طرف نبوت ختم ہو چکی ہو رسالت کا دروازہ مسدود ہو دوسری طرف اس آخری رسول کے حالاتِ زندگی بھی مشکوک اور مشتبہ صورت میں رہ جائیں جن کو آئندہ رسول کا درجہ ہی نہ ملتا تو وہ کتاب ان کی سیرت کا صحیح مطالعہ بھی میسر نہ آسکے اس لئے قرآن کریم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کی بھی ایک ضرورت تھی اس کا احساس بھی قلوب میں پیدا کر دیا گیا۔ آخر عمر بن عبدالعزیز نے[1] ابوبکر بن حزم کے نام یہ فرمان لکھ بھیجا۔

[1] یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ عادل نے ابوبکر بن حزم کو اس کام کے لئے اس لئے منتخب فرمایا تھا کہ وہ اس وقت مدینہ طیبہ میں منصبِ قضا پر فائز تھے اور ان کا علمی پایہ بھی اتنا بلند تھا کہ امام مالک جیسے ان کے قریب ہو سکتے ہیں۔

لم یکن احد بالمدینۃ عندہ من علم القضاء	اس وقت مدینہ میں علم قضاء کا عالم ابن حزم کے برابر کوئی
ما کان عند ابی بکر بن حزم (تہذیب التہذیب)	اور شخص موجود نہ تھا۔

علاوہ ازیں ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقات روایات اور سنن کے کچھ احکام بھی لکھے ہوئے موجود تھے حافظ ابن عبد البر ابن شہاب الزہری سے نقل کرتے ہیں۔

امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبناہا دفترا دفترا	ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے حدیث کے جمع کرنے کا حکم دیا
فبعث الی کل ارض لہ علیہا سلطان دفترا	ہم نے ایک ایک کتاب تیار کیا پھر آپ نے اپنی قلمرو
(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۶)	میں ہر جگہ ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابن شہاب اپنے زمانہ کے اتنے بڑے عالم شخص تھے کہ ان کے متعلق عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اب ہمارا خیال تھا کہ ہم نے زہری کا بہت سا علم حاصل کر لیا ہے جب سلیمان بن ہشام کے قتل کا واقعہ پیش آیا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے خزانے سے بہت سے دفتر لاد کر کتابیں آرہی ہیں ہم نے جب ان کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بیان کیا کہ یہ سب زہری کا علم ہے۔ (جامع بیان العلم ص ۷۳) یہ ان کے علمی ذخیرہ کا یہ حال تھا۔ اب ان کے حافظہ کا حال سنئے۔ ابن شہاب خود اپنا حال لکھتے ہیں۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

جمع احادیث کے متعلق حضرت عمرؓ کی مجلس مشاورت

بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صحابہ کرام دین کے معاملہ میں اتنے محتاط تھے کہ وہ اپنی رائے سے ایک قدم اٹھانا بھی پسند نہ کرتے تھے جمع قرآن کا ایک بڑا معاملہ جب زیر بحث آیا تو وہاں بھی مجلس مشاورت منعقد کی گئی اور جب بڑی رد و بدل کے بعد یہ معاملہ طے پا گیا تو سرکاری طور پر جمع قرآن کا کام شروع کر دیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جمع حدیث کی تحریک کا حال ہے۔ یہ تحریک اصل میں آج سے بہت پہلے حضرت عمرؓ کے دل میں پیدا ہوئی تھی مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دنیا کو قلم سے زیادہ اپنے حافظہ پر ناز تھا۔ حافظہ ہی کے ذریعہ سے معلومات کی تحصیل کی جاتی تھی پھر حدیث کا جتنا حصہ عملی تھا وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود تھا البتہ اس کا جو حصہ صرف اقوال سے متعلق تھا وہ زیادہ تر بہت ابتدائی حیثیت رکھتا زبان کے فطری ماحول کی وجہ سے کسی اہتمام کے بغیر حافظوں میں محفوظ تھا۔ لیکن قرآن کریم کے ایک ایک نقطہ اور زیر و زبر کی ذمہ داری سے کاندھے دبے جا رہے تھے اس لئے وہ تحریک صرف دلوں ہی میں گذر کر رہ گئی۔

ان عمر بن الخطاب اراد ان یکتب السنن	ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خیال کیا کہ احادیث قلمبند کرلی جائیں
فاستشار اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تو اس بارے میں صحابہ سے رائے لی۔ انہوں نے مشورہ دیا
فی ذلک فاشاروا علیہ ان یکتبھا فطفق	کہ قلمبند کرلینا چاہئے اس کے بعد حضرت عمرؓ ایک مہینہ تک
عمر یستخیر اللہ فیھا شھراً ثم اصبح یوماً	استخارہ کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے خیال میں
وقد عزم اللہ لہ فقال انی کنت اریدُ	استقلال پیدا ہو گیا۔ تو کہا کتاب اللہ کے علاوہ میں کوئی
ان اکتب السنن وانی ذکرت قوماً کانوا	یادداشت قلمبند کرنا تھی مگر مجھے خیال آگیا کہ اس سے پہلے
قبلکم کتبوا کتباً فاکبوا علیھا وترکوا	جنہوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا تھا۔ خدا کی قسم میں
وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ	کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور چیز ملانا پسند نہیں کرتا۔ عمرؓ کے
بشیء ابداً۔ [۱]	الفاظ یہ ہیں۔ لا البس کتاب اللہ۔

اس بیان سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ (۱) حضرت عمرؓ جمع حدیث کے خود محرک تھے (۲) صحابہ کی رائے حدیثوں کے جمع کرنے کی طرف تھی۔ (۳) حدیثوں کو قلمبند کرنے کی وجہ اہل کتاب کی تاریخ تھی۔ (۴) لا اشوب کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت سنت کی کتابت کا خیال قائم ہوتا تو شاید کتاب اللہ کے ساتھ ہی حاشیہ پر اس کو لکھا جاتا۔ دوسرے لفظ "لا البس کتاب اللہ" بھی اسی کے شاہد ہیں۔ پس اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اس طرح ملی جلی قلمبند کر دی جاتیں تو یقیناً اسلام کے ابتدائی دور میں نو آموزوں کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ حدیث بھی جب پہلے پہلے کتابت کے دور سے گذری تو اس میں بھی اصل متن

[۱] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴

مرفوعہ اور آثار صحابہ کو ایک ساتھ ہی جمع کر دیا گیا تھا پھر احکام اور ضروریات کی تدریجی ترقی سے مرفوعات کو الگ جدا جدا کر دیا ہے اس سے بہت ممکن تھا کہ جمع حدیث کے نقش اول میں شاید اتنی ارتقائی ترتیب و تہذیب کے مدارج کی طرف ذہن نہ جاتا۔ بالخصوص جبکہ اس دور میں قوت حافظہ کی وجہ سے قرآن و حدیث میں کسی اختلاط کا اندیشہ بھی نہ تھا۔ آج بھی تفسیر کی کتابیں اسی طرح کتاب اللہ و تفسیر کے ساتھ ساتھ مخلوط بھی ہوتی ہیں مگر اس اختلاط سے غلط کوئی شبہ نہیں پڑتا پھر وہ زمانہ نزول کا اور ہی تھا مگر حضرت عمرؓ کی شان حزم و احتیاط نے یہ طریقہ بھی پسند نہ فرمایا کیونکہ ان کے سامنے اس قوم کی تاریخ تھی جو آسمانی کتاب کے ساتھ کتابت کی بدولت اپنے اصول مذہب کے گم کر بیٹھی تھی اس لئے شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجا کہ اگر کسی کے پاس کوئی یادداشت لکھی ہوئی ہو تو اسے مٹا دے۔ ؎

حیرت ہوتی ہے کہ صحیح ہی کتابوں میں ان واقعات کے ہوتے ہوئے بھی منکرین حدیث یہ بے دریغ لکھ دیتے ہیں کہ صحابہ کے درمیان حدیث کی کوئی تشریعی حیثیت نہ تھی اور اسی لئے وہ اس کے جلانے اور مٹانے کا حکم دیتے تھے حالانکہ یہ ایک واقعہ نہیں۔ عام طور پر سلف سے ثابت ہے کہ وہ صرف کتابت کی ممانعت کرتے تھے نہ کہ حدیث کے زبانی یاد کرنے کی۔

سلف کے نزدیک کتابت حدیث کی ممانعت کا مطلب

ابو سعیدؓ سے کسی نے کہا اگر آپ فرمائیں تو ہم آپ کی بیان کردہ حدیثیں لکھ لیا کریں؟ انھوں نے جواب دیا ہرگز نہیں۔ بلکہ جیسا ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زبانی سن کر یاد کی ہیں، تم بھی ہم سے سن کر زبانی یاد کرو۔

ابو بردہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰؓ نے بہت سی احادیث روایت کیں جب ہم ان کو لکھنے کے لئے اٹھے تو فرمایا اچھا کیا تم جو مجھ سے سنتے ہو اس کو لکھتے بھی ہو؟ ہم نے عرض کی جی ہاں۔ کہا وہ سب لاؤ پھر پانی منگا کر ان کو دھو ڈالا اور فرمایا جیسے ہم نے زبانی یاد کی تھیں تم بھی ہمارے حوالہ سے زبانی یاد کرکے نقل کرو۔

مسروق نے علقمہ سے کہا کہ مجھے قرآن کی منتخب سورتیں لکھا دیجئے فرمایا کیا تم یہ نہیں جانتے کہ سلف کو لکھنا ناپسند تھا میں نے کہا ہاں معلوم تو ہے مگر میرا ارادہ یہ ہے کہ میں یاد کرکے پھر انھیں جلا دوں گا۔

سلف میں اپنی تحریری یادداشتوں کو ضائع کر دینے کا عام رواج

عبیدہ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے وفات کے وقت اپنی سب کتابیں منگائیں اور ان کو مٹا ڈالا۔ جب ان سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا مجھے اس کا خطرہ ہے کہ کہیں یہ نا اہل کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اور وہ اس کی غلط مرادیں بیان کریں۔

اوزاعی فرماتے تھے کہ جب تک یہ علم زبانی چلتا رہا محترم رہا جب کتابوں میں مدون ہو گیا تو نااہلوں کے ہاتھ بھی آ گیا

؎ دیکھو جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۵۔

اور اس کا زور جاتا رہا۔

ابراہیم کتابت کے ممانعت کی ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں: "لکھا مت کرو کیونکہ لکھنے کے بھروسہ پر آدمی یاد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔" [1]

ان چند واقعات سے ہمارے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ صحابہ میں حفظ حدیث کا اہتمام ہمیشہ رہا اور اتنا اہتمام رہا کہ ابتدائی دور میں عام طور پر اس کی کتابت کی اجازت بھی نہیں دی گئی مبادا اس کے حفظ میں کوئی تساہل پیدا ہو جائے اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کتابت کی ممانعت ان کے نزدیک مسئلہ کے طور پر نہ تھی بلکہ صرف ایک وقتی مصلحت مبنی تھی ورنہ حضرت عمرؓ کتابت حدیث کے متعلق مشورہ ہی کیوں کرتے صحابہ کرامؓ کی رائے بالاتفاق کتابت کی طرف کیسے جھک جاتی، بہت سے صحابہ حدیثیں کیوں لکھتے اور ان سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن عمروؓ کے لیے جائز کیسے قرار دیتے۔

"میں جو سنتا ہوں سب لکھ لیا کرو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ غصہ کے حال کا کلام بھی یا خوشی کا؟ فرمایا ہاں میں دونوں حالتوں میں جو کہتا ہوں حق ہی کہتا ہوں۔" [2]

حافظ ابن عبدالبر حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں۔ قیدوا العلم بالکتاب (علم کو تحریر کے ذریعہ قید کرو) اسی لئے حضرت انسؓ اپنی اولاد کو کتابت علم کی وصیت فرمایا کرتے تھے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا میں علم کو مقید کر لوں فرمایا کر لو۔ عطا کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمروؓ سے پوچھا علم کے مقید کرنے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا لکھ لینا یہی وجہ تھی کہ ابوہریرہؓ جیسے مشہور کثیر الحدیث صحابی کہتے ہیں کہ میرے علم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ذخیرہ مجھ سے زیادہ کسی کو محفوظ نہیں سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کیونکہ ...... وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔ [3]

پس اس قسم کی احادیث کے ہوتے ہوئے کتابت حدیث کی ممانعت کو ایک مسئلہ بنا ڈالنا انصاف کی ناواقفی ہے۔ اصل بات یہی تھی کہ عرب کے عام افراد فطرۃ کے ہوتے ہوئے قرآن کے ساتھ عام طور پر ...... کتابت حدیث کی اجازت دے دینا بالخصوص اس ابتدائی دور میں جب کہ ابھی تک کتابت کا پورا سلیقہ بھی حاصل نہیں ہوا تھا یقیناً نامناسب تھا ان حضرات کو یہ خطرہ لاحق تھا ان کو اس وقت بھی اجازت دے دی گئی تھی پھر بعد میں جب کتابت کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی تو عام طور پر کتابت کی اجازت دے دی گئی ہے اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ ان کی

---

[1] جامع بیان العلم [2] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۰ [3] ایضاً

ضروریات اور حالات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ قرآن ہی کو دیکھیے ایک زمانہ تھا کہ اس پر اعراب اور نقطے لگانا بھی
تک بدعت سمجھا جاتا تھا، پھر ایک زمانہ آیا کہ اعراب وغیرہ کے بغیر کوئی چھاپ ہی نہ سکتا تھا کجا بدعت ہونا تو الگ
اعراب لگانا واجب ہو گیا۔ پھر ایک زمانہ آیا جب حضرت شاہ ولی اللہ کا تحت اللفظ ترجمہ بھی علماء میں شورش
کا باعث بن گیا۔ اب ایک زمانہ ہے کہ سب سے اہم ضرورت ترجمہ کی محسوس کی جا رہی ہے۔ بالکل یہی صورت
تھی اور یہی صورت ہے۔ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ کتابت حدیث کے مسئلہ میں شروع میں جو علماء کا
اختلاف منقول ہے پھر وہ اختلاف ختم ہو گیا تھا اور علم کی کتابت سب کا متفقہ دستور العمل بن گیا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا
جاتا تو آج ہمارے زمانہ میں علم کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔[1]

خلاصہ یہ کہ تدوین حدیث حفظ علم کی ایک ارتقائی شکل تھی۔ جس طرح خود قرآن کریم کے ضبط کی ارتقائی
شکل پہلے صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھا پھر صحف میں لکھا گیا پھر صحف سے مصحف بنا، پھر غیر منقوط سے منقوط ہوا،
رکوع اور سورتوں کے نشانات قائم کیے گئے، پھر مترجم ہوا، پھر اس کی مختلف تفاسیر لکھی گئیں۔ ٹھیک اسی طرح
حدیث بھی پہلے سینوں میں محفوظ رہی، پھر ضرورت کے ساتھ ساتھ یہاں بھی ایک ارتقاء نمودار ہوا اور اس کے
قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ پہلے کہیں کہیں اور متفرق طور پر حدیثیں لکھی گئیں، اسی حال پر ایک دور گزرا
دوسرا دور آیا تو مرتب کر کے جمع کیا گیا، اس کے بعد جب وضع حدیث کا سلسلہ شروع ہوا تو تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی
یہ تمام صورتیں فطری ارتقاء کی بنا پر ظاہر ہوتی رہیں۔ یہ ارتقائی حرکت پہلے پہل تابعین کے بعض لوگوں کو ناگوار گزری آخر کار
وہی متفقہ دستور العمل بن گئی۔ اسی بنا پر امام زہری نے بھی حدیث کو جمع کرنا شروع میں ناپسند کیا اور شکایت
کے لہجہ میں کہا کہ ہمیں ان امراء نے مجبور کر دیا ہے ورنہ ہم حدیث کی تدوین نہ کرتے، مگر کیا آپ حضرت عمر بن عبدالعزیز
جیسے خلیفہ عادل کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ ان کا حکم ایک ذرہ بھی تعلیمات اسلام کے خلاف ہو سکتا تھا
یہ کلمات ناگواری جیسے ہر حرکت ارتقائی کی ابتداء میں منہ سے نکلا کرتے ہیں یہاں بھی نکلے۔ بالآخر وہی زہری تھے جن
کی عمر کا بیشتر حصہ یہی مشغلہ یعنی تدوین حدیث تھا۔ یہاں کسی کے ہیر پھیر کا گمان کر کے یہ بدگمانی پیدا کرنا کہ تدوین
حدیث سے حدیث کی تاریخ شروع ہوتی ہے بالکل خلاف واقعہ ہے۔ تدوین سے پہلے بھی حدیث محفوظ تھی، فرق صرف
یہ پڑا کہ اب حفظ صدور کے ساتھ اوراق میں بھی مدون ہو گئی۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ منکرین حدیث کا یہ بیان تدوین حدیث کے مسئلہ سے متعلق محض ایک مغالطہ
ہے۔ اسی طرح کسی کسی صحابی کا عام طور پر یہ بات حدیث کی ممانعت کرنا یا روایت کرنے والوں سے گواہی طلب کرنا
ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ ان کے نزدیک اصولی طور پر حدیث حجت نہ تھی بلکہ یہ تمام واقعات اس کا

[1] دیکھیے مقدمہ ابن الصلاح ج۔ ص ۱۸۱۔

سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ان کے درمیان حدیث کی حیثیت قطعاً تشریعی حیثیت نہیں تھی ورنہ وہ اس کا اہتمام قرآن کی طرح کیا کرتے تھے۔ ورنہ تاریخی واقعات کی تدوین کے لئے کبھی حفاظت کی گئی ہے اور نہ تاریخ کے ہر ہر جزو کے لئے کبھی شاہدین کا مطالبہ کیا گیا ہے یہ اہتمام صرف مذہب اور شریعت کے لئے کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ جزائری نے اس بحث پر بسط و شرح سے بحث کی ہے ہم یہاں صرف اس کا ایک ٹکڑا نقل کرنا چاہتے ہیں

وقد رد عليهم الجمهور بأن	جن چند واقعات سے حدیث کے لئے تواتر شرط کرنے والوں نے
المرء إنما كان لاسباب عارضة	استدلال کیا ہے وہ کئی وجہ سے درست نہیں بلکہ توہین ہے کہ
وهو لا يقتضي رد جميع الأخبار	کسی صحابی نے کسی حدیث کو کسی عارضی سبب سے قبول نہیں کیا تو اس کا
الآحاد وكما ذهب أولئك	یہ مطلب ہرگز نہیں نکل سکتا کہ اس کے نزدیک خبر واحد قبول نہ کرنا
على أن الأخبار التي استندوا	اصولی طور پر یہی مسلم تھا یہ ہو سکتا ہے کہ صرف اس کے نزدیک خبر
إليها إنما تدل على بعض مذهب	واحد حجت ہو لیکن خاص اس جگہ راوی یا متن کے اندر نقص کی
من يشترط في قبول الخبر التعدد	شرط موجود ہونے کی وجہ سے اسے قبول نہ کیا ہو یا کسی وقتی
في رواته ولا تدل على مذهب	مصلحت کی بنا پر ہو ایسی حدیث کے لئے اگر مطلب کیا جائے
من يشترط التواتر فيه۔	علاوہ ازیں اگر یہ واقعات دلیل بن سکتے ہیں تو اس شخص کی دلیل
	بن سکتے ہیں جس کے نزدیک خبر واحد کے راوی کا تعدد ضروری ہو
(توجیہ ص ۱۰)	نہ کہ اس شخص کے جس کے نزدیک تواتر ضروری ہے۔

اس کے بعد سب سے پہلے اس پر غور کرنا ہے کہ قرآن کی حفاظت کا مفہوم کیا ہے اور کیا یہ تسلیم کیا گیا کہ احادیث کا تمام ذخیرہ محفوظ ہو گیا ہے اور قرآن کو پوری طرح محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ابوالحسن بن منتاب اور قاضی اسماعیل کا ایک مکالمہ بہت دلچسپ ہے۔ علامہ شاطبی نقل فرماتے ہیں کہ ابوالحسن بن منتاب نے ایک دن قاضی اسماعیل سے پوچھا آخر اس کا سبب کیا ہے کہ اہل تورات کو تورات کی تحریف پر قدرت حاصل ہو گئی لیکن قرآن کی تحریف پر کسی کو قدرت نہ ہوئی۔ قاضی نے جواب دیا اہل تورات کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ — اس سبب سے کہ ان پر خدا کی کتاب کی حفاظت کا بوجھ ڈالا گیا تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لی بلکہ اس کو خود اہل تورات کے سپرد کر دیا تھا اس کے بالمقابل قرآن کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ — یہ ذکر ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں تحریف پر کسی کو دسترس حاصل نہیں ہو سکی۔ (الموافقات)

یہی سوال اگر کسی مورخ سے کیا جائے تو وہ بہت سے بہت اس کا سبب عرب کا ماحول اور ان کا تعلق حفظ ہی قرار دیتا۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو کہ اس ماحول کے ہوتے قرآن کا راوی بھی بعثت سے صدیوں بعد رہا تھا تھا مگر یہاں جب عجم پر نظر کی جاتی ہے جو نہ قرآن کی زبان سے آشنا نہ اس کے تلفظ پر پورے قادر تو عرب حفاظ میں کچھ ممتاز تو وہ بھی قرآن کے حفاظ میں عرب سے پیچھے نظر نہیں آتے بلکہ اگر کچھ پیش قدم کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ جب اس پر بھی غور کیا جاتا ہے کہ اس غیر معمولی حفاظت کا دائرہ قرآن کے صرف الفاظ تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کی طرز کتابت اور قرأت یا لہجہ تک پھیلتا چلا گیا ہے اور اس سے بھی گذر کر ان تمام علوم و فنون کو محیط ہو گیا ہے جو اس سلسلہ میں قریب یا بعید طور پر کارآمد تھے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ حفاظت انسانی حفاظت کا نتیجہ نہیں بلکہ ضرور اسی وعدۂ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس حفاظت کے حدود اتنے وسیع ہو گئے ہوں قرآن کے معانی اور اس کی ضروری تفصیلات اس کے احاطے سے باہر نہیں رہ سکتیں۔

یہ بات ہر شخص کو باور کر لینا چاہئے کہ معانی کی حفاظت کو بھی الفاظ کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے الفاظ اور معانی دونوں کا باہم ایسا علاقہ ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اصول فقہ میں جب قرآن کی بحث شروع ہوتی ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ قرآن درحقیقت نظم و معنی کے مجموعہ ہی کا نام ہے یعنی یہ دونوں قرآن کے دو رکن ہیں جن میں معنی کی رکنیت ایک اعتبار سے بہ نسبت لفظ کے اہم تر ہے۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسا ایمان میں تصدیق و اقرار کی۔ اگرچہ ایمان کے یہ دونوں رکن ہیں مگر تصدیق کی رکنیت بہ نسبت اقرار کے

؎ علامہ شاطبی تحریر فرماتے ہیں: وهكذا نجري الامر في جميع الشريعة فقيض الله لكل علم رجالا حفظه على ايديهم۔ (الموافقات ج ۲ ص ۶۰) قرآن کریم کی طرح حفاظت الٰہیہ کا دائرہ تمام شریعت کو محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو علم بھی اس سلسلہ میں کارآمد ہو سکتے تھے سب کے لئے کچھ لوگ ایسے مقرر فرما دیئے ہیں جن کے ذریعہ سے اس کی حفاظت ہوتی رہتی ہے۔ لغت قرآن کے لئے اہل لغت الفاظ و اعراب کی تصحیح کے لئے اہل صرف و نحو۔ اسی کے ساتھ ایک ایسی جماعت بھی پیدا فرما دی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت سے لے کر آج تک تمام راویوں کے حالات لکھے۔ ان کی ولادت و وفات کے سنہ معلوم کئے تاکہ ایک دوسرے کی ملاقات کا حال صحیح صحیح کھل سکے اور سند کا اتصال روشن ہو جائے اور اسی طرح آپ کی صحیح و سقیم احادیث کو ایک ایک کر کے نکھار دیا پھر ایک جماعت ایسی پیدا فرمائی جس نے اغراض شارع سے بحث کی اور ان کے مطابق احکام استنباط کرنے کے حق کو قرآن و سنت کو نصوص وار ایک ایک مسئلہ کی شکل پر مرتب کر دیا۔ ان کے علاوہ ایسے بھی پیدا فرمائے جنہوں نے ملحدین کے شبہات اور معاندین کے اعتراضات کی تردید کی اور اس پر مستقل کتابیں لکھے ہیں۔ وهكذا نجري الامر في كل علم توقف فهم الشريعة عليه او احتيج في ايضاحها اليه وهو عين الحفظ الذي تضمنته الادلة المنقولة (ج ۲ ص ۶۰)

خلاصہ یہ کہ جس جس علم پر شریعت کا سمجھنا موقوف تھا یا کسی کی ایضاح و تفصیل میں اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی سب کے لئے ایک ایک جماعت پیدا فرما دی اور یہ سب کچھ بے شک اسی حفاظت ہی کا مصداق تھا جس کا تذکرہ قرآنی آیات میں کیا گیا ہے۔

زیادہ اہم ہے۔ اسی لئے اکراہ کی حالت میں اقرار کی رکنیت تو ساقط ہو سکتی ہے مگر تصدیق کی رکنیت کسی
میں ساقط نہیں ہو سکتی۔ اکراہ و رضا کے دونوں حالتوں میں ہی تصدیق قائم رہنا ضروری ہے۔

اسی طرح یہاں الفاظ و معانی کا معاملہ ہے۔ الفاظ بھی قرآن کا ایک رکن ہیں اور معنی بھی لیکن معانی کی
رکنیت بہ نسبت الفاظ کے زیادہ اہم ہو اس لئے چاہئے تو یہ تھا کہ ان کی حفاظت بھی الفاظ کی حفاظت سے زیادہ اہم
ہوتی لیکن ہر کلام کا ڈھانچہ چونکہ الفاظ ہی سے تیار ہوتا ہے الفاظ نہ ہوں تو کوئی کلام وجود ہی نہیں آسکتا جیسے
انسان میں جسم و جان، جسم موجود نہ ہو تو انسان کو موجود کون کہے۔ الفاظ ہی ان معانی کا لباس ہیں الفاظ ہی سے
قرآن کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے اور الفاظ ہی کے لحاظ سے معانی کے حدود پھیلتے اور سمٹتے ہیں۔ اس کے برخلاف معانی
صرف منقولات ہوتے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے پھر الفاظ کی ضرورت ہے اور وہ قرآنی الفاظ سے زیادہ خوبصورت
میسر نہیں آسکتے۔ اس اعتبار سے دیکھو تو الفاظ کی حفاظت مقدم ہو جاتا ہے۔ اس لئے مقدر یہی ہوا کہ الفاظ کی حفاظت
تو بطریق تواتر ہو اور معانی قرآن یعنی اس کی تفصیلات کی حفاظت صرف اس حد تک محدود ہے جو اس کی مراد کو
تحریف معنوی کی نذر سے بچائے رکھے اور اس طرح ایک طرف الفاظ کا تواتر معانی کو بکھرنے نہ دے۔ دوسری طرف
معانی کی حفاظت الفاظ کی بندش میں معین رہے اور مراد متکلم کے خلاف غیر مقصود احتمالات کا دائرہ پھیلنے
نہ دے۔ یہ ہے وہ حفاظت جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ ہوں تو
ہر مصنف اپنے اغراض نفسانی کے مطابق جو معنی چاہے ان میں پیدا کر دے اور اگر صرف معانی محفوظ ہوں
تو ان کے لفظوں کے سمجھنے کا ہمارے پاس کوئی قطعی ذریعہ ہی باقی نہ رہے۔ اب الفاظ و معانی دونوں محفوظ
ہیں۔ الفاظ کی گرفت سے معانی باہر نہیں جا سکتے اور معانی کے لحاظ سے الفاظ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دونوں
کی حفاظت میں فرق ہے تو یہ کہ الفاظ بعینہٖ محفوظ ہیں اور معانی قدر مشترک محفوظ۔ جیسا کہ حاتم کی سخاوت
کی حکایات کہ اس کی ہر ہر جزئی حکایت تو متواتر نہیں مگر ان سب میں مشترک طور پر اس کی سخاوت کا مضمون متواتر
اسی طرح قرآن کے معنی کی تمام تفصیلات اگرچہ متواتر نہیں مگر ان سب میں بھی ایک مشترک امر متواتر ہوتا ہے اور یہی
ان مختلف تفسیروں کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے معنی بھی الفاظ کی طرح کسی ایک صورت میں محدود ہو کر
رہ جائیں تو یہ اس کی بلاغت اور بلندی کے شایانِ شان نہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جس قدر بلند پایہ کلام ہوتا
ہے اتنے ہی خوبصورت سے خوبصورت معانی کا حامل ہوتا ہے۔ نظم قرآنی کی بلندی بھی اس کو مقتضی ہے کہ اس
میں مختلف معانی پیدا ہوں اور ہر ایک ہدایت کا ایک بہتا ہوا چشمہ ہو۔ اس کے علاوہ قانونِ یسر بھی یہی چاہتا ہے
کہ اختلافِ معانی کی وجہ سے عاملین کو کچھ اور وسعت مل جائے لیکن ان مختلف معانی اور مختلف احتمالات
کا معیار اگر صرف لغت دانی اور عقل کو ٹھہرا دیا جاتا تو یسر ہی یسر اور وسعت ہی وسعت رہ جاتی لیکن اس میں

جو اصل مقصد تھا وہ سب فوت ہو جاتا۔ اس لئے وسعت کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کے صحیح اطراف شناسی کے لئے بھی محدود دائرے رکھے جائیں یعنی وسعت و تنگی کے درمیان کا ایک میدان ہے جسے احادیث نے متعین کر دیا ہے۔ سب ایک حد تک یہاں آزادی بھی حاصل ہے اور اسی کے ساتھ بالکل مطلق العنانی بھی نہیں۔

ان تمام تفصیلات کا ہر ہر جزو اگرچہ متواتر نہیں لیکن اس مجموعے سے جو صحیح تعریف ہیں وہ قدر مشترک بطریق تواتر ثابت ہو جاتی ہیں مثلاً قرآن کی آیت "اقیموا الصلوٰۃ" ہی کو لیجئے اس کی تمام تفصیلات اگرچہ تواتر نہیں ہیں لیکن ان سے یہ بات بداہتہً ثابت ہو جاتی ہے کہ لفظ صلوٰۃ سے صرف دعا مراد لینا قرآن کی تحریف ہے۔ اسی طرح اگر آج کوئی شخص نماز کی کوئی نئی ہیئت ایجاد کرنا چاہے اور سجدہ کو رکوع سے مقدم یا رکوع کو قرارت کے درمیان یا دو سجدوں کے درمیان رکوع یا دو سجدوں کے درمیان قراءت یا قیام کی حالت میں سلام تجویز کرے تو یہ سب تحریف شمار ہوگا۔ اور یہ تحریف بھی اسی طرح قرآن کی تحریف کہلائے گی جیسا کہ آیت مذکورہ میں لفظ صلوٰۃ کی بجائے لفظ الدعا کی تحریف۔ پس اگر قرآن کے الفاظ کا تحفظ اس لئے ضروری ہے کہ کتاب الٰہی کی صورت محفوظ رہے تو اس کی تفصیلات کی حفاظت اس لئے ضروری ہے کہ ان محفوظ الفاظ کی مرادیں اور ان کے صحیح مصداق بھی محفوظ رہیں۔

خدا انصاف کرنا چاہئے کہ اس کامل دین کی حفاظت کا وعدہ کیا صرف الفاظ کی حفاظت سے پورا ہو سکتا تھا یہ حفاظت تو شاید تورات و انجیل کو بھی حاصل تھی۔ لیکن کیا محض الفاظ کی حفاظت سے یہودیت و نصرانیت محفوظ رہ گئیں کیا احبار و رہبان نے تحریف معنوی کر کے ان کو تباہ و برباد نہیں کیا۔ چلئے اگر راجح کے قول کی بنا پر تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں لفظی تحریف بھی ہو گئی ہے تو بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ تحریف معنوی کے اثرات لفظی تحریف سے زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ پس قرآن کے صرف الفاظ کو محفوظ کر کے دین محمدی کے اصل خط و خال کی حفاظت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے یہ حفاظت صرف ان احادیث کی بدولت ہے جو اگرچہ انفرادی حیثیت سے خبر آحاد کہلاتی ہیں مگر قدر مشترک صدر و تعریف کو بطریق تواتر متعین کر دیتی ہیں آج بھی بہت سے منتسبین اسلام صرف عقائد قرآن کے الفاظ میں ٹھونسنا چاہتے ہیں مگر قرآن کی معنوی حفاظت کا یہی دوسرا مضبوط بازو ہے جو انہیں کامیاب ہونے نہیں دیتا۔ بہت سے ہیں جو اپنی زبان سے آیت خاتم النبیین بڑی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں پھر اسی آیت سے نبوت کا تا قیامت تسلسل ثابت کرتے ہیں۔ بہت ہیں جو رسول کو عام انسانوں کی صف میں لا کر ان کے بالکل برابر کھڑا کر دینا چاہتے ہیں اور بہت ہیں جو اس کوشش کی اللہ تعالیٰ کی ذات میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں اور سب کے ہاتھوں میں یہی قرآن ہے مگر سب کے سب اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ قرآنی حفاظت صرف اس کے الفاظ تک محدود نہیں رہی اس کے معانی کو بھی شامل ہو گئی

ہیں۔ اگر کوئی زبان ایک ہزار بار آیت ختم النبیین پڑھ کر ایک بار بھی نبوت کا دعویٰ کر دیتی ہے تو وہ امت کے نزدیک منکرین ہی کی فہرست میں شمار ہوتی ہے۔ یہاں اس کے الفاظ کا انکار کرنے والا اور اس کے کسی متفق علیہ معنی کا انکار کرنے والا ایک ہی صف میں سمجھا جاتا ہے۔

پس اگر آپ کے نزدیک بھی یہ ضروری ہے کہ قرآن کی حفاظت لفظی اور معنوی دونوں طریقوں پر ہو تو اب صفحات تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ وہ کون سی امت تھی جس نے اس فریضہ کو ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے تو اس کے معانی کے سمجھنے ہوئے سوائے تعامل امت کے حقیقی کے سوا کسی نے نہیں کی۔ اگر یہ تسلیم کی ہے حفاظت عملی اور تعبیر کا مصداق نہ ہوتی تو ذرا اکثر آپ پھر اس محافظت کا محیر العقول نقشہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا۔

ابن حزم جیسا وسیع النظر مورخ اور عالم قرآن امت کو اس امت کی خصوصیات میں شمار کرتا ہے یہی وہ بڑے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ دین کی حفاظت کے جو چند طریقے اس امت کو مرحمت ہوئے ان میں سے ایک بھی پچھلی کسی امت کو نصیب نہیں ہوا۔ بقول منکرین حدیث اگر دین کی حفاظت صرف تواتر کی ایک ہی صورت میں منحصر ہو تو پھر تمام دین کی حفاظت کا دعویٰ تو صرف ایک بے دلیل خوش عقیدگی بن جائے یا دین کے بہت بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑے۔ قرآن کریم اگرچہ متواتر ہے مگر بہت سے مقامات پر اس کی مراد اور معنی کا تواتر ثابت نہیں ہو سکتا۔ لغت میں اشتراک کا جو شعبہ ہے پھر حقیقت و مجاز استعارات و کنایات کا ایک وسیع باب ہے جس پر معتزلہ نے تو اپنے سارے مذہب کی بنیاد ہی رکھدی ہے۔ ان کے نزدیک ذات و صفات کی آیات اکثر اسی باب میں داخل ہیں۔ ان اختلافات کے موجود ہوتے ہوئے ہر جگہ تواتر اور قطعیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر احادیث تو درکنار قرآن احکام سے بہت بڑے حصہ سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔ اور اگر بہت سوچ کر سے یہ دعویٰ کیا جائے کہ معنی کی تمام تفصیلی قطعی اور متواتر ہیں تو مذہبی دنیا میں موجودہ حالت سے بھی زیادہ انتشار پیدا ہو جائے گا۔ ہر شخص اپنے اپنے ذوق عقل کے مطابق ایک معنی تراش لیگا۔ اور اس پر اس زعم میں مبتلا رہے گا کہ یہی معنی متواتر اور قطعی ہیں مثلاً منکرین حدیث اتباع وحی کی تمام آیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں حدیث کے انکار کی بہت بڑی دلیل موجود ہے اور قائلین حدیث ان ہی آیات کو اثبات حدیث کی بہت بڑی حجت سمجھتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر یہ دونوں معنی متواتر ہوں تو ایک دوسرے کہاں تک تکذیب کی نوبت آجائے گی۔ لیکن اگر مسائل تفصیلیہ بھی قرآن کے ماتحت داخل رہ سکتے ہیں تو پھر کسی فریق کو یقینی طور پر دوسرے کو باطل کہنے کا حق نہیں ہو سکتا۔ بہت سی آیات کے معانی میں بھی جو کہ مرکز کا اختلاف ثابت ہو اس کے باوجود چونکہ قطعیت کا دعویٰ کسی کو نہ تھا اس لئے ان میں مناقشت کا کوئی اثر بھی نہ تھا۔

لہٰذا خالی الذہن ہو کر آپ براہ راست ان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو شاید کسی غور و فکر کے جو بات آپ کے ذہن میں پیدا ہوگی وہ صرف ایک ہی بات ہوگی کہ ان کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اپنی حیات طیبہ میں رسالت ہی کی حیثیت سمجھی گئی ہے اور آپ کو ایک نوع کے لئے بھی صرف ایک عام امام یا عام امیر کی حیثیت میں نہیں سمجھا گیا۔ ان کی نظروں میں آپ پر ایمان لانا، آپ سے محبت کرنا، آپ کی اطاعت کرنا، اور وہ تمام قربانیاں جو ان کے سینوں میں تھیں کر گذرنا صرف رسالت ہی کی ایک حیثیت سے متعلق تھا وہ آپ کی اطاعت آپ کی حکم برداری کے لئے کسی ادنیٰ تامل و تفتیش کے بغیر ہر وقت تیار رہتے تھے اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کے حکم یا آپ کے حکم کی بجا آوری میں سر مو کوئی تفریق کرتے ہوں یا آپ کا حکم ثابت ہو جانے کے بعد حیات و وفات کی تفریق ان کے ذہنوں میں کبھی گذری ہو۔ ان کے نزدیک آپ کے احکام اور آپ کی جو حیثیت تھی وہ ہرگز کسی حاکم کسی امیر اور کسی بادشاہ کے حکم کی سی نہ تھی سلف کی تاریخ کا یہ حصہ اتنا صاف ہے کہ اس میں مسلمان و کافر دو رائیں نہیں رکھتے۔ سند کی تحقیق شاہدوں کی تلاش، ہر شخص کو سمجھ کے بغیر حدیث بیان کرنے کی ممانعت تو محض ازراہ احتیاط اور آپ کی حضرت خطاء انتساب کے سدباب کے لئے تھی۔ اگر قرآن کی طرح لکھے قرآن کی طرح حدیث کو اپنا مشغلہ بنائے رکھنے کی کسی رسم نے ممانعت کی تو اس کی وجہ صرف اس تحریک حفاظت کی ناواقفی جو ان کی آنکھوں کے سامنے ابھی تو تکمیل میں ہو رہی تھی۔ الغرض سند کی تحقیق، شاہدوں کا مطالبہ، کتابت کی ممانعت مگر حفظ کا اہتمام، ہر شخص کو تعلیم کی ممانعت اور غیر فقیہ کی حدیث کی روایت کی روک تھام، روایت حدیث کے وقت خوف و ہراس، کثیر روایات سے احتراز وغیرہ وغیرہ یہی صحابہ اور حدیث کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ چاہو تو اسے آپ حدیث کی مخالفت کا پہلا قدم سمجھ لیجئے، یا حدیث کی حفاظت، تعلیم دین کی اہمیت، روایت احادیث میں غیر محتاطین کی رعایت، نیز اس احساس کی صحت میں لاپرواہی سے اجتناب اور انتہائی تشدد احتیاط سے تعبیر کیجئے۔

ہر شخص کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر اس کے عام مزاج یا اس کے زمانے کے عام مزاج کے بھی خلاف ہو سکتے ہیں، ان کی اصل وجہ وقتی مصلحت یا کوئی اور عارضی سبب بھی ہو سکتا ہے۔ صرف ان واقعات کی بنا پر اس کی ساری زندگی یا اس زمانے کے سارے مزاج کو بدل دینا اس دور کی تاریخ کو مسخ کرنے کے مرادف ہے۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی لٹریچر اول تو کوئی دیکھتا نہیں اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو وہ بھی مخالف ہی کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ اسلام کے واضح اور کھلے ہوئے حقائق بھی نظری مسائل بنتے چلے جاتے ہیں اسلامی نقطہ حیثیت بدل لینے کا یہ پہلا نقصان ہے اور ہر نقصان جو اس کے بعد ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔ ؎

لمثل هذا یذوب القلب من کمد

ان کان فی القلب اسلام و ایمان

ائمہ اربعہ اور بعض اُن مشہور محدثین کے تذکرے

جن کی تصنیفات اس مجموعہ کی زمین اور ماخذ ہیں

اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن مقدس ہستیوں کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے جن کے خزانوں سے لے کر حدیث کے یہ موتی آپ کے سامنے بکھیرے گئے ہیں۔ اس مرحلے پر یہ کیسے ممکن تھا کہ ائمہ اربعہ کا تذکرہ رہ جاتا کہ درحقیقت یہی حضرات ان تمام محدثین اور اُن کی مرویات گرامی کا اصل سرچشمہ ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ یہ تذکرے ان شخصیات بارزہ کے صرف تعارف کی حد تک ہیں۔ ان کے حالات زندگی کی تفصیلات یا اُن پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں کہ اس کے لئے بڑی فرصت درکار ہے۔ پھر یہ اس کا محل بھی نہیں ہے۔ ان مختصر تذکروں سے اجمالاً یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان بزرگوں کے حفظ، دیانت، وجاہت، علم و اخلاق، عقل و فہم کا عالم کیا رہا ہے پھر ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں کے یہ عظیم الشان دفتر کس وزن اور مرتبہ کے ہو سکتے ہیں، چونکہ اصل مقصد حدیث اور حاملین حدیث کی وقعت ذہن نشین کرانا ہے اس لئے ہم نے اپنے نزدیک جو ایک نکھری ہوئی حقیقت تھی اس کو سامنے رکھ دیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس سے پہلے اس باب میں دنیا کے خیالات کیا تھے اور آئندہ اس باب میں لوگوں کی تحقیق کیا ہوگی، ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس مقدس جماعت کی عقیدت ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اُن کا عقیدت مند بنا دیں۔ امام اعظمؒ کا تذکرہ نسبتاً بسیط ہو گیا ہے یہ صرف عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت کی بناء پر، کثرت تحسین اگر انبیاء علیہم السلام کے لئے وجہ لزوم ہو سکتی ہے تو یہ فخر امام صاحبؒ کو حاصل ہے۔ اس کے ساتھ جتنے ائمہ کرام ہیں وہ سب ہمارے نزدیک آفتاب و ماہتاب ہدایت ہیں، ان سب کی محبت سے الحمد للہ کہ ہمارا قلب معمور ہے اور یہی درخواست اپنے قارئین کرام سے بھی ہے۔ فقہاء ذی شان ہوں یا محدثین والا مقام، علماء ہوں یا فقراء، ان کے درمیان فرق مراتب کی بحثوں میں پڑ کر درجہ بندی کی جا سکتی ہے اور اگر حد سے تجاوز ہو جائے تو گمراہی بھی ہے۔ ہنر تو یہ ہے کہ شخصی ضرورتوں کو اس کی تعلیم دی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان تذکروں میں جرح و قدح کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ ان تذکروں کو بصیرت اور عقیدت کے ساتھ پڑھیے تاکہ اس امت کے بعد والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پہلے کیسے تھے۔

از ادارہ باقی شخصی بیضلہم — ازا جمعیت تایید المدارس

ابو حنیفۃ الامام

ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ

شجرۂ نسب | مورخ ابن خلکان نے امام اعظمؒ کا شجرۂ نسب اس طرح نقل کیا ہے: ابو حنیفۃ النعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ۔ اور زوطی کو تابعی کے مولیٰ اور طاء کے زبر وزن تقریبی یا منصور و منصوبہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ لیکن امام صاحب کے پوتے نے جو شجرۂ نسب اپنے دادا کا خود بیان کیا ہے وہ اس طرح ہے: اسمٰعیل بن حماد بن النعمان بن ثابت بن النعمان بن المرزبان۔

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ جب زوطی اسلام لائے ہوں گے تو ان کا نام نعمان رکھ دیا گیا ہو گا اس لئے جب اسمٰعیل نے اپنا شجرۂ نسب بیان کیا تو اپنے دادا کا اسلامی نام ہی ذکر کیا ہے۔

صحیح روایات کی بنا پر یہ مشہور ہے کہ امام صاحب کے والد جن کی ولادت اسلام ہی پر ہوئی ہے۔ خطیب بغدادی نے جو کچھ اس کے خلاف لکھا ہے وہ محض بے اصل اور ان کے مشہور تعصب پر مبنی ہے۔ غالباً اسی خیال کی تائید کے لئے انھوں نے حسب ذیل روایت بھی نقل کی ہے۔

کان ابو حنیفۃ اسمہ عتیک بن زوطی — ابو حنیفہ کا نام عتیک بن زوطی تھا پھر انھوں نے

فسمی نفسہ النعمان وابوہ ثابت۔ — اپنا نام نعمان اور اپنے والد کا نام ثابت بدل دیا تھا:

اس کا راوی عند الماہی مختلف فیہ ہونے کے علاوہ مشہور متعصب ہے تاہم اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو غالباً ثابت کا نام خود ان کے والد زوطی کی مناسبت سے رکھا گیا ہو گا۔

ہمارے نزدیک نام و نسب کے تعین کے لئے سب سے زیادہ معتبر شہادت خود اہل خاندان ہی کی ہو سکتی ہے لہٰذا یہاں اسمٰعیل کے بیان کے خلاف جو بیانات بھی ہیں وہ سب مرجوح یا ناقابل توجہ ہوں گے۔ اسمٰعیل یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے پردادا ثابت زمانۂ طفولیت میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے آپ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا برکت فرمائی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ ان کی یہ دعا ہمارے حق میں ضرور قبول ہوئی ہو گی۔ وہ کہتے ہیں کہ نعمان کے والد نعمان وہی ہیں جو حضرت علیؓ کی خدمت میں ہدیہ لیکر حاضر ہوئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ کے خاندان کو حضرت علیؓ سے پیشتر سے تعلق رہا ہے اور اسی بنا پر انھوں نے ثابت اور ان کی اولاد کے لئے خصوصیت سے دعا فرمائی ہو گی۔ اسمٰعیل یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم فارسی النسل ہیں ہمارے باپ دادے سب آزاد لوگ تھے اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

واللہ ما وقع علینا رق قط — خدا کی قسم ہم غلامی کی ذلت میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔

ان کے اس تاکیدی بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے متعلق پیدا ہو گئی تھی کہ وہ بنی تیم اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اسمٰعیل امام اعظمؒ کے پوتے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو اپنے دادا کے حالات کی بھی پوری تحقیق نہ ہوگی۔ اسلامی عہد میں رقیت کی غلط فہمی پیدا ہو جانا وہ بھی عجم کے نسب میں کچھ بعید نہیں ہے۔ اور واقعہ کی حقیقت منکشف ہو جانے کے بعد غلط فہمیوں کے اسباب بیان کرنے کی منعت صدری اتنا ہی غیر ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس افواہ کو شہرت دینے میں بہت بڑا دخل اس غلطی کو بھی ہے جو امام اعظمؒ سے روایت کے سلسلہ میں بعض علماء کو پیدا ہو گئی تھی۔ علامہ کوثری نے مشکل الآثار کی ایک روایت کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کو مولیٰ حلیف کے معنی میں کہا گیا تھا۔ اگر بالفرض تاریخ سے صحیح طور پر آپ کا اولاد موالی ہونا ثابت ہو جاتا تو اسلامی نقطۂ نظر سے یہ امر بعید ہی مدعا ہی کی مدافعت کرنا ہمارے لئے ضروری ہوتا لیکن افسوس یہ ہے کہ عصبیت کی آنکھ جب خشم آلود ہو جاتی ہے تو وہ کوئی ہنر اپنے حریف میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

مولد و مدفن | آپ کی پیدائش کوفہ میں اور وفات بغداد میں ہوئی ہے۔ علمی پایہ کے لحاظ سے کوفہ جیسے ممتاز شہر کا پایہ علامہ کوثری نے نصب الرایہ کے مقدمہ میں اس کی مختصر تاریخ لکھی ہے ہم اس کا خلاصہ یہاں درج کرتے ہیں۔

کوفہ ایک اسلامی شہر ہے جو عہد فاروقی کے ۱۷ھ میں بحکم امیر المومنین تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے اندر گرد فصحاء عرب بسائے گئے اور ان کے تعلیمی نظم و نسق کے لئے سرکاری طور پر حضرت ابن مسعودؓ کو بھیجا گیا۔ ان کی علمی منزلت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو لکھا تھا کہ ابن مسعودؓ کی مجھے یہاں خود بھی ضرورت تھی لیکن تمہاری ضرورت کو مقدم سمجھ کر تمہاری تعلیم کے لئے ان کو بھیج رہا ہوں۔ انہوں نے یہاں بیٹھ کر عہد عثمانؓ کے آخری عہد تک لوگوں کو قرآن پاک اور دین کے مسائل کی تعلیم دی۔ ان کی تعلیمی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض محدثین کے بیان کے مطابق اس نو آباد شہر میں چار ہزار علماء و محدثین پیدا ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب حضرت علیؓ کوفہ میں داخل ہوئے تو علم کی یہ شان دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھے: اللہ تعالیٰ ابن مسعودؓ کا بھلا کرے، انہوں نے تو اس بستی کو علم سے بھر دیا۔ کوفہ کی یہ حالت موجود ہی کیا کم تھی کہ اس مدینۃ العلم کی آمد نے اور چار چاند لگا دیئے۔ ایک سعید بن جبیرؓ تنہا یہاں ابن عباسؓ کے علوم کا ایسا نمونہ موجود تھے کہ جب کوفہ والے ان کے پاس کوئی فتویٰ پوچھنے جاتے تو فرماتے کیا تمہارے یہاں سعید بن جبیر موجود نہیں ہیں ان کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

شعبی کے علم کا یہ عالم تھا۔ حضرت ابن عمرؓ جب ان کو مغازی پر بحث کرتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے یوں تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہ چکا ہوں مگر ان کی یادداشت ان کو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔

ابراہیم نخعی کو توجہاتی کہا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اہل نقد کے نزدیک ان کے سب مراسیل صحیح سمجھے
جاتے ہیں۔ انھوں نے ابو سعید خدریؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے۔ ابو عمران نے اُن کو اپنے زمانہ کے
تمام علماء سے افضل کہا ہے۔ ۹۶ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو ابو عمران نے ایک شخص سے کہا آج تم نے سب
سے زیادہ فقیہ شخص کو دفن کر دیا۔ اس نے کہا کیا حسن بصریؒ سے بھی زیادہ؟ انھوں نے کہا ایک حسن بصریؒ سے نہیں
بلکہ تمام اہل بصرہ، اہل کوفہ، اہل شام اور اہل حجاز سے بھی۔

شعبی کہا کرتے تھے کہ ابراہیم فقہ کے گھرانے ہی کو پیدا ہوئے تھے اس کے بعد ہمارے پاس آئے اور ہماری
وہ حدیثیں جو بے غبار تھیں اپنی فقہ میں شامل کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

مسروق جو کبار تابعین میں ہیں فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا خلاصہ میں نے ان چھ اشخاص
میں دیکھا۔ علی، عبداللہ بن مسعود، عمر، زید بن ثابت، ابوالدرداء، اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم پھر نظر ڈالی
تو ان سب کے علم کا خلاصہ پہلے دو شخصوں میں پایا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جو زبان رسالت سے اعلم بالحلال والحرام
کا تمغہ حاصل کر چکے تھے اپنے خاص شاگرد عمرو بن میمون کو حکم دیا تھا کہ تحصیل علم کے لئے تم حضرت ابن مسعودؓ کی
خدمت میں کوفہ جاؤ۔

کوفہ کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مصر میں آنے والے صحابہ کی تعداد جو بیس سے
زیادہ اور بھی کوئی تین سو سے زیادہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بالمقابل .... صرف ایک کوفہ میں
پندرہ سو صحابہ کا ورود ہوا جن میں ستر بدری صحابہ بھی تھے عراق کے بقیہ شہروں میں بسنے والے صحابہ کا کوئی ذکر
نہیں ہے۔ اور یہ تعداد بھی کم ہے ورنہ جو مقام مرکزی چھاؤنی بنا دیا گیا ہو معلوم نہیں کہ وہاں کتنے اور صحابہ
آگئے ہوں گے۔ ابو جعفر رازی اپنی کتاب "الفاصل" میں تابعین سے نقل فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا
کیا بات ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس جایا کرتے ہیں۔ یہ ابن مسعودؓ کے
شاگرد تھے۔ فرمایا اے جان پدر بات یہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو خود ان کے پاس مسائل
دریافت کرنے کے لئے آتا دیکھتا ہوں۔ شریحؒ جو یہاں کے قاضی تھے ان کے حق میں حضرت علیؓ کا ارشاد ہے "اے
شریح اٹھو اور فیصلہ کرو کیونکہ تم عرب میں سب سے زیادہ قاضی ہو"۔ ان کے علاوہ تیس اشخاص یہاں اور بھی
ایسے موجود تھے جو صحابہ کی موجودگی میں ارباب فتویٰ سمجھے جاتے تھے۔

اس دور کے بعد دوسرا دور ان حضرات کے تلامذہ کا شروع ہوتا ہے ان کا عدد بھی ہزاروں سے متجاوز تھا
امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ دیر جماجم میں حجاج سے جنگ کرنے کے لئے ایک عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ جو
جماعت نکلی تھی اس میں چار ہزار کی تعداد صرف قراء تابعین کی تھی۔ ابو معشر رازی انس بن سیرین سے نقل کرتے ہیں جب

میں کوفہ پہنچا تو اس وقت وہاں چار ہزار حدیث کے طلبہ اور چار سو فقہا موجود تھے۔ نیز عفان بن مسلم سے ناقل ہیں کہ جب ہم کوفہ پہنچے تو ہم نے وہاں صرف چار ماہ اقامت کی۔ حدیث کا وہاں یہ چرچا تھا کہ اگر ہم ایک لاکھ حدیثیں لکھنا چاہتے تو لکھ لیتے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثوں ہی پر اکتفا کیا اور صرف وہی حدیثیں جمع کیں جو جمہور کے نزدیک مسلم تھیں۔ اسی لئے مسلم ائمہ و حفاظ کو بھی طلب حدیث کے لئے کوفہ کا سفر کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگر آج بھی آپ رجال کی کتابیں کھول کر دیکھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ حتیٰ کہ خود امام بخاریؒ فرماتے ہیں میں شمار نہیں کر سکتا کہ حدیث حاصل کرنے کے لئے کتنی بار کوفہ گیا ہوں۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ کو اگر مہبط وحی ہونے کا فخر حاصل تھا تو کوفہ کو ہزاروں صحابہؓ کے مرجع و مسکن ہونے کا بجا فخر حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کو دیگر بلاد اسلامیہ کے ساتھ اہل کوفہ کا تعامل بھی بڑی اہمیت سے نقل کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ امام ترمذیؒ نے فقہ کا کوئی باب کم چھوڑا ہے جہاں ائمہ کے ساتھ اہل کوفہ کا مذہب نقل نہ کیا ہو۔ یہ ہے امام ابو حنیفہؒ کا مولد اور ان کا علمی گہوارہ جس کی آغوش میں رہ کر ان کی علمی پرورش ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جو فقہ اس سرزمین میں مدون کی گئی ہو وہ سر مو بھی کتاب و سنت سے تجاوز کر سکتی ہے۔

حلیہ و اخلاق | خطیب بغدادی ابو نعیم سے نقل کرتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ خوش رو، خوش لباس، خوشبو پسند کرنے والے، خوش مجلس، نہایت کریم النفس اور اپنے رفقاء کے بہت ہمدرد تھے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قد میانہ تھا نہ بہت کوتاہ نہ بہت دراز، گفتگو نہایت شیریں، آواز بڑی دلکش اور فصیح و بلیغ الکلام تھے۔ عمر، امام حمادؒ کے پوتے فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کسی قدر دراز قامت تھے۔ آپ کے رنگ پر گندم گونی غالب تھی، اچھا لباس پہنتے، عام طور پر اچھی حالت میں رہتے، خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہو جاتا تھا۔ [2]

آپ ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ قیس بن الربیع بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب مشائخ اور محدثین سے ایک رقم لے کر ان کے لئے بغداد سے سامان خریدتے اور کوفہ لا کر اسے فروخت کر دیتے اور سال بہ سال اس کا نفع اپنے پاس جمع رکھتے اور اس نفع سے محدثین کے خورد و نوش لباس وغیرہ کی ضروریات مہیا کرتے۔ اس سے جو کچھ بچتا وہ ان کے حوالہ کر دیتے اور کہتے کہ اسے اپنی دیگر ضروریات میں صرف کر لو اور خدا کا شکر ادا کرو میرے شکر کی

---

[1] یہ عفان بن مسلم امام احمدؒ اور بخاریؒ وغیرہ کے شیخ ہیں۔ علی بن مدینی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر حدیث کے کسی حرف میں ان کو ذرا شبہ ہو جاتا تو اسے سرے سے ترک کر دیا کرتے تھے۔ (تقریب) اب اندازہ فرمائیے کہ جب اس احتیاط کے ساتھ بھی پچاس ہزار حدیثوں کا ذخیرہ ان کو کوفہ میں مل سکتا ہے تو حدیث کے لحاظ سے کوفہ کا مرتبہ کیا ہو گا۔

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۹۳۔ [2] خطیب ج ۱۳ ص ۳۲۰ و ۳۲

ضرورت نہیں کیونکہ میں نے یہ مال اپنے پاس سے تو تم کو دیا نہیں تمہارے ہی مال کا نفع ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ اس نے اس کا ذریعہ مجھے بنا دیا ہے۔

حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ امام کی مجلس میں ایک شخص پر امام صاحب نے خستہ لباس دیکھا۔ سب کو کہا بیٹھے جاؤ۔ جب مجلس برخاست ہو گئی وہ بیٹھا رہ گیا تو فرمایا مصلیٰ اٹھا کر جو اس کے نیچے تم کو ملے وہ لو۔ اس نے جا نماز اٹھائی تو نیچے ہزار درہم تھے آپ نے فرمایا یہ لو اور اپنا لباس درست کر لو۔ وہ بولا میں خود صاحب وسعت ہوں مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے فرمایا تو پھر اپنا حال ایسا بنایا کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے بھائی کو غم ہو کیا یہ حدیث تم کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر اپنی نعمت و کرم کے آثار دیکھنا پسند کرتا ہے۔

جعفر بن عون بیان کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے ایک ریشمی کپڑا آپ سے مانگا آپ نے ایک کپڑا اس کے لئے نکالا تو وہ بولی میں بڑھیا عورت ہوں اور یہ معاملہ امانت کا ہے، مناسب ہے کہ آپ کو جتنے میں پڑا ہے اسی قیمت پر میرے ہاتھ فروخت کر دیجئے فرمایا ۴ درہم دیدے۔ اس نے کہا بڑھیا کا مذاق نہ بنائیے اور ٹھیک ٹھیک قیمت بتا دیجئے۔ آپ نے فرمایا میں نے دو کپڑے خریدے تھے اور ایک ہی کپڑے سے چار درہم کم میری لاگت کی قیمت وصول ہو گئی تھی اب یہ کپڑا مجھے چار درہم ہی کا پڑا ہے۔ [1]

ابن مبارک نے سفیان ثوریؒ سے پوچھا۔ ابو حنیفہؒ غیبت کرنے سے بہت دور رہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے دشمن کی غیبت بھی نہیں کرتے۔ سفیانؒ نے جواب دیا ابو حنیفہؒ اس سے بالاتر ہیں کہ اپنی نیکیوں پر اپنے دشمن کو مسلط کریں۔ (کہ وہ قیامت کے دن اپنی غیبت کے بدلہ میں ان کی نیکیاں لے لے)۔ [2]

اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں، مفصل تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں ان چند واقعات میں امام صاحب کی صرف ہمدردی اور سخاوت قابل غور نہیں ہے۔ دنیا میں سخی اور کریم اور بھی گزرے ہیں دیکھنا تو یہ ہے کہ یہاں آپ نے صرف ہمدردی نہیں کی بلکہ بہت ہمدردی کرنے کے اصول بھی بتلا دیئے۔ ہمدردی کا اخفاء، محتاج کی حاجت روائی کرنا پھر اس کو بالکل پوشیدہ رکھنا اور ایسے طریقے سے کام لینا جن سے اپنے نفس کو محسن اور محتاج کو ندامت کا خطرہ بھی نہ گزر سکے۔ ضرورت اس کی حاجت رفع ہو جائے اور آئندہ کے لئے اس کو سوال کی عادت بھی نہ پڑنے پائے۔ یہ ایک قیمتی سبق ہے جو ان چند واقعات سے ہم کو ملتا ہے۔

تابعیت الامام الاعظم ابن خلکان لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ نے چار صحابہؓ کو پایا ہے۔ انس بن مالکؓ اور عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کو کوفہ میں، سہل بن سعد الساعدی کو مدینہ منورہ میں، ابو الطفیل عامر بن واثلہ کو مکہ میں۔ حافظ ذہبی خود امام صاحبؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالکؓ صحابی کو بارہا دیکھا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی کے ساتھ

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۱، ۳۶۲ – [2] خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۲

اور بہت سے دیگر حفاظ حدیث نے حضرت انسؓ کی رویت تسلیم کی ہے۔ خلاف جو کچھ ہے وہ روایت کے ثبوت و عدم ثبوت میں ہے۔ ہمارے نزدیک ایک ایسے شخص کے متعلق جو صحابہ ہی کے عہد میں پیدا ہوا ہو رویت تو درکنار روایت کا دعویٰ بھی بعید نہیں بلکہ بہت ہی قرین قیاس تھا لیکن کیا کیجئے جن پر امام صاحب کا وجود و احوال ہی شاق ہو ان پر آپ کا لقب تابعین میں شمار ہونا کیوں شاق نہ ہوتا۔ اس لئے یہ بھی ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ متوسط قول یہ ہے کہ رویت سے تو انکار نہ کیا جائے اور روایت کا قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ باقی جو کچھ ہے وہ افراط و تفریط کا میدان ہے۔

تحصیل علم زفر بن ہذیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے سنا ہے کہ مجھے علم کلام کا پہلے اتنا شوق تھا کہ میں اس علم میں شہرۂ آفاق ہو گیا تھا۔ حماد بن ابی سلیمانؒ[1] کا حلقۂ درس میرے قریب تھا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میرے پاس ایک عورت آئی اور اس نے مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک شخص کی بی بی باندی ہے وہ سنت کے موافق اسے طلاق دینا چاہتا ہے کتنی طلاقیں دے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا جواب دوں۔ میں نے کہا حماد سے پوچھو اور واپس آ کر مجھے بھی بتا۔ وہ حماد کے پاس گئی۔ انھوں نے فرمایا جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو جماع کرنے سے پہلے اسے صرف ایک طلاق دینا چاہئے۔ جب وہ حیض لے کر نہا چکے تو بس وہ اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ اس نے واپس آ کر مجھ سے ان کا جواب نقل کیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ علم کلام ہے کس کام کی چیز اور اپنے جوتے اٹھا حماد کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ مسائل بیان کرتے تھے میں ان کو سنتا اور یاد رکھتا۔ جب دوسرے دن وہ تشریف لاتے پھر ان کا اعادہ فرماتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ میں نے ان مسائل کو صحیح ضبط کیا ہے اور ان کے دوسرے شاگردوں نے غلطیاں کی ہیں اس لئے انھوں نے فرمایا کہ میرے حلقۂ درس کے صدر مقام پر ابوحنیفہ کے سوا اور کوئی شخص نہ بیٹھے۔ دس سال مسلسل بلکہ ان کی وفات تک میں ان کے ساتھ رہا۔ حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے والد کسی سفر میں باہر تشریف لے گئے تھے جب واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ اس اثنا میں آپ کو زیادہ یاد کس کی رہی۔ میرا خیال تھا وہ یہی فرمائیں گے تیری لیکن انھوں نے ابوحنیفہ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابوحنیفہ سے ایک لحظہ کے لئے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔[2]

---

[1] حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں تھے۔ تاریخ اصبہان میں ابو الشیخ ذکر کرتے ہیں کہ ایک دن نخعی نے ان کو ایک درہم کا گوشت لانے کے لئے بازار بھیجا۔ زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی اور سامنے سے ان کے والد بھی گھوڑے پر سوار آ رہے تھے یہ صورت دیکھ کر انھوں نے ان کو ڈانٹا اور زنبیل لے کر ہاتھ سے پھینک دی۔ جب ابراہیم نخعی کی وفات ہو گئی تو حدیث کے طلبہ ان کے والد مسلم بن یزید کے دروازہ پر آئے اور دستک دی۔ یہ چراغ لیکر باہر نکلے تو انھوں نے کہا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ کے فرزند حماد کی ضرورت ہے یہ خفیف ہو کر اندر تشریف لے گئے اور حماد سے کہا جاؤ۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کی بدولت ہی نصیب ہوا ہے۔ ابن عدی نے "الکامل" میں نقل کیا ہے کہ حماد فرماتے تھے کہ قتادہ، طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں۔ جب ابراہیم نخعی سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد مسائل کا حل کس سے کیا کریں تو انھوں نے حماد کا نام لیا تھا۔
(مقدمہ زیلعی)

[2] تاریخ خطیب ج ۱۳ صفحہ ۳۳۲ و ۳۳۳۔

روایت مذکورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی عمر کا ابتدائی حصہ علم کلام میں صرف ہوا ہے اور زمانۂ صغر ہی سے آپ کی کنیت ابوحنیفہ تھی یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ کنیت امام صاحب نے خود اختیار کی تھی یا والدین نے آپ کی یہ کنیت مقرر کی تھی۔ اسی روایت سے امام صاحب کے حسن ذوق، سلامتی فطرت اور قوت حفظ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے صرف درس حدیث کے صدر نشین نہ ہونے سے یہ گمان قائم کر لینا کہ آپ کا حفظ کمزور تھا بہت سطحی نظر ہے۔

مآخذ علم | خطیب بغدادی روایت کرتا ہے کہ امیر المومنین ابو جعفر نے امام صاحب سے پوچھا آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا ہے۔ فرمایا عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے شاگردوں کا۔ فرمایا آپ نے بہت مستحکم ذریعہ علم حاصل کیا یہ سب بہت مبارک ستھری اور مقدس ہستیاں تھیں۔ حضرت عمر کی شان تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ میرے بعد اگر کوئی شخص نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ حضرت علی تو وہ ہیں جن کو آپ نے خود اپنے دست مبارک سے قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ رہ گئے عبداللہ بن مسعود تو ان کی شان ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی امت میں ضرب المثل ہو چکی ہے اب سوچئے کہ جو علم اتنے جامع اور مضبوط مآخذ سے حاصل کیا گیا ہو گا وہ کتنا عمیق اور کتنا مستحکم ہو سکتا ہے۔ نہایت قابل توجہ بات ہے کہ مسائل حنفیہ کا مرجع یہی اصحاب ہوتے ہیں کوفہ جو امام اعظم کا مسکن تھا حضرت عمر ہی کا بسایا ہوا آباد کیا ہوا تھا پھر جو صحابی اہل کوفہ کی تعلیم و تربیت کے لئے سرکاری طور پر مقرر کئے گئے وہ ابن مسعود تھے پھر حضرت علی کا تو کوفہ دارالخلافت ہی رہ چکا تھا اس لئے اہل کوفہ کے لئے ان اصحاب ہی کی کشش کے علاوہ ایک فطری کشش بھی موجود تھی۔ کسی مجتہد کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ اس کے استفادہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہر جزئی میں ایک مقلد کی طرح اتباع کرتا ہو گا اجتہاد و رجحان کی ناواقفی ہے بلکہ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کے زیر تربیت رہ کر اس کا جو علمی مذاق اور انداز طبیعت قائم ہو چکا تھا وہ ان حضرات ہی سے ملتا جلتا تھا۔ ان کے اصول استنباط، اصول فکر، مصالح و مفاسد پر غور و خوض کا زاویہ نظر سب ان ہی سے متاثر تھا۔ اس لئے دونوں کے اجتہادات و مسائل میں ایک قسم کی یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہو جانا بھی ضروری امر تھا۔

اصول و عقائد | یحییٰ بن ضریس کہتے ہیں میں سفیان کے پاس حاضر تھا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ کو امام صاحب پر کیا اعتراض ہے انہوں نے فرمایا اعتراض کیا ہے میں نے تو خود انہیں یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سب سے پہلے قرآن کو لیتا ہوں اگر کوئی مسئلہ اس میں نہیں ملتا تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتا ہوں۔ اگر کتاب اللہ اور حدیث رسول دونوں میں نہیں ملتا تو پھر میں آپ کے صحابہ کے اقوال تلاش کرتا ہوں اور ان میں جو زیادہ پسند آتا ہے اسے اختیار کر لیتا ہوں مگر ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ پھر جب بعد والے تابعین کا نمبر آتا ہے تو پھر ان کا اتباع کرنا لازم

آپ نے بحث جیسا انھوں نے اجتہاد کیا تھا میں بھی اختیار کرلیتا ہوں۔ [1]

ابویوسف روایت کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ خراسان میں دو قسم کے لوگ سب سے بدترین ہیں جہمیہ اور مشبہہ۔ ابویوسفؒ سے دوسری جگہ اس طرح منقول ہے کہ امام صاحب جہم بن صفوان کی مذمت کیا کرتے تھے اور اس کی باتوں پر نکتہ چینی فرماتے تھے۔ عبدالرحمن حمانی کہتے ہیں میں نے ابوحنیفہؒ کو فرماتے خود سنا ہے کہ جہم بن صفوان کافر ہے۔ [2] یحییٰ بن نصر کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ شیخین کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے ختنین سے محبت رکھتے تھے تقدیر کے قائل تھے اور اس میں کوئی بحث نہیں کرتے تھے مسح علی الخفین کرتے تھے اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے اور متقی عالم تھے۔ [3] ابوسلیمان جوزجانی اور معلی بن منصور رازی کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ میں کسی نے قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ ہاں بشر مریسی اور ابن ابی داؤد نے اس مسئلہ میں بحث شروع کی اور انھوں ہی نے امام صاحب کے تلامذہ کو بدنام کیا۔ [4]

محدثین کی نظروں میں امام صاحب کی ثقاہت

امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ مالکؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے وقت کے امام تھے شافعیؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے وقت کے امام تھے ابوحنیفہؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے زمانہ کے امام تھے۔ [5] امام احمدؒ جب کبھی امام ابوحنیفہؒ کے کوڑے کھانے اور قضا قبول نہ کرنے کا واقعہ ذکر فرماتے تو رو پڑتے تھے اور امام صاحب کے لئے دعا رحمت فرماتے۔ [6]

حسن بن علی حلوانی شبابہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کے بارے میں شعبہ اچھا خیال رکھتے تھے

علی بن مدینی کہتے ہیں کہ امام صاحب سے ثوری، ابن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع، عباد، جعفر بن عون جیسے جلیل محدثین نے روایت کی ہے وہ ثقہ ہیں ان کی روایت میں کوئی سقم نہیں۔ یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا (اسے ابوزکریا! آپ کی کیا رائے ہے) کیا ابوحنیفہؒ حدیث کے بارے میں سچے ثقہ ہوتے تھے انھوں نے فرمایا نہایت سچے اور بالکل صحیح روایت کرنے والے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا کیا ابوحنیفہؒ بھی غلط واقع بھی حدیث روایت کرتے تھے؟ فرمایا محدثین ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے حق میں بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ اُن کی شان اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی۔ [7]

خطیب یحییٰ بن معین سے نقل کرتا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدیث روایت کرنے کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ سننے کے بعد سے برابر یاد رہی ہو اگر یاد نہ ہو تو اس کا روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام صاحب کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا تو وہ بار بار فرمایا ثقہ ہیں ثقہ ہیں۔ ایک مرتبہ یہ کہا کہ حدیث و فقہ میں ثقہ او

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۰۰ [2] البدایۃ ج ۱۰ ص ۱۰۷ [3] الانتقاء ج ۱۳ ص ۱۳۰ [4] مناقب ج ۱ ص ۲۰۸

[5] جامع بیان العلم ص ۳۰۳ [6] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۳ [7] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹

سچے ہیں اور ثقہ لوگ ہیں دین کے بارے میں بھروسہ کرنے کے قابل ہیں۔ خارجہ بن مصعب اور ابو وہب عابد کہتے تھے کہ جو شخص مسح علی الخفین کا قائل نہ ہو یا ابو حنیفہؒ پر نکتہ چینی کرے وہ یقیناً ناقص العقل ہے۔ ۱؎

حافظ ابن حجر شافعی نے امام صاحب کے مناقب نقل کر کے یحییٰ بن معین سے اس کے خلاف کوئی نقل پیش نہیں کی اور آخر تذکرہ میں لکھا ہے کہ امام صاحبؒ کے مناقب بہت ہیں اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور جنت فردوس میں ان کو جگہ دے۔ ذہبی نے مناقب امام پر مستقل ایک تصنیف لکھی ہے۔

فقہ حنفی کا امتیاز اس عنوان پر علامہ کوثری مصری نے ذہبی کے مقدمہ میں ایک مختصر مقالہ سپرد قلم کیا ہے ہم یہاں اس کا اختصار ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

فقہ حنفی صرف ایک شخصی رائے نہیں بلکہ چالیس علماء کی جماعت شوریٰ کی ترتیب دادہ ہے۔ امام طحاویؒ اسناد کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کی یہ جماعت شوریٰ چالیس افراد پر مشتمل تھی جن میں ممتاز ہستیاں یہ تھیں ابو یوسف، زفر بن الہذیل، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد السمتی (یہ امام شافعیؒ کے شیوخ میں ہیں) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ۔ خطیب نے امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں ان اسماء کا اضافہ کیا ہے۔ عافیہ الازدی، قاسم بن معن، علی بن مسہر، حبان، مندل۔

اسد بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب کی خدمت میں پہلے ایک مسئلہ کے مختلف جوابات پیش کئے جاتے پھر جو ان کا سب سے زیادہ تحقیقی جواب ہوتا آپ ارشاد فرماتے اسی طرح ایک ایک مسئلہ تین تین دن زیر بحث رہتا۔ اس کے بعد کہیں وہ لکھا جاتا تھا۔ صیمری بیان فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ امام کے ساتھ مسائل میں بحث و تمحیص کرتے اگر اس وقت قاضی عافیہ بن یزید موجود نہ ہوتے تو آپ فرماتے ان کے آنے تک اس مسئلہ کا فیصلہ ملتوی رکھو جب وہ تشریف لے آتے اور وہ بھی دوسروں کی رائے سے اتفاق کر لیتے تو امام صاحبؒ فرماتے اب اس کو لکھو۔ جب تک مسئلہ تحقیق و تفتیش کے یہ مراحل طے نہ کر لیتا آپ اس کو لکھنے سے منع کرتے۔ یحییٰ بن معینؒ تاریخ و العلل میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے ایک دن امام ابو یوسفؒ سے فرمایا اے یعقوب جو کچھ مجھ سے سنو اسے فوراً ہی نہ لکھ لیا کرو کیونکہ کبھی ایک مسئلہ کے متعلق میری رائے آج کچھ ہوتی ہے اور کل کچھ ہو جاتی ہے۔ اس روایت سے صیمری کی اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ امام صاحب کا مسلک شورائی مسلک ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اپنے تلامذہ پر اپنے مسائل تسلیم کرنے کے متعلق کبھی جبر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ان کو پوری آزادی دی کہ وہ بہت خوشی سے اپنی اپنی رائیں پیش کریں پھر اس پر خوب جرح و قدح ہو اس کے بعد اگر سمجھ میں آجائے تو اس کو قبول کریں۔

۱؎ خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۹ و ۴۲۰۔ ۲؎ ایضاً ج ۱۴ ص ۲۴۲ و ۲۴۵

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب کی مجلس شوریٰ نقلی و عقلی ہر دو لحاظ سے بہت مکمل مجلس تھی۔ اس میں اگر حفاظ محدثین، عربیت و تفسیر کے جاننے والے شامل تھے تو زفر بن ہذیل جیسے میزان عقل پر تولنے والے بھی موجود تھے۔ ان ہی ائمہ علم و فہم علماء کے تبادلۂ خیالات کا نتیجہ تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو اتنا صاف ہو جاتا تھا کہ مصالح و مفاسد سب طشت ازبام سامنے آ جاتے تھے۔ زمانہ کی ہر ضرورت کی اس میں پوری پوری رعایت ہو جاتی تھی
خطیب امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص نے وکیع سے کہا امام ابو حنیفہؒ نے اس مسئلہ میں غلطی کی ہے۔ وکیع نے فرمایا ابو حنیفہ غلطی کر کیسے سکتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ ابو یوسفؒ اور زفرؒ جیسے قیاس کے ماہر یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان و مندل جیسے حفاظ حدیث اور قاسم بن معن جیسے لغت و عربیت کے جاننے والے۔ داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و متقی شامل ہوں۔ اگر وہ غلطی کرتے تو یہ لوگ ان کی اصلاح نہ کر دیتے۔ دراصل فقہ حنفی کی عام مقبولیت کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا مگر اس کا یہی کمال محدثین کی نظروں میں موجب نقصان بن گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عام محدثین کا مذاق بالکل اس سے جداگانہ تھا۔ وہ اس تمام غور و خوض کو رائے کی مداخلت تصور کرتے تھے اور وہ اس میں بڑی حد تک معذور بھی تھے کیونکہ آئین شریعت کی اس طرح ترتیب و تشکیل کا سلسلہ میں یہ پہلا قدم تھا اسے اوپری نظروں سے دیکھا جانا چاہئے تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر رفتہ رفتہ دوسرے علماء کو بھی اسی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی حتیٰ کہ کوئی امام ایسا نہیں رہا جس کی فقہ صحابہ کی مرتب شکل پر نہ آ گئی ہو مگر ابتدائی ظلم کے قاعدہ کے مطابق اصحاب الرایٔ[۱] کا اولین مخاطب صرف حنفیہ ہو گئے۔

یہ مسئلہ بہت اہم اور طویل الذیل ہے کہ فقہ حنفی کے امتیازی اصول کیا کیا ہیں اور کیا ان کو مداخلت رائے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام کا استقصاء اس مختصر تذکرہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہاں ہم صرف ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد آپ فقہ حنفی کی گہرائی معلوم کر سکیں گے اور اس کے بعد یہ یقین کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ محدثین کی فقہ حنفی سے بے گانگی اور حنفیہ کی معذوری دونوں ہی اپنی جگہ بجا ہیں۔
امام شافعیؒ ابن عبد البر سے نقل کرتے ہیں کہ بہت سے محدثین امام صاحب پر طعن کرنا اس لئے جائز سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک آپ نے بہت سی صحیح اخبار آحاد کو ترک کر دیا تھا۔ حالانکہ امام صاحب کا ضابطہ یہ تھا کہ آپ پہلے خبر واحد کو اسی باب کی دوسری احادیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے۔ قرآن کریم کے بیان۔ سے بھی ان کو

---

[۱] ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن جو امام مالکؒ کے استاد ہیں اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے ربیعۃ الرایٔ کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے عبد العزیز بن ابی سلمہ کہتے تھے اے اہل عراق تم ربیعۃ الرایٔ کہتے ہو خدا کی قسم ہم نے ان سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ ابن سعد فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور کثیر الحدیث شخص تھے مگر اس کے باوجود ان کی طرف رائے کی نسبت اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ ان کا لقب ہی ربیعۃ الرایٔ پڑ گیا تھا۔

خلاف۔ اگر وہ قرآن کریم اور ان احادیث کے بیان کے مطابق ہو جاتیں تو اُن پر عمل کر لیتے ورنہ انھیں شاذ قرار دیتے اور عمل نہ کرتے۔ ؎

انصاف کیجئے کہ ایک آئینی تفکر کے لئے آئین سازی کا یہ کتنا صحیح راستہ تھا مگر جن مزاجوں میں صحابیت صرف اسناد و تعبیر کا پابند ہو وہ اس کا نام صحیح احادیث کا ترک رکھ لیتے تھے۔ اس کی بہت مشہور مثال حدیث مصراۃ ہے حنفیہ پر اس مسئلہ کی وجہ سے ہمیشہ طعن کی گئی اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے محض اپنی رائے سے اس حدیث کو ترک کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر حنفیہ نے تاوان کے وسیع باب میں اس قسم کا تاوان کہیں نہ دیکھا اور اس لئے یہاں بھی اس باب کے عام ضابطہ ہی پر عمل کر لیا ۔۔۔ تو کچھ بیجا بھی نہیں کیا۔ بقول حافظ ابو عمرو کون ایسا ہے جس نے ہر باب کی ہر حدیث کو من و عن تسلیم کیا ہو اپنے استقراء و اجتہاد کے بعد جب ایک حدیث کو مخصوص اور معلول بنایا گیا ہے تو اس کی مخالفت حدیث میں سب نے تاویل و توجیہ جائز قرار دی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حنفیہ نے اکثر مواضع میں اصول کو جزئیات پر قربان نہیں کیا۔ جب کسی بات میں ان کے نزدیک مآخذ شریعت سے ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو گیا تو پھر انھوں نے اس کے برخلاف جزئیات کو عموماً قابل تاویل سمجھا ہے۔ مثلاً انسانی حاجت کے لئے بیٹھنے کا ایک آئین یہ ہے کہ قبلہ کو اپنے سامنے یا پشت کی جانب نہ رکھنا چاہیے۔ اس ضابطہ کو حنفیہ نے پہلے منقول اور معقول ہر طریق پر جانچا تو لا محالہ اُن کے نزدیک ادب و احترام کا یہ آئین ثابت ہو گیا تو حضرت ابن عمرؓ کے صرف ایک جزئی واقعہ کی بنا پر کہ انھوں نے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قضاء حاجت کے لئے قبلہ کی جانب پشت کئے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا۔ اس ضابطہ کلیہ کی تاویل نہیں کی بلکہ اس واقعہ ہی کی کوئی توجیہ کر لینا زیادہ مناسب سمجھا۔

دوسری مثال نماز میں بات کرنے کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر احادیث سے نماز میں بات کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہاں کسی استثناء کی طرف ادنیٰ اشارہ نہیں ملتا صرف ایک ذوالیدین کی حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں کسی کو سہواً اور کسی کو عمداً کچھ بات چیت کرنے کی نوبت آگئی تھی اس کے باوجود ان کی نمازوں کو فاسد نہیں سمجھا گیا۔ دیگر ائمہ نے اس ایک جزئی واقعہ کی وجہ سے اصل قاعدہ ہی کی تخصیص و توجیہ شروع کر دی ہے حنفیہ نے یہاں بھی قاعدہ میں کوئی تخصیص نہیں کی بلکہ اس کو بدستور اپنے عموم پر قائم رکھا ہے اور اس ایک واقعہ ہی کی کوئی توجیہ یا تاویل کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جہاں حنفیہ نے قاعدہ کلیہ کے مقابلہ میں جزئیات ہی کی تاویل کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ضابطہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور جزئیات منتشر اس لئے تاویل کرنے والوں کی صف میں زیادہ تر یہی حنفیہ ہی نظر آنے لگے اب آپ کو اختیار

؎ الموافقات ج ۳ ص ۲۳ ۔

کہ اس کا نام ترک حدیث رکھ لیجئے یا عمل بالحدیث رکھئے۔ یہی سب کے امتیازات ہیں جن کی بنا پر ہر دور میں امت
نصف حصہ اسی فقہ پر عمل پیرا رہا ہے اور اسی اصولی نظر کی وجہ سے حنفی فقہ میں اتنی لچک ہے کہ اتنی دوسری
فقہ میں نہیں اگر علماء انسانوں کی ضرورت اور دین حنیف کی سہولت دونوں کو پیش نظر رکھتے تو ان کو حنفی کتاب الحیل
پر لکھنا مقصود نہ آتا اور نہ وہ حنفیہ کو محض رائے کا مقلد قرار دیتے۔

امام اعظم کا علمی پایہ

محمد ابن حکیم فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ سے بڑھ کر میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا۔ مکی بن ابراہیم نے
امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وکیع فرماتے
ہیں میں کسی عالم سے نہیں ملا جو ابو حنیفہؒ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں لوگ
علم فقہ سے بے خبر پڑے ہوئے تھے ابو حنیفہؒ نے انہیں بیدار کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں ہم خدا کے
سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے، واقعی بات یہ ہے کہ ابو حنیفہؒ سے بہتر قول ہم نے کسی کی نہیں سنی اور اسی لئے ان کے
اکثر اقوال ہم نے بھی اختیار کر لئے ہیں۔ یحییٰ ابن معینؒ کہتے ہیں کہ فتوے میں یحییٰ بن سعید کوفیوں کا قول اختیار کیا کرتے
تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں جسے علم فقہ میں مہارت حاصل کرنا ہو اسے لازم ہے کہ ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کو
دیکھے کیونکہ تمام لوگ فقہ میں ان کے محتاج ہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ فقہ تو بس امام ابو حنیفہؒ ہی کی ہے
جعفر بن ربیع کہتے ہیں میں پانچ سال ابو حنیفہؒ کی خدمت میں رہا ان جیسا خاموش انسان میں نے نہیں دیکھا۔ ان
سے جب فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو منہ کھل جاتا اور دریا کی طرح بہنے لگتے تھے۔ عبداللہ بن
داؤد فرماتے ہیں کہ اہل اسلام پر فرض ہے کہ وہ اپنی نمازوں کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے لئے دعا کریں اور ان کا ذکر
کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے امت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور مسائل فقہ جمع کر کے رکھ دیئے
ہیں۔ مسعر بن حبابہ کہتے ہیں کہ میں ابن جریجؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہیں امام صاحبؒ کے وفات کی خبر پہنچی
انہوں نے انا للہ پڑھا اور فرمایا افسوس کیسا عجیب علم جاتا رہا۔ اسی سال ابن جریجؒ کا بھی انتقال ہوا۔

علم فقہ کا انتخاب

جو شخص امام صاحبؒ کے مناظرات و حالات سے تھوڑی بھی واقف ہے وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ
امام صاحب کو جمیع علوم میں پوری دستگاہ حاصل تھی۔ علم کلام سے آپ کی ابتدا شروع ہوتی ہے
اور حدیث و تفسیر و فقہ تو آپ کا مشغلہ ہی تھا۔ مورخ ابن خلکان آپ کے متعلق لکھتا ہے "ولم یکن یعاب
بشیء سوی قلۃ العربیۃ" یعنی آپ پر قلت عربیت کے سوا اور کوئی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی جو
کچھ ہیں تحقیق کے بعد کچھ نہیں رہتے لیکن ہم اس سلسلہ میں ان چند اسباب کو ظاہر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جن کی بنا پر
امام صاحب نے دیگر علوم کی بجائے علم فقہ کو اپنا دائمی مشغلہ بنا لیا تھا۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے
کہ جو شخص حدیث و قرآن نہیں جانتا وہ فقہ سے بھی کوئی مجتہدانہ مذاق نہیں رکھ سکتا

لہ خطیب مناقب امام

جائے تو یک اس موقع پر اختیاری اسباب کے ساتھ کچھ تدریجی اسباب بھی ایسے پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے فقہ
آپ کا سب سے بڑا مشغلہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مناقب موفق اور تاریخ خطیب میں مذکور ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد
علم فقہ کی جہالت کے لئے جن پر نظریں پڑتی تھیں وہ حماد بن ابی سلیمان نخعی کی ذات تھی جب تک یہ حیات رہے لوگ ان کی
وجہ سے عام طور پر بے نیاز رہے لیکن جب حماد کی وفات ہو گئی تو اب اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ لوگوں کی ضروریات
پورا کرنے کے لئے ان کا کوئی دوسرا جانشین ہو ادھر ان کے تلامذہ کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ان کے علم اور استاد کا نام
اور ان کا علم کہیں ختم نہ ہو جائے۔ حماد کے ایک فرزند تھے جو اچھے عالم تھے۔ ان پر اتفاق ہو گیا کہ انہیں اپنے والد
کی مسند پر بٹھا دیا جائے، ابوبکر نہشلی اور ابو بردہ وغیرہ جوان کے شاگرد تھے اب ان کے پاس آنے جانے لگے
لیکن ان حضرات پر شعر و سخن کا ذوق غالب تھا، یہ جگہ کو نبھا نہ سکے، پھر لوگوں کا خیال ابوبکر نہشلی کی طرف گیا
ان سے درخواست کی گئی تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابو بردہ کی خدمت میں یہ مسند پیش کی گئی مگر
انھوں نے بھی انکار کیا۔ آخر کار لوگوں نے امام صاحب کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا میرا دل نہیں چاہتا
کہ علم فنا ہو جائے اس لئے ان کی درخواست کو منظور کر لیا اور مسند افتاء پر بیٹھ گئے۔ (مناقب موفق ۵ ص ۱۰)

واقعہ یہ ہے کہ جب نخعی کوفی کی مسند پر بیٹھنے کے لئے قدرت نے امام صاحب ہی کو انتخاب کیا ہو تو اس جگہ کوئی
دوسرا کیسے بیٹھ سکتا تھا۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ امام ابو حنیفہ وہی ہیں جن کے سامنے جب منصب قضا پیش کیا گیا تو ہر سختی و ذلت
برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر منصب قضا قبول نہ کیا۔ اور یہی ہیں کہ جب ان سے ایک آزاد علمی خدمت
کی درخواست کی گئی تو فوراً قبول کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بہر حال اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ کچھ اتفاقات
سماوی کی بنا پر علم کی جو مسند امام صاحب کے لئے مقدر ہو چکی تھی وہ علم نبوت ہی کی گویا بعد میں نیابت کی
مسند تھی اس لئے قدرتی طور پر آپ کا مشغلہ فقہ ہی بن جانا چاہئے تھا۔

حافظ ابن عبدالبرؒ ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے اعمشؒ نے ایک مسئلہ دریافت کیا اس وقت
میرے اور ان کے سوا وہاں کوئی اور موجود نہ تھا میں نے اس کا جواب دیا انھوں نے فرمایا اے یعقوب یہ
جواب تم نے کس حدیث سے اخذ کیا؟ میں نے کہا اسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے بیان فرمائی تھی انھوں نے فرمایا
یعقوب یہ حدیث تو مجھے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے سے یاد تھی مگر میں آج تک اس کا یہ مطلب سمجھ سکا تھا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اعمش اور امام صاحب کے درمیان بھی پیش آیا ہے۔ عبیداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں
اعمش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اور ایک مسئلہ دریافت کیا وہ اس کا جواب نہ دے سکے

لہ خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۲۔

دیکھا تو وہاں ابو حنیفہؒ بھی بیٹھے ہوئے تھے فرمایا اے نعمان! اس کے متعلق تم کچھ بولو! انھوں نے فرمایا اس کا جواب یہ ہے۔ اعمشؒ نے فرمایا کہاں سے کہتے ہو؟ امام صاحبؒ نے فرمایا اسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے روایت کی تھی۔ اس پر اعمش نے کہا نحن الصیادلۃ وانتم الاطباء تم لوگ اطباء ہو اور ہم عطار ہیں (یعنی محدثین کے پاس صرف دواؤں کا سٹاک ہوتا ہے وہ اس کی ترکیب و خواص نہیں جانتے، علماء ان کے اثرات اور ترکیب بھی جانتے ہیں۔ [1]

خطیب بغدادی امام ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ان سے اعمش نے پوچھا کہ آپ کے استاذ نے عبداللہ کا یہ مسئلہ کیوں ترک کر دیا کہ باندی کے آزاد ہونے سے اس پر طلاق ہو جاتی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی اسی حدیث کی بنا پر جو آپ نے ان سے بواسطہ ابراہیم و اسود کے نقل فرمائی تھی کہ بریرہ جب آزاد ہوئیں تو ان کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں۔ اس پر اعمش نے کہا کہ ابو حنیفہؒ نہایت سمجھدار شخص ہیں۔ امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ اعمش کو امام صاحبؒ کا یہ استنباط بہت پسند آیا تھا۔ [2]

امام ترمذیؒ اپنی جامع میں غسل میت کے مسئلہ کی تحقیق کرنے کے بعد فرماتے ہیں وکذالک قال الفقہاء وھم اعلم بمعانی الحدیث۔ فقہاء نے اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور حدیث کے مطالب یہی لوگ زیادہ سمجھتے ہیں۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ حدیث و فقہ دو علیحدہ چیزیں نہیں، فرق ہے تو یہ کہ محدث کے نزدیک الفاظ حدیث کا حفظ مقدم ہوتا ہے اور فقیہ کے نزدیک ان کے معانی کا فہم مقدم۔

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ امام صاحب نے شغل فقہ صرف امت کے نفع کی خاطر اختیار فرمایا تھا اور یہ اختیار فرض تھا۔ الفاظ حدیث تو محفوظ ہو ہی چکے تھے اب جس خدمت کی ضرورت تھی وہ استخراج و استنباط مسائل اور ان کی آئینی تشکیل و ترتیب ہی کی تھی۔ محدثین ہزاروں موجود تھے لیکن فقہ کا یہ مقام خالی پڑا ہوا تھا اس لئے امام صاحب نے اس خلا کو پر کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ امام صاحب فن حدیث و قرآن سے نا آشنا تھے۔ ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ محدثین اگر الفاظ حدیث کے ذمہ دار ہیں تو فقہاء اس کے صحیح استعمال کے جاننے والے ہیں وہ عطار ہیں تو یہ طبیب فقہ کا تمام تر مدار ہی قرآن و حدیث کے ہی فہم پر ہے۔

ابن خلدون لکھتے ہیں کہ بعض کم عقل لوگ قلت روایت کو ان کی علم حدیث سے بے بضاعتی کی دلیل سمجھا کرتے

---

[1] جامع بیان العلم ج ٢ ص ١٣٠، ١٣١ - [2] خطیب ج ١٣ ص ٣٤١

صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ شریعت کا ماخذ کتاب و سنت ہی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی شرعی مسائل کے استنباط و ترتیب کا ارادہ کرے گا اس کے لئے کتاب و سنت کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ امام صاحب کی قلتِ روایت کا مبنیٰ اس علم سے بے بضاعتی نہ تھی بلکہ درحقیقت روایت و نقل کے وہ شرائط تھے جن کا معیار آپ نے عام محدثین سے بہت بلند قائم کیا تھا۔ اس لئے آپ کے لئے روایت کا میدان بھی زیادہ وسیع نہیں رہا تھا۔ امام صاحب کے علم حدیث میں ماہر اور مجتہد ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے درمیان آپ کی فقہ ہمیشہ بنظرِ اعتبار دیکھی گئی ہے ایک طرف جہاں امام احمدؒ، امام شافعیؒ کا مسلک نقل کیا گیا ہے اسی کے پہلو بہ پہلو امام صاحب کا مسلک بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ محدثین کے نزدیک آپ کی فقہ بھی اسی درجہ پر معتبر تھی جیسا کہ دیگر فقہاء محدثین کی فقاہت۔ یہ رد و قبول کے اعتبار سے اس کا زیر بحث رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ کی فقہ بھی دیگر محدثین کی فقہ کی صف میں سمجھے جانے کے قابل تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر ایک جماعت اسے قبول کرتی رہی تو دوسری جماعت ترک کرتی رہی۔ [1]

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی صحیح مراد اور اس میں مسائل کے ماخذ امام صاحب سے زیادہ جاننے والا میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا۔ بعض مرتبہ میں آپ کی رائے چھوڑ کر کسی حدیث کے ظاہر پہلو کو اختیار کر لیتا تو بعد میں مجھے متنبہ ہوتا کہ حدیث کی صحیح مراد سمجھنے میں امام صاحب کی نظر بہت زیادہ گہری تھی۔ [2]

اسرائیلؒ جو مسلم ائمہ حدیث میں ہیں امام صاحب کی مدح میں بطریق تعجب فرماتے ہیں نعمان کیا خوب شخص ہیں جو احادیث مسائل فقہیہ سے متعلق ہیں وہ ان کو کیسی محفوظ ہیں اور کس تفحص و تدقیق سے وہ ان سے مسائل مستنبط استنباط فرماتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ محدثین میں وکیعؒ اور یحییٰ بن سعید القطانؒ جیسے اشخاص امام اعظم کی فقہ کے مطابق فتوےٰ دیتے تھے حافظ ابن عبد البرؒ یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں۔

وکان وکیع یفتی برأی ابی حنیفة و	وکیع امام صاحب کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور
کان یحفظ حدیثہ کلہ وکان قد سمع	آپ کی احادیث کو تمام حفظ یاد رکھتے تھے اور انہوں
من ابی حنیفة حدیثا کثیرا۔ [3]	نے آپ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں۔

امام صاحب کے اساتذۂ محدثین کی جو تعداد بعض نے لکھی ہے وہ ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن چونکہ دیگر محدثین کی طرح خود امام نے باقاعدہ روایتِ حدیث کے حلقے قائم نہیں کئے اور تدوینِ فقہ کو ترجیح دی، اس لئے بعد کے زمانہ میں آپ کی شانِ محدثیت نظری بن کر رہ گئی۔

۱؎ مقدمہ ص ۲۱۲۔ ۲؎ [illegible] ج ۲ ص ۲۰۰۔ ۳؎ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹

محدثین کو امام صاحب سے وجہِ شکایت

تاریخ کا یہ بھی ایک عجیب غریب ورق ہے کہ وہاں ایک طرف تو امام صاحب کی تعریف و توصیف میں کھری جاتی ہے اور جلی حروف میں یہ لکھی جاتی ہے کہ آپ عہدِ صحابہ میں پیدا ہوئے ورع و تقویٰ بے حد تھا، علم و فضل، زہد و عقل کے تمام کمالات آپ میں جمع تھے۔ آخر میں امام اعظم آپ کا لقب تھا محدثین و علماء کا ایک جمِ غفیر ہمیشہ آپ کے زمرۂ مقلدین میں شامل رہا اور امتِ مرحومہ کا نصف سے زیادہ حصہ اب تک آپ کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے ہی ورق پر دیانت و عقل کا کوئی عیب ایسا اٹھا کر نہیں رکھتی جو آپ کی ذات میں لگا نہیں دیتی۔

خطیب بغدادی نے پہلے سترہ صفحات پر امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے۔ پہلے امام صاحب کے مناقب میں صفحے کے صفحے رنگ دیئے ہیں اس کے بعد پورے ۲۰ صفحات پر آپ کی ذات میں وہ وہ نکتہ چینیاں نقل کی ہیں جو شاید کسی بھی بڑے سے بڑے کافر پر بھی نہیں کی جا سکتیں۔ ایک متوسط عقل کا انسان ان متعارض بیانات کو پڑھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسے دو متضاد صفات کا حامل نہیں ہو سکتا یا اس کے مناقب کی یہ تمام داستان فرضی ہے یا عیوب کی یہ طویل فہرست صرف مخترع حکایات اور صریح بہتان ہے۔ مورخ ابن خلکان نے خطیب کے اس غلط طرز پر حسب ذیل الفاظ میں تنقید کی ہے۔

وقد ذكر الخطيب في تاريخه منه اشياء كثيرة ثم اعقب ذلك بذكر ما كان الاليق تركه والاضراب عنه فمثل هذا الامام لا يشك في دينه ولا في ورعه ولا في حفظه ولم يكن يعاب بشيء سوى قلة العربية (ج ۲ ص ۱۶۵)

یعنی خطیب نے اپنی تاریخ میں آپ کے مناقب کا بہت سا حصہ ذکر کیا ہے اس کے بعد ایسی ناگفتنی باتیں بھی لکھی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اور ان سے اعراض کرنا مناسب تھا کیونکہ امام اعظم جیسے شخص کے متعلق نہ دیانت میں شبہ کیا جا سکتا ہے نہ حفظ و ورع میں۔ آپ پر کوئی نکتہ چینی بجز قلتِ عربیت کے اور نہیں کی گئی۔

حافظ ابن عبد البر مالکی کا کلام یہاں نہایت منصفانہ ہے کیونکہ تنقید کا یہ شاخسانہ صرف ایک امام صاحب کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اوپر تک بھی پہنچا چلا گیا ہے۔ اگر غور و نظر کو اور وسیع کیجئے تو بعض صحابہ کا استثنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ غضب اور مسرت انسانی فطرت ہے۔ ان دونوں حالتوں میں انسان کے الفاظ کا صحیح توازن قائم نہیں رہ سکتا اسی لئے غضب کے حال میں فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ صرف ایک نبی کی شان ہے جس کے منہ سے غضب و رضا کے دونوں حالوں میں یکساں تلے الفاظ ہی نکلتے ہیں۔ اب اگر انسانوں کے صرف ان جذباتی پہلوؤں سے تاریخ مرتب کر لی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض صحابہ کے الفاظ صحابہ کے متعلق اور ائمہ کے متعلق بھی ایسے مل سکتے ہیں جن کے بعد امت کا یہ مقدس گروہ بھی زدِ تنقید آ سکتا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے امام شعبی کا کیسا بصیرت افروز مقولہ نقل کیا ہے۔

قال الشعبی حدثنا الامام بغضب	شعبی فرماتے ہیں ہم سے تو لوگوں نے حضرت علی اور علی وغیرہ کے
بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صحابہ کے بارے میں عصبیت کی حمایت نقل کی تھیں انہوں نے اٹھا کر
فاخذوہ ودیناہ سنۃ	انہیں حضرت علی کی فہرست میں داخل کر لیا ہے۔

اس کے سوا دوسری شکل یہ ہے کہ محدثین کے جو مبہم الفاظ آج کتب میں مدون نظر آتے ہیں کچھ ضرورت ہے کہ ان کے اصل معنی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے ایک مرتبہ امام صاحب اعمش کی عیادت کے لئے گئے۔ اعمش نے کچھ روکھا پن دکھایا اور امام صاحب کچھ غصہ کے انداز سے۔ اس اتفاق پر اعمش کا یہ عدد آپ کو ناگوار گزرا اور گذرنا ہی چاہئے تھا۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ اعمش نہ تو رمضان کے روزے رکھتا ہے اور نہ کبھی جنابت سے غسل کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی امام دین پر ان الفاظ کو کتابی چیز بنا لیجئے کہ جہاں نہیں ہو سکتے اگر کہیں ان الفاظ کی تشریح ہمارے سامنے نہ ہوتی تو معلوم نہیں کہ اس مقولہ سے ہمارے خیالات کتنا کچھ پریشان ہو جاتے۔ لیکن جب ان الفاظ کی مراد ہاتھ آگئی تو آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ ائمہ غصہ کے حال میں بھی ایک دوسرے کے متعلق عوام کی طرح بے سروپا کلمات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب فضل بن موسیٰ سے اس کا مطلب دریافت کیا گیا (اس واقعہ میں وہ امام صاحب کے ساتھ ساتھ تھے) تو انہوں نے فرمایا کہ اعمش التقاء ختانین سے غسل کے قائل نہ تھے بلکہ جمہور کے خلاف اسی مسئلہ پر عمل کرتے تھے جس پر کبھی ابتدائے اسلام میں عمل کیا گیا تھا یعنی انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض صحابہ کا مذہب یہ تھا کہ طلوع فجر کے بعد روشنی پھیلنے تک سحری کھانا درست ہے۔ ان دو مسئلوں کے لحاظ سے امام صاحب کی یہ دونوں باتیں بھی درست تھیں اور اعمش کا عمل بھی اپنے مذہب کے مطابق درست تھا۔

اگر اسی طرح امام کے حق میں بھی بہت سے مشہور مقولوں کی مرادیں تلاش کی جائیں تو ہاتھ آ سکتی ہیں اور اس کے بعد اصل بات بھی اتنی قابل اعتراض نہیں رہتی جیسا کہ الفاظ کی سطح سے معلوم ہوتی تھی۔ کتب تذکرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے محدثین کی ناراضگی کا بڑا سبب صرف اختلاف مذاق تھا۔ کہ اختلاف مسائل امام صاحب کے دور تک عام مذاق یہ تھا کہ مسائل کے متعلق بہت ہی کم بدیہات پر غور و خوض کیا جاتا تھا۔ صرف جتنی آمدہ واقعات کا شرعی حکم وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ معلوم کر لیا جاتا اس کے بعد مسئلہ کی فرضی صورتوں سے بحث کرنا ایک لایعنی مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ خطیب بغدادی نے یہاں ایک بہت دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔

نضر بن محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ قتادہ کوفہ آئے۔ وہ ابو بردہ کے گھر اترے۔ ایک دن باہر نکلے تو لوگوں کی بھیڑ ان کے ارد گرد جمع ہو گئی۔ قتادہ نے قسم کھا کر کہا آج جو شخص بھی حلال و حرام کا کوئی مسئلہ مجھ سے دریافت کرے گا

ﻟﻪ الروض الباسم ج۱ ص ۱۲۸ - ﻛﻪ دیکھو جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۰۶۔

میں اس کا ضرور جواب دوں گا۔ امام ابوحنیفہ کھڑے ہو گئے اور سوال کیا کہ اے ابوالخطاب (ان کی کنیت ہے) آپ اس عورت کے متعلق کیا فرماتے ہیں جس کا شوہر چند سال غائب رہا اس نے یقین کر کے کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے اپنا دوسرا نکاح کر لیا اس کے بعد اس کا پہلا شوہر بھی آ گیا اب آپ اس کے مہر کے متعلق فرمائیے کیا فرماتے ہیں اور جو بھیڑ ان کو گھیرے کھڑی تھی ان سے مخاطب ہو کر کہا اگر اس مسئلہ کے جواب میں یہ کوئی حدیث روایت کریں گے تو وہ غلط روایت کریں گے اور اگر اپنی رائے سے فتوے دیں گے تو وہ بھی غلط ہو گا۔ قتادہ بولے کیا خوب! کیا یہ واقعہ پیش آ چکا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا نہیں انھوں نے کہا پھر جو مسئلہ ابھی تک پیش نہیں آیا اس کا جواب مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو؟ امام صاحب نے فرمایا کہ ہم علماء پیش آنے سے قبل اس کے لئے تیاری کرتے ہیں تاکہ جب پیش آ جائے تو اس سے نجات کی راہ معلوم ہے۔ قتادہ ناراض ہو کر بولے خدا کی قسم کہ حلال و حرام کا کوئی مسئلہ اب میں تم سے بیان نہیں کروں گا۔ ہاں کچھ تفسیر کے متعلق پوچھنا ہو تو پوچھو اس پر امام صاحب نے ایک تفسیری سوال کیا قتادہ اس پر بھی لاجواب ہو گئے اور ناراض ہو گئے۔ آخرکار غصہ ہو کر اندر تشریف لے گئے۔ [1]

بہرحال سلف کے اس مذاق کی شہادت بہت سے واقعات سے ملتی ہے اور بے شبہ علم و تقویٰ کے اس دور میں مناسب بھی یہی تھا لیکن جب متعدد ہوا کہ علم کا بازار سرد ہو گیا، ورع و تقویٰ کی جگہ حیل و فریب نے لے لی اور ہر روز ہونے سے نئے واقعات پیش آنے لگیں تو اس سے پہلے کہ حیلہ شریعت میں دست اندازی شروع کر دیں یہی مقصود ہو گیا کہ شریعت کی ترتیب و تہذیب ایسے قاعدے و اصول ہو جائے جنھوں نے صحابہ و تابعین کے دور میں پرورش پائی ہو۔ انصاف کیجئے اگر قتادہ کے زمانہ کی یہ احتیاط اسی طرح آئندہ بھی برتی جاتی تو کیا شرعی مسائل اسی ضبط و وسعت کے ساتھ جمع ہو جاتے جیسا کہ اب جمع ہوئے۔ درحقیقت یہ امام صاحب کی بڑی انجام بینی اور امت کی بروقت دستگیری تھی کہ آپ نے ان کے سامنے شریعت کو ایک مرتب آئین بنا کر رکھ دیا۔ اسی لئے عبداللہ بن داؤد فرماتے تھے کہ امت پر آپ کا یہ حق ہے کہ وہ آپ کے لئے نمازوں کے بعد دعائیں کیا کریں۔ یہ خدمت اپنی جگہ خواہ کتنی ہی ضروری اور بروقت سہی مگر واقعہ یہ ہے کہ تھی محدثین کے مذاق کے خلاف۔ جس دور میں آثار و مرفوعات کو علیحدہ علیحدہ ضبط کرنا بھی عام و مشہور نہ ہوا تھا اس وقت میں صرف ابواب فقہیہ کی اونچی اونچی تعمیر کا کھڑا کر دینا کب ذہنی برداشت ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مسائل منصوصہ سے آپ ذرا قدم ادھر ادھر ہٹائیں گے تو آپ کو اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔ ایسے دور میں جہاں خاموشی کے ساتھ عمل کرنے کے علاوہ ایک قدم ادھر ادھر اٹھانا بھی قابل اعتراض نظر آتا ہو۔ احادیث و آیات کے اشارات، دلالات اور اقتضاء سے

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۸۔

جز لبعض مسائل اخذ کر کے ان کو احادیث سے ایک علیحدہ شکل دے دینا کب روا رکھا جا سکتا تھا۔ آخر جب آپ کا دور گزر گیا تو بعد کے علماء کے سامنے صرف پہلے علماء کی ان ناگواریوں کی نقل باقی رہ گئی جیسا استادی و شاگردی کے تعلقات نے حقائق کو ایسا پوشیدہ کر دیا کہ جس نے جہم کو کافر کہا تھا اسے خود جہمی اور کافر کہا گیا۔ جس نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کرنے کی وصیت کی تھی اسی پر کتاب و سنت کی مخالفت کرنے کی تہمت رکھی گئی۔ ہاں اگر خوش قسمتی سے ماحول کے تاثرات سے نکل کر کسی اللہ کے بندے نے تحقیق کی نظر ڈالی تو بہت جلد اس کی آنکھوں سے حجاب اٹھ گیا اور اس نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا ورنہ تاریخ ان ہی افواہوں پر چلتی رہی جو استادی و شاگردی کے اختلاف سے علماء کے حلقوں میں گشت لگا رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی ہی میں اس کے متعلق مختلف خیالات قائم ہو چکے ہیں اور فیصلہ کی راہ آسانی سے نہیں نکل سکتی بہت سی باتیں اس کی موافقت اور بہت سی اس کی مخالفت میں چلی ہیں تو اس کی وفات کے بعد جبکہ اس کی شخصیت بھی سامنے نہیں رہتی فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہوگا۔ اسماء الرجال کے فن میں تاریخ کی اس تاریکی کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ایک معتدل مزاج انسان کے لئے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل بھی نہیں رہا لیکن تاریخ کی جو نقول دو طرف میں مسخ ہو چکی ہیں اس سے ہر خیال کا انسان اگر مزاج کا معتدل نہیں ہو سکتا تو اپنے خیال کے موافق کام و اشاعت اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس لئے اسماء الرجال کی پیدا کردہ روشنی تاریخ کی پھیلائی ہوئی تاریکی کے دور کرنے میں بسا اوقات ناکام ہو کر رہ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب آپ امام صاحب پر جرح کرنے والوں کی صف پر نظر ڈالیں گے تو ان میں زیادہ تر آپ کو وہی افراد نظر آئیں گے جو آپ کے عہد حیات کے بعد پیدا ہوئے ہیں یا انہوں نے محدثین میں تعاصب سے زیادہ بہرہ نہیں صرف سنی سنائی خبریں ان تک پہنچیں اور وقتی ماحول کی وجہ سے باور کر لی گئیں۔ یوں تو امام صاحب کے تلامذہ کا دائرہ بھی کچھ مختصر نہ تھا ایک ابوالمحاسن شافعی کی تحریر کی بنا پر ان کی جو تعداد نام و نسب کی قید کے ساتھ ثابت ہوتی ہے وہ نو سو آٹھ تک پہنچتی ہے لیکن ان میں اکثر شاگرد سلسلہ فقہ سے
کاش آپ کا درس حدیث کا حلقہ بھی اسی پیمانہ پر قائم ہو جاتا تو شاید امام کی تاریخ کا نقشہ آج آپ کو کچھ دوسرا نظر آتا۔ چنانچہ جس حنفی نے بھی اس تسلسل کو قائم رکھا ہے اس کے ساتھ تاریخ زیادہ بے دردی کا سلوک نہیں کر سکی۔
ذیل کے ایک ہی واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ افواہ کیا ہوتی ہے اور جب حقیقت سامنے آجاتی ہے تو پھر اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے مجھ سے پوچھا اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی شخص ہے؟ جواب جس کی کنیت ابو حنیفہ ہے۔ یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور تین دن لگ کر امام صاحب کے عمدہ عمدہ مسائل انتخاب کئے۔ تیسرے دن اپنے ہاتھ میں کتاب لیکر آیا وہ اپنی مسجد کے

امام موصوف تھے انھوں نے دریافت کیا کہ کیا کتاب ہے جس نے ان کے حوالہ کردی جس میں وہ مسئلے بھی ان کی نظر سے گذرے جن کے شروع میں میں نے یہ لکھ دیا تھا "ابو نعمان" اس کے متعلق یہ فرماتے ہیں۔ اذان ہوئے کر جب کھڑے ہوئے وہ کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ چکے تو کتاب اٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لی، اور اقامت کہہ کر نماز پڑھی پھر نکال لی اور پڑھنا شروع کی یہاں تک کہ ختم کر دی پھر مجھ سے پوچھا اے خراسانی یہ نعمان کون شخص ہیں؟ میں نے عرض کیا ایک شیخ ہیں ان سے عراق میں میری ملاقات ہوئی تھی فرمایا یہ تو بڑے پایہ کے شیخ ہیں جاؤ ان سے اور علم سیکھو۔ اب میں نے کہا یہی تو وہی ابو حنیفہ ہیں جن کے پاس جانے سے بھی آپ نے مجھے منع کیا تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام صاحب کے متعلق انھوں نے کیا رکھا تھا اور جب حقیقت سامنے آئی تو بات کیا نکلی اس لئے قاضی شہادات اور قضات سے آنکھیں بند کر کے صرف کالے حروف سے تاریخ مرتب کرنا کوئی صحیح عمل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انسان میں حسد و تنافس کا بھی ایک کمزور پہلو موجود ہے اس کی بدولت بہت سے تاریخی حقائق پوشیدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سو اتفاق سے یہاں یہ سب باتیں جمع ہو گئی ہیں۔

عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں: میں نے حسن بن عمارہ کو امام ابو حنیفہ کی رکاب پکڑے ہوئے دیکھا۔ امام صاحب کی توصیف کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ وہ آپ کے متعلق صرف اندازہ و حسد سے گفتگو کرتے ہیں۔ حافظ ابن ابی داؤد کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ کے متعلق جو گفتگو کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں: یا حاسد یا ان کی شان سے ناواقف، میرے نزدیک ان دونوں میں ناواقف شخص بہتر ہے۔ وکیع کہتے ہیں کہ میں امام صاحب کے پاس آیا دیکھا تو سر جھکائے کچھ فکرمند سے بیٹھے ہیں۔ مجھ سے پوچھا کدھر سے آرہے ہو میں نے کہا قاضی شریک کے پاس سے۔ آپ نے سر اٹھا کر یہ اشعار پڑھے۔

إن يحسدوني فإني غير لائمهم — اگر وہ لوگ مجھ پر حسد کرتے ہیں تو کریں میں تو انھیں کچھ ملامت نہیں کرتا۔

قبلي من الناس أهل الفضل قد حسدوا — کیونکہ اہل فضل پر مجھ سے پہلے بھی لوگ حسد کرتے آئے ہیں۔

فدام لي ولهم ما بي وما بهم — میرا اور ان کا یہی شیوہ رہے گا۔

ومات أكثرنا غيظا بما يجد — اور ہم میں اکثر لوگ حسد کر کے مر گئے ہیں۔

وکیع کہتے ہیں شاید امام صاحب کو ان کی طرف سے کوئی بات پہنچی ہوگی جس سے انھوں نے یہ اشعار پڑھے۔

جعفر بن الحسن ابو عمرو کے شیخ کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہ کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ فرمایا بخش دیا۔ میں نے کہا علم کے طفیل میں؟ کہا مفتی فتوی کی تو مفتی کے لئے بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ میں نے کہا پھر؟ فرمایا لوگوں کی ان ناحق نکتہ چینیوں کے طفیل میں جو لوگ مجھ پر کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مجھ میں نہ تھیں (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۲۰)

امام مالک بن انس بن مالکؒ

ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ

آپ امت میں امام دار الہجرت کے لقب سے مشہور ہیں۔ دراز قد، فربہ جسم، زردی مائل سفید رنگ، کشادہ چشم، بلند ناک اور خوبصورت تھے۔ آپ کی پیشانی کی طرف سر پر بال کم تھے۔ ریش مبارک دراز اور گھنی تھی، مونچھ منڈانا کو مثلہ فرماتے تھے۔ صرف لب کا بالائی حصہ ترشواتے تھے اور دونوں طرف کے بال چھوڑتے تھے اس بارے میں حضرت عمرؓ کی تقلید فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں متفکر ہوتے تو اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مونچھوں کے دو طرفہ بال دراز تھے۔ آپ خوش پوشاک تھے۔ آپ کا نسب غیمان بن خثیل پر پہنچتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اس کو بصیغہ تصغیر خا معجمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور دار قطنی نے جیم کے ساتھ۔ خثیل عمرو بن الحارث کے فرزند تھے اور حارث کا لقب ذو اصبح تھا اسی کے لحاظ سے آپ کو اصبحی کہتے ہیں۔ ؎

آپ تبع تابعین کے طبقہ میں تھے۔ آپ کے شیوخ اور تلامذہ کا کیا پوچھنا، نووی تہذیب الاسماء میں لکھتے ہیں کہ امام کے شیوخ کی تعداد نو سو تک پہنچتی ہے، تین سو تابعین اور چھ سو تبع تابعین تھے۔ سفیانؒ فرماتے تھے رجال کی چھان بین کرنے والا مالکؒ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ مالکؒ کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے میں شک پڑ جاتا تو پوری کی پوری ترک کر دیتے تھے۔ وہب بن خالد کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان احادیث نبویہ کے بارے میں قابل اطمینان شخص مالک سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ترمذی صحیح اسناد کے ساتھ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دور دراز کا سفر کریں گے لیکن عالم مدینہ سے بڑھ کر عالم انہیں کہیں میسر نہ آئے گا۔ سفیان بن عیینہ کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالکؒ تھے۔ خلف بن عمر کہتے ہیں میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ مدینہ کے قاری ابن کثیر نے امام مالکؒ کو ایک پرچہ دیا، امام نے اسے پڑھا اور اپنی جا نماز کے نیچے رکھ لیا۔ جب وہ کھڑے ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی چلنے لگا، فرمایا بیٹھ جاؤ اور وہ پرچہ مجھے دے دیا۔ دیکھا جس کا اس میں یہ خواب لکھا ہوا تھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع ہیں اور آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے اس منبر کے نیچے ایک بہت بڑا خزانہ دفن کیا ہے اور مالکؒ سے کہہ دیا ہے وہ تم میں تقسیم کر دیں گے اس لئے مالکؒ کے پاس جاؤ۔ لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے جاؤ مالک تقسیم کریں گے یا نہیں، کسی نے جواب دیا جس بات کو مالک کو حکم دیا گیا ہے وہ ضرور اسے پورا کریں گے۔ اس خواب سے مالک پر گریہ طاری ہو گیا، جو اتنا روئے کہ میں ان کو اسی حالت میں چھوڑ آیا۔

؎ بستان المحدثین

عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ ہم مالک کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اور بولا میں چھ ماہ کی مسافت سے ایک مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں فرمایا پوچھو کیا ہے؟ اس نے بیان کیا آپ نے فرمایا مجھے اچھی طرح معلوم نہیں وہ حیران ہو کر بولا پھر اپنے شہر والوں سے کیا کہوں۔ فرمایا کہو کہ مالک نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ آپ کی ہیبت سے رعب چھا گیا۔ مالک گھر میں کیا کرتے ہیں فرمایا تلاوت قرآن۔ آپ کی محفل ایسی پر رعب تھی کہ بادشاہوں اور سلاطین کو تاب سخن نہ تھی ایک خاموشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ ۱

محدثین کے نزدیک اصح الاسانید میں بحث ہے۔ مشہور ہے کہ جس کے راوی مالک نافع سے اور نافع ابن عمرؓ سے ہوں وہ اسناد سب سے صحیح ہے۔ امام زہری جو آپ کے شیوخ میں شامل تھے وہ بھی آپ سے مستفید تھے۔ لیث ابن مبارک، امام شافعی اور امام محمد جیسے محدث آپ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل تھے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے اگر مالک و سفیان نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ آپ کے حفظ کا یہ عالم تھا جو بات ایک مرتبہ سن لیتے پھر کبھی نہ بھولتے حدیث روایت کرنے کے لئے جب بیٹھتے تو پہلے وضو کرتے اچھی پوشاک پہنتے خوشبو لگاتے ریش مبارک میں کنگھی کرتے لوگوں نے اس تجمل کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی توقیر کرتا ہوں۔

عبداللہ بن المبارک روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام مالک نے درس حدیث شروع کیا تو اثنائے درس میں آپ کا رنگ بار بار متغیر ہو جاتا تھا مگر آپ نے درس حدیث بند کیا نہ آپ سے حدیث کی روایت کرنے میں کسی قسم کی لغزش واقع ہوئی۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے مزاج مبارک دریافت کیا تو فرمایا کہ اثنائے درس میں تقریباً دس بار بچھو نے ڈنک مارا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ صبر اپنی شجاعت و استقامت جتانے کے لئے نہیں کیا بلکہ صرف حدیث پیغمبر کی تعظیم کے لئے کیا ہے۔ ۲

یافعی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ امام مالک کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے عشق تھا حتیٰ کہ آپ اپنے ضعف و پیری کے باوجود مدینے میں سوار نہ ہوتے اور فرمایا کرتے تھے کہ جس شہر میں آپ کا جسم مبارک مدفون ہوا اس میں میں ہرگز سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ ہارون رشید مدینہ منورہ آیا اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ امام مالک نے کتاب موطا تالیف فرمائی ہے اور آپ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ہارون الرشید نے جعفر برمکی کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور سلام عرض کیا اور یہ عرض کرے کہ آپ موطا کو لے کر تشریف لائیں جعفر برمکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا امیر المومنین کا سلام پہنچا کر اس کی درخواست پیش کی۔ امام نے جواب دیا امیر سے سلام کہنا اور کہنا کہ علم خود کسی کے پاس نہیں آیا کرتا لوگ اس کے پاس آیا کرتے ہیں۔ جعفر واپس آیا اور امام مالک کا فرمان عرض کر دیا تھا کہ ہیں امام عالی مقام ہی خود تشریف لے گئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ رشید نے کہا میں نے آپ کے پاس ایک پیغام بھیجا تھا آپ نے میرا حکم نہیں مانا۔

ـــــ ۱ تہذیب ... ۲ شذرات الذہب ...

امام مالکؒ نے سند کے ساتھ وہ حدیث سنائی جس میں زید فرماتے ہیں کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا زانوئے مبارک میرے زانو پر تھا صرف کلمہ غیر اولی الضرر نازل ہوا تھا کہ ان کے وزن سے زانو چور ہو جانے کے قریب ہو گیا
تھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جس قرآن کا ایک حرف حضرت جبرئیل علیہ السلام پچاس ہزار سال کی مسافت سے لے کر
آئے ہوں کیا میرے لئے زیبا نہیں کہ میں بھی اس کی عزت و احترام کروں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت و وجاہت
سے نوازا ہے اگر سب سے پہلے آپ ہی اس علم کی تخریب کریں گے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی آپ کی عزت و جاہ
ذرہ ختم کر دے۔ یہ سن کر وہ مؤطا سننے کے لئے آپ کے ساتھ ہو گیا۔ امام مالکؒ نے اپنے ساتھ اس کو مسند پر بٹھالیا۔ جب مؤطا
پڑھنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا آپ ہی مجھے پڑھ کر سنائیے۔ امام نے فرمایا عرصہ ہو گیا میں خود پڑھ کر سنانا چھوڑ چکا ہوں
اس نے کہا اچھا تو اور لوگوں کو باہر نکال دیجئے تاکہ میں خود آپ کو سنا دوں۔ امام نے فرمایا علم کی خاصیت یہ ہے
کہ اگر خاص لوگوں کی رعایت سے عام لوگوں کو اس سے محروم کر دیا جاتا ہے تو پھر خواص کو بھی اس سے نفع نہیں ہوتا۔
اس کے بعد آپ نے معن بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ وہ قرات شروع کریں۔ جب انہوں نے قرات شروع کی تو امام نے
ہارون سے کہا اے امیر المؤمنین اس شہر میں اہل علم کا دستور ہے کہ وہ علم کے لئے تواضع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہارون یہ
سن کر مسند سے اتر آیا اور سامنے آ بیٹھا اور مؤطا سننے لگا۔

ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان سے کسی نے شکایت کر دی کہ امام صاحب آپ کی خلافت کے مخالف ہیں۔ اس نے آپ
کے کوڑے لگانے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد آپ کی عزت اور بڑھ گئی گویا یہ کوڑے ... آپ کا زیور بن گئے۔ منصور
جب مدینہ آیا تو اس نے انتقام لینے کا ارادہ کیا امام مالکؒ نے قسم کھا کر فرمایا میں نے اس کا ایک ایک کوڑا آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی خاطر معاف کر چکا ہوں۔ مورخین کہتے ہیں کہ یہ سزا آپ کو اس جرم میں دی
گئی تھی کہ آپ نے کوئی فتویٰ ان کی غرض کے موافق نہیں دیا تھا۔ [1]

ذہبی کا بیان ہے کہ پانچ باتیں جیسی امام مالکؒ کے حق میں جمع ہو گئیں میرے علم میں کسی اور شخص میں جمع نہیں
ہوئیں (۱) اتنی درازی عمر اور ایسی عالی سند۔ (۲) ایسی عمدہ فہم اور اتنا وسیع علم (۳) آپ کے حجت اور صحیح الروایۃ
ہونے پر ائمہ کا اتفاق۔ (۴) آپ کی عدالت، اتباع سنت اور دینداری پر سب کا اتفاق (۵) فقہ اور فتویٰ میں
آپ کی مسلّم مہارت۔ [2]

اس اعتبار سے صرف ایک آپ ہی ہیں جن کی تصنیف فن حدیث کے متعلق امت کے ہاتھ میں موجود ہے بقیہ جو تصانیف
حدیث ائمہ کی طرف منسوب ہیں وہ ان کے شاگردوں کی جمع کردہ ہیں جیسے مسند امام احمد گو اس کی تصحیح خود امام موصوف

---

[1] حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی مسافت کا پچاس ہزار سال کی مدت ہونا ائمہ کے
درمیان بھی مشہور تھا۔ [2] تذکرات، ذہبی۔ [3] تذکرۃ الحفاظ

گئی ہے۔ مگر اس کی موجودہ ترتیب امام کی نہیں ہے۔[1] ہارون الرشید کے نام بیس صفحات پر آپ کا جو خط ہے مقالید میں ہے افسوس ہے کہ یہاں اس کا خلاصہ بھی درج نہیں کیا جا سکتا اور جو خود ہی مختصر ہو اس کا خلاصہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں آپ نے نصیحت آمیز کلمات کے نقل کرتے ہیں کہ بیکار اور غلط باتوں کے پیچھے پڑنا بربادی کی علامات ہیں زبان پر لانا سچائی سے دوری کی علامت ہے۔ اگر انسان کا دین و مروت بگڑ گئے تو دنیا بہت بھی جمع ہو جائے پھر بھی کس کام کی ہے۔ ابن وہب کہتے ہیں کہ مالک کہا کرتے تھے کہ علم تنزل پذیر ہو گیا ہے کیونکہ نبیوں اور انبیاء اور کتب سماویہ کے نزول کے بعد گھٹا ہی کرتا ہے۔ سلف میں علم ہدایت کے علوم ہی کا نام تھا۔ اس لحاظ سے اس مقولے کے صدق میں کیا تردد ہے۔[2]

عتبی نقل کرتے ہیں کہ میں مرض الموت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اسلام کر کے بیٹھ گیا دیکھا تو امام رو رہے تھے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کیسے نہ روؤں مجھ سے زیادہ رونے کا کون مستحق ہو سکتا ہے میری آرزو ہے کہ جو مسئلہ بھی میں نے اپنی رائے سے بتلایا ہر مسئلہ کے بدلے میرے ایک کوڑا مارا جاتا۔ کاش میں نے اپنی رائے کا ایک مسئلہ بھی نہ بتلایا ہوتا مجھے گنجائش تھی کہ جن سوالات کے جواب مجھ سے پہلے دیے جا چکے تھے ان ہی پر سکوت کر لیتا۔ ماہ ربیع الاول میں آپ کا انتقال ہوا اور جس بستی میں عمر گزاری تھی آخر وہیں کی ہو رہی یعنی دیار حبیب کی خاک پاک نے ہمیشہ کے لئے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیا آپ سرزمین مدینہ ہی میں آسودہ خواب ہیں۔

فقہ مالکی امام مالک کی فقہ میں اہل مدینہ کے تعامل کو خاص اہمیت حاصل ہے اُن کے نزدیک مدینہ جو مہبط وحی ہے، اس کا تعامل حجت ہونا چاہیے۔ حافظ ابو عمر ابن عبدالبر ہی سے نقل کرتے ہیں کہ امام مالک جب یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کا عمل اسی مسئلہ پر دیکھا ہے تو اس سے ان کی مراد ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن اور ابن ہرمز ہوتے ہیں۔[3]

فقہ مالکی کا زیادہ چرچا اہل مغرب اور اندلس میں ہے۔ ابن خلدون اس کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ اہل مغرب اور اندلس کا سفر اکثر حجاز ہی کی جانب ہوا کرتا تھا اس زمانہ میں مدینہ منبع علم تھا گو وہ بن رہا تھا یہیں سے نکل کر علم عراق پہنچا ہے اس کے راستہ میں عراق نہ پڑتا تھا اس لئے ان کے علم کا ماخذ صرف علمائے مدینہ تھے علمائے مدینہ میں امام مالک کا رتبہ معلوم ہے اس لئے مغرب اور اندلس کے اصحاب کا علم امام مالک اور ان کے بعد ان کے تلامذہ میں منحصر ہو گیا تھا انہی کے وہ مقلد تھے اور جن کا علم انہیں نہیں پہنچا ان کے وہ مقلد بھی نہیں تھے۔

---

[1] بستان المحدثین۔ [2] تذکرہ۔ [3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

الشافعیؒ الامام

ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ

آپ کی کنیت ابو عبد اللہ اسم مبارک محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع ہے۔ نسباً آپ قریشی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ عبد مناف میں آپ کا نسب مل جاتا ہے۔

بیت المقدس سے دو مرحلے کے فاصلہ پر غزہ یا عسقلان میں آپ کی ولادت ہوئی۔ دو سال کی عمر میں آپ کے والدین آپ کو مکہ معظمہ لے آئے تھے۔ نہایت تنگدستی میں آپ کی پرورش ہوئی یہاں تک کہ یادداشتوں کے لکھنے کے لئے جب آپ کو کاغذ بھی میسر نہ آتا تو جانوروں کی ہڈیوں پر لکھ لیتے۔ آپ کی عمر کا ابتدائی حصہ شعر، تاریخ، ادب وغیرہ کی تحصیل میں گذرا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کہیں جا رہا تھا کہ پشت کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی "علیک بالفقہ" فقہ سیکھو۔ اسی زمانہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مسلم بن خالد زنجی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا صاحبزادے کس ملک کے باشندہ ہو میں نے کہا مکہ معظمہ۔ فرمایا مکان کس محلہ میں ہے؟ میں نے کہا خیف میں۔ پھر پوچھا کس قبیلہ کے ہو میں نے کہا عبد مناف کی اولاد۔ فرمایا بہت خوب بہت خوب۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دونوں جہان کا شرف بخشا ہے۔ اچھا یہ تھا کہ اپنی اس فہم و ذکاوت کو علم فقہ میں خرچ کرتے۔ یہ سن کر آپ نے ان کی شاگردی قبول کی ان کے بعد پھر امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ موطا حفظ کر چکے تھے اور آپ کی عمر کل تیرہ سال کی تھی۔ موطا میں شریک ہوگئے جب قرأت کا وقت آیا تو آپ نے بر زبان قرأت شروع کی۔ امام مالکؒ کو اس پر تعجب ہوا اور آپ کی قرأت کو بہت پسند فرمایا جب یہ ختم ہونے کا ارادہ کرنے لگے تو فرمایا اور پڑھو اور پڑھو۔ امام مالکؒ نے ان کے حق میں فرمایا تھا کہ تم تقویٰ اپنا شعار بنانا ایک زمانہ آئے گا کہ تم بڑے شخص ہوگے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں ایک نور ودیعت رکھا ہے معصیت کر کے اسے ضائع نہ کرنا اس کے بعد آپ عراق تشریف لے گئے۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ کے شیخ مسلم بن خالد نے آپ کو فتویٰ نویسی کی اجازت دیدی تھی۔ حدیث، تفسیر، فقہ ادب و عربیت کی جملہ خصوصیات کے ساتھ آپ بڑے تیر انداز بھی تھے دس میں ایک تیر بھی نشانہ سے خطا نہ کرتا تھا۔

نووی مقدمہ شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام عبد الرحمن بن مہدی کے فرمانے پر امام شافعیؒ نے اصول فقہ میں الرسالہ تصنیف فرمایا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کو اصول فقہ کا مؤسس کہتے ہیں۔

فقہ میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ صحیح احادیث کو لیتے۔ ضعیف کو ترک کر دیتے تھے کسی اور مذہب میں فقہ کی تعمیر اس معیار پر نہیں کی گئی۔ عبادات کے مسائل میں آپ احتیاط کا پہلو اختیار فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی تصنیف کتاب الام اور الرسالہ دونوں طبع ہو کر آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

ان تمام فضائل و کمالات کے باوجود حیرت ہوتی ہے کہ آپ بھی قائل نہیں رہے حتیٰ کہ یحییٰ بن معین جیسے شخص سے آپ کے
متعلق ایسے کلمات منقول ہیں جن کو سن کر آخرکار امام احمد کو کہنا پڑا۔ ومن این یعرف یحییٰ الشافعی .. ومن جہل شیئا عاداہ
بھلا یحییٰ بن معین امام شافعیؒ کو کیا جانیں۔ اور جو شخص کسی کو جانتا نہیں وہ اس سے عداوت رکھتا ہے حافظ ابن عبد البرؒ
لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن معین سے متعدد طریقوں سے ثابت ہے کہ وہ امام شافعیؒ پر کلام کرتے تھے یہاں تک کہ امام احمدؒ نے
ان کو اس سے روکا اور فرمایا کہ تمہاری ان دو آنکھوں نے بھی اس جیسا شخص نہ دیکھا ہوگا۔

تمام علم و فضل کے ساتھ سخی بھی درجہ کے تھے حمیدی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ صنعاء سے تشریف لائے تھے
اس وقت آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ آپ کا خیمہ مکہ کے باہر لگا ہوا تھا لوگ ملاقات کے لئے آتے تھے اور
آپ ان کو دینار تقسیم کرتے یہاں تک کہ بیٹھے بیٹھے آپ نے وہ تمام رقم لوگوں پر تقسیم کر ڈالی۔

ابن خلکان ربیع بن سلیمان مرادی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے وفات کے بعد امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا
ان سے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا امام شافعیؒ نے فرمایا مجھے ایک سنہری کرسی پر بٹھا کر میرے اوپر تازہ موتیوں
کی بکھیر کی۔ ۱۹۵ھ میں بغداد گئے یہ دو سال وہاں قیام فرمایا پھر مکہ کرمہ آئے ۱۹۸ھ میں پھر بغداد تشریف لے گئے۔
چند ماہ قیام فرما کر ۱۹۹ھ میں مصر گئے پھر وفات تک مصر ہی میں رہے۔ جمعہ کے دن انتقال ہوا اور بعد عصر مدفون ہوئے
قبر مبارک قرافہ صغریٰ میں مخلوق خدا کے لئے زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

ابو عبداللہ احمد بن حنبل الشیبانی الامام

ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ

ابن خلکان لکھتا ہے کہ آپ کی پیدائش بغداد میں ہوئی اور وہیں آپ کی وفات بھی ہوئی
آپ کا مزار مبارک باب حرب میں واقع ہے یہ جگہ حرب بن عبداللہ کی طرف منسوب ہے عباس بن محمد دوری
لکھتے ہیں کہ آپ عرب کے مشہور خاندان بنی ذہل بن شیبان ابن ثعلبہ سے متعلق تھے۔ خطیب بغدادی لکھتا ہے یہ عباس
دوری کی غلطی ہے۔ آپ کا خاندان بنی شیبان بن ذہل بن ثعلبہ تھا ... وہ ذہل بن ثعلبہ رشتہ میں
ذہل بن شیبان کا چچا ہے۔ آپ کے دو بیٹے تھے صالح اور عبداللہ دوسرے بیٹے کے نام پر ابو عبداللہ آپ کی کنیت
تھی۔ آپ نہایت خوبصورت تھے قد میانہ تھا۔ ہلکا سرخ خضاب لگاتے تھے ریش مبارک میں
کچھ بال سیاہ تھے۔ سفید رنگ کے موٹے کپڑے پہنتے تھے۔ آپ کا عام لباس ازار اور عمامہ تھا اپنے زمانہ کے متقی
امام تھے۔ قتیبہ آپ کو اور اسحاق بن راہویہ کو امام الدنیا کہا کرتے تھے۔ اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام احمد
اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان اس کی حجت ہیں۔ علی بن مدینی فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

دین کو دو شخصوں کے ذریعہ سے عزت نصیب فرمائی ہے جیسا کہ کوئی اور شخص نہیں معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شخص جنہیں ارتداد کے وقت ابو بکر صدیق تھے اور دوسرے فتنہ خلق قرآن کے زمانہ میں امام احمد تھے۔ اسمٰعیل بن خلیل فرماتے تھے کہ اگر امام احمد بنی اسرائیل میں پیدا ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے معجزوں میں ایک معجزہ شمار ہوتے۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں امام احمدؒ نے کوفہ بصرہ حرمین شریفین یمن اور شام وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی نے امام شافعی امام ابو یوسف وکیع بن الجراح یحییٰ بن ابی زائدہ وغیرہم کو آپ کے اساتذہ میں اور ائمہ ستہ میں بخاری مسلم ابو داؤد وغیرہ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ ابن خلکان لکھتا ہے کہ آپ امام شافعیؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے جب تک امام شافعیؒ بغداد میں رہے آپ ان کی خدمت سے کبھی جدا نہ ہوئے جب امام شافعیؒ بغداد چھوڑ کر مصر جانے لگے تو چلتے وقت فرمایا میں نے بغداد میں ان جیسا متقی اور فقیہ شخص کسی اور کو نہیں چھوڑا۔

ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو مجھ سے فرمایا میرا ایک خط امام احمدؒ کو پہنچا دو اور اس کا جواب مجھے لا دو۔ میں خط لیکر بغداد پہنچا صبح کی نماز میں امام احمدؒ سے ملاقات ہوئی جب محراب سے اٹھے تو میں نے خط پیش کیا اور عرض کیا یہ امام شافعیؒ کا خط ہے۔ امام احمدؒ نے دریافت فرمایا تم نے اس کو دیکھا تو میں نے عرض کیا نہیں اس کے بعد آپ نے مہر توڑی اور پڑھا تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں میں نے پوچھا اے ابو عبد اللہ خیر ہے خط میں کیا لکھا ہے فرمایا لکھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا فرماتے تھے کہ ابو عبد اللہ کو میرا سلام کہہ دو اور کہو کہ اس کا امتحان ہوگا اور خلق قرآن کے قائل ہونے پر مجبور کیا جائے گا مگر اس کو منظور نہ کریں اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں تا قیامت ان کا علم روشن رکھے گا۔ ربیع کہتے ہیں میں نے کہا اے ابو عبد اللہ بشارت مبارک ہو تو امام احمدؒ نے اپنی دو قمیصوں میں سے نیچے والی قمیص جو جسم سے متصل تھی اتار کر مجھے انعام میں دیدی میں اس کا جواب لیکر مصر آیا اور امام شافعیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امام شافعیؒ نے دریافت فرمایا اور خوشخبری کے صلہ میں کیا انعام ملا ہے؟ میں نے کہا امام کا اتارا ہوا کرتہ ہے فرمایا کہ میں تکلیف تو نہیں دے سکتا کہ وہ قمیص ہی مجھے دیدو البتہ مہربانی کرو اس کو تھوڑے سے پانی میں بھگو کر نچوڑ دو اور وہ پانی مجھے دیدو تاکہ میں اسی کو تبرک رکھ لوں۔ (طبقات)

اس واقعہ سے امام احمدؒ کی منقبت کے علاوہ یہ بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ پہلے محدثین و علماء کے درمیان کیسے تعلقات ہوتے تھے ان کی جو کچھ جنگ تھی وہ صرف ایک مسئلہ کے نام پر تھی۔ اس امتحان کی مفصل روداد شیخ تاج الدین سبکی نے طبقات شافعیہ میں بیان کی ہے۔ قتیبہ بن سعید امام احمد اور وکیع کے ایک مذاکرہ کا حال نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام احمد و وکیع نماز پڑھ کر کھڑے ہوگئے اور سفیان کی جو روایات ہیں ان کا تذکرہ ہونے لگا۔ دونوں آپس میں مذاکرہ کرتے رہے کہ تمام رات یونہی کھڑے کھڑے کٹ گئی اور کسی کو خبر نہ ہوئی

صبح ہونے لگی تو آپ کی باندی حاضر ہوئی اور کہا کہ زہرہ ستارہ نکل چکا ہے۔

آپ کی مشہور تصنیفات میں مسند احمد سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ حنبل بن اسحاق آپ کے بھتیجے کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے ہم سے کہا ہے کہ یہ کتاب میں نے سات لاکھ سے زیادہ احادیث کے ذخیرے سے منتخب کی ہے اور اس لئے منتخب کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے لئے ایک معیار بن جائے جو حدیث اس میں مل جائے اسے حجت سمجھا جائے جو نہ ملے اسے حجت نہ سمجھا جائے۔ ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کو دس لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد جب آپ کی کتابوں کا تخمینہ لگایا گیا تو بارہ اونٹوں کے بوجھ سے زیادہ تھا اور وہ سب آپ کو زبانی محفوظ تھیں جمعہ کے دن آپ کا انتقال ہوا آپ کے جنازہ پر نمازیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ متوکل بادشاہ کے حکم سے جب نمازیوں کے قیام کی جگہ ناپی گئی تو پیمائش کے حساب سے پچیس لاکھ کے قریب آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔ ورکانی امام احمدؒ کا پڑوسی بیان کرتا ہے کہ آپ کی وفات کے دن بیس ہزار یہود و نصاریٰ اور مجوسی مسلمان ہوئے تھے لیکن ذہبی نے اس حکایت کو تسلیم نہیں کیا اور منکر کہا ہے۔ احمد بن محمد کندی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا اے ابو عبداللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا فرمایا بخش دیا پھر کہا اے احمد ہمارے ہی لئے تم نے کوڑے کھائے تھے۔ میں نے عرض کیا اے پروردگار جی ہاں۔ ارشاد ہوا تو اے احمد یہ میرا چہرہ ہے دیکھ لے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں نے بھی اس کی راہ میں مصیبتیں جھیلی ہیں ان کے نامۂ اعمال میں یہی ان کا سب سے زیادہ وزنی عمل ثابت ہوا ہے چنانچہ اسی قسم کا ایک خواب آپ امام اعظمؒ کے حالات میں بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔

فقہ حنبلی کے پانچ بنیادی اصول

(۱) جب کسی مسئلے کے متعلق صریح نص موجود ہو تو پھر کسی کے اختلاف کی پرواہ نہ کی جائے اسی لئے امام احمدؒ کے نزدیک مبتوتہ عورت کے لئے نفقہ و سکنیٰ دونوں واجب نہیں کیونکہ اس بارے میں فاطمہ بنت قیس کی صریح حدیث موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ اپنے زمانہ میں ان کے قول کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن امام احمدؒ نے حدیث کی صحت کے بعد ان کے خلاف کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اسی طرح ان کا مذہب ہے کہ حج کو فسخ کرکے عمرہ بنایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اکثر صحابہ اس کے منکر تھے لیکن چونکہ اس کے متعلق حدیث ثابت ہو چکی ہے اس لئے یہاں بھی امام نے کسی کے اختلاف کی رعایت نہیں کی۔

(۲) جب کسی مسئلہ میں صحابی کا فتویٰ معلوم ہو جائے اور اس کے مخالف کسی صحابی کا قول معلوم نہ ہو سکے تو پھر وہی مختار ہونا چاہئے۔ ایسے مقام پر امام احمد لفظ اجماع کا استعمال نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ فرماتے تھے کہ مجھے اس کے خلاف کسی کا قول معلوم نہیں۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک فتاویٰ صحابہ کی اہمیت حدیث مرسل سے بھی زیادہ تھی۔ اسحاق بن ابراہیم نے امام احمد سے پوچھا آپ کو حدیث مرسل زیادہ

سبب ہے یا صحابی کا صحیح اثر، فرد یا صحابی کا صحیح اثر

(۳) جس مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو اس میں ان میں کا قول کتاب و سنت کے قریب تر نظر آئے اسی کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ اگر ترجیح ثابت نہ ہو سکے تو پھر صحابہ کے مختلف اقوال نقل کر دیئے جائیں یا کسی ایک قول پر جزم کر لیا جائے۔

(۴) اگر کسی مسئلہ میں ضعیف یا مرسل حدیث موجود ہو تو اس کو بھی قیاس پر مقدم رکھا جائے گا بشرطیکہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی اور حدیث یا قول صحابی یا اجماع مخالف نہ ہو۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہاں ضعیف سے منکر یا باطل مراد نہیں بلکہ حسن وغیرہ مراد ہے۔ ان کے نزدیک حدیث کی دو ہی قسمیں تھیں صحیح و ضعیف اور حدیث حسن بھی ضعیف میں داخل تھی۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ اصول اجمالی طور پر دوسرے ائمہ کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ دیکھئے امام ابو حنیفہؒ نے نماز میں قہقہہ کو نواقض وضو میں شمار کیا ہے حالانکہ وہ قیاس کے مخالف ہے لیکن اس کے متعلق ایک ضعیف حدیث موجود ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں قیاس ترک کر دیا گیا ہے۔

(۵) قیاس اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب کسی مسئلہ کے متعلق منقول دلائل نہ مل سکے اور وہ بھی بقدر ضرورت۔

ضرورت تھی کہ ان اصول خمسہ کی تشریح کی جاتی اس کے بعد امام صاحب کے اصول سے مقابلہ کر کے یہ بتایا جاتا کہ کن کن گوشوں میں ان کو اختلاف ہے اور کیوں ہے اور دلائل کی روشنی میں اقرب کیا ہے مگر اس مختصر تذکرہ میں یہ مباحث کب سما سکتے ہیں پھر ائمہ کے اصولوں پر تبصرہ کرنا مجھ جیسے بے بضاعت کا کام نہیں علماء کی طرف مراجعت کی جائے۔

الامام القاضی یعقوب ابو یوسفؒ

ولادت ۱۱۳ھ وفات ۱۸۲ھ

کوفہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک غریب آدمی تھے۔ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ ان کے والد نے ان کو امام صاحب کی خدمت میں حاضری سے روکا اور کہا ابو حنیفہؒ تو صاحب استطاعت شخص ہیں اور تم تنگدست ہیں۔ مگر انھوں نے امام صاحب کی خدمت میں جانا چھوڑ دیا۔ ادھر امام صاحب نے جب مجھے نہ دیکھا تو میری تلاش شروع کی۔ میں پھر حاضر ہونے لگا۔ غیر حاضری کے بعد جب آپ کے درس میں پہلے دن پہنچا تو آپ نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا معاشی ضروریات اور والد کا حکم مانع ہوا۔ یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا جب لوگ رخصت ہو گئے تو آپ نے مجھے ایک تھیلی عنایت فرمائی اور فرمایا اسے خرچ کرو اور درس میں پابندی سے آیا کرو جب صرف ہو جائے مجھ کو کہنا۔ میں نے دیکھا تو اس میں سو درہم تھے اس کے بعد ہمیشہ کچھ دنوں بعد ہی آپ مجھے دیتے رہے مجھے خود کبھی یہ کہنے کی نوبت نہیں آئی کہ میرے پاس خرچ نہیں رہا ہے۔ ہلال بن یحییٰؒ فرماتے ہیں تفسیر و مغازی اور تاریخ عرب کے حافظ تھے اور فقہ تو آپ کے علم کا ایک ادنیٰ جزو تھا۔

۱؎ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۰ تا ۳۱۔

حافظ ذہبی نے آپ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور منجملہ دیگر ائمہ حدیث کے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین
کو آپ کے تلامذہ میں لکھا ہے۔ علی بن جعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو یوسف کو فرماتے سنا ہے جو شخص یہ کہے کہ میرا ایمان
جبرئیل علیہ السلام جیسا ایمان ہے وہ بدعتی ہے۔ اور آپ کے پرحکمت مقولوں میں یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ تھوڑا علم بھی
اس وقت تک تم کو نہیں آ سکتا جب تک تم اپنے آپ کو پورا اس کے حوالہ نہ کردو۔ بشر بن ولید کہتے ہیں میں نے
ابو یوسف سے سنا ہے، جو آدمی نجومیوں کے پیچھے پڑا وہ جھوٹ میں مبتلا ہوا۔ جس نے کیمیا کے ذریعے مال طلب
کیا وہ فقیر ہو گیا، جس نے کلام کے ذریعے دین کی تحقیق و عمل کی کوشش کی وہ زندیق ہوا۔ آپ اپنے زمانۂ
قضاء میں دو دو سو حدیثیں یومیہ املا فرمایا کرتے تھے۔ ابن عساکر کہتے ہیں کہ حافظ ترمذی نے انس بن مالک کی حدیث ابو یوسف عن
ابو حنیفہ کی سند سے نقل کر کے لکھا ہے هذا حديث متصل عال۔ اس کی اسناد متصل اور عالی ہے۔
ابن خلکان کہتا ہے ولم يختلف يحيى بن معين واحمد بن حنبل وعلي بن المديني في ثقته في النقل یعنی نقل کے
بارے میں یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور علی بن مدینی کو آپ کی ثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس مقولہ کو خطیب
نے اپنی تاریخ میں بھی نقل کیا ہے۔
ابن خلکان فرماتے ہیں یہ پہلے شخص تھے جن کو قاضی القضاۃ کا خطاب دیا گیا تھا۔ ابن عماد حنبلی لکھتا ہے
کہ ابن عبد البر فرماتے ہیں اپنے زمانہ میں مشرق و مغرب میں ابو یوسف پہلے شخص تھے جن کو قاضی القضاۃ کا لقب دیا گیا
تھا۔ آپ امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں ۱۷ سال آپ کے ساتھ رہے ...... سب سے پہلے حنفی اصول فقہ
انھوں ہی نے مرتب فرمایا...... آپ کی وفات کے بعد معروف کرخی نے خواب میں جنت میں ایک بہت بڑا محل
دیکھا، پوچھا کس کا ہے، کہا گیا ابو یوسف قاضی کا۔ انھوں نے تعجب سے کہا ایسا محل ان کو کس خدمت کے صلہ میں ملا؟
جواب ملا لوگوں کو تعلیم دینے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنے کے صلہ میں۔ [1]
اپنی وفات کے وقت حسرت سے فرمایا کرتے تھے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اسی فقر کے حال میں مرجاتا اور قضاء قبول
نہ کرتا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے جان بوجھ کر کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا اور بادشاہ وغیرہ کسی سے فیصلہ
کے بارے میں کبھی کوئی رعایت نہ کی۔ خطیب بغدادی نے اپنی عادت کے موافق پہلے تو امام ابو یوسف کی توصیف میں
پہلے تو خوب کھل کر دل سے مقولے پیش کیے پھر ایک طومار ان کے خلاف لکھ مارا ہے اور لطف یہ کہ اس تناقض
بیان پر اہل علم کی روشنی میں کوئی توجہ بھی نہیں کی۔ ابن خلکان نے بھی امام ابو یوسف کے مناقب نقل کر کے لکھا ہے
کہ خطیب نے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے ان کے متعلق ایسے کلمات نقل کیے ہیں جن کو کان سننا بھی گوارا نہیں
کر سکتے مگر چونکہ آپ نہایت قابل تعظیم اور افضل ہستی ہیں اس لیے ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔

---

[1] شذرات، مذہب۔

امام محمد بن الحسنؒ

ولادت سنہ ۱۳۲ھ وفات سنہ ۱۸۹ھ

آپ امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں ہیں، امام صاحب کے بعد امام ابو یوسفؒ سے تکمیل کی ہے، امام مالکؒ کی زبان سے آپ نے مؤطا سنی ہے اور تین سال مسلسل آپ کی خدمت میں رہے ہیں۔ امام شافعیؒ جیسا امام وقت آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتا ہے۔ ابن عماد حنبلی لکھتا ہے کہ آپ کی شان میں امام شافعیؒ کے تعریفی کلمات تواتر کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ امام محمد بن الحسنؒ سے زیادہ حلال و حرام، علل حدیث، ناسخ و منسوخ کا جاننے والا میرے علم میں کوئی اور شخص نہیں۔ اگر لوگوں میں انصاف ہوتا تو وہ یقین کرتے کہ محمد بن الحسنؒ جیسا فقیہ سے کوئی شخص اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کی برابر علم حاصل کیا ہے اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کا باب نہ کھلتا۔ ؎۱

امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا یہ باریک باریک مسائل آپ کے پاس کہاں سے آئے فرمایا امام محمدؒ کی کتابوں سے۔ ابو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ امام محمدؒ سے بڑھ کر قرآن کا عالم میں نے کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔ مشہور ہے کہ آپ نے نو سو نوے کتابیں تصنیف کی ہیں اور وہ سب علوم دینیہ میں ہیں۔ ؎۲

ابن عماد حنبلی حافظ ابن عبد البرؒ سے امام شافعیؒ کے تذکرہ میں نقل کرتے ہیں ایک مرتبہ امام شافعیؒ علوی خاندان کے نو شخصوں کے ساتھ گرفتار ہو کے بغداد لائے گئے۔ رشید اس وقت مقام رقہ میں تھا اس لئے یہ لوگ بغداد سے رقہ آئے اور اس کے سامنے پیش کئے گئے وہاں رقہ میں قاضی محمد بن الحسنؒ موجود تھے یہ امام شافعیؒ کے محسن تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ ہارون رشید کی خلافت پر طعن کے الزام میں گرفتار ہو کر آ رہے ہیں تو بہت بے چین ہوئے کیا کریں اور برابر اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ کب پیش ہوتے ہیں پیشی کے بعد نو لوگ تو قتل کر دیے گئے۔ ایک علوی نوجوان اور امام شافعیؒ بچ گئے۔ جب اس نوجوان کی باری آئی تو اس نے کہا امیر المؤمنین میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی بات کا دعوی کروں لیکن اس کے بھی قتل کا حکم دیدیا گیا۔ اس نے کہا اگر آپ مجھے قتل ہی کرتے ہیں تو ذرا اتنی مہلت دیجئے کہ میں اپنی بوڑھی ماں کو خط لکھ دوں اسے میرے حال کا کچھ پتہ نہیں ہے آخر اس کے بھی قتل کا حکم دیدیا گیا۔ اس کے بعد میرا نمبر آیا مجھ سے بھی ہارون رشید نے وہی بات دریافت کی جو اس علوی سے دریافت کی تھی میں بولا اے امیر المؤمنین میں تو علوی ہی نہیں ہوں جب زبردستی ان کے ساتھ گرفتار کر کے لایا گیا ہوں۔ میں بنی عبد المطلب سے ہوں اور اس کے ساتھ کچھ علم سے شد بد بھی رکھتا ہوں آپ کے یہ قاضی صاحب بھی ان سب باتوں سے واقف ہیں۔ ہارون رشید نے کہا اچھا آپ محمد بن الحسنؒ کے پاس رہیں میں نے کہا

؎۱ شذرات الذہب۔ ؎۲ الفوائد البہیہ۔

تدفین عمل میں آئی۔ آپ نے اپنے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ [1]

بچپن میں بصارت کا واقعہ دنیا میں آکر ابھی اچھی طرح آنکھیں کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ بصارت زائل ہوگئی۔ ان کی والدہ کو سخت صدمہ ہوا۔ بارگاہ ایزدی میں رو رو کر عجز و انکسار کے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔ آخر ماں کی دعا پر در استجابت وا ہوگیا۔ اور خواب میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ان کی بے چین و مضطرب والدہ کو بشارت دی کہ خدا نے تیری دعا قبول کر لی اور تیرے نور نظر کو پھر نور بصر عطا کر دیا گیا۔ صبح کو اٹھیں تو دیکھتی ہیں کہ بیٹے کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی۔ [2]

قوت حافظہ خطیب بغدادی نے امام بخاری کے طلب حدیث کے حالات خود ان کی زبانی اس طرح نقل کئے ہیں کہ مجھے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے حفظ حدیث کے لئے بنایا تھا۔ ابھی میری عمر دس سال ہی کی تھی کہ میں محدث عصر داخلی کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ سند نکلی "سفیان عن ابی الزبیر عن ابراھیم" میں نے فوراً ٹوکا اور عرض کیا کہ ابو الزبیر تو ابراہیم سے روایت نہیں کرتے۔ داخلی نے مجھے جھڑک دیا۔ میں نے پھر گذارش کی کہ ذرا اپنی اصل کتاب کی طرف مراجعت کیجئے۔ انھوں نے اصل کتاب جا کر دیکھی اور واپس آکر مجھ سے کہا کہ میاں لڑکے پھر یہ سند کس طرح ہے؟ میں نے کہا کہ ابراہیم سے روایت کرنے والے زبیر ہیں اور یہ عدی کے صاحبزادے ہیں، ابو الزبیر نہیں۔ داخلی نے اسی وقت قلم اٹھا کر اپنے نسخہ کی اصلاح کر لی اور فرمایا جو تم نے کہا وہی درست تھا۔ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ جب ان کی عمر سولہ سال کی ہوگئی تو انھوں نے عبد اللہ بن المبارک اور وکیع کی جمع کی ہوئی حدیثیں یاد کر لیں۔ اور اٹھارہ سال کی عمر میں ایک تصنیف صحابہ و تابعین کے فیصلے اور ان کے مختلف اقوال کے بارے میں مرتب کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کے قریب چاندنی راتوں میں کتاب التاریخ تصنیف کی۔ [3]

حاشد بن اسمٰعیل بیان کرتے ہیں کہ مشائخ بخارا کی خدمت میں امام بخاری ہمارے ساتھ بھی جایا کرتے تھے اس وقت یہ بہت نو عمر تھے مگر یہ کچھ لکھا نہ کرتے تھے۔ ہم ان کو بہت ملامت کرتے کہ جب تم کچھ لکھتے ہی نہیں ہو خواہ مخواہ درس میں شریک کیوں ہوتے ہو۔ سولہ دن کے بعد انھوں نے تنگ آکر فرمایا کہ تمہاری ملامت کی حد ہو گئی ہے۔ اچھا اب لاؤ دکھاؤ تم نے کیا لکھا ہے۔ ہم اس وقت تک پندرہ ہزار حدیثیں لکھ چکے تھے وہ سامنے رکھ دیں۔ امام بخاری نے وہ تمام حدیثیں بر زبان اس طرح فر فر سنا دیں کہ ہمیں ان کی یادداشت سے اپنے نوشتوں کی تصحیح کرنا پڑی۔ [4]

امام بخاری کی اس قدر ذکاوت و حفظ کا ہر طرف شہرہ ہو چکا تھا اس لئے جہاں جہاں جاتے اس کے

---

[1] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۶ ۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۰ ۔ [3] ایضاً ج ۲ ص ۷

[4] خطیب ج ۲ ص ۱۰

آگے آگے ان کا نام پہنچ جاتا تھا۔[1] جب یہ تشریف لے جاتے تو عجیب عجیب انداز سے ان کے لئے مجالس امتحان مرتب ہوتیں اور ہر مجلس سے فائق تر پر اہل مجلس کو یہ پتہ چلتا کہ امام بخاری کے متعلق اب تک جو کچھ مبالغہ آمیز قصے بھی کلمات ان کے کانوں میں پڑے تھے وہ بھی ناتمام تھے امام بخاری کی شان رفیع اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے ان کی حفظ و صورت اور بیدار مغزی علم دیکھ دیکھ کر دنیا حیرت میں مبتلا تھی۔

بصرہ میں ایک مجلس امتحان کا تذکرہ

ایک مرتبہ بصرہ میں داخل ہوئے تو اسی وقت امام بخاری، امام بخاری کا شور و غل مچ گیا ہزاروں تک نکل پڑے خصوصاً محدثین جمع ہو گئے اور ان تشنگان علم نے فوراً مجلس استفادہ آراستہ کرنے کا بندوبست کیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر با ادب اپنی درخواست پیش کی۔ امام جامع نے فرمایا میں ابھی بہت نو عمر ہوں اور تم مجھ سے ایسی فرمائش کرتے ہو اچھا تو میں خود تمہارے شہر کی ایسی حدیثیں تمہارے سامنے بیان کروں گا کہ انہیں سن کر تم بھی جدید فائدہ حاصل کرو گے یہ کہہ کر حدیث "المرء مع من احب" سنائی اور فرمایا کہ میں اس حدیث کو سالم سے بواسطہ منصور نقل کر رہا ہوں اور تمہارے شہر میں یہ روایت سالم کے علاوہ دوسرے اور اشخاص سے روایت کی جاتی ہے اس لئے تم کو وہ لطف ہو گا کہ اپنی سند اس کے ساتھ اس طریق کو بھی شامل کر دو گا۔ اور جب تقویت ہوئی پوری مجلس میں امام بخاری نے صرف اسی طرح کی حدیثیں سنائیں جو ان کے شہر میں مشہور تھیں لیکن جب امام بخاری نے ان کو روایت کیا تو ان کے لئے اس میں استفادہ کا کوئی نہ کوئی جدید پہلو موجود تھا۔

[2] بڑے بڑے اساتذہ و محدثین نے ان کے سامنے اپنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا جبکہ ان کے قول اس وجہ پر آغاز شباب کا ایک خط بھی نمودار ہوا تھا اپنے زمانہ کے مشاہیر جیسے ابو زرعہ، ابو حاتم، ترمذی، محمد بن نصر، ابن خزیمہ اور امام مسلم صحیح مسلم کے علاوہ ان سے روایت کرتے تھے۔

امام بخاری کی جلالت قدر

ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ میں نے ابو زرعہ کو امام بخاری کے سامنے بچوں کی طرح علل حدیث دریافت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حاشدی جو عمر میں امام بخاری سے بڑے تھے اور جن کے امام بخاری بھی خود معتقد تھے فرمایا کرتے تھے کہ ہم سب میں بڑے عالم، سب سے بڑے فقیہ اور علم کے سب سے زیادہ جفاکش امام بخاری ہیں۔[3] ایک مرتبہ ایک حدیث کے متعلق ان سے پوچھا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ امام بخاری اس کو صحیح فرماتے تھے تو دارمی نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے۔

"بخاری فن حدیث میں مجھ سے کہیں زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر عقلمند ہیں جو شارع کے امر و نواہی کو نصوص سے خوب سمجھا ہے۔ جب قرآن پڑھتے ہیں تو قرآن اس کے معنی سمجھتے ہیں"

---

۱ تاریخ کی منتخب ج ۱ ص ۱۰، ۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹، ۳ مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۹۹۔

فرق ہو جاتا ہے یہی اور اس کے ناسخ و منسوخ اور معانی و مرادات کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ کیا بات ہے۔ ۱

شغف حدیث اور شب بیداری

محمد بن ابی حاتم وراق بخاری اور محمد بن یوسف فربری (صاحب نسخہ) اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری ایک رات میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھ کر چراغ روشن کرتے حدیث کا مطالعہ کرتے اور پھر سو جاتے۔ ۲

تالیف بخاری کا سبب

صحیح بخاری کی تصنیف کا واقعہ خود ان سے اس طرح منقول ہے کہ ایک دن اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھے تو ایک آدمی نے فرمایا کاش تم حدیث کی کوئی ایسی کتاب جمع کرتے جس میں صرف صحیح صحیح حدیثیں ہوتیں۔ یہ بات سب نے سنی مگر دلوں میں اسی کے تڑپ پیدا ہوئی جس کے نصیب میں یہ سعادت روز ازل سے مقدر ہو چکی تھی۔ اس مجلس کے بعد ہی امام بخاری اس خدمت کے لئے کمربستہ ہو گئے اور ان ہی دنوں میں یہ خواب دیکھا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوں اور مکھیاں اڑا رہا ہوں۔ فن تعبیر کے ماہرین سے جب اس کی تعبیر پوچھی تو معلوم ہوا کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے کذب و افترا کی مکھیاں اڑاؤ گے۔ ۳

تالیف بخاری میں حیرت انگیز شرائط کا التزام

غرض امام بخاری نے کمر ہمت کس لی اور ان چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے حافظہ میں محفوظ تھیں نہایت سخت شرائط کے مطابق حدیثیں انتخاب کرنا شروع کر دیں۔ صرف ذکاوت و حفظ ہی کا زور نہیں بلکہ خلوص نیت تقوی و طہارت کے آخری مرحلے بھی ختم کر ڈالے یعنی جب کوئی حدیث لکھنے کا ارادہ کرتے تو پہلے غسل فرماتے دو رکعت نماز نفل ادا کرتے پھر کہیں کتاب میں ایک حدیث درج کرتے۔ اسی طرح جب تعلیق و حدیث ابواب کے لئے تراجم و ابواب قائم کرتے اس وقت بھی یہی عمل کرتے۔ عبدالقدوس بن ہمام اپنے چند مشائخ سے ناقل ہیں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کے تراجم ریاض الجنۃ میں بیٹھ کر لکھے ہیں۔ اس جانکاہی اور سخت محنت کے ساتھ سولہ سال کی مدت میں یہ عظیم الشان اور عدیم النظیر کتاب مکمل ہوئی اور صفحہ ہستی پر ایک ایسی تصنیف وجود میں آ گئی جس کا لقب کسی تردد کے بغیر "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" قرار پایا۔ امت کے لاکھوں اور کروڑوں محدثین و علماء نے سخت سے سخت کسوٹی پر اس کو کسا بہت کچھ سعی و کوشش کے بعد دو چار جگہ نکتہ چینیاں کی گئیں مگر جو لقب اس تصنیف کو مشہور ہو چکا تھا وہ پتھر کی لکیر تھا، نہ مٹنا تھا نہ مٹا۔

خلوص نیت کے آثار برکت

اس خیر و برکت کا یہ عالم ہوا کہ اس وقت سے آج تک ہزاروں علماء نے اس کتاب کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے اس کی جو شرحیں لکھی گئی ہیں ان میں بعض بعض شرح چودہ چودہ ضخیم جلدوں کی ہے

۱ مقدمہ بخاری ۲ تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۳ ۳ مقدمہ فتح الباری ص ۵ ۴ تاریخ خطیب ج ۲ ص ۹۔

۲۲ شرحیں لکھے گئے محدثین کو چھوڑ کر نحویوں اور صرفیوں نے بھی ابواب و تعریف کی جو خدمت بن پڑی کی حتی کہ جب متون و تراجم ابواب و شرح کی تمام خدمتیں ختم ہو گئیں تو خدمت بخاری کی فہرست میں نام درج کرانے والے مشتاقوں نے قرآن کریم کی طرح اس کے حروف تک بھی شمار کر ڈالے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے جو کام صدق دل کی رضا جوئی کے لئے کیا جاتا ہے اس کے آثار قبولیت دنیا میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بخاری شریف کی علمی خصوصیات کے متعلق اگر کچھ لکھا جائے تو بغیر کسی مبالغہ کے اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ علماء کا تو ذکر ہی کیا بعض عوام کے ذہن میں بھی اتنا ہی ہے کہ وہ کتاب صحیح حدیثوں کا مجموعہ ہے لیکن جن کو کتاب بخاری پر کافی غور و مطالعہ کا وقت ملا ہے۔ انھیں یہ کتاب اصول و عقائد، عبادات و معاملات، فرامین و سیر، اسلامی معاشرت و تمدن، سیاست و سلطنت کی ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا نظر آتی ہے۔

خودداری امام بخاری کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ عمر بن حفص الاشقر کہتے ہیں بصرہ میں ہم اور وہ ساتھ ہی علم کی تحصیل کرتے تھے۔ ایک دن امام بخاریؒ درس میں نہ آئے ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس تن پوشی کے لئے کپڑے نہیں ہیں لیکن امام نے اس مرحلہ پر بھی اپنی فطری غیرت کی قربانی برداشت نہ کی اور اپنے بے تکلف رفقاء سے بھی اس راز کو ذہن ہی کے درجہ میں رکھا۔ ان کا یہ حال دیکھ کر فوراً کپڑے مہیا کئے گئے اس کے بعد امام بخاریؒ پھر اسی طرح پابندی کے ساتھ درس گاہ میں آنے لگے۔ [۲]

ایک مرتبہ خالد بن احمد امیر بخارا نے درخواست کی کہ وہ ان کی مجلس میں آکر اپنی تصنیف جامع اور تاریخ اس کو سنا دیں۔ امام نے اس سے صاف انکار کر دیا تو دوسرے درجہ پر اس نے اس کے لئے مجبور کیا کہ شاہزادوں ہی کے لئے ایک مجلس ایسی مخصوص کر دیں جس میں ان کے سوا کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے مگر امام بخاریؒ نے علم نبوی کی دولت کی تقسیم میں یہ تخصیص بھی گوارا نہ کی۔ آخر یہ ناگواریاں اتنی بڑھتی گئیں کہ امام بخاری کو اپنا وطن مالوف چھوڑ دینا پڑا۔ [۳]

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم جو جابجا بکھرا ہوا تھا ہزاروں مصائب جھیل کر حاصل کیا اور جب اس بے بہا خزانہ کو اپنے سینہ میں جمع کر لیا تو اپنے حدیث اقدس کی طرح ہر خاص و عام کے سامنے اس کو بے منت لٹا دیا اس کی خود عزت کی، دنیا کی نظروں میں اس کا احترام قائم کیا اور اسی کے احترام کی خاطر وطن سے بے وطن ہوئے۔ جان دے دی مگر علم کی آن بان اسی طرح قائم رکھی۔

---

[۱] حضرت استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ نسخہ میں نے خود دیکھا ہے بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔ [۲] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۲ [۳] ایضاً ج ۲ ص ۳۳۔

سانحۂ وفات ! تذکروں میں لکھا ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ چند صحابہ کے ساتھ کھڑے کسی کا انتظار فرما رہے ہیں انھوں نے با وجود سلام عرض کیا آپ نے جواب سلام دے کر فرمایا مجھے محمد بن اسمٰعیل بخاری کا انتظار ہے۔ ان کے انتظار میں ہوں جب امام بخاری کی وفات کی خبریں لوگوں تک پہنچیں تو انھوں نے حساب لگایا تو ان کی وفات کا ٹھیک وہی وقت نکلا جس میں ...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں منتظر دیکھا تھا۔ خرتنگ میں دفن ہوئے۔

آپ کی قبر سے مشک و عنبر سے زیادہ عمدہ خوشبو پھیلی یہ عجیب ماجرا دیکھ کر لوگ ٹوٹ پڑے اور اس کی مٹی کو تبرک سمجھ کر لوٹ کر لے جانے لگے۔ حتیٰ کہ مزار مبارک کا نشان باقی رکھنے کے لئے اس کا انتظام کرنا پڑا کہ اس کی مٹی لوگ نہ لیجا سکیں۔ لوگوں کو اس مٹی کی خوشبو پر تعجب ہوتا ہے لیکن ہمیں تو کوئی تعجب نہیں ہوتا

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد ۔۔۔ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن الفضل بن بہرام الدارمی

ولادت ۱۸۱ھ وفات ۲۵۵ھ

جس سال عبد اللہ بن المبارک کی وفات ہوئی ہے اسی سال حافظ دارمی کی ولادت ہوئی ہے۔ روایت علم اجتہاد اور جلالت میں ضرب المثل تھے۔ حدیث کی تلاش میں بلادِ اسلامیہ کا دور دور سفر کیا تھا۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ دارمی اپنے زمانہ کے امام تھے۔ مسلم صاحب صحیح، ترمذی، ابو داؤد صاحب سنن اور امام احمدؒ کے فرزند جیسے ائمۂ حدیث ان کی تلامذہ کی فہرست میں داخل ہیں۔ حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے بھی سنن صغریٰ کے علاوہ ان سے روایت کی ہے۔ امام احمدؒ کے فرزند اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حافظ حدیث ہیں۔ ابو زرعہ رازی۔ محمد بن اسمٰعیل بخاری، عبد اللہ بن عبد الرحمٰن دارمی، حسن بن شجاع بلخی۔

مسند دارمی آپ کی مشہور تصنیف ہے اس کو مسند کہنا محدثین کی اصطلاح کے خلاف ہے۔ اس کتاب میں ثلاثیات سب کتابوں سے زیادہ ہیں۔ مجموعہ کتاب تین ہزار پانچ سو پچاس حدیثوں پر مشتمل ہے عرفہ کے دن آپ کی وفات ہوئی اور عید الاضحیٰ جمعہ کے دن مدفون ہوئے۔ امام بخاریؒ کو جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو انتہائی صدمہ سے سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے ساختہ آپ کی زبان سے یہ حسرت آمیز شعر

له تاریخ خطیب ج ۱۰ ص ۳۰ سه مقدمہ تحفۃ الاحوذی

نقل کیا حالانکہ قرآن اشعار کے جو حدیث میں روایت کئے گئے ہیں آپ کبھی کوئی شعر نہیں پڑھتے تھے۔

ان حق تحجبو ا حب کلاھا | اگر تو تم سب کا تو تم دوستوں کی مخالفت کا مدعو ہی کو انا نا پڑے گا۔

وان ہمست لا ارتد المحجم | مگر غیری موت کا سامنا ان سب سے زیادہ مشکل ہے۔

اسی سنہ میں نیشاپور کے شیخ محدث عبدالرحمن بن واسطہ کے محمد بن حرب نسائی اور دمشق کے مفتی بن عامر اور گروہ کرامیہ کے بانی محمد بن کرام کی وفات ہوئی۔ ۔ لہ

ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی

ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ

سجستانی کی تحقیق میں یہاں مورخ ابن خلکان نے ایک مشہور غلطی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بصرہ میں ایک قریہ کا نام ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ یہ ان کا وہم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ سیستان قندھار و چشت کے قریب ایک مقام ہے یہ نسبت اسی کی طرف ہے اور سجزی کی نسبت بھی اسی کی طرف ہے انھوں نے مصر و شام، حجاز و عراق اور خراسان وغیرہ بلاد اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ حفظ و اتقان، روایت و عبادت، تقوی و صلاح میں یگانۂ روزگار تھے۔ حاکم کہا کرتے تھے کہ ابوداؤد کسی شک و شبہ کے بغیر اپنے زمانہ کے امام تھے۔ موسیٰ بن ابراہیم جو ان کے معاصر تھے فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد دنیا میں حدیث کے لئے اور آخرت میں جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ابراہیم بن حربی کا مقولہ ہے کہ علم حدیث ابوداؤد کے لئے اس طرح نرم کر دیا گیا تھا جیسا حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا۔ حافظ سبکی نے بھی اس مضمون کو دہرایا ہے اور اس کو نظم کر دیا ہے۔ ترمذی و نسائی جیسے ائمہ حدیث ان کے تلامذہ میں شمار ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود امام احمد تو ان کے اساتذہ میں ہیں لیکن امام احمد کے بعض استادوں نے ان سے روایت کی ہے بلکہ امام احمد نے بھی عتیرہ کی حدیث ان سے روایت کی ہے۔

سنن ابی داؤد ان کی مشہور تصنیف ہے اس میں ۴۸۰۰ حدیثیں حسن و صحیح جمع کی ہیں۔ اور اپنے نزدیک کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی جو قابل حجت نہ ہو۔ ابوداؤد نے جب اس کتاب کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بہت پسند فرمایا۔ ان کے فقہی مسلک میں اختلاف ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ شیخ ابو اسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں انھیں حنبلیوں میں شمار کیا ہے۔ حافظ ذہبی کے بیان سے بھی

لہ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۰ و بستان المحدثین

بھی قیاس ہوتا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابوداؤدؒ اپنے علم طور طریق میں امام احمدؒ کے قدم بقدم تھے۔ اور امام احمد وکیع کے اور وکیع سفیان کے اور سفیان منصور کے اور منصور ابراہیم کے اور ابراہیم علقمہ کے اور علقمہ ابن مسعودؓ کے اور ابن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

لباس میں آپ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ اپنے قمیص کی ایک آستین فراخ اور دوسری تنگ رکھا کرتے تھے جب آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا ایک آستین تو اس لئے کشادہ رکھتا ہوں کہ اس میں اپنی کتاب کے کچھ اجزا رکھ لوں دوسری آستین کشادہ رکھنا اسراف میں داخل سمجھتا ہوں آپ کا مرقد مبارک بصرہ میں ہے۔[1]

حجۃ الاسلام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوری

ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۶۱ھ

حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں مشہور یہ ہے کہ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں ہوئی ہے لیکن مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ میں نے کسی حافظ کو ان کے سن ولادت کی تصریح کرتے نہیں دیکھا، البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۲۶۱ھ کے بعد ہے میرے شیخ حافظ ابن الصلاح ضرور کچھ تصریح فرماتے تھے مگر جہاں تک میرا گمان ہے ان کے نزدیک سن ولادت ۲۰۶ھ تھا اور اس کا اصل ماخذ حاکم کی ایک تصنیف تھی لیکن جب مجھے اصل کتاب دستیاب ہو گئی اور وہ نسخہ میری ملکیت میں آ گیا تو اس میں سن ولادت کی بجائے صرف سن وفات ۲۶۱ھ لکھا ہوا تھا ہاں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ان کی عمر ۵۵ سال کی ہوئی ہے اس حساب سے ان کی ولادت ۲۰۶ھ میں ثابت ہوتی ہے۔

ابوالحسین کنیت، عساکر الدین لقب اور مسلم ان کا اسم گرامی تھا۔ بنی قشیر عرب کے مشہور قبیلہ کی طرف منسوب تھے۔ نیشاپور خراسان میں ایک بہت خوبصورت اور بڑا شہر ہے اس لحاظ سے نیشاپوری بھی کہے جاتے تھے۔ ابوزرعہ اور ابوحاتم نے ان کی امامت حدیث کی گواہی دی ہے۔ ابوحاتم رازی اور ابن خزیمہ ان سے روایت کرنے والوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ امام ترمذیؒ نے بھی ان سے ایک روایت کی ہے۔ بہت کثیر التصانیف شخص تھے۔ صحیح مسلم ان کی تصانیف میں اس پایہ کی کتاب ہے کہ بعض مغاربہ نے اس کے متعلق یہ الفاظ تک کہہ دیئے ہیں کہ آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح کتاب نہیں۔ دعویٰ اپنی جگہ جیسا کچھ بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ تصنیف فن حدیث کے بہت سے لطائف پر مشتمل ہے۔ سوا اسانید و متون کا حسن سیاق، تلخیص طرق اور ضبط انتشار میں صحیح بخاری پر بھی فائق ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۲ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۳ و بستان المحدثین۔

ابن عقدہ فرماتے ہیں: امام بخاری کی اکثر روایات اہل شام سے بطریق مناولہ ہیں یعنی ان کی کتابوں سے لی گئی ہیں جو ان کے مصنفین سے نہیں سنی گئیں اس لئے ان کے راویوں میں کبھی کبھی امام بخاریؒ سے غلطی واقع ہو جاتی ہے ایک ہی راوی کہیں اپنی کنیت اور کہیں اپنے نام سے مذکور ہوتا ہے امام بخاریؒ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ یہ مغالطہ امام مسلم کو پیش نہیں آیا۔ نیز حدیث میں امام بخاریؒ کے تصرفات مثلاً تقدیم و تاخیر حذف و اختصار کی وجہ سے بعض مرتبہ تعقید پیدا ہو جاتی ہے ہرچند کہ خود بخاری ہی کے دوسرے طرق دیکھ کر وہ صاف بھی ہو جاتی ہے لیکن امام مسلم نے یہ طریقہ بھی اختیار نہیں کیا بلکہ متون حدیث کو موتیوں کی لڑی کی طرح اس طرح مرتب روایت کیا ہے کہ تعقید کی بجائے اس کے معانی اور سمجھے چلے جاتے ہیں۔

خطیب بغدادی ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے حدیث کی تلاش میں عراق، حجاز، مصر، شام وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ قتیبہ، اسحٰق بن راہویہ، امام احمد جیسے ائمہ اور جلیل محدثین سے علم حاصل کیا ہے۔ ابتداء میں امام بخاریؒ سے کچھ مانوس نہ تھے لیکن جب امام بخاریؒ آخر عمر میں نیشاپور پہنچے اور امام مسلمؒ نے ان کی مجالس قبول حدیث کی صورت اپنی آنکھوں سے دیکھی تو ان کے تمام پچھلے خیالات، عقیدت اور جذبات محبت سے بدل گئے۔ امام کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور قدموں کو بوسہ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ استاذ الاستاذین، سید المحدثین، طبیب الحدیث فی علله کے محبت بھرے خطابات سے یاد کیا۔ خلق قرآن کے مسئلہ میں محمد بن یحییٰ ذہلی اور امام بخاریؒ کا اختلاف جب بہت بڑھ گیا حتیٰ کہ ذہلی نے یہ اعلان کر دیا کہ جو امام بخاریؒ کے مشرب پر ہو وہ ہمارے حلقۂ درس میں شریک نہ ہو تو بیشتر لوگ امام بخاریؒ سے کٹ گئے۔ لیکن ایک امام مسلم تھے جو علوم بخاری کے اتنے گرویدہ ہو چکے تھے کہ انھیں کسی دوسرے محدث کے علوم میں اب کوئی ذائقہ ہی نہ آتا تھا فوراً اپنی چادر سنبھالی عمامہ سر پر رکھا، ذہلی کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے علوم کا جو ذخیرہ اب تک حاصل کیا تھا وہ بھی ایک خادم کے سر پر رکھ کر ان کے مکان پر واپس کر دیا اور امام بخاریؒ کے مقابلہ میں اپنے استاد محمد بن یحییٰ ذہلی کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیا۔

ان کی وفات کے بعد ابو حاتم رازی نے ان کو خواب میں دیکھا حال پوچھا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لئے مباح کر دیا ہے جہاں جاتا ہوں پھرتا ہوں۔ ابو علی زاغونی کو ایک ثقہ شخص نے خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کس عمل سے آپ کی نجات ہوئی انھوں نے صحیح مسلم کے چند اجزاء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان اجزاء کی بدولت۔

(تاریخ خطیب، تذکرۃ الحفاظ و ابن خلکان)

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی

ولادت سنہ ۲۰۹ھ وفات سنہ ۲۷۹ھ

شیخ تقی الدینؒ فرماتے ہیں کہ ترمذ ت کے کسرہ کے ساتھ قریب قریب متواتر ہے۔ نہر جیحون کے کنارہ پر ایک قدیم شہر ہے۔ تفقہ اور ماوراء النہر میں شہرت سے جنہوں نے نہر اول گنی ہے۔ یہ امام بخاریؒ کے سب سے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ خود امام بخاری سے ان کے حق میں بہت سے کلمات تعریف منقول ہیں۔ محدثین ان کو ناصر بخاریؒ کا خلیفہ کہتے ہیں۔ ان کے تفقہ کے لئے یہ کافی ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ مسلم، ابوداؤد اور ان کے شیوخ سے بھی روایت کرتے ہیں۔ کوفہ، بصرہ، رے، خراسان اور حجاز میں طلب حدیث کے لئے سالہا سال سفر کرتے رہے ہیں۔ ان کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک شیخ کی روایات کے دو جزء انھوں نے نقل کئے تھے مگر اب تک ان کو پڑھ کر سنانے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ مکہ مکرمہ کے راستہ میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہو گئی۔ ترمذی نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان سے ان اجزاء کے قرات کی درخواست پیش کی۔ شیخ نے قبول فرمایا اور کہا ان اجزاء کو نکال لو میں پڑھتا ہوں تم مقابلہ کرتے جاؤ۔ امام ترمذیؒ نے تلاش کیا تو اتفاقاً وہ اجزاء ان کے ساتھ نہ تھے۔ ترمذی بہت گھبرائے لیکن اس وقت ان کی سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہ آیا کہ وہ اجزاء اور سادے کاغذ کے ہاتھ میں لیکر فرضی طور پر سننے میں مشغول ہو جائیں۔ شیخ نے قرات شروع کی اتفاقاً ان کی نظر کاغذات پر پڑ گئی تو سادے نظر آئے۔ شیخ کو طیش آیا اور فرمایا کیا مذاق بناتے ہو ترمذی نے مجبوراً جو واقعہ تھا صاف عرض کر دیا اور کہا اگرچہ وہ اجزاء میرے ساتھ نہیں ہیں لیکن مجھے لکھے ہوئے سے زیادہ محفوظ ہیں۔ شیخ نے فرمایا اچھا تو پڑھ کر سناؤ۔ ترمذی نے وہ تمام حدیثیں پڑھ کر سنا دیں۔ شیخ بہت متعجب ہوئے اور فرمایا یقین نہیں آتا کہ صرف میرے ایک بار پڑھنے سے یہ سب حدیثیں تم کو محفوظ ہو گئی ہوں گی۔ ترمذی نے عرض کیا اچھا اب امتحان کیجئے۔ شیخ نے خاص اپنی چالیس حدیثیں اور پڑھیں ترمذی نے فوراً ان کو بھی اسی صحت کے ساتھ سنا دیا کہیں ایک جگہ غلطی نہیں ہوئی۔ اس ایک واقعہ کے علاوہ ان کے حفظ کے اور بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

جامع ترمذی ان کی بہت مشہور اور مقبول تصنیف ہے۔ بعض کی حدیثی نوعیت کے لحاظ سے اس کتاب کو تمام کتابوں پر فوقیت دی گئی ہے۔ عراقیین و حجازیین دونوں کے مسائل پر علیحدہ علیحدہ باب قائم کرتے ہیں ہر باب کے تحت میں اگرچہ حدیث کا ذخیرہ تفصیلاً تو زیادہ پیش نہیں کرتے لیکن اس باب میں جتنے صحابہ کی حدیثیں ان کے زیر نظر ہوتی ہیں سب کی طرف صحابہ کے نام گنوا کر اشارات کر جاتے ہیں۔ رواۃ کی

جرح و تعدیل، مشہور راویوں کی کنیتیں اور مشہور کنیتوں کے اسماء، سلف کا تعامل، ائمہ کے مذاہب پر تقریباً ہر باب میں تنبیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہی امور کی وجہ سے اگرچہ یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن فوائد کے لحاظ سے بہت بڑی کتاب ہے۔ ترمذی سے پہلے بھی گو حدیث کی ثلاثی تقسیم کا پتہ ملتا ہے مگر حسن و صحیح کو جگہ جگہ استعمال کرنے والے یہی پہلے شخص ہیں۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں دو حدیثوں کے علاوہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس پر امت میں کسی نہ کسی کا عمل نہ ہو۔ [1]

حفظ و اتقان، علم و فہم کے ساتھ بہت خدا ترس بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیت ان پر اتنا غالب تھا کہ روتے روتے آخر کار ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

ان کی کنیت ابو عیسیٰ تھی۔ ابو داؤد میں اس کنیت کی ممانعت منقول ہے۔ شارحین حدیث نے اس کی مختلف توجیہات نقل کی ہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں عام شارحین کے علاوہ ایک جدید توجیہ کی جا

ابو عبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجۃ الربعی

ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ

لفظ ماجہ جیم کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ ان کی والدہ کا نام تھا۔

ابو یعلیٰ خلیلی فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ متفق علیہ ثقہ تھے۔ فن حدیث و تفسیر کے علاوہ علم تاریخ کے بھی بڑے عالم تھے۔ ان کا قول قابل حجت تھا۔ حدیث کی تلاش میں انہوں نے کوفہ، بصرہ، عراق، شام، مکہ مکرمہ اور مصر وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ حدیث میں ان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔ ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ تصنیف کرنے کے بعد جب یہ کتاب میں نے حافظ ابو زرعہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب میں تیس سے زیادہ ضعیف حدیثیں نہیں ہیں۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ اگر چند کمزور حدیثیں اس میں نہ ہوتیں تو یہ کتاب بہت عمدہ ہوتی۔ [3]

---

[1] حضرت استاذؒ فرماتے تھے کہ ترمذی کی اس تصریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے صرف سند کی قوت دیکھنا نہیں ہے۔ ترمذی کی بہت سی وہ حدیثیں جن پر خود انہوں نے ضعف کا حکم لگایا ہے معمول بہ بھی ہو چکی ہیں۔

[2] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۷ و ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۴، بستان المحدثین

[3] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹ و ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۴۔

ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب النسائی

ولادت ٢١٥ھ وفات ٣٠٣ھ

نسا خراسان میں ایک مشہور شہر ہے اسی کی طرف نسبت میں نسوی بھی کہا جاتا ہے۔ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ ذہبی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ سے پوچھا مسلم زیادہ حافظ تھے یا نسائی، فرمایا نسائی۔ پھر میں نے اپنے والد سے بھی سوال کیا انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔

ابن طاہر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سعد بن علی زنجانی سے میں نے ایک شخص کا حال دریافت کیا انھوں نے اس کو ثقہ فرمایا۔ میں نے کہا نسائی تو اس کو ضعیف سمجھتے تھے فرمایا عزیزمن راویوں کے متعلق نسائی کی شرطیں بخاری و مسلم سے بھی زیادہ سخت تھیں۔ ابو علی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ ہم لوگ اصفہان اور ... ابن نسائی کو واسطہ بنایا بچپن طلب حدیث کے لئے انھوں نے حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ بڑے بڑے شیوخ سے ملاقات کی تھی۔ سب سے پہلے قتیبہ بن سعید کے پاس گئے تھے اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی اور ایک سال دو ماہ ان کی خدمت میں قیام کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ فروع میں یہ شافعی مسلک پر تھے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ پہلا انھوں نے سنن کبریٰ تصنیف فرمائی تھی، امیر وقت نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب میں جتنی حدیثیں آپ نے جمع کی ہیں کیا سب صحیح ہیں، فرمایا نہیں حسن بھی ہیں۔ اس نے کہا میرے لئے ایسا مجموعہ مرتب فرما دیجئے جس میں صرف صحیح حدیثیں ہوں۔ اس کے بعد امام نے سنن صغریٰ تالیف کی جس کو مجتبیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی وفات کا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حضرت علیؓ اور اہل بیت کے مناقب لکھ کر فارغ ہو گئے تو انھوں نے چاہا کہ ان کو دمشق کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنائیں تاکہ بنو امیہ کی سلطنت کے اثر سے عوام میں ناصبیت کی طرف جو رجحان پیدا ہو گیا تھا اس کی اصلاح ہو جائے۔ ابھی اس کا تھوڑا سا حصہ ہی پڑھنے پائے تھے کہ ایک شخص نے پوچھا امیر معاویہؓ کے فضائل کے متعلق بھی آپ نے کچھ لکھا ہے۔ نسائی نے جواب دیا اگر وہ برابر سرابر چھوٹ جائیں تو بہت غنیمت ہے مناقب تو ان کے کہاں ہیں۔ پھر کیا تھا لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور شیعہ شیعہ کہہ کر اتنا مارا کہ نیم جان کر دیا۔ خادم اٹھا کر گھر لے آئے۔ امام نسائی نے فرمایا مجھے ابھی مکہ مکرمہ پہنچا دو تاکہ میرا آخر وقت وہیں ہو۔ کہتے ہیں کہ جب امام مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کا انتقال ہو گیا اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کئے گئے۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ و طبقات ج ۲ ص ۸۳ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱)

سلہ واضح رہے کہ یہ سوال و جواب جو بیان مذکور ہے وہ خود امام مسلم و نسائی کے متعلق ہے ان کی تصنیفات کے متعلق نہیں ہے مسلم کی کتاب نسائی سے بالاجماع زیادہ صحیح ہے۔ سلہ واضح رہے کہ بعض مرتبہ شارحین سنن نسائی کو مراد لیتے ہیں اور حدیث سنن صغریٰ ہی میں ملتی ہیں کہ ان کا ... ہے ... ہی ہے۔

احمد بن محمد ابو جعفر الطحاوی الامام

ولادت ۲۲۹ھ وفات ۳۲۱ھ

ابو جعفر ان کی کنیت ہے اور طحا مصر میں ایک قریہ ہے اسی کی طرف منسوب ہیں۔ ابو اسحٰق شیرازی طبقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں حنفیہ کی سیادت کا ان پر خاتمہ ہو گیا۔ ابن کثیر نے ان کو علامہ اور حافظ کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ فقہ نبیل کے مالک تھے۔ ابن یونس نے ان کے حق میں ثقہ، ثبت، فقیہ اور عاقل کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

مزنی ان کے ماموں تھے اور ان ہی کی زیر تربیت انہوں نے ابتداء میں تعلیم حاصل کی ہے اور انہی کے شافعی مسلک پر تھے۔ ایک دن کسی بات پر ناراض ہو کر مزنی نے ان سے فرمایا خدا کی قسم.. تجھ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ سن کر امام طحاوی کو بہت غیرت آئی اور وہاں سے اٹھ کر قاضی ابن ابی عمران حنفی کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور حنفی مذہب میں ایسی مہارت پیدا کی کہ اپنے زمانہ میں تو کیا بعد کے زمانوں میں بھی حنفیوں کے مقتدا کہلائے۔ امام طحاوی کے انتقال مسلک کے سلسلہ میں عام طور پر یہی واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ صرف اتنی سی بات کسی شاگرد کو اپنے استاد کا مسلک چھوڑنے کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کا اصل سبب خود امام طحاوی کی زبانی ہی کیوں نہ معلوم کیا جائے۔

مورخ ابن خلکان نقل کرتا ہے کہ امام طحاوی سے پوچھا گیا آپ نے اپنے ماموں کے خلاف حنفی مسلک کیوں اختیار فرمایا۔ امام نے جواب دیا اس لئے کہ میں اپنے ماموں کو اکثر حنفی مسلک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے دیکھا کرتا تھا اس سے میں نے بھی اس مسلک کو پسند کر لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ بہت معقول ہو سکتی ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ اس ارادہ کا ظہور امام مزنی کی اس ناراضگی پر ہوا ہو۔

امام طحاوی کی بہت کثیر تصانیف مشہور ہیں۔ اختلاف العلماء اور شروط کے موضوع پر ان کے علاوہ کسی نے کم قلم اٹھایا ہے۔ تاریخ کبیر، احکام القرآن، معانی الآثار اور مشکل الآثار ان کی بہت مشہور تصنیفیں ہیں۔ حافظ ابن حزم اندلسی تو طحاوی کی تصنیف کو موطا پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک اگر ان کا یہ حکم احادیث کی نشست و رسائل کی نفی تقریب کے لحاظ سے ہو تو صحیح ہے ورنہ اگر صحت اسانید و متون کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ قول ابن حزم کی جلالت شان سے کسی طرح موزوں نہیں۔ امام طحاوی جب مختصر الطحاوی کی

۱؎ حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ [illegible] ان کی تصانیف [illegible] افسوس ہے کہ [illegible]
[illegible] -

تابعین کر چکے تو فرمایا۔ کاش ابوابراہیم (مزنی کی کنیت ہے) آج زندہ ہوتے تو ان کو اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا۔
جس سال امام طحاوی کی وفات ہوئی۔ اسی سال علم حدیث کے بہت سے چراغ گل ہوئے۔۔۔۔
مصر میں طحاوی کے شیخ ابوبکر احمد بن عبدالوارث، ہرات میں ابو علی احمد بن محمد، اصبہان میں ابو علی الحسن
بغداد میں ابو عثمان سعید بن محمد اور ابو علی جبائی کے فرزند اور شیخ المعتزلہ ابو ہاشم وغیرہم۔
امام طحاوی کے سن ولادت میں اختلاف ہے۔ ابن خلکان کہتے ہیں کہ صحیح ۲۲۹ھ ہے۔ [1]

ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی

ولادت سنہ ۲۶۰ھ وفات سنہ ۳۶۰ھ

ملک شام موضع عکا میں ان کی ولادت ہوئی۔ طبرانی طبریہ کی طرف منسوب ہے۔ ابن خلکان لکھتا ہے کہ طبرستان کی طرف نسبت طبری آتی ہے۔ طلب علم کے لئے حرمین شریفین، یمن، شام، کوفہ، بصرہ، مصر، بغداد اور اصفہان وغیرہ کا سفر کیا۔ آپ کے والد بزرگوار کو علم حدیث سے بڑا شغف تھا۔ بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں انھیں خود لے جایا کرتے تھے۔ تحصیل علم میں انھوں نے بڑی بڑی مشقتیں جھیلی ہیں۔ تیس سال مسلسل بوریے پر سوئے ہیں۔ وسعت علم میں اپنے زمانہ میں ضرب المثل تھے۔

ابوالعباس احمد بن منصور کہتے ہیں کہ میں نے طبرانی سے تین لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ ان کی اکثر تصانیف اس وقت نایاب ہیں۔ حافظ ابن مندہ نے ان سب کا ذکر کیا ہے۔ کتاب السنہ، کتاب المناسک، کتاب عشرۃ النساء، کتاب الاوائل، کتاب دلائل النبوۃ کے سوا انھوں نے ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔۔۔۔ اور حدیث میں تین معجم بھی لکھے ہیں جن کے حوالجات اکثر شروح حدیث میں ملتے ہیں۔ ابن عمید مشہور ادیب اور وزیر تھا اس کا گمان تھا کہ علم و سلطنت کے دونوں عہدے میرے پاس ہیں آج مجھ سے زیادہ عزت کس کو حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ ابوبکر جعابی اور ابوالقاسم طبرانی کے درمیان ابن عمید کے سامنے ایک مکالمہ ہوا۔ دوران گفتگو میں ابوبکر کا پلہ ذکاوت میں اور ابوالقاسم کا کثرت محفوظات میں بھاری نظر آرہا تھا۔ اتفاقاً اثنائے گفتگو میں ابوبکر نے کہا کہ ایک حدیث میرے پاس ایسی ہے جو اس وقت دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے پھر سند بیان کی حدثنا ابو خلیفہ ثنا سلیمان بن ایوب۔ ابوالقاسم طبرانی نے کہا آپ جانتے ہیں کہ سلیمان بن ایوب کون ہیں وہ خود میں ہی ہوں اور ابو خلیفہ میرے شاگرد ہیں آپ اب آپ اس روایت

---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۲۸ و ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹-

ابو حنیفہ کی بجائے براہ راست مجھ سے ہی روایت کیا کیجئے تاکہ ایک واسطہ اور گھٹ جائے اور آپ کی سند عالی ہو جائے۔ یہ سن کر ابوبکر کو بڑی خفت ہوئی۔ ابن عمید کہتے ہیں کہ اس وقت طبرانی کا اعزاز دیکھ کر مجھے ان پر رشک ہونے لگا۔ کاش کہ میں آج طبرانی ہوتا اور وزیر نہ ہوتا کہ یہ فتح و ظفر آج مجھ کو نصیب ہوتا۔ شاہ عبد العزیز لکھتے ہیں کہ یہ رشک بھی ابن عمید میں وزارت کے لطیفہ اثرات کا نتیجہ تھا ورنہ عمر رسیدہ بزرگ پر ایسے امور کچھ اثر انداز نہیں ہوتے۔ آخر عمر میں قرامطہ نے ان پر جادو کر دیا تھا اور اس کے اثر سے ان کی بصارت زائل ہو گئی تھی۔ حافظ ابو نعیم اصبہانی نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ [1]

ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی

ولادت ۳۰۶ھ وفات ۳۸۵ھ

دارقطن بغداد میں ایک بڑا محلہ ہے وہیں ان کا مسکن تھا۔ طلب حدیث کے لئے انھوں نے کوفہ، بصرہ، شام، واسط، مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ مشہور شافعی المذہب تھے۔ حاکم، عبد الغنی، تمام رازی صاحب فوائد اور ابو نعیم صاحب الحلیہ جیسے ائمہ حدیث ان کے زمرہ تلامذہ میں شامل تھے۔ فن علل و اسماء الرجال میں استاد مانے جاتے تھے اور اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ خطیب و حاکم وغیرہ کو آپ کے اس تفوق کا اعتراف تھا۔ فنون حدیث کے علاوہ فن قراءت و نحو میں بھی آپ کو کافی دستگاہ تھی۔ قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اپنے زمانۂ شباب میں اسمٰعیل صفار کی مجلس املاء میں بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرما رہے تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس طرح تو تمہارا سماع معتبر نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف لکھنے میں مشغول ہو اور دوسری طرف حدیث بھی سن رہے ہو۔ دارقطنی نے کہا اچھا جناب کو یاد ہے کہ اب تک شیخ نے کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں انھوں نے کہا نہیں۔ دارقطنی نے فرمایا اٹھارہ حدیثیں۔ پھر ان تمام حدیثوں کو بالترتیب لفظ بہ لفظ سنا دیا یہ دیکھ کر اہل مجلس حیران رہ گئے۔

ابوالحسن بیضاوی ایک شخص کو اپنے ہمراہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص بڑی دور دراز سے علم حدیث طلب کرنے کے لئے آیا ہے براہ مہربانی چند حدیثیں اس کو بھی املا کرا دیجئے۔ دارقطنی نے پہلے تو عذر کیا جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو از راہ ظرافت [illegible] سند کے ساتھ ہی ایک حدیث روایت کی۔

نعم الشیء الهدیة امام الحاجة۔ یعنی حاجت ظاہر کرنے سے قبل کچھ ہدیہ پیش کرنا بہت اچھا ادب ہے۔

---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۱۰۸، ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۵

دوسرے دن وہ شخص مناسب ہدیہ لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور بیس ہزار سندوں کے ساتھ حدیث کا یہ متن املا کرایا۔

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ ‏ جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز شخص آئے تو اس کی توقیر کیا کرو۔

آپ کی علمی ذہانتوں میں سے ایک واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن آپ نماز میں مشغول تھے اور کوئی شخص غلطی سے نسیر کو بشیر پڑھ رہا تھا۔ دارقطنی نے سبحان اللہ کہا تاکہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے مگر وہ عمر و ذئب کی بجائے بشیر یا رے کے ساتھ پڑھنے لگا۔ جب دارقطنی نے دیکھا کہ یہ کسی طرح اصلاح پر نہیں آتا تو آپ نے والقلم ن والقلم وما یسطرون پڑھنا شروع کر دیا تاکہ یہ سمجھ جائے کہ اس راوی کا نام نون کے ساتھ ہے۔ اسی طرح ایک شخص عمرو بن شعیب کو عمرو بن سعید پڑھ رہا تھا یہاں بھی دارقطنی نے سبحان اللہ کہا جب وہ اداء کرنے میں اٹکنے لگا تو دارقطنی نے یہ آیت تلاوت کی "یا شعیب اصلوتک تامرک"

حافظ ابو نصر ماکولا کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فرشتوں سے دارقطنی کا حال پوچھ رہا ہوں انھوں نے مجھے یہ جواب دیا ہے کہ جنت میں ان کا لقب امام ہے۔

مقبرہ باب حرب میں معروف کرخی کے پاس آپ کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔ [۱]

ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکم

ولادت ۳۲۱ھ وفات ۴۰۵ھ

حاکم نیشاپور کے باشندے تھے اور ابن البیع کی کنیت سے مشہور تھے۔ بیع زبان میں بیاس کا ترجمہ بیوپاری کا لڑکا ہے۔ چونکہ یہ قاضی تھے اس لئے حاکم ان کا لقب پڑ گیا تھا۔ طہمان ان کے جد تھے۔ اسی مناسبت سے ان کو طہمانی بھی کہہ دیتے تھے۔ بچپن ہی سے ان کو علم حدیث کا شوق تھا، ان کے والد اور ماموں کو بھی علم حدیث سے بڑا شغف تھا۔ حدیث کی تلاش میں انھوں نے خراسان، ماوراء النہر اور دیگر بلاد اسلامیہ کا سفر کیا ہے ان کے شیوخ کی تعداد دو ہزار تھی جن میں ایک ہزار صرف نیشاپور کے شیوخ تھے۔ ابو ذر ہروی، صاحب روایت بخاری ابو یعلی، ابو القاسم قشیری اور بیہقی وغیرہ جیسے ائمہ حدیث ان سے روایت کرنے والوں کی صف میں داخل ہیں ابو حازم نقل کرتے ہیں کہ حاکم نے آب زمزم پی کر اللہ تعالی سے دعا مانگی تھی کہ مجھے حسن تصنیف مرحمت ہو۔ ان کے زمانے میں تین حافظ حدیث اور بھی تھے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ان کے مابین فیصلہ

---

[۱] تذکرہ ج ۳ ص ۱۹۶ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۳۱

کہا گیا ہے کہ علل حدیث کی معرفت میں تو دارقطنی ممتاز تھے۔ ابن مندہ کثرت احادیث میں۔ عبدالغنی بن سعید انساب میں اور حاکم حسن تصنیف میں۔

خطیب نے ان کو ثقہ کہنے کے باوجود ان میں تشیع کی نکتہ چینی کی ہے۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ سلف میں جو شخص حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتا تھا وہ تشیع سے متہم ہو جاتا تھا۔ رفض اور تشیع میں بہت فرق تھا۔ طبقات الشافعیہ میں بہت تفصیل سے ان کی برأت پر کلام کیا ہے اور اس کا سب سے کھلا ثبوت خود ان کی تصنیف سے پیش کیا ہے کہ انھوں نے مستدرک میں شیخین کی خلافت پر باب۔ انھیں صحیح بتایا کی ہے اسی طرح حضرت عثمانؓ کی فضیلت کے متعلق بھی ایک حدیث روایت کی ہے۔ وہ ان دونوں حدیثوں کو صحیح کہا ہے حالانکہ دونوں کی سند میں کلام کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ اسی لئے حافظ ذہبی نے حاکم کی تصحیح پر تعقب کیا ہے۔ حاکم کی صداقت کے لئے اس سے زیادہ کھلا ہوا ثبوت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تصانیف بہت ہیں۔ ابن خلکان نے ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار لکھی ہے۔ کتاب الاکلیل ان کی بہت مفید تصنیف ہے۔ ہر مفسر کو اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔

علم حدیث کے علاوہ ان کو دیگر علوم میں بھی کافی مہارت تھی لیکن چونکہ یہ زیادہ مشغلہ حدیث ہی کا رکھتے تھے اس لئے محدث مشہور ہو گئے تھے۔ مستدرک حاکم ان کی بہت مشہور تصنیف ہے اور حال میں چھپ بھی چکی ہے۔ حاکم کا بیان ہے کہ اس کی تمام حدیثیں شیخین کی شرط پر ہیں مگر علماء نے ان کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ ذہبی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں اور اسی ضرورت سے انھوں نے تلخیص مستدرک تصنیف فرمائی ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ حاکم کی تصحیح پر کسی کو اعتماد کرنا مناسب نہیں ہے جب تک کہ میری تعقبات نہ دیکھ لے۔ حاکم کے دعویٰ کے بالکل برخلاف ابو سعید کا دعویٰ ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو از اول تا آخر دیکھا ہے اس میں ایک حدیث بھی شیخین کے شرط پر نہیں ہے۔ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابو سعید کا یہ بیان بھی سراسر زیادتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی نصف حدیثیں صحیحین یا ان میں سے ایک نہ ایک کی شرط پر موجود ہیں اور ایک چوتھائی حصہ ایسا ہے جو اگرچہ شیخین کی شرط پر نہ ہو لیکن صحیح ضرور ہے۔ البتہ کتاب کا بقیہ چوتھائی حصہ کمزور اور منکر احادیث پر مشتمل ہے بلکہ اس میں موضوعات بھی ہیں جن پر تلخیص المستدرک میں تنبیہ کر دی گئی ہے اور ان چند حدیثوں کی وجہ ہی سے مستدرک تمام کی تمام بے رونق ہو گئی ہے۔

طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابو الفضل ہمدانی جس کا لقب بدیع الزماں مشہور ہے، نیشاپور آیا۔ اسے اپنے حافظہ پر بڑا ناز تھا۔ سو سو اشعار ایک مجلس میں سنتا اور ایک ہی بار سن کر اس کو اس طرح محفوظ ہو جاتے کہ اول سے آخر تک پھر آخر سے اول تک بالترتیب سنا دیتا جب اس کے سامنے

حفاظِ حدیث کا ذکر آیا تو ان سے اپنے حفظ کے مقابلہ میں ان کو ہیچ سمجھا۔ حاکم کو یہ خبر ملی تو انہوں نے حدیث کا ایک جزو اس کے پاس بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ ایک ہفتہ کی مہلت ہے یاد کر کے سنا دو لیکن بجنسہٖ وہ اجزاء اس نے واپس کر دیئے اور کہا کہ ان مختلف الفاظ، مختلف مضامین اور راویوں کے غیر مرتب اجزاء کو بھلا کون یاد کر سکتا ہے۔ حاکم نے کہا تو اب اپنی حیثیت پہچانو اور آئندہ شیخی کی بات مت بگھارو۔

ان کی وفات اچانک واقع ہوئی۔ ایک دن غسل کے لئے حمام میں تشریف لے گئے جب غسل سے فارغ ہوئے اور لنگی باندھ لی تو ابھی قمیص پہننے نہیں پائے تھے کہ ایک آہ کھینچی اور طائر روح قفس عنصری کو چھوڑ کر گیا۔

ابو محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی

ولادت ۳۸۴ھ وفات ۴۵۶ھ

یہ فارسی الاصل تھے۔ قرطبہ میں ان کی ولادت ہوئی ہے فقیہ، مجتہد اور صاحب تصانیف شخص تھے۔ حفظ نہایت قوی تھا اور انتہا درجہ کے ذکی تھے۔ علوم کی وسعت بے نہایت تھی۔ پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے پھر داؤد ظاہری کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ قیاس کے سرے سے منکر تھے۔ فن منطق محمد بن حسن مذحجی سے حاصل کیا تھا امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اسماء الہیہ کے متعلق میں نے ان کی ایک تصنیف دیکھی اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کس غضب کے حافظ اور ذکی تھے۔ صاعد بن احمد فرماتے ہیں کہ ابن حزم مختلف زبانوں کی مہارت رکھتے تھے اور علوم اسلامیہ کے علاوہ بلاغت اور شاعری وغیرہ میں تمام اہل اندلس پر فائق تھے۔ ان کے فرزند بیان کرتے ہیں کہ میرے والد کی تصنیفات کے اسی ہزار ورق میرے پاس موجود ہیں۔ حمیدی کہتے ہیں ابو محمد حافظ حدیث و مجتہد ہونے کے سوا دیگر علوم میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے وراس کے ساتھ باعمل بھی تھے۔ ہم نے ان جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس میں سرعت حفظ، ذکاوت، تدین اور شرافت مزاج کے سب اوصاف بیک وقت جمع ہوں۔ فی البدیہ اشعار کہنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کی تصانیف میں کتاب الاحکام، محلی والمجلی، اور الفصل فی الملل والنحل وغیرہ دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے تھے کہ فقہاً علم میں نے محلی ابن حزم اور مغنی ابن قدامہ میں دیکھا ہے اتنا کسی اور کتاب میں نہیں دیکھا۔ ذہبی نے بھی ان کی جلالت قدر کو تسلیم کیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے باوجود ان میں ایک فطری کمزوری بھی تھی۔ اپنی رائے پر متشدد رہتے اور اپنے مخالف کی تنقید سخت الفاظ میں

---

۱ تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۸ و الطبقات ج ۳ ص ۱۲ و ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۰ و بستان۔

تجمیل و تحسین حتی کہ ائمہ و محدثین کو بھی نہایت درشت اور نازیبا لہجہ میں تردید کرتے تھے۔

ابن خلکان ابو العباس سے ناقل ہیں کہ حجاج کی تلوار اور ان کی زبان ہم پلہ مشہور تھی اور اسی وجہ سے ان کو جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ انھوں نے مداواۃ النفوس میں خود تحریر فرمائی ہے کہ میری تلی بڑھ گئی تھی اور اس لئے میرے مزاج میں اتنا تغیر پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے خود اس پر تعجب ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مقدمہ ابن الصلاح کی تلخیص میں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ترمذی کے تذکرہ میں یہ تصریح کی ہے کہ ابن حزم اپنی علمی وسعت کے باوجود ترمذی اور ان کی تصنیف سے ناواقف تھے۔ ؎

ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی

ولادت ۳۸۴ھ وفات ۴۵۸ھ

شافعیہ کے بہت بڑے اور مشہور محدث ہیں۔ حاکم، ابو طاہر، ابن فورک متکلم، اور ابو علی روذباری صوفی اور ابو عبد الرحمن سلمی صوفی وغیرہم سے علوم حاصل کئے تھے۔ طلب علم کے لئے کوفہ، بغداد، خراسان، حجاز اور دیگر بلاد اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ بہت کثیر التصانیف محدث تھے۔ ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد ایک ہزار تک شمار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے علم میں بڑی برکت مرحمت فرمائی تھی۔

ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے نصوص شافعی جمع کی ہیں۔ سبکی نے اس پر تعقب کیا ہے اور طبقات میں لکھا ہے کہ ان کو پہلا شخص کہنے کی بجائے آخری شخص کہا جائے تو صحیح ہے۔ ان کے قلم سے ایسی ایسی تصانیف نکلی ہیں جن کی نظیر سابقین میں بھی خال خال ملتی ہے۔ کتاب الاسماء والصفات کی نسبت سبکی فرماتے ہیں کہ اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ دلائل النبوۃ، مناقب الشافعی، دعوات الکبیر، شعب الایمان کو سبکی نے قسم کھا کر بے نظیر کہا ہے۔ سنن کبریٰ، سنن صغریٰ، خلافیات، کتاب الزہد، اربعین کبریٰ و صغریٰ، کتاب الاسرار بھی ان کی تصانیف میں بہت بلند پایہ تصنیف ہیں۔

امام الحرمین فرماتے تھے کہ ہر شافعی مذہب والے پر امام شافعیؒ کا احسان ہے لیکن ایک بیہقی ہیں جن کا احسان خود امام شافعی پر ہے۔ کیونکہ ان کی فقہ کو اس طرح مضبوط و مدلل صورت پر مدون کرنے اور اس کے رائج کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

معرفۃ السنن والآثار کی تصنیف کے دوران میں متعدد اشخاص نے امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا

؎ تذکرہ ج ۲ ص ۲۳۴ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۰ و تہذیب التہذیب

کہ ان کے ہاتھ میں اس کتاب کے چند اجزاء ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ آج نسخہ اصلی کتاب کے سات اجزاء میرے پاس ہیں۔ ان تمام فضائل و کمالات کے باوجود تعجبات میں سے ہے کہ جامع ترمذی، نسائی اور سنن ابن ماجہ ان کے پاس نہ تھیں اس لئے ان تینوں کتابوں کی احادیث کی انہیں اطلاع نہ تھی۔

شہر نیساپور میں ان کی وفات ہوئی۔ پھر ان کا تابوت خسروجرد جو بیہق کا سب سے بڑا شہر تھا منتقل کر کے لایا گیا اور یہیں آپ کو ہمیشہ کے لئے سپرد خاک کر دیا گیا۔

نورالدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الہیثمی

ولادت ۷۳۵ھ وفات ۸۰۷ھ

قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور بچپن سے لے کر وفات تک حضر و سفر میں شیخ زین الدین عراقی کے ساتھ رہے۔ حرمین شریفین، بیت مقدس، دمشق، بعلبک، حمص، حلب، اور طرابلس وغیرہ کے تمام سفر عراقی کے ہمراہ کئے۔ حتیٰ کہ ایسی حدیثوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جو انہوں نے کسی شیخ سے تنہا حاصل کی ہیں۔ عراقی کو ان پر بڑا اعتماد تھا اپنی صاحبزادی کو ان سے منسوب کر دیا تھا اور یہی ان کے بعد ان کے جانشین قرار دیئے گئے تھے۔

مصری علماء میں ابوالفتح میدومی، ابن ملوک، ابن قطروالی۔ اور شامیوں میں ابن الخباز ابن الحموی اور ابن قیم ضیائیہ وغیرہم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ مجمع الزوائد ان کی مشہور ترین تصنیف ہے اس کتاب میں تینوں معاجم، مسند امام احمد، بزار، اور ابو یعلیٰ کے زوائد جمع کئے ہیں۔ راویوں پر جرح و قدح اور روایات پر صحیح و ضعیف کا تفصیلی حکم بیان کیا ہے۔ ابن حبان اور عجلی کی کتاب الثقات جمع کر کے حروف معجم پر اور کتاب الحلیہ کو ابواب کی شکل پر مرتب کر دیا ہے۔

ان علمی خدمات کی وجہ سے متون حدیث ان کو بہت یاد تھے۔ نہایت نرم مزاج سلیم الفطرت اور اہل خیر محدث تھے۔ حافظ ابن حجر نے مجمع الزوائد کا تقریباً نصف حصہ ان کے سامنے پڑھا ہے اور اس کے علاوہ بھی بعض کتابیں پڑھ کر سنائی ہیں۔ حافظ ابی جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔ دنیا میں ان کے بعد دوسرا کوئی حافظ ان کی نظیر کا پیدا نہیں ہوا ان کی حدیثی مہارت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۱ و الطبقات ج ۲ ص ۳

۲؎ یہ کتاب دس ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

ارادہ کیا تھا کہ مجمع الزوائد میں جو مسعودی وہم جیتی آگئے ہیں ان کو تلاش کر کے جمع کر دیں لیکن حافظ نور الدین کی ناگواری کی خاطر یہ ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی اصحاب البرقوقیہ کے باہر مدفون ہوئے۔ [1]

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۱۰، حاشیہ البدر الطالع ج ۱ ص ۱۲۳، والضوء اللامع ج ۵ ص ۲۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب التوحید

إن معرفة الله تعالیٰ مما فطر علیه الإنسان

قال اللہ تعالیٰ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ۔ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ۔ (الاعراف)

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اعتراف انسانی فطرت کی آواز ہے

اور وہ وقت یاد کیجئے جبکہ آپ کے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ بنایا، کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انھوں نے جواب دیا بیشک ہے، ہم گواہی دیتے ہیں یہ اس لیے کیا، کہ کہیں قیامت کے دن عذر کرنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔ یا یہ کہنے لگو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا۔ ہم ان کے بعد ان کی اولاد تھے (تو ہم بھی اسی راستے پر چلے) تو کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو ہم سے پہلے غلط کاروں نے کیا تھا۔ [1]

[1] [illegible]

اسم اللہ الاعظم

اسماء دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن میں صرف ذات ملحوظ ہوتی ہے ان کا مقصد صرف اس ذات کا تعارف ہوتا ہے براہ راست ان کی صفات کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہوتا، دوسرے وہ جن میں خاص کسی نہ کسی صفت کا لحاظ ہوتا ہے ان اسماء سے اس ذات کی کسی خاص صفت ہی کا تعارف ہوتا ہے علمی پہلی قسم اسم ذات اور دوسری اسم صفت کہلاتی ہے، خدا کا ذاتی نام یا اللہ ہے یا رحمٰن باقی جتنے نام ہیں اس کے صفاتی نام ہیں۔ ذات میں چونکہ جملہ صفات کا وجود لپٹا ہوا ہوتا ہے اس لئے اسماء میں اسم اعظم شاید وہی اسم ہو سکتا ہے جس کو اسم ذات کہا جائے اس لحاظ سے اسم اعظم "اللہ" یا "رحمٰن" ہونا چاہئے۔ رحمٰن گو اسم صفت ہے مگر بارگاہ واجب میں رحمت کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کی ذات ہی گویا عین رحمت ہے اس لئے بنی اسرائیل میں رحمٰن خدا کے اسم ذات کی جگہ مستعمل تھا شریعت اسماعیلیہ میں جو اصل اسم ذات تھا وہ خدا کو پکارنے کے لئے بتا دیا گیا اور اسی لئے جو شریعت آخری شریعت اور سب شرائع کی جامع تھی اس نے بسم اللہ میں ان دونوں ناموں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث میں جہاں جہاں نظر ڈالئے وہاں اسماء الٰہیہ میں پہلے لفظ اللہ مذکور ہوتا ہے بقیہ نام اس کے بعد بطور تابع ذکر ہوتے ہیں۔ یہی حال اسم رحمٰن کا ہے۔ جہاں یہ اسم مبارک دوسرے ناموں کے ساتھ مستعمل ہے وہاں یہاں اس کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے اس لحاظ سے بسم اللہ میں پہلا اسم ذاتی ہے اور ایک اسم صفتی۔ اس لئے رحمٰن و رحیم کے یکجا جمع کرنے میں جو پُر از تکلفات جواب دئیے گئے ہیں احقر کے نزدیک ان کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ شریعت موسوی چونکہ جلالی شریعت تھی اس لئے ضرورت تھی کہ اس میں خدا کو ہمیشہ الرحمٰن کہہ کر پکارا جائے، شریعت اسماعیلی جمالی شریعت ہے یہاں اسم ذات وہ رہیگا جو در اصل ذات باری تعالیٰ کے لئے موضوع ہے وہ لفظ اللہ ہے۔

---

(۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِأَنِّيْ أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم

(۸) عبد اللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص

له شیخ اکبر کا اس میں کچھ تردد ہے۔ دیکھو الیواقیت والجواہر ج ۱ ص [illegible] عله اسماعیل [illegible] رحمٰن [illegible]

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ اِذَا دُعِيَ بِهِ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِهِ اَعْطٰى۔ (رواه ابوداؤد والترمذی)۔

(۱۱) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْوَةُ ذِي النُّوْنِ اِذْ دَعَا رَبَّهٗ وَهُوَ فِيْ بَطْنِ الْحُوْتِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اسْتَجَابَ لَهٗ (رواه احمد والترمذی)

(۱۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسْجِدَ عِشَاءً فَاِذَا رَجُلٌ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ هٰذَا مُرَاءٍ قَالَ بَلْ مُؤْمِنٌ

پیدا کرنے والے ہے اے جلال و اکرام والے اے ناقابلِ فنا اور مخلوق کی ہستی قائم رکھنے والے۔۔ (یہ سن کر) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے اللہ کا وہ نام لیکر دعا کی ہے کہ جب وہ اس نام کے ساتھ پکارا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے اور جب اس سے مانگا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے۔ (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۱) سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ذوالنونؑ نے جب اپنے پروردگار کو مچھلی کے پیٹ میں پکارا تھا تو یوں پکارا تھا۔ لا الٰہ الا انت ... سوا تیرے کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے بیشک میں ظلم کرنے والوں میں سے تھا۔ کوئی مسلمان کسی حاجت میں خدا تعالیٰ کو ان کلمات سے پکارتا نہیں مگر وہ ضرور اس کی سنتا ہے (اس حدیث کو احمد ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(۱۲) بریدہؓ فرماتے ہیں کہ عشاء کے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بلند آواز سے قراءت کر رہا ہے میں نے عرض کیا آپ اس کے متعلق کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) [illegible] ... بیت کے ساتھ [illegible] ... ان اسماء میں رکھی گئی ہے [illegible] ... بعض احادیث ... حدیث میں [illegible] ... دوسری انکی تعلیم کے مرتبہ [illegible] ... تفصیل [illegible] نہیں کہ [illegible] کیا جائے

(۱۰) [illegible] ... اس کے نام کی برکتوں سے [illegible] ... ان نام کی برکت [illegible] ... بیشک تو ہی خلق پر [illegible] پروردگار کے اسکی برکت [illegible] آپ نے پیدا کیا۔

نُصَيْبٌ قَالَ وَأَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهُ فَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَسَمَّعُ لِقِرَاءَتِهِ ثُمَّ جَلَسَ أَبُو مُوسَى يَدْعُو فَقَالَ اللّٰهُمَّ إِنِّي أُشْهِدُكَ أَنَّكَ أَنْتَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ سَأَلَ اللّٰهَ بِاسْمِهِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أُخْبِرُهُ بِمَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ فَأَخْبَرْتُهُ بِقَوْلِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِي أَنْتَ الْيَوْمَ لِي أَخٌ صَدِيقٌ حَدَّثْتَنِي بِحَدِيثِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ رزین)

خیال فرماتے ہیں کیا یہ ریاکار ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ وہ خدا کی طرف جھکنے والا مرد مومن ہے۔ بلوی کہتے ہیں کہ یہ زور سے پڑھنے والے شخص ابوموسیٰ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قرات پر کان لگا کر سننے لگے۔ پھر ابوموسیٰ دعا کرنے کے لئے بیٹھے تو بولے اے اللہ میں تجھ کو گواہ بناتا ہوں کہ اللہ بس تو ہی ہے۔ یکتا ہے بے نیاز ہے۔ نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا اس کو جنا نہ اس کا کوئی نظیر و ہمسر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے خدا کا وہ نام لیکر سوال کیا ہے کہ جب وہ اس نام سے سوال کیا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے اور جب پکارا جاتا ہے تو ضرور جواب دیتا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ بات جو میں نے آپ سے سنی ہے کیا ان کو بھی کہہ دوں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ خوشخبری ان کو سنا دی۔ انہوں نے کہا: آج سے تم میرے سچے بھائی ہو کیونکہ تم نے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ خوشخبری سنائی ہے (اس حدیث کو رزین نے روایت کیا ہے)۔

(۱) جواب میں ہوتا تو صرف عقلی بات تھی مگر تعاون و ہمدردی کا ایک پہلو نظر انداز ہو کے ایک خلوص پرستی کو کہہ بتانا چاہیں ہو جس سے صوت آئی بات پہ ناخوش ہوتا ہے کہ یہ ٹھیک تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک بشارت سنائی تھی جس کے ساتھ مسرت کرنی ان کا عام دستور تھا جب اس وقت پھر اور طلوع لگی تھی پھر انہوں نے مقدم اخوۃ ہی قائم کر لیا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کا اندازہ لگائیے کہ ان کے قلب میں اسلام نے باہمی اسلام کے لئے جذبات کیا تھے

اذا دعی بہ اجاب واذا سئل بہ اعطی۔ ان دونوں جملوں میں فرق ہے پہلے جملہ کا مطلب ہے کہ جب اس نام سے کسی کو پکارا جاتا ہے تو اس کے پکارنے والے کی طرح نہیں کہ اس کا جواب تک نہیں آتا۔ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ۔ کافروں کی پکار بیکار جاتی ہے۔

سوال خاص حاجت کی طلب کو کہتے ہیں۔ دعا عام ہے۔ اجابت دعا سے مقصود الٰہی کی طرف سے امداد کی تسلی ہو جاتی ہے۔ جس کی حاجت روائی یقینی نہ ہو۔ جیسے کہ پکارنے کا مقصد بھی سوال نہیں بلکہ اس کی یاد ہے۔ وہی حاجت پیش کرنا یقینی کی عرضی ہے۔ اس نے پہلا جملہ دوسرے سے اعلیٰ ہے۔

(۱۸) وعن جابر عن النبي صلى الله عليه وسلم بينا أهل الجنة في نعيمهم إذ سطع لهم نور فرفعوا رؤوسهم فإذا الرب قد أشرف عليهم من فوقهم فقال السلام عليكم يا أهل الجنة قال وذلك قوله تعالى سلام قولا من رب رحيم قال فينظر إليهم وينظرون إليه فلا يلتفتون إلى شيء من نعيمهم ما داموا ينظرون إليه حتى يحتجب عنهم ويبقى نوره. (رواه ابن ماجة)

(۱۹) عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن الله خلق إسرافيل منذ يوم خلقه صافا قدميه لا يرفع بصره بينه وبين الرب تبارك وتعالى سبعون نورا ما منها من نور يدنو منه إلا احترق. (رواه الترمذي وصححه)

---

(۱۸) جابرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جبکہ جنتی جنت کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے اچانک ان کے سامنے ایک نور بلند ہوگا وہ سر اٹھائیں گے تو دیکھیں گے کہ پروردگار عالم ان پر جلوہ فرما ہے اور فرما رہا ہے اے اہل جنت السلام علیکم۔ قرآن کریم کی آیت سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ (سلام کہا جائے گا پروردگار مہربان کی طرف سے) کا یہی مطلب ہے وہ انہیں دیکھے گا اور یہ اسے دیکھا کریں گے اور دیدار الٰہی میں ایسے مستغرق ہو جائیں گے کہ جب تک ادھر نظر رہے گی جنت کی کسی نعمت کی طرف التفات تک نہ کریں گے یہاں تک کہ دیدار ختم ہو جائے گا اور صرف اس کا نور باقی رہ جائے گا۔ (اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)۔

(۱۹) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے اسرافیل (صاحب صور فرشتہ) کو پیدا فرمایا ہے وہ دونوں پیروں پر کھڑا ہے نظر اوپر نہیں اٹھاتا۔ اس کے اور پروردگار کے درمیان نور کے ستر پردے ہیں ہر پردہ ایسا ہے کہ اگر اس کے قریب بھی جائے تو خاک ہو جائے (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہم نے "نورانی" کے لفظ کو ترجیح دی ہے کیونکہ بعض روایات میں "رایت نورا" کا لفظ بھی موجود ہے ترمذی کے مطابق یہی کہا گیا ہے "نور انی اراہ" پڑھا جائے تو مطلب ہوگا وہ تو نور ہی ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا [illegible] بلکہ [illegible] میں قرآن کا اصل ثابت ہوگا [illegible] جہاں نہیں ہے اس کی [illegible] کی جائے گی۔ قرآن و حدیث خدائے پاک کا جہاں ذکر کرتے ہیں تو اس کو نور ہی کہتے ہیں [illegible] میں اس کا ایک نام "النور" ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا) اللہ تعالیٰ ہی کا نور ہے جس سے روشن ہے [illegible] ذرات کو عالم [illegible] ظلمت [illegible] (بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)۔

(۳۰) عَنْ زُرَارَةَ بْنِ أَوْفَى أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِجِبْرِيلَ هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ فَانْتَفَضَ جِبْرِيلُ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّ بَيْنِي وَبَيْنَهُ سَبْعِينَ حِجَابًا مِنْ نُورٍ لَوْ دَنَوْتُ مِنْ بَعْضِهَا لَاحْتَرَقْتُ (هكذا في المصابيح ورواه أبو نعيم في الحلية عن زرارة بن أوفى إلا أنه لم يذكر فانتفض)

(۳۰) زرارہ بن اوفیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ یہ سن کر وہ کانپ اٹھے اور بولے اے محمد! میرے اور اس کے درمیان نور کے ستر پردے ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کے نزدیک بھی پہنچ جاؤں تو جل جاؤں۔ اس حدیث کو مصابیح میں ایسا ہی روایت کیا ہے لیکن ابو نعیم نے اپنی کتاب الحلیہ میں بواسطہ زرارہ کے اسی سے روایت کی ہے اور جبرئیل علیہ السلام کے کانپنے کا ذکر نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور حجابات کا ستر ہزار ہونا۔ یہ نور جس قدر لطیف اور قوی ہو جاتا ہے اسی قدر اور نگاہ و بصر سے باہر ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وجود ذات پاک تو تجربہ کے انسانی مراتب میں سے وہ تمام دنیا کے ادراک نظر و بصر سے بھی باہر ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ۔ خدا کو کسی کی بصر نہیں پا سکتی . . . .

احادیث میں عالم حجابات کا جہاں تذکرہ ہے وہاں اس کو نور ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کو اس نور پر قیاس کرنا چاہئے۔ نور آفتاب سے نور بصر زیادہ لطیف ہوتا ہے نور بصر سے نور عقل زیادہ لطیف ہے پھر ان میں جس قدر لطافت بڑھتی ہے اسی قدر غیر محسوس ہے جب مخلوقات میں یہ نسبت ہے تو اس سے حجابات کا اندازہ کر لیجئے۔

(حاشیہ حدیث نمبر ۲۸، ۲۹ بقیہ صفحہ گزشتہ)

لہ والد و ولد، عالم و متعلم، احباب و اعزہ کے سلام کی لذت سے تمام دنیا آشنا ہے۔ خالق کے سلام سے لطف اندوزی صرف اہل جنت کا حصہ ہے، یہ شرف و تکریم کی انتہا ہے۔ جو لذت کہ نور حقیقی ہے اس کے احتجاب کے بعد نور کا بقا ایسا ہی ہے جیسا کہ غروب آفتاب کے بعد روشنی کا۔

لہ اس حدیث میں حجاب کا عدد ستر مذکور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں صرف کثرت مراد ہو جیسا کہ اردو میں بھی یہ عدد صرف کثرت کے لئے مستعمل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام مخلوق اور نورانی مخلوق کے درمیان حجاب کا کچھ فرق بھی ملحوظ ہو بہر حال نفس حجاب کا ثبوت یہاں بھی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا)

(۳۰) جبرئیل علیہ السلام جیسے ملک مقرب بھی سراپردۂ عظمت و جلال سے دور محروم رہے ہیں وہ فقط ایک اور صرف ایک ہی ذات تھی جس کے لئے سب حجابات اٹھا کر اعلان کر دیا گیا تھا کہ ذرا اپنے پروردگار کے جمال کا بے پردہ نظارہ کرو۔ سبحان اللہ وہ بندہ بھی کتنا مقرب بندہ ہوگا جس کے لئے وہ سارے حجابات اٹھا دیئے گئے جن میں سے جبرئیل جیسے ملک مقرب کے لئے ایک بھی نہ اٹھ سکا۔

(۲۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقْبِضُ اللهُ الْأَرْضَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَطْوِي السَّمَاءَ بِيَمِينِهِ ثُمَّ يَقُولُ أَنَا الْمَلِكُ أَيْنَ مُلُوكُ الْأَرْضِ (رواہ احمد والشیخان وغیرہم)

(۲۳) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُونَ أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا عَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا وَلَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ عَلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُونَ إِلَى اللهِ تَعَالَى قَالَ أَبُو ذَرٍّ وَاللهِ وَدِدْتُ أَنِّي شَجَرَةٌ تُعْضَدُ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ)

(۲۲) ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا قیامت کے دن خدائے تعالیٰ اپنے ایک دست مبارک میں زمین کو لیگا اور آسمانوں کو لپیٹ کر فرمائیگا کہ میں ہی بادشاہ ہوں اب زمین کے بادشاہ کدھر ہیں۔ (اس حدیث کو امام احمد و شیخین نے روایت کیا ہے)۔

(۲۳) ابوذرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ باتیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چرچر آواز کر رہا ہے اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے کیونکہ اس میں چار انگشت برابر بھی کوئی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ میں پڑا نہ ہو اگر تم وہ باتیں جانتے جو میں جانتا ہوں تو بہت کم ہنستے اور بہت روتے اور اپنے بستروں پر اپنی بیویوں سے لطف اندوز نہ ہوتے اور خدا کی طرف شور مچاتے ہوئے جنگلوں میں نکل جاتے۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں اے کاش میں ایک درخت ہوتا (جو جڑ سے) کاٹ دیا جاتا۔ (حساب کا خطرہ نہ رہتا) اس حدیث کو امام احمد ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(۲۲) محدثین کے نزدیک قبض اور آسمانوں کے طی [illegible] قرآن نے بھی استعمال کیا ہے [illegible] زمین پر کسی کی سلطنت نہیں [illegible] [illegible] کی طرح [illegible]۔ حدیث کا ماحصل عنوان باب سے ظاہر ہے۔

(۲۳) جو بات [illegible] عالم غیب [illegible] ایک دوسرا عالم ہے [illegible] رسول [illegible] سب [illegible] اس کے [illegible] ابوذرؓ جیسا صحابی [illegible] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم غیب عوام کی نظروں سے بالکل پوشیدہ رہتا ہے [illegible] رسول جیسا قلب [illegible] اس سے [illegible] اسے مان لو۔

مَا بَلَغَتْ اُمْنِيَّتُهٗ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ سَائِلٍ مِّنْهُمْ مَّا سَاَلَ مَا نَقَصَنِيْ كَمَا لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ مَرَّ بِشَفَةِ الْبَحْرِ فَغَمَسَ فِيْهَا اِبْرَةً ثُمَّ انْتَزَعَهَا كَذٰلِكَ لَا يَنْقُصُ مِنْ مُّلْكِيْ، ذٰلِكَ بِاَنِّيْ جَوَادٌ مَّاجِدٌ صَمَدٌ عَطَائِيْ كَلَامٌ وَّعَذَابِيْ كَلَامٌ وَّفِيْ رِوَايَةٍ عَطَائِيْ كَلَامِيْ وَعَذَابِيْ كَلَامِيْ اِذَا اَرَدْتُ شَيْئًا اِنَّمَا اَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (رواه احمد ومسلم والترمذی).

(۲۵) وَعَنْهُ فِيْ اُخْرٰى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَرْوِيْ عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّ وَجَلَّ اِنِّيْ حَرَّمْتُ عَلٰى نَفْسِي الظُّلْمَ وَعَلٰى عِبَادِيْ اَلَا فَلَا تَظَالَمُوْا كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ يُخْطِئُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُنِيْ فَاَغْفِرُ لَهٗ وَلَا اُبَالِيْ وَقَالَ يَا بَنِيْ اٰدَمَ كُلُّكُمْ كَانَ ضَالًّا اِلَّا مَنْ هَدَيْتُ وَكُلُّكُمْ كَانَ عَارِيًا اِلَّا مَنْ كَسَوْتُ وَكُلُّكُمْ كَانَ جَائِعًا اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُ

(اور) ایک روایت میں، انسان و جن، چھوٹے اور بڑے، مرد و عورت، زندہ اور مردہ، تر اور خشک سب جمع ہوں اور ان میں ہر سائل جو مانگے جو اس کی انتہائی آرزو ہو پھر ان میں ہر سائل کو میں اس کی منہ مانگی مراد دے دوں تو بھی میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ آئے گی جیسا کہ تم میں کوئی شخص سمندر کے کنارے گذرے اور اس میں سوئی ڈبو کر نکال لے (تو سمندر میں کوئی کمی نہیں آتی) اسی طرح میری سلطنت میں کچھ کمی نہیں آتی اس لئے کہ میں سخی ہوں بزرگی والا ہوں بے نیاز ہوں، بات میری بخشش اور بات میرا عذاب ہے اور (اور) ایک روایت میں ہے میری بات (یعنی) میری بخشش اور میری بات یعنی میرا عذاب پھر کچھ کرنا نہیں پڑتا) اور جب میں کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو صرف یہ کہہ دیتا ہوں کہ موجود ہو جا وہ موجود ہو جاتی ہے

(اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۲۵) ابوذرؓ سے دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے نفس پر بھی ظلم کو حرام کیا ہے اور اپنے بندوں پر بھی ظلم کرنا حرام کیا ہے لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔ تمام اولادِ آدم شب و روز خطا کرتی رہتی ہے پھر مجھ سے معافی مانگتی ہے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا اور فرمایا کہ اے اولادِ آدم تم سب بے راہ تھے مگر جس کو میں نے راہ دکھائی، سب ننگے تھے مگر وہ جس کو میں نے لباس پہنایا، سب بھوکے تھے

---

(۲۵) ترغیب و ترہیب کی حد ہو گئی کہ ظلم کے بارے میں خالق نے اپنے آپ کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا اور اس کی کراہت درست ہیں اپنے آپ کو بھی اپنی مخلوق کے برابر ٹھہرایا۔ مگر مخلوق کی بے دینی کی بھی انتہا [illegible] کہ اس نے اپنے خالق سے آگے بڑھ کر ظلم ہی کو نصب العین بنا لیا

لمنعت الرحمن كذا وكذا تقولوا ما شاء الله ثم شاء محمد (رواه احمد والطيالسي)

(۲۸) عن ابن عباس ان رجلا قال للنبي صلى الله عليه وسلم ما شاء الله وشئت فقال له النبي صلى الله عليه وسلم أجعلتني والله عدلا بل ما شاء الله وحده (رواه احمد)

(۲۹) وعنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان اذا قام الى الصلوة من جوف الليل يقول اللهم لك الحمد انت نور السموات والارض ومن فيهن ولك الحمد انت قيم السموات والارض ومن فيهن ولك الحمد انت رب السموات والارض ومن فيهن ولك الحمد انت الحق وقولك الحق ووعدك الحق ولقاءك حق والجنة حق والنار حق والساعة حق اللهم لك اسلمت وبك امنت وعليك

صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کی قسم میں تمہاری اس بات کو پسند نہ کرتا تھا (بجائے اس کے) یہ کہو کہ ماشاء اللہ محمدؐ (پہلے جو خطاب تھا) اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا (اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد طیالسی نے روایت کیا ہے)۔

(۲۸) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ماشاء اللہ وشئت (جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں) آپ نے اس شخص سے کہا کیا تو نے مجھے اور اللہ تعالیٰ کو برابر کر دیا! صرف یہ کہہ کہ جو اکیلا اللہ چاہے۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۲۹) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شب میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو کہتے اے اللہ تمام تعریف تیرے لئے ہیں زمین و آسمان اور جو مخلوق ان میں ہے سب کا نور تو ہے اور تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں زمین و آسمان اور جو مخلوق ان میں ہے سب کا وجود قائم رکھنے والا تو ہے اور تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں۔ تو حق ہے اور تیرا قول سچا ہے تیرا وعدہ سچا اور تیرا ملنا سچا ہے جنت حق ہے دوزخ حق ہے قیامت کی آمد حق ہے اے اللہ میں تیرا ہی مطیع ہوا تجھ پر ہی ایمان لایا

---

(۲۹) [illegible]

[illegible]

(۴۳) عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی یَسْمَعُہٗ مِنَ اللّٰہِ یَدْعُوْنَ لَہُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْھِمْ وَیَرْزُقُھُمْ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ

(۴۳) ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خدا تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ کلمات سن کر تحمل کرنے والا کوئی نہیں مشرکین اس کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ اس پر بھی انھیں عافیت بخشتا اور روزی پہنچاتا رہتا ہے (اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)۔

باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ

انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا پہلا تعارف اگرچہ صفت ربوبیت کے ذریعہ قائم ہوا ہے مگر ربوبیت کی اصل روح رحمت ہی ہے اس لئے سورۂ فاتحہ میں رب العالمین کے بعد رحمٰن و رحیم کی صفت کا ذکر ہے اگر رحمت نہ ہوتی تو تربیت بھی نہ ہوتی بلکہ تمام جہان کی پیدائش بھی اسی رحمت کا ثمرہ ہے رحمت ہی کا یہ جوش تھا کہ بلا استدعا بلا استحقاق محض عدم کو لباس وجود عطا کیا مگر رحمت کا اقتضاء صرف معدوم کو وجود اور معصوم کو تحسین کرنا نہیں ہوتا تھا اس لئے رحمٰن نے بالقصد نور و ظلمت سے ایک مرکب مخلوق بنائی تاکہ وہ گناہ کرے اور جب وہ بھولے سے بھی استغفار کے لئے ہاتھ اٹھائے تو رحمت کو بخشش کا بہانہ مل جائے یہ گناہ کر کرکے شرمندہ ہوا کرے وہ معاف کر کرکے خوش ہوا کرے۔ فلاسفہ و معتزلہ کو صرف عادل خدا دیکھا ہے مگر ہم گنہگاروں کو وہ عادل ملا ہے جس کے غضب پر اس کی رحمت غالب ہو۔ یہ عجیب بات ہے کہ گنہگاروں کو رحمٰن کی اتنی تلاش نہیں جتنی رحمٰن کو گنہگاروں کی۔ یہی وجہ ہے کہ معصوم موجود تھے مگر گنہگاروں کی جگہ پھر خالی تھی، رحمت کا جوش چاہتا تھا کہ ان کو بخشے جن پر قہر بھی بھڑک چکا ہو۔ جب سے کوئی ایسا نہ ملا تو اس نے ایک مخلوق اسی صفت کی پیدا فرمائی مگر جب یہ مخلوق پیدا ہوئی تو ان میں سے بعضوں نے رحمٰن کا دروازہ چھوڑ دیا رحمت بلاتی رہ گئی اور انھوں نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا مگر جب عمر بھر روگردانی کے بعد بھی یہ آگئی تو رحمت نے سینے لگانے سے کسی کو انکار نہ کیا اور گذشتہ سب گناہ بخش دیئے

خدا کی ذات پاک کسی کی ایذا رسانی سے بالاتر ہے مگر جب کسی کا بنایا ہوا مخلوق اپنی جانب سے ایذا دہی کے سامان تیار کرلیتی ہے تو وہ اس کی اطلاع دیتا ہے کہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں مگر اس کے جواب میں عافیت و رزق فراہم رہتا ہے مگر اس کے برخلاف اگر صرف جواب کا ارادہ کرلے تو سب دنیا ویران ہو جائے ہماری پستی اور اس کی بلندی، ہماری تنگ ظرفی اور اس کی فراخ حوصلگی، ہماری جہالت اور اس کے تحمل کا یہ نقشہ قیامت تک یونہی جاری رہے گا۔ اللہ چاہتا ہے کہ قیامت میں اپنے حلقہ بگوشوں کو اس رسوائی سے بچا لے۔

قلم عفو کھینچنے کا اعلان کر دیا صفت قہر و غضب بھی اپنی تمامیت و کمال کے باوجود مستحقین پر ٹوٹنے کے لئے بھی مشیت کا انتظار کرتی ہے مگر صفت رحمت ہے کہ ہر چیز کو بلا تفریق گھیرے ہوئے ہے رحمتی وسعت کل شیء۔ عالم کا کوئی گوشہ نہیں جسے صفت رحمت سے کوئی نہ کوئی حصہ ملا ہو اسی اعتبار سے عرش پر اسم رحمٰن کی تجلی ہے تاکہ تمام مخلوق رحمت کے نیچے بسر کرے اور اسی لئے جو نوشتہ کہ عرش رحمٰن کی زینت بنا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان رحمتی سبقت غضبی۔

اس سبقت و غلبے کے اظہار کے لئے رحمت کی کچھ کرشمہ سازیاں میدان حشر میں نظر آئیں گی انہیں دیکھ کر خدا کی صفت قہر و غضب سے مطمئن نہ ہونا چاہئے رحمت کی سبقت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں صفت غضب نہیں ہوگی مجرموں کی باز پرس مظلوموں کی داد رسی نہیں ہوگی انسانوں کی بیداری، متکبر جابر سرکش و مفسدوں کے بگاڑ کا کوئی حساب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک انسان سو قتل کرے اور ایک کافر عمر بھر کی بغاوت کے بعد بھی رحمت کی طرف متوجہ ہونا چاہے تو رحمت بے حساب نہیں لگائے گی اور ان جیسے مجرموں کے لئے بھی اس میں وسعت نظر آئے گی۔ لیکن کوئی مجرم اگر صفت رحمت کا خود سہارا نہیں ڈھونڈتا تو اسے خدائی غضب کی پکڑ سے مامون نہیں رہنا چاہئے۔

شیخ اکبر نے سہل تستری اور ابلیس کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے کہ ایک دن ابلیس نے ان سے کہا جب قرآن ورحمتی وسعت کل شیء کہتا ہے (یعنی میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہے) تو پھر کس دلیل سے تم مجھے رحمت سے نکال سکتے ہو کیا میں شے نہیں۔ سہل کہتے ہیں یہ اعتراض سن کر میں حیران رہ گیا اسی دل ہی دل میں اس آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے لگا دفعتہ مجھے خیال آیا کہ اس کے آگے ہی اس کا جواب موجود ہے۔ فسأکتبها للذین یتقون (میں اپنی رحمت ان کے لئے لکھ دوں گا جو متقی ہیں) میں نے بڑی خوشی سے کہا اے ملعون مگر اس رحمت کو اللہ تعالیٰ نے چند قیود کے ساتھ مقید کیا ہے چونکہ تجھ میں وہ صفات نہیں پائی جاتیں تو رحمت کا مستحق بھی نہیں۔ یہ جواب سن کر ابلیس جھک آمیز لہجہ میں مسکرا پڑا اور بولا کہ سہل مجھے یہ خیال تمہارے متعلق نہ تھا کہ تم اور صفات الٰہیہ سے اتنے جاہل ہو گے تقیید تو تمہاری صفت ہے خدا تعالیٰ کی جو صفت بھی ہے وہ قیود کے داغ سے مبرا و منزہ ہے وہاں اطلاق ہی اطلاق ہے۔ سہل کہتے ہیں اس کا یہ اعتراض سن کر میرا منہ خشک ہو گیا اور مجھے کوئی جواب نہ آیا۔ [1]

حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ آیت میں صرف خدائی رحمت کی وسعت کا بیان کیا گیا ہے جو در خود اس میں نہ آئے یہ اس کا قصور ہے رحمت کی وسعت کا نہیں۔ اگر ایک مکان میں سو آدمیوں کی

---

[1] الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۶۷۔

گنجائش ہے مگر اس مکان میں آنے والے صرف پچاس ہی آدمی ہوں تو اس میں مکان کی وسعت کا قصور نہیں بلکہ آنے والوں کی کوتاہی ہے۔ شیطان اور اس سے بڑھ کر متکبر کے لئے بھی رحمت میں ہر وقت گنجائش ہے مگر وہ خود ہی اگر نہ آئے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے۔ اللہم احفظنا واقبلنا کما ترضیٰ۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُہَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ہُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ۔ وَقَالَ تَعَالٰی قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ہُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۔ (زمر)

(۳۴) عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْخَلْقَ کَتَبَ فِیْ کِتَابِہٖ فَہُوَ عِنْدَہٗ فَوْقَ الْعَرْشِ اِنَّ رَحْمَتِیْ تَغْلِبُ غَضَبِیْ۔

(۳۵) وَعَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ یَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰہِ مِنَ الْعُقُوْبَۃِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِہٖ اَحَدٌ وَلَوْ یَعْلَمُ الْکَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰہِ مِنَ الرَّحْمَۃِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِہٖ اَحَدٌ

خدا تعالیٰ کی وسعت رحمت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ میری رحمت میں ہر چیز کی سمائی ہے تو اس کو ان کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ کہہ دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی مہربانی سے آس مت توڑو، بیشک اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ سب گناہ بخش دے سکتا ہے وہی گناہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۳۴) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو لوح محفوظ میں یہ لکھ دیا میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے یہ تحریر اس کے سامنے عرش پر موجود ہے۔

(۳۵) ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اگر مومن جانتا اللہ تعالیٰ کا عذاب کتنا ہے تو اس کی جنت کی کوئی طمع نہ رکھتا اور اگر کافر جانتا خدا کی رحمت کتنی ہے تو اس کی جنت سے کوئی ناامید نہ رہتا۔

(۳۴) کا مطلب یہ ہے کہ تمام مراتب و ... کا علم ہے ... حدیث میں اگر کہیں کتاب و کتابت کا ذکر کیا جاتا ہے اس کو یاد رکھنے کی ضرورت ... کی ... جنت ... کی ضرورت نہیں کیونکہ ... حدیث کے ... جو لوگ ... وہی ... تصور کر لئے ہیں ... (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(٣٦) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَاَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ وَاَنْزَلَ فِي الْاَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ يَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰى تَرْفَعَ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ اَنْ تُصِيْبَهُ ۔

(٣٧) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ اَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ وَبِهَا يَتَرَاحَمُوْنَ وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَلَدِهَا وَاَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَتِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ فِيْ اٰخِرِهٖ قَالَ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ اَكْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَةِ [illegible]

(۳۶) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے ننانوے حصے تو اپنے لئے محفوظ رکھے ہیں اور صرف ایک حصہ زمین والوں کو بخشا ہے یہی ایک حصہ ہے جس سے مخلوق باہم ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتی ہے یہاں تک کہ جانور اپنا پاؤں اپنے بچے سے ہٹا لیتا ہے اس خوف سے کہ کہیں اس پر جا نہ پڑے ۔

(۳۷) ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے لئے سو رحمتیں ہیں جن میں سے اس نے جن و انس جانوروں اور حشرات میں رحمت کا صرف ایک حصہ اتارا ہے یہی ایک حصہ کی وجہ سے وہ باہم ایک دوسرے کی طرف جھکتے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یہی ایک حصہ کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچے سے الفت رکھتا ہے (بقیہ) رحمت کے ننانوے حصوں کو اس نے قیامت کے دن کے لئے رکھ چھوڑا ہے کہ ان سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا ۔ اور مسلم میں ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ان ننانوے حصوں کو رحمت کے اس ایک حصہ سے پورا کرکے (پوری سو کی) سو رحمتوں سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا ۔ ان چار حدیثوں کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رحمت کی سبقت کا یہ مطلب ہے کہ مذکورہ تحریر کے سبب سے ہر مخلوق رحمت کو غضب کا استحقاق [illegible] رحمت ہمیشہ غضب سے آگے رہتی ہے یہ کتاب اس نے عرش پر رکھا ہے کہ اس کے نیچے بعنوان مخلوق [illegible] کی حاجت رحمت کے ماتحت ہوئی صفت انتقام بطرف صفت غضب کے ماتحت نہ رہا ۔

(۲) یہ عنوان صفات کمالیہ کا ہے کہا جاتا ہے کہ ہر ایک اپنی جگہ اتنی کامل ہے کہ ایک کا تقاضہ دوسرے کے تصرف سے مختل نہ ہو جائے مگر خدا کی ذات کا وہ کمال ہے کہ اس کی ہر شان ہر وقت یکساں ظہور کرتی رہتی ہے وہ عین رحمت کے حال میں غضب اور عین غضب کے حال میں رحمت کرتا رہتا ہے ۔ نَبِّئْ عِبَادِيْ اَنِّيْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (میرے بندوں کو مطلع کر دیجئے کہ غفور رحیم صرف میں ہی ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے ۔ ([illegible] حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۳۸) عَنْ جُنْدُبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ وَأَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى قَالَ مَنْ ذَا الَّذِي يَتَأَلَّى عَلَيَّ أَنْ لَا أَغْفِرَ لِفُلَانٍ فَإِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَأَحْبَطْتُ عَمَلَكَ أَوْ كَمَا قَالَ وَفِي رِوَايَةٍ لَا يَسْتُرُ اللّٰهُ عَلَى عَبْدٍ فِي الدُّنْيَا إِلَّا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواہ مسلم)

(۳۹) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّهُ قَالَ قُدِمَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ بِسَبْيٍ فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ تَبْتَغِي إِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ أَخَذَتْهُ فَأَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَأَرْضَعَتْهُ فَقَالَ لَنَا

---

(۳۸) جندبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا یہ کون ہے جو مجھ پر قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کو نہیں بخشوں گا (جا) میں نے فلاں کو بخشا اور تیرے عمل اکارت کئے (راوی کو تردد ہے کہ یہ یا اس کے مشابہ کوئی جملہ فرمایا) اور ایک روایت میں یہ ہے جس بندہ کی اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ پوشی فرمائے (امید ہے کہ) آخرت میں بھی ضرور اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(۳۹) عمر بن الخطابؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے۔ ان میں ایک عورت نظر پڑی جو اپنا بچہ تلاش کرتی پھرتی تھی جونہی کہ اس کو بچہ مل گیا اسی وقت اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ... غیر محدود رحمت کے تصور سے عقل عاجز ہے اور اس کو سمجھانا ... تمام عالم ... رحمت الٰہی کا ... اور تم ... اس رحمت میں ... آپس میں ... ظاہر ہوگی کیا ... ہے اس لئے ... کے لئے ایک قریبی مثال بیان کیا ہے ... کہ انسانی ... غیر محدود رحمت کے اندازہ کرنے کا ... غیر محدود ... تقسیم کیا جا سکتا ... حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ... جنت ... جنت میں جانا ... رحمت الٰہیہ ... کے مقابلہ میں رحمت کا ایک جز بنایا گیا ہے۔ حدیث ... کی ... تفہیم مقصود ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) (۳۸) مسند امام احمد میں اس واقعہ کی تفصیل ہے کہ بنی اسرائیل میں دو دوست تھے ایک عبادت گذار (دوسرا) گنہگار تھا۔ یہ اس کو سمجھاتا رہتا کہ گناہ مت کیا کر۔ وہ جواب دیتا کہ تجھ کو کیا ... مجھ کو اور میرے رب کو ... ایک دن اس نے گناہ کرتے دیکھا تو ... اس نے کہا ... غصہ آیا اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ خدا تیری مغفرت نہیں کرے گا اور نہ تجھے اپنی جنت میں داخل کرے گا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے موت کا فرشتہ بھیجا اس نے دونوں کی روح قبض کر لی جب ... کے سامنے ... گنہگار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جا تو میری رحمت کی (وجہ سے) جنت میں چلا جا۔ پھر ... سے کہا کیا تیری یہ طاقت ہے کہ تو میرے بندہ پر میری رحمت روک سکے؟ ... دوزخ میں لے جاؤ۔ اس حدیث میں اس کی صفت رحمت کا مظہر ہے ... کہ ... [illegible] ... کی بات پر گرفت فرمائے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

بِي شَيْئًا لَقِيتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً. رواه مسلم والترمذي ولفظه قال الله تعالى يا ابن آدم إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ عَلَى مَا كَانَ فِيكَ وَلَا أُبَالِي يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِي يَا ابْنَ آدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيتَنِي لَا تُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً.

(۴۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى قَالَ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ

اس کے اتنا ہی قریب ہوں گا اور جو میری طرف ٹہلتا ہوا آئے گا میں اس کی طرف لپکتا ہوا آؤں گا جو مجھ سے زمین کے برابر گناہ کر کے ملے گا میں اس سے اتنی ہی بڑی مغفرت لیکر ملوں گا۔ بشرطیکہ اس نے میرا کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہو۔ اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے ابن آدم جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امید لگائے رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا خواہ تیرے عمل کیسے ہی ہوں اور میں بے نیاز ہوں اے ابن آدم اگر تیرے گناہوں کا ڈھیر آسمان تک پہنچ جائے پھر تو مجھ سے معافی مانگنا چاہے تو میں تیرے پاس اتنی ہی مغفرت لیکر آؤں گا بشرطیکہ تو نے کسی کو میرا شریک نہ ٹھیرایا ہو اور میں بے نیاز ہوں اے ابن آدم اگر تو زمین کے برابر خطاؤں کا بوجھ لیکر میرے پاس آئے اور مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تو نے شرک نہ کیا ہو تو میں اسی کے برابر تیرے پاس مغفرت لیکر آؤں گا۔

(۴۷) ابو ہریرۃ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے میرا بندہ میرا تقرب

(۲) عاشقوں کے درمیان ہر طرح بہت سے نکتے کہے جاتے ہیں اور وقت بہ وقت نظر آنے لگے ہیں جب ایک عجیب شخص بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایسا ہے کہ ان دونوں میں کوئی ایسا امر مخصوص ہے جس میں ان کا تعلق ہے جس کو ظاہر کر دیا ہے وہ دیکھتا ہے کہ نشست و برخاست کے اوضاع و اطوار کے تذکرے کے خیال میں بھی مشترک ہو گیا ہے۔ جب آنحضرت کے اقوال و افعال اور حالات کے اتحاد کے ساتھ ظاہر ہو گیا یہ اتحاد کی تعریف سے لگتا ہے تو اس اتحاد کی صحیح ترجمانی کے لئے تنہا اتحاد کے سوا کوئی لفظ ہی نہیں ملتا ہے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ‏ ‏ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

متنبی کہتا ہے

ما الخل إلا من أود بقلبه ‏ ‏ وأرى بطرف لا يرى بسوائه

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

فعلم ان له ربا یغفر الذنب ویاخذ بالذنب ثم عاد فاذنب فقال ای رب اغفر لی ذنبی فقال تبارک وتعالی عبدی اذنب ذنبا فعلم ان له ربا یغفر الذنب ویاخذ بالذنب ثم عاد فاذنب فقال ای رب اغفر لی ذنبی فقال تبارک وتعالی اذنب عبدی ذنبا فعلم ان له ربا یغفر الذنب ویاخذ بالذنب اعمل ما شئت فقد غفرت لک۔

(۴۳) وعنه ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال قال رجل لم یعمل حسنۃ قط لاھلہ اذا مات فحرقوہ ثم اذروا نصفه فی البر ونصفه فی البحر فواللہ لئن قدر اللہ علیہ

گناہ کیا اور جانتا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار بھی ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ اس کے کچھ مدت بعد پھر گناہ کرتا اور کہتا ہے کہ اے رب میرا گناہ بخش دے حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے گناہ کیا اور جانتا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد وہ بندہ گناہ کرتا اور کہتا ہے کہ اے رب میرا گناہ بخش دے حق تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کیا اور یہ سمجھا کہ کوئی اس کا پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر گرفت کرتا ہے (اگر تیری انابت کا یہی طور ہے) تو اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔

(۴۳) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے جس نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا تھا اپنے گھر والوں سے وصیت کی کہ دیکھو جب میں مر جاؤں تو اسے جلا کر اس کی نصف خاک جنگل میں اڑا دینا اور نصف دریا میں بہا دینا۔ خدا کی قسم۔ اگر کہیں حق تعالیٰ نے

۱؎ یعنی خدا کی رحمت پر اعتماد اور اس کی قدرت پر پورا یقین رکھنے کی وجہ سے یہ بندہ مغفرت کا مستحق ہو گیا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

حدیث انا عند ظن عبدی بی کا مفہوم یہی ہے یعنی خدا تعالیٰ کا اپنے بندے سے معاملہ اس کے اعتماد و وثوق کے بقدر ہوتا ہے اگر اس کو یہ یقین ہے کہ گناہوں پر گرفت یا چشم پوشی کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں تو خدا تعالیٰ بھی اس کے اس حسن عقیدت کا خلاف کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور اس کے لئے مغفرت کا اعلان کر دیتا ہے "جو چاہے کر" یہ لفظ تہدید و تخویف، اعزاز و تشریف کے دونوں مقام پر بولا جاتا ہے۔ اور دونوں جگہ اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ قرینہ مقام کے مناسب یہ صرف تخویف مراد ہوتی ہے یا تشریف۔ قرآن کریم میں اعملوا ما شئتم "فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" اسی محاورہ پر استعمال ہوا ہے۔ محاورات پر منطق چلانا نہیں چاہئے۔

بِمَعْصِيَتِهِ عَذَابًا لَا يُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ فَلَمَّا مَاتَ الرَّجُلُ فَعَلُوا مَا أَمَرَهُمْ فَأَمَرَ اللّٰهُ الْبَرَّ فَجَمَعَ مَا فِيهِ وَأَمَرَ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِيهِ ثُمَّ قَالَ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ وَأَنْتَ أَعْلَمُ فَغَفَرَ اللّٰهُ لَهُ۔

(۴۳) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ أَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ نَفْسًا فَسَأَلَ عَنْ أَعْلَمِ أَهْلِ الْأَرْضِ فَدُلَّ عَلَى رَاهِبٍ فَأَتَاهُ فَقَالَ إِنَّهُ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ نَفْسًا فَهَلْ لَهُ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ لَا فَقَتَلَهُ فَكَمَّلَ بِهِ مِائَةً ثُمَّ سَأَلَ عَنْ أَعْلَمِ أَهْلِ الْأَرْضِ فَدُلَّ عَلَى رَجُلٍ عَالِمٍ فَأَتَاهُ فَقَالَ إِنَّهُ

اس کو جمع کر لیا تو ایسا عذاب دیگا کہ تمام جہان میں ایسا عذاب کسی کو نہ دیگا۔ اس شخص کا انتقال ہوگیا اور گھر والوں نے اس کی وصیت پوری کر دی۔ حق تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا (کہ اس کے اجزاء جو پھیلے ہوئے ہیں جمع کر دے) اس نے سب جمع کر دیئے اور (اسی طرح) سمندر کو حکم دیا تو اس نے بھی اس کے جو اجزاء اس میں تھے جمع کر دیئے اس کے بعد فرمایا (بتلا) تو نے یہ حرکت کیوں کی تھی اس نے عرض کیا اے پروردگار صرف تیرے خوف و ڈر سے اور تو خود خوب واقف و دانا ہے۔ اس پر حق تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔

(۴۳) ابو سعید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلی امتوں میں ایک شخص تھا اس نے ننانوے قتل کئے اور اپنے شہر کے سب سے بڑے عالم کو دریافت کیا تو اس کو ایک درویش کا پتہ بتا دیا گیا وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اس نے ننانوے قتل کئے ہیں کیا اب بھی اس کے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے اس نے جواب دیا نہیں۔ اس نے اسے بھی قتل کر ڈالا اور پورے سو کر دیئے پھر کسی بڑے عالم کو دریافت کیا تو کسی دوسرے عالم کا پتہ بتا دیا گیا وہ اس کے پاس پہنچا اور

یہاں اس گنہگار نے شدت خوف و مایوسی کے عالم میں عذاب الٰہی سے نجات کا ایک غلط راستہ تجویز کیا تھا اور اس اضطراب میں عجیب سے عجیب کلمات ایک جاہل کے منہ سے نکل سکتے ہیں نکال دیئے تھے جب شریعت نے اس کی گرفت نہیں کی تو آپ بلا وجہ کیوں اس پر گرفت کرتے ہیں ایک جاہل کے الفاظ سے اس کے عقائد کا اندازہ لگانا چاہئے اس کی عبارت ہمیشہ قاعدوں کے اتفاق ہمیشہ ناتمام ہوتے ہیں۔ غلط عمل ہمیشہ غلط ہے اور کسی وقت قابل تحسین نہیں مرتبہ اگر ایسی ہو تو جہالت کی بعض صورتوں میں رحمت اسے تنہا بھی چھوڑ سکتی ہے یہاں اس شخص کی مغفرت سے اس کے عمل کا تحسین نہ سمجھنا چاہئے بلکہ یہ کرشمۂ رحمت ہے۔ رحمت کے ساتھ جب ایک شریعت کا اعتبار حائل ہو تو اس قسم کے کرشموں کا ظہور ضروری ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

قَتَلَ مِائَةَ نَفْسٍ فَهَلْ لَهُ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ نَعَمْ وَمَنْ يَحُولُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ التَّوْبَةِ انْطَلِقْ إِلَى أَرْضِ كَذَا وَكَذَا فَإِنَّ بِهَا أُنَاسًا يَعْبُدُونَ اللّٰهَ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مَعَهُمْ وَلَا تَرْجِعْ إِلَى أَرْضِكَ فَإِنَّهَا أَرْضُ سَوْءٍ فَانْطَلَقَ حَتَّى إِذَا نَصَفَ الطَّرِيقَ أَتَاهُ الْمَوْتُ فَاخْتَصَمَتْ فِيهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلَائِكَةُ الْعَذَابِ فَقَالَتْ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ جَاءَ تَائِبًا مُقْبِلًا بِقَلْبِهِ إِلَى اللّٰهِ وَقَالَتْ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ إِنَّهُ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ فَأَتَاهُمْ مَلَكٌ فِي صُورَةِ آدَمِيٍّ فَجَعَلُوهُ بَيْنَهُمْ فَقَالَ قِيسُوا مَا بَيْنَ الْأَرْضَيْنِ فَإِلَى أَيَّتِهِمَا كَانَ أَدْنَى فَهُوَ لَهُ فَقَاسُوهُ فَوَجَدُوهُ أَدْنَى إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي أَرَادَ فَقَبَضَتْهُ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ (رواه الثلاثة الشيخان)-

کہا اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہو کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا ہاں کون اس کی توبہ کے درمیان حائل ہو سکتا ہے فلاں فلاں بستی میں چلا جا جہاں خدا تعالیٰ کے عبادت گزار بندے رہتے ہیں تو بھی جا کر ان کے ساتھ عبادت کر اور اپنے وطن کی طرف واپس مت لوٹ کہ وہ معصیت کی زمین ہے وہ چلا جب نصف راستہ پہنچا تو اس کی موت آ گئی یہاں عذاب و رحمت کے فرشتوں میں بحث ہونے لگی رحمت کے فرشتوں نے کہا یہ توبہ کر کے خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو کر آ رہا تھا عذاب کے فرشتوں نے کہا اس نے اپنی گزشتہ زندگی میں کبھی کوئی نیک کام کیا ہی نہ تھا۔ اسی درمیان میں ان کے پاس انسانی صورت میں ایک فرشتہ آیا انہوں نے اس کو پنچ بنا لیا اس نے کہا اچھا دونوں زمینوں کا فاصلہ ناپو جس طرف وہ زیادہ قریب نکلے ادھر ہی کا سمجھا جائے ناپا تو وہ ادھر زیادہ قریب نکلا جدھر اس نے پہنچنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لئے رحمت کے فرشتوں نے اُسے قبضہ میں لے لیا۔ (ان تینوں محدثوں اور شیخین نے روایت کیا ہے)-

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حدیث میں لفظ لاابالی مجھے پروا نہیں اسی امید و بشارت کی طرف اشارہ ہے خدائی رحمت کے سمندر اگر رحمت کا غلبہ ہو تو پہاڑ سے بڑا گناہ بے وزن ہو جاتا ہے اور اگر رحمت و عدل کا میزان ہو تو بڑی سے بڑی عبادت بے وزن ہے۔ ضعیف انسان کی سراپا ناقص عبادت کا وزن ہی کیا ہو سکتا ہے اس میں تمام وزن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب شرف قبولیت میسر آ جائے۔

(۴۳) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بے گناہ قتل بڑا ہی عذاب آمیز عمل ہے اور سو بے گناہ قتل پر امام قرطبی نقل و قائم کرنا رب کی مرضی اور رحمت کی بات ہے کہ یہی آدمی توبہ کے عمل کرتے۔ اس حدیث کے ایک طریق میں تھوڑا سا جز اور ہے وہ یہ کہ جب فرشتوں نے زمینوں کی پیمائش شروع کی تو اس کو حکم ہوا کہ جس طرف سے آ رہا تھا اس طرف زیادہ قریب ہو جائے اور جس طرف جا رہا تھا اس طرف قریب ہو جائے۔ جب انہوں نے پیمائش کی تو جس طرف اس کا رخ تھا ایک بالشت زمین بڑھی ہوئی نکلی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(٤٥) عن ابن عمر قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يحدث حديثا أكثر من سبع مرات سمعته يقول كان الكفل من بني إسرائيل لا يتورع من ذنب عمله فأتته امرأة فأعطاها ستين دينارا على أن يطأها فلما قعد منها مقعد الرجل من امرأته أرعدت وبكت فقال ما يبكيك أأكرهتك؟ قالت لا ولكنه عمل ما عملته قط وما حملني عليه إلا الحاجة فقال تفعلين أنت هذا وما فعلته اذهبي فهي لك وقال لا والله لا أعصي الله بعدها أبدا فمات من ليلته فأصبح مكتوبا على بابه إن الله قد غفر للكفل (رواه الترمذي)

(۴۵) ابن عمرؓ کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث سات مرتبہ سے زیادہ بولتے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ کفل بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا (یہ وہ کفل نہیں ہے جن کا قرآن کریم میں ذکر ہے) کسی گناہ سے پرہیز نہ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عورت اس کے پاس آئی اس نے ساٹھ دینار اس شرط پر اس کو دیئے کہ اس سے زنا کرے جب وہ اس جگہ بیٹھ گیا جہاں مرد اس خیال سے عورت کے سامنے بیٹھا کرتا ہے تو وہ کانپ اٹھی اور رو پڑی۔ اس نے پوچھا کیوں روتی ہے؟ کیا میں نے تجھے کچھ مجبور کیا ہے؟ وہ بولی نہیں لیکن یہ کام کبھی میں نے اپنی عمر بھر نہیں کیا تھا مگر اب میری محتاجی کی مجبوری سے کرنا پڑتا ہے اس نے کہا اچھا کبھی تو نے یہ کام نہیں کیا؟ اور اب مجبوراً کرتی ہے جا یہ دینار میں نے تجھے یونہی بخشے اور قسم کھائی کہ آج کے بعد میں کبھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا (اتفاق) کہ اسی شب میں اس کا انتقال ہو گیا صبح کو اس کے دروازہ پر نوشتہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے کفل کو بخش دیا۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کر یا تو اس نے ان دو متضاد آئینوں میں باہم خود ترتیب کی یہ صورت تجویز کر لی کہ اس کا فضل بصورت عدل ہی نمودار ہو۔ اس لئے زمین کی ناپ تول تو اس لئے تھی کہ عدل کی صورت محفوظ رکھی جائے۔ صرف ایک بالشت بھر زمین کی زیادتی پر مغفرت اس لئے ہوئی کہ آپ کے فضل کا مظاہرہ ہو جائے۔ جہاں اس بیان سے صرف ایک بالشت چھوٹنے کا نکتہ بھی حل ہو گیا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہو گیا ہوگا کہ عدل و فضل کی باگ صرف بخشنے والے قدرت میں ہے اس لئے صفت عدل پر نظر کرے۔ یہ دیکھ کر اس کے فضل پر بھروسہ کر کے بے فکر بھی نہ ہونا چاہئے نہیں۔ بلکہ خوف و رجاء رکھنا۔ اپنے رب کی اس طرح رکھنا چاہئے کہ اس کے قہر کا خوف اور اس کی مہربانی کا بھروسہ لگا رہے۔

(۴۵) ..... بعض عمل اپنے عزم و خلوص کی وجہ سے مقبولیت کا وہ رتبہ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کا تنہا وجود مغفرت کا سامان بن جاتا ہے۔ یہ صرف انسانی عمل کا کمال نہیں بلکہ رحمت کی فیاضی کی بات ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۴۶) عن ثوبان عن النبي صلى الله عليه وسلم قال إن العبد ليلتمس مرضاة الله فلا يزال بذلك فيقول الله عز وجل لجبريل إن فلانا عبدي يلتمس أن يرضيني ألا وإن رحمتي عليه فيقول جبريل رحمة الله على فلان ويقولها حملة العرش ويقولها من حولهم حتى يقولها أهل السماوات السبع ثم تهبط له إلى الأرض (رواه احمد)

(۴۷) عن عامر الرام قال بينا نحن عنده يعني عند النبي صلى الله عليه وسلم إذ أقبل رجل عليه كساء وفي يده شيء قد التف عليه فقال يا رسول الله مررت بغيضة شجر فسمعت فيها أصوات فراخ طائر فأخذتهن فوضعتهن في كسائي

(۴۶) ثوبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں رہتا ہے اور اسی تلاش میں لگا ہی رہتا ہے تو اللہ عز وجل جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں فلاں میرا بندہ مجھے راضی کرنے کی تلاش میں ہے تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری رحمت اس کے لئے ہو چکی یہ سن کر جبرئیل علیہ السلام آواز لگاتے ہیں کہ فلاں شخص پر خدا کی رحمت ہو اس کے بعد حاملین عرش بھی یہ آواز دیتے ہیں پھر آس پاس کے فرشتے یہی کہتے ہیں یہاں تک کہ ساتوں آسمان والے یہی کہتے ہیں اس کے بعد اس کے لئے اہل زمین (کے قلوب) میں رحمت پیدا ہو جاتی ہے۔
(اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۴۷) عامر رام روایت فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی خدمت میں (راوی تفسیر کرتا ہے) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اس پر ایک کملی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو اس میں لپیٹ رکھی تھی اس نے کہا یا رسول اللہ میں جھاڑیوں میں گذرا تو مجھے پرندوں کے بچوں کے بولنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ عمل تنہائی میں کیا گیا تھا مگر اس پر خدائی خوف کا جو نقشہ اس نے پیش کیا شاید کوئی عمر بھر کا ایک مشکل سے مشکل عمل بھی اس کا بدل نہ ہو سکے اس طرح اللہ کو جہاں انسان کی کمزور فطرت قابل رحم تھی وہیں یہ سختی پھر آئندہ کے لئے خدا کی نافرمانی سے احتراز کا عزم کر لینا ایک پسندیدہ عمل تھا کہ اس کی یہی ادا رحمت نے اس کی ساری غریب سے کاروں سے افضل کر دیا ... اسرائیل کی سنت کے مطابق اس کی مغفرت کا قصہ ہوا انسان لوگوں نے دیکھ لیا۔ بنی اسرائیل میں یہ سنت متروک ہو گئی کہ جب حق تعالیٰ کی محبت سے بندہ کا دل لبریز ہو ... نظر نہیں

(۴۶) ۔ ۔ ۔ ۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت و محبت اصحاب کو نہیں خدا کی طرف سے محبت کا ثمرہ ہے اسی سے عمل مشہور ہے صدائے خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

فجاءت أمهن فاستدارت على رأسي فكشفت لها عنهن فوقعت عليهن فلففتهن بكسائي فهن أولاء معي قال ضعهن فوضعتهن وأبت أمهن إلا لزومهن فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أتعجبون لرحم أم الأفراخ فراخها والذي بعثني بالحق لله أرحم بعباده من أم الأفراخ بفراخها ارجع بهن حتى تضعهن من حيث أخذتهن وأمهن معهن فرجع بهن (رواه ابو داود)

(۴۸) عن عبد الله بن عمر قال كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في بعض غزواته فمر بقوم فقال من القوم فقالوا نحن المسلمون وامرأة تحضب بقدرها

کی آواز آئی میں نے ان کو پکڑ لیا اور اپنی کملی میں رکھ لیا۔ ان کی ماں آئی اور میرے سر پر گھومنے لگی میں نے کملی بچوں کے اوپر سے ہٹا دی وہ بچوں پر آ پڑی میں نے سب کو لپیٹ لیا اور وہ سب میرے ساتھ یہ موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ان کو نیچے رکھ دو میں نے رکھ دیا۔ ان کی ماں ان سے پھر جدا نہ ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔ کیا تم اس ماں پر اپنے بچوں کی اس محبت سے تعجب کرتے ہو۔ اس ذات کی قسم ... جس نے مجھے بھیجا ہے جتنی اس کو اپنے بچوں سے محبت ہے خدائے عزوجل کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت ہے جاؤ اور جہاں سے تم نے ان بچوں کو پکڑا ہے وہیں رکھ آؤ اور ان کی ماں کو بھی ان کے ساتھ لیجاؤ وہ شخص ان سب کو لیکر واپس چلا گیا (اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

(۴۸) عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ہم ایک غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے آپ کا ایک قوم پر گذر ہوا تو آپ نے ان سے دریافت کیا کون لوگ ہو؟ وہ بولے مسلمان۔ ان میں ایک عورت اپنی ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ تھا جب آگ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قرآن کریم نے یہ اصول ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا — جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے رحمٰن ضرور محبت پیدا کرے گا۔

(۴۷) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا انداز تعلیم ہے کہ لوگوں کے فہم کے قریب بیان ذات و صفات کے مشکل مسائل ایسے دلپذیر طریقہ پر ذہن نشین کر دئے جاتے ہیں کہ محبت و نصرت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں پر کسی غور و خوض حکمت و منطق کے عنوانات نہیں رہتے جس طرح ماں کی محبت ایک بدیہی اور یقینی حقیقت ہے وہ خدا کی محبت کا ایسا ہی یقین پیدا کر دیتے ہیں جو اس کے بعد نہ عقل مدہوش ہو کر کیف و سرور، لذت و مسرت محسوس ہونے لگتا ہے جو فطری احساسات میں ہوا کرتا ہے۔

وَمَعَهَا ابْنٌ لَهَا فَإِذَا ارْتَفَعَ وَهَجٌ تَنَحَّتْ بِهِ فَأَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ
أَنْتَ رَسُولُ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي أَلَيْسَ اللّٰهُ أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ قَالَ
بَلَى قَالَتْ أَلَيْسَ اللّٰهُ أَرْحَمَ بِعِبَادِهِ مِنَ الْأُمِّ بِوَلَدِهَا قَالَ بَلَى قَالَتْ إِنَّ الْأُمَّ لَا تُلْقِي
وَلَدَهَا فِي النَّارِ فَأَكَبَّ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْكِي ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ إِلَيْهَا فَقَالَ
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِهِ إِلَّا الْمَارِدَ الْمُتَمَرِّدَ الَّذِي يَتَمَرَّدُ عَلَى اللّٰهِ وَأَبَى أَنْ
يَقُولَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ. رواه ابن ماجه۔

(۴۹) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَا أُحِبُّ
أَنَّ لِيَ الدُّنْيَا بِمَا فِيهَا بِهٰذِهِ الْآيَةِ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا الْآيَةَ

لپٹ اٹھتی اپنے بچہ کو ایک طرف ہٹا لیتی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی رسول اللہ
آپ ہی ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا میں ہی ہوں تو بولی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا خدا
ارحم الراحمین نہیں؟ آپ نے فرمایا بیشک ہے۔ اس نے کہا کیا خدا اپنے بندوں پر زیادہ مہربان نہیں بہ نسبت
ایک ماں باپ کے اپنے بچوں پر؟ فرمایا بیشک ہے۔ اس نے کہا ایک ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں نہیں
ڈال سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا سر مبارک جھکا لیا اور رو پڑے پھر سر اٹھایا اور فرمایا
خدا اپنے بندوں میں کسی کو عذاب نہیں دیگا مگر صرف اس سرکش کو جس کی سرکشی خدا کے ساتھ بھی قائم ہے
جو لا الہ الا اللہ کہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ (اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

(۴۹) ثوبان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے اگر اس آیت کے
بدلہ میں مجھے تمام دنیا مل جائے تو بھی مجھے پسند نہیں یا عبادی الخ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی

---

(۴۸) اس عورت کے سوال پر خدا کی بے نہایت رحمت کا نقشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آگیا اور آپ پر
گریۂ رحمت طاری ہو گیا۔ اس تاثر اور بے خودی کے عالم میں اس کو آپ نے اتنا ہی مختصر جواب دیدیا کہ خدا کی
رحمت نے تو کسی کو اپنے دامن سے باہر نہیں رکھا مگر کیا کیا جائے کہ اس کی بعض سرکش مخلوق نے خود ہی اس کے
دامن میں آنے سے انکار کر دیا۔

(۴۹) بغوی معالم میں ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشی قاتل حمزہ کو
جب دعوت اسلام دی تو اس نے کہلا بھیجا کہ میں نے تو قتل، زنا، شرک سب ہی کچھ کیا ہے اور قرآن کہتا ہے ومن
یفعل ذلک یلق اثاما یضاعف له العذاب یوم القیامة (جو یہ گناہ کرے گا انہیں اس کا صلہ ملکر رہیگا
اور اس کو دوگنا عذاب ہوگا) پھر میں اسلام کیا قبول کر کے کروں گا (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ أَشْرَكَ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ أَلَا وَمَنْ أَشْرَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (رواه احمد)

(۵۰) عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا وَلَا يُبَالِيْ (رواه احمد والترمذی)

جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے امید نہ توڑو۔ ایک شخص نے عرض کیا اچھا کیا وہ شخص بھی جس نے کہ شرک کیا ہے؟ آپ خاموش رہے پھر فرمایا سن لے جس نے شرک کیا ہے وہ بھی تین بار فرمایا۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۵۰) اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا کہ یا عبادی الخ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے امید نہ توڑو خدا کی یہ شان ہے کہ وہ سب گناہ بخش سکتا ہے اور کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ (اس حدیث کو احمد و ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آپ نے بتلا دیا کہ قرآن میں یہ استثنا بھی تو ہے اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کئے) اس لئے جواب میں عرض کیا کہ یہ سخت شرط ہے شاید ایمان اور عمل صالح کے معیار پر پورا نہ اتر سکوں اگر قرآن میں کوئی اور آیت ہو تو ارشاد فرمایئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ (اللہ یہ معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا) وحشی نے کہا کہ اب بھی معاملہ صاف نہیں ہوا مجھے معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت ایزدی کیا ہے کوئی اطمینان بخش ضمانت دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی قل یا عبادی الخ وحشی نے کہا جی ہاں بیشک یہ نجات کی صاف ضمانت ہے اور اسلام قبول کر لیا۔ حاضرین نے سوال کیا یا رسول اللہ یہ بشارت ان کے لئے مخصوص ہے یا سب کے لئے ہے؟ آپ نے فرمایا سب کے لئے۔

خدا کی یہ شان مغفرت سن کر کسی نے مشرک کی مغفرت کا سوال کیا آپ نے یہی جواب دیا کہ مشرک کے لئے بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں وہ بھی توبہ کرے تو اس عموم رحمت میں آ جائے۔ بعض شارحین کو توبہ سے شرک کی مغفرت بڑی بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اس سوال و جواب میں اور بہت سی توجیہات کی ہیں حالانکہ جن کے نزدیک زنا و سرقہ جیسے معاصی کی معافی کا تصور مشکل ہو ان کیلئے شرک کی مغفرت کا تصور مشکل نظر آنے لگا کیا بعید ہے۔ یہ حالت صحابہ کی بہت قریب عہد جاہلیت کی۔ ابوذر کی حدیث میں ابھی آ چکا ہے کہ زنا و سرقہ کی مغفرت پر انھیں کتنا تعجب تھا۔

(۵۱) عن أبي هريرة قال قام رسول الله في صلوة وقمنا معه فقال أعرابي وهو في الصلوة اللهم ارحمني ومحمدا ولا ترحم معنا أحدا فلما سلم النبي صلى الله عليه وسلم قال للأعرابي لقد تحجرت واسعا رواه البخاري وغيره

باب حق الله على العباد

(۵۲) عن معاذ قال كنت ردف النبي صلى الله عليه وسلم على حمار يقال له عفير فقال يا معاذ تدري ما حق الله على العباد وما حق العباد على الله قلت

---

(۵۱) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہوئے ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے تو ایک دیہاتی نے نماز میں ہی کہا اے اللہ صرف میرے اوپر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کر ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم مت کر جب آپ نے سلام پھیرا تو اس دیہاتی سے فرمایا تو نے تو بڑی وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔ (اس حدیث کو بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

بندوں پر خدا تعالیٰ کا کیا حق ہے

(۵۲) معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک گدھے پر سوار تھے جس کو عفیر کہا جاتا تھا میں آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا آپ نے آواز دی اے معاذ (بعض روایات میں تین بار آواز دینے کا ذکر ہے تاکہ پوری طرح متوجہ ہو جائیں) جانتے ہو بندوں پر خدا کا اور خدا پر بندوں کا کیا حق ہے میں نے عرض کیا

---

(۵۱) اس اعرابی نے اپنے زعم کی حد تک یہ سمجھا کہ خدا کی رحمت کی وسعت کا تصور کہاں ممکن تھا اس لئے اپنے خلوص کی بنا پر جی کھول کر اس نے اسی سنت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت گوارا کی مگر اس سے زیادہ شرکت وہ برداشت نہ کر سکا اس بیچارہ کے خیال کے مطابق شرکاء کی تعداد جتنی بڑھتی جائے گی ہر ایک کا حصہ اتنا ہی گھٹتا جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی رحمت تو اتنی ہے کہ سب پر چھا جائے پھر بھی ختم نہ ہو تو اسے تنگ سمجھ رہا ہے۔ ان الفاظ میں قرآنی لفظ رحمتی وسعت کی طرف اشارہ تھا۔ جہاں اس جیسے گنوار کی سادگی پر کتنی شفقت ہے۔

(۵۲) عفیر، مشہور الحمیر ہیں کا نام مشہور ہے۔ عرب میں حیوانات کے نام رکھنے کا بھی دستور تھا جیسا کہ انگریز بھی کتوں کے نام رکھتے ہیں۔

مالک پر مملوک کا آقا پر غلام کا بھلا کیا حق مگر صفت رحمت وجود چاہتی ہے کہ محتاجوں کی خود توقع بندھ جائے اور یہ اس حق کو اس اہتمام سے ادا کرے گویا اس کے ذمہ یہ واقعی واجب حق تھا کہاں عبدیت کے ساتھ ہر گز کمال جلدی ہو تو اس کا تصور ہو جانا چاہیے ورنہ اللہ کی ذات پاک پر کسی کا حق نہیں اسی کو حق سب پر ہے۔

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ
شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَلَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ
اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (رواہ الشیخان والترمذی)

(۵۳) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ
هَلْ تَدْرِىْ مَا حَقُّ النَّاسِ عَلَى اللّٰهِ وَمَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى النَّاسِ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ
قَالَ حَقُّ اللّٰهِ عَلَى النَّاسِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَحَقٌّ عَلَيْهِ
اَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمْ (رواہ احمد)

اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی
بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق ہے کہ جو اس کا شریک نہ ٹھہرائے
اس کو عذاب نہ دے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت ہو تو یہ خوشخبری اور لوگوں کو بھی سنا دوں؟
فرمایا نہیں ایسا نہیں وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہیں گے (اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۵۳) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوہریرہؓ تم جانتے ہو
لوگوں کا خدا پر اور خدا کا لوگوں پر کیا حق ہے میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں
فرمایا خدا کا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور جب
وہ ایسا کریں تو اس پر یہ حق ہے کہ پھر ان کو عذاب نہ دے۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

۵۵ عام طور پر اس بشارت کو سنانے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کو صحابہؓ کے متعلق فرائض چھوڑ بیٹھنے کا
کوئی احتمال ہو سکتا تھا۔ فرض و واجب جن کا شریعت مطالبہ کرتی ہے بھلا کون ترک کرتا۔ بلکہ یہاں صرف وہ اعمال
مطلوب ہیں جہاں بندہ رغبت میں سرگرمی اور اطمینان کے عالم میں سستی دکھلانے کا خود مختار ہے حقیقت یہ ہے
کہ انسان ایک کمزور سا دل رکھتا ہے کہ خوف زیادہ ہو تو جب عمل سے معطل ہو جاتا ہے اور اگر اطمینان زیادہ ہو تو بھی
سست رفتار بن جاتا ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ بہرحال بندے کو اتنا آگاہ کر دے جتنا کوئی قریب سے قریب رکھ سکتا ہے
دوزخ سے نجات کوئی عجب نہیں کہ انسان کے لئے بڑی کامیابی ہے مگر رحمت صرف اس پر راضی نہیں وہ چاہتی ہے
کہ اپنے وفاداروں کو انعام و اکرام بخشنے کا موقع دے اس سے مقصود یہ ہے کہ عملی سرگرمی زیادہ سے زیادہ جاری
رہے حدیث ۵۲ پر غور کیجئے اس میں کلمۂ شہادت کے ساتھ نماز روزہ کا بھی ذکر ہے اور وہاں بھی بشارت پر یہی
سوال و جواب مذکور ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں نماز روزہ جیسے فرائض میں سستی کا ذکر نہیں بلکہ ان عبادات نافلہ کا
ذکر ہے جن میں نفسیاتی اثرات سے انسان سستی یا چستی دکھلانے کا مختار ہے کوئی شبہ نہیں کہ اگر صدر اول کے
مسلموں کو صرف فرائض پر جنت کی بشارت سنا دی جاتی تو (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

نفر من قومي فقال ابشروا وبشروا من وراءكم انه من شهد ان لا اله الا الله صادقا بها دخل الجنة فخرجنا من عند النبي صلى الله عليه وسلم نبشر الناس فاستقبلنا عمر بن الخطاب رضي الله عنه فرجع بنا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال عمر يا رسول الله اذا يتكل الناس فسكت رسول الله صلى الله عليه وسلم (رواه احمد والطبراني)۔

(۵۹) عن معاذ بن جبل رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال ما من احد يشهد ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله صدقا من قلبه الا حرمه الله على النار قال يا رسول الله افلا اخبر به الناس فيستبشروا قال اذا يتكلوا واخبر بها معاذ عند موته تأثما (رواه الشيخان والترمذي)

چند افراد کے ساتھ حاضر ہوا آپ نے فرمایا کہ تمہیں خوشخبری ہو اور جو لوگ تمہارے اُس طرف ہیں ان کو بھی یہ خوشخبری سنا دو کہ جو شخص صدق دل سے گواہی دے گا کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ وہ جنت میں جائے گا۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سے یہ خوشخبری سنانے کے لئے نکلے تو سامنے سے عمر بن الخطابؓ آتے تھے وہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر واپس لے گئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ لوگ تو اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے آپ نے کچھ نہ فرمایا اور خاموش ہو گئے۔ (اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے)۔

(۵۹) معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص صدق دل سے گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں وہ یقیناً اس کو دوزخ پر حرام کر دے گا انھوں نے عرض کیا کیا یہ خوشخبری میں اور لوگوں کو بھی سنا دوں؟ فرمایا پھر لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اس لئے معاذؓ نے اپنی موت کے وقت یہ حدیث بیان کی، مبادا اخفائے حدیث کا گناہ ان کے سر رہ جائے (اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱) اس حدیث سے اندازہ کرو کہ صحابہ کو احادیث کی تبلیغ کی کس درجہ اہمیت تھی یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بھی اپنے سینہ میں چھپانا گناہ عظیم کی بات سمجھتے تھے۔ اگر احادیث کی حیثیت تشریعی نہ ہوتی یا کتاب اللہ کے بعد وہ تشریحات غیر ضروری ہوتیں تو یہ اہتمام کس لئے تھا۔ تم کو بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کے نزدیک
إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ (بقرہ)   (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۵۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اَنَا مِمَّنْ شَهِدَ مُعَاذًا حِيْنَ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ يَقُوْلُ اكْشِفُوْا عَنِّيْ سِجْفَ الْقُبَّةِ اُحَدِّثْكُمْ حَدِيْثًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَمْنَعْنِيْ اَنْ اُحَدِّثَكُمُوْهُ اِلَّا اَنْ تَتَّكِلُوْا سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ يَقِيْنًا مِنْ قَلْبِهٖ لَمْ يَدْخُلِ النَّارَ وَقَالَ مَرَّةً دَخَلَ الْجَنَّةَ وَلَمْ تَمَسَّهُ النَّارُ (رواه احمد)

(۵۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَيُصَلِّي الْخَمْسَ وَيَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَ لَهٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا (رواه احمد)

(۵۹) عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ

---

(۵۷) جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں معاذؓ کی وفات کے وقت موجود تھا انہوں نے فرمایا میرے سامنے سے ذرا قبہ کا پردہ ہٹا دو تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سناؤں گا جو اب تک صرف اس لیے نہیں سنائی تھی کہ تم اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤ۔ میں نے آپ یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو صاف دل سے یا دلی یقین کے ساتھ (راوی کو لفظ میں تردد ہے) گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ وہ کبھی دوزخ میں نہیں جائے گا اور ایک مرتبہ یہ لفظ فرمائے کہ جنت میں جائے گا اور آگ اسے چھو بھی نہ سکے گی۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

(۵۸) معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے جو خدا سے ملیگا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہو، پانچوں نمازیں پڑھی ہوں، رمضان کے روزے رکھے ہوں وہ بخشدیا جائے گا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت ہو تو یہ خوشخبری مسلمانوں کو سنادوں، فرمایا انھیں عمل میں لگا رہنے دو۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے) (از مشکوٰۃ)

(۵۹) معاذ بن جبلؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو رمضان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جس طرح آیات قرآنیہ واضح نہیں ہیں اسی طرح احادیث نبویہ بھی واضح نہیں اور امت کا فریضہ یہ تھا کہ دین کی مجموعی تشریح سنت کے ساتھ ایک قرینہ سے دوسرے قرینہ کو ملا کر دوسرے سے مسئلہ سمجھا جائے جو لوگ احادیث سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں وہ احادیث سے نہیں خدا کے رسول سے بے نیازی چاہتے ہیں نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

(۵۸) ۔۔۔ یہ حدیث صرف سابق واقعہ کی مزید تشریح کے لیے نقل کی گئی ہے۔

إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فأجهشت بالبكاء وركبني عمر وإذا هو على أثري فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما لك يا أبا هريرة قلت لقيت عمر فأخبرته بالذي بعثتني به فضرب بين ثديي ضربة خررت لاستي فقال ارجع فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم يا عمر ما حملك على ما فعلت فقال يا رسول الله بأبي أنت وأمي أبعثت أبا هريرة بنعليك من لقي يشهد أن لا إله إلا الله مستيقنا بها قلبه بشره بالجنة قال نعم قال فلا تفعل فإني أخشى أن يتكل الناس عليها فخلهم يعملون فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم فخلهم (رواه مسلم)

بہت کہ رونے لگا۔ عمرؓ کا خوف میرے سر پر سوار ہی تھا کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے پیچھے وہ آ پہنچے۔ آپ نے دریافت فرمایا ابوہریرہ خیریت ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے راستہ میں عمرؓ ملے تو جس کام کے لئے آپ نے مجھے بھیجا تھا میں نے انہیں اس کی خبر کر دی انھوں نے اس زور سے میرے سینہ پر ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل پیچھے جا پڑا اور مجھ سے کہا واپس جاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرؓ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا واقعی آپ نے ابوہریرہؓ کو اس لئے بھیجا تھا کہ جو دلی یقین کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہو اسے اس کو جنت کی خوشخبری سنادیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ عرض کیا ایسا نہ کیجئے مجھے خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں انھیں عمل میں لگا رہنے دیجئے۔ آپ نے فرمایا اچھا تو رہنے دو۔

(اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مسئلہ کی یہ بات نہ تھی، حلال و حرام کا کوئی حکم نہ تھا صرف مصلحت کی بات تھی وہاں بھی ایک بشارت دینے کی قدر دانی کی گئی اور محبت و مصلحت کے دو پہلوؤں میں مصلحت کو ترجیح دیدی گئی۔

مخاطب اگر متکلم کا مزاج شناس ہو تو وہ اس کے امر و نہی کے مراتب سمجھ لیتا ہے اور مشورہ دینے کا موقع و محل پہچان لیتا ہے۔ حدیث کے معاملات کو اپنے روزمرہ کے معاملات کے ماتحت حل کر لینا چاہئے بلاوجہ وحی بنا کر رسول و حبیب کی زحمت اٹھا لینا ہے۔

وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(٩١) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ (رواہ احمد ومسلم)

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَحْوَهٗ وَفِیْهِ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّةَ بَدَلَ قَوْلِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ

(٩٢) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اٰمَنَ بِیْ عَشَرَةٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے

(٩١) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اس امت میں کوئی یہودی ایسا نہیں ہے اور کوئی نصرانی جو میری خبر پائے پھر اس دین پر ایمان نہ لائے جو میں دیکر بھیجا گیا ہوں اور اسی حال پر مرجائے مگر وہ دوزخیوں میں ہوگا۔ (اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے روایت کیا ہے)۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کے ہم معنی مضمون منقول ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں الا کان من اصحاب النار کے بجائے لم یدخل الجنۃ (جنت میں نہیں جائیگا) کا لفظ ہے۔

(٩٢) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر یہود کے

---

(٩١) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر یہاں خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ اہل کتاب تھے۔ جب آپ پر ایمان لائے بغیر ان کی نجات نہیں ہو سکتی تو جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب بھی نہیں ان کی نجات کیسے ہو سکتی ہے۔ نیز یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ نجات صرف ان ہی کے لئے ہے اس لئے ان کو خبردار کرنا ضروری تھا کہ یہ خیال غلط ہے۔

(٩٢) اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں لو امن بی عشرۃ من الیہود لآمن بی الیہود۔ اگر مجھ پر دس یہود ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ ان الفاظ پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے یہود آپ پر ایمان لا چکے تھے مگر اس کے باوجود پھر تمام یہود کا ایمان ثابت نہیں۔ مسند امام احمد کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء مراد تھے۔ اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی اتباع میں یقیناً بقیہ یہود بھی ایمان لے آتے جیسا کہ قبائل عرب بھی اسی کے منتظر تھے کہ قریش اسلام لے آئیں تو ان کی اتباع میں ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

مِنْ أَحْبَارِ الْيَهُوْدِ لَآمَنَ بِيْ كُلُّ يَهُوْدِيٍّ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ قَالَ كَعْبٌ اِثْنَا عَشَرَ وَمِصْدَاقُهُمْ فِيْ سُوْرَةِ الْمَائِدَةِ (رواه احمد والبخاری وابوداؤد)

دس یہود علماء مجھ پر ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ کعب کہتے ہیں (آپ نے دس نہیں فرمایا) بارہ (فرمایا ہے) جن کا مصداق سورۂ مائدہ میں موجود ہے۔ اس حدیث کو امام احمد بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حافظ ابن حجرؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت رؤساء یہود میں سے مشاہیر کے حسب ذیل اسماء لکھے ہیں۔ عبداللہ بن سلام۔ ابو یاسر بن اخطب۔ حیی بن اخطب۔ کعب بن الاشرف۔ رافع بن ابی الحقیق۔ عبداللہ بن ضیف۔ فنحاص۔ رفاعہ بن زید۔ زبیر بن باطیا۔ کعب بن اسد۔ شمویل بن زید وغیرہم۔ ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا اسلام ثابت ہے۔ سہیلی نے عبداللہ بن صوریا کا اسلام قبول کرنا بھی تسلیم کیا ہے مگر حافظ کو اس میں کلام ہے۔

کعبؓ اور ابوہریرہؓ کے درمیان یہاں یہ اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء یہود میں دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا۔ کعب کا رجحان دوسری جانب ہے جس کی تائید میں وہ قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے تھے جس میں نقباء یہود کا عدد بارہ ہی مذکور ہے۔ وبعثنا منهم اثني عشر نقيبا۔

یحییٰ بن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ کعب نے پورا عدد ذکر کیا اور ابوہریرہؓ نے صرف ان کا ذکر کیا ہو جو صرف اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے۔ عبداللہ بن سلام اور مخیریق اسلام قبول کر چکے تھے۔ بہرحال خلاصۂ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار بھی اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب کی جگہ سمجھتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لئے ان کے علماء کو بھی بہت کم اسلام کی توفیق میسر آئی۔

بظاہر اسی فطری شقاوت کی وجہ سے جب اس عام ہدایت کے وقت انھیں ایمان نصیب نہ ہوا تو عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد بھی احادیث میں ان کی محرومی ہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس وقت یہ فرقہ اکثر دجال کا متبع ہوگا البتہ عیسائی من حیث القوم اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اور دنیا کے مذاہب سے چھٹکارا پا کر وحدت ادیان کا اہم مقصد پورا ہو جائے گا۔ اسی کی طرف سورۂ نساء کی آیت وان من اهل الكتاب الا ليؤمنن به قبل موته میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کے پہلے ان پر ایمان نہ لائیگا۔

یہاں غرض صرف یہ ہے کہ اس حدیث کو آیت بالا کے ساتھ رکھنا چاہئے قرآن کریم بھی اہل کتاب کا عام طور پر ایمان لانا ذکر کرتا ہے مگر اس کو ایک خاص وقت پر معلق کرتا ہے اور حدیث بھی یہاں ان کے عام ایمان کا ذکر کرتی ہے مگر اس کو ایک خاص شرط سے مقید کرتی ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو تو کیا اسلام قبول کرکے ایک دن ان دونوں کا آخری دین یعنی اسلام میں داخل ہونا مقدر ہے۔ وحدت ملت ظہور پذیر ہو چکی ہے اب وحدت کا مرکزی نقطہ تھا جو آئندہ ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ عالم فطری حوادث کا باہمی ربط جنھیں کوئی نظر میں ان میں بڑا گہرا ربط رہا کرتا ہے۔

سلہ فتح الباری ج ۷ باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

بعضھم اِنَّ العین نائمۃ والقلب یقظان فقالوا مثلہ کمثل رجل بنی دارًا وجعل فیہا مأدبۃ وبعث داعیًا فمن اجاب الداعی دخل الدار واکل من المأدبۃ ومن لم یجب الداعی لم یدخل الدار ولم یأکل من المأدبۃ فقالوا اوّلوھا لہ یفقھھا فقال بعضھم انہ نائم وقال بعضھم اِنَّ العین نائمۃ والقلب یقظان فقالوا الدار الجنۃ والداعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فمن اطاع محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم فقد اطاع اللہ ومن عصی محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم فقد عصی اللہ عزوجل ومحمد فرق بین الناس (متفق علیہ)

لگے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مکان بنایا اور اس میں دعوت کا انتظام کیا پھر ایک بلانے والے کو بھیجا۔ جس نے اس بلانے والے کی بات مانی وہ مکان میں آگیا اور دعوت کا کھانا بھی کھایا اور جس نے اس بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ مکان میں آیا اور نہ طعام دعوت کھایا۔ پھر انھوں نے کہا اس مثال کی توضیح بھی کردو تاکہ آپ اس کو صاف صاف سمجھ لیں تو بعض نے کہا یہ سوتے ہیں اور بعض نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل بیدار ہے پھر کہنے لگے وہ مکان جنت ہے اور بلانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے خدائے عزوجل کی نافرمانی کی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں نیک و بد کو جدا جدا تمیز کر دینے والے ہیں (یہ حدیث متفق علیہ ہے)۔

(تشریح) علم غیب میں تفہیم کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی بیداری کو تین بار ذکر کیا گیا ہے اسی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے خواب کو وحی کہا جاتا ہے۔ جب انبیاء علیہم السلام کی نوم کا حال یہ ہے تو ان کی موت کا حال اسی پر قیاس کر لینا چاہئے۔ یعنی یہ لوگ موت کے بعد عام اموات کی طرح بیکار و معطل ہو سکتے ہیں یا ان کا ادراک و شعور، فہم و احساس اپنی جگہ بحال رہتا ہے۔ اس مثال میں یہ ذہن نشین کرانا منظور ہے کہ فوز و فلاح کا مدار صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میں منحصر ہے۔ نیز یہ تنبیہ کرنی بھی مقصود ہے کہ آپ کی نافرمانی کرکے خدا کی فرمانبرداری کی ہوس کرنا غلط ہے

فرق کو بعض نے بصیغہ ماضی کہا ہے اور بعض نے بسکون را بمصدر یعنی فارق و فرق کرنے والے پڑھا ہے بہرحال یہ بھی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہے کہ مطیع و عاصی، مومن و کافر کا گروہ علیحدہ علیحدہ کر دیں۔

(۶۵) عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا مَثَلِي وَ
مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْمًا فَقَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ وَ
إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَدْلَجُوا فَانْطَلَقُوا
عَلَى مَهَلِهِمْ فَنَجَوْا وَكَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوا مَكَانَهُمْ فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ
فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهِ وَمَثَلُ مَنْ
عَصَانِي وَكَذَّبَ مَا جِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ۔ (متفق علیه)

(۶۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِي كَمَثَلِ
رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِي

---

(۶۵) ابو موسیٰ رض روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے میری اور
اس دین کی مثال جو خدا نے مجھے دیکر بھیجا ہے اس شخص کی سی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور
کہا اے میری قوم میں نے دشمن اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ایک سچا ڈرانے والا ہوں
لہٰذا نجات کی فکر کرو اس پر اس کی قوم میں کسی نے تو اس کا کہنا مانا اور آہستہ آہستہ شروع رات میں
ہی چل پڑے اور دشمن سے نجات پا گئے اور کسی نے اس کو جھوٹا سمجھا اور اپنے بستروں پر صبح تک
پڑے سوتے رہے دشمن کا لشکر صبح صبح ان پر ٹوٹا اور ان کو تباہ و برباد کر ڈالا بس ٹھیک یہی مثال ہے
اس شخص کی جس نے میری بات مان لی اور میرے لائے ہوئے دین کی پیروی کی اور اس شخص کی
جس نے میری بات نہ مانی اور اس سچائی کو جھٹلا دیا جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں (یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(۶۶) ابو ہریرہ رض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے میری
مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی جب اس نے گردوپیش کو خوب روشن کر دیا تو پروانے اور

۱؎ عرب میں غارت گری کے لئے صبح کا وقت ہی مقرر تھا۔ یہی سبب ہے جس کو وہ دعا دیتے یہی دعا دیتے کہ خدا
تیری صبح اچھی رکھے۔ اسی طرح ان کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص دشمن دیکھ پاتا تو اپنے کپڑے اتار کر کسی اونچی جگہ
ان کو ہلاتا کہ یہ وحشتناک صورت دیکھ کر لوگ دشمن کی آمد کا یقین کر لیں اور دشمن کے پہنچنے سے قبل ہوشیار
ہو جائیں چنانچہ اس قسم کی خبر کی تشہیر ہوا کرتی کہی جاتی تھی۔ یہی سبب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو
"النذیر العریان" سے تعبیر فرمایا ہے جن خوش نصیبوں نے آپ کے فرمان کو مانا خدا کے عذاب سے نجات پائی
اور جنہوں نے آپ کی بات پر کان نہ دھرا اور کفر پر مصر رہے وہ مر گئے عذاب الٰہی نے انہیں آ پکڑا اور
موت ابدی میں دھکیل دیا۔

تَقَعْنَ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيهِ وَجَعَلَ يَحْجُزُهُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ فَيَتَقَحَّمْنَ فِيهَا فَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَقَحَّمُونَ فِيهَا هٰذِهِ رِوَايَةُ الْبُخَارِيِّ وَلِمُسْلِمٍ نَحْوُهَا وَقَالَ فِي آخِرِهَا قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلِي وَمَثَلُكُمْ أَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُونِي تَقَحَّمُونَ فِيهَا (متفق علیه)

(٦٧) عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ

یہ کیڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس میں گرنے لگے وہ ہے کہ انہیں روک رہا ہے یہ ہیں کہ اسے عاجز کرکے اس میں گھسے جا رہے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ہوں کہ تمہاری کمر پکڑ کر تمہیں دوزخ سے بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے جاتے ہو۔ یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم نے بھی اسی کے ہم معنی روایت کی ہے اس کے آخر میں یہ لفظ ہیں۔ کہ میری اور تمہاری مثل یہ ہے میں تمہاری کمر پکڑے ہوئے (کہہ رہا) ہوں دوزخ سے بچو دوزخ سے بچو، تم مجھے عاجز کرکے اس میں گھسے جاتے ہو (یہ حدیث متفق علیہ ہے)۔

(٦٧) ابوموسیٰؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو ہدایت اور دین کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی اس زمین کے ایک حصہ نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پی لیا گھاس اور سبزہ خوب اُگایا اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے

(٦٦) دنیا کے تمام انسانوں اور سب ملتوں کی انتہائی محبت و خیر خواہی کا جو نقشہ اس مثال میں کھینچا گیا ہے اس سے زیادہ بہتر اور موثر الفاظ میں کھینچنا ناممکن ہے۔ نہ معلوم انجام کا ہوش ہوتا ہے تو آج دنیا کے کونے کونے سے قیامت کا نقشہ سامنے آ جائے، تنگی و نادانی سے اس جان قربان کرنے والوں پر سب سے زیادہ رحم کھانے والا پکار رہا ہے کہ تم آگ میں جا رہے ہو کون نصیب والا ہوگا جو اس کی آواز سنے گا۔

(٦٧) یہاں زمین کی مفصل اقسام اور لوگوں کی مکمل تقسیم پھر ان میں پوری پوری مطابقت بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اجمالاً یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جس طرح دنیا میں بارش کے پانی سے بعض زمین نفع اٹھاتی ہے اور بعض نفع نہیں اٹھاتی اور جو نفع نہیں اٹھاتی یہ اس کی خرابی کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی کی بارش ہے بعض قلوب اس سے نفع اٹھاتے ہیں ہدایت کا بیج ان میں اسی طرح پھولنے پھلنے لگتا ہے جیسا کہ اچھی زمین میں کھیتی اور بعض ایسے اوست ہوتے ہیں کہ چٹیل میدان کی طرح نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ خود کوئی نفع حاصل کریں اور نہ ان میں یہ قابلیت ہوتی ہے کہ اس پانی کو صرف روک لیں کہ کم از کم دوسرے ہی اس سے فائدہ حاصل کرلیں۔ یہ بھی نفع کی ایک صورت تھی۔

فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرٰى إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ (متفق علیہ)

(۶۸) عَنْ رَبِيْعَةَ الْجُرَشِيِّ قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهُ لِتَنَمْ عَيْنُكَ وَلْتَسْمَعْ أُذُنُكَ وَلْيَعْقِلْ قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَيْنِيْ وَسَمِعَتْ أُذُنَايَ وَعَقَلَ قَلْبِيْ قَالَ فَقِيْلَ لِيْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا فَصَنَعَ مَأْدُبَةً وَأَرْسَلَ دَاعِيًا فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ

وہ پانی جمع کر لیا تو اس کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو نفع پہنچایا انھوں نے خود پانی پیا اور اپنے جانوروں کو پلایا اور کاشت کی لیکن زمین کا ایک حصہ تھا جو چٹیل میدان تھا نہ پانی کو روکے نہ گھاس اگائے۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے خدا کے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اس دین سے اس کو نفع دیا اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال جس نے اوپر سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کو دے کر میں بھیجا گیا تھا۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(۶۸) ربیعہ جرشی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک فرشتہ حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا چاہئے کہ آپ کی آنکھیں سو جائیں (اور کسی طرف نہ دیکھیں) اور آپ کے کان میری بات سنیں اور آپ کا دل (متوجہ ہو کر) سمجھے آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں (تمام محسوسات کی طرف سے) سو گئیں میرے کان سننے کے لئے تیار اور دل سمجھنے کے لئے بیدار ہو گیا آپ فرماتے ہیں پھر فرشتہ نے کہا ایک سردار ہے اس نے ایک گھر بنایا اور دعوت کا انتظام کیا اور ایک بلانے والا بھیجا اب جس نے اس کی دعوت کو سنا اور مانا وہ اس گھر میں آ گیا اور دعوت بھی کھائی سردار اور مالک مکان بھی اس سے خوش ہوا اور جس نے اس بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ تو گھر میں آیا اور نہ اس نے دعوت کا کھا[

---

(۶۸) اس باب کی پہلی حدیث میں جنت کو گھر کہا گیا تھا اور یہاں اسلام کو گھر کہا گیا ہے اور جنت کو طعام دعوت قرار دیا گیا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں مثالوں کا مشترک نمبر ایک ہی ہے۔ یہاں ہر ہر جزو کی تشبیہ مقصود نہیں ہے۔ نیز اسلام چونکہ جنت میں داخل ہونے کا واحد سبب ہے اس لئے اس کو عین سبب اور مجازاً گھر کہہ دینا بھی درست ہے۔ بہرحال ان سب شقوں اور کہاوتوں میں یہی کہا گیا ہے کہ جنت کا گھر بغیر آپ کی تصدیق اور پیروی کئے نہیں ملے گا۔

وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَالدَّارُ الْإِسْلَامُ وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ (رواه الدارمی)

(۶۹) عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا وَعَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِيْهِمَا أَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ اسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَلَا تَعْوَجُّوْا وَفَوْقَ ذٰلِكَ دَاعٍ يَدْعُوْ كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ أَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ قَالَ وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَإِنَّكَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ ثُمَّ فَسَّرَهُ فَأَخْبَرَ أَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الْإِسْلَامُ وَأَنَّ الْأَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَأَنَّ السُّتُوْرَ الْمُرْخَاةَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَأَنَّ الدَّاعِيَ عَلٰى

کھایا اور مالک مکان اس پر ناراض ہوا۔ اس کے بعد اس کی توضیح کی کہ مالک مکان تو خدا ہے اور اس کے منادی اور بلانے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور گھر اسلام کا گھر ہے اور وہ دعوت جنت (اور اس کی نعمتیں) ہیں۔ (اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے)

(۶۹) ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال بیان فرمائی ایک سیدھی راہ ہے اس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس راہ کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اے چلنے والو اسی راہ پر سیدھے چلے جاؤ اور دائیں بائیں رخ نہ کرو اس پکارنے والے سے آگے ایک اور پکارنے والا ہے جب بندہ ان دروازوں میں کسی دروازہ کو کھولنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کم بخت اسے کھول مت اگر کھولے گا تو اس میں ضرور داخل بھی ہوگا۔ پھر اس مثال کی خود توضیح کی: یہ سیدھی راہ تو اسلام ہے اور کھلے ہوئے دروازے خدا کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور ان پر لٹکے ہوئے پردے خدا کی بیان کردہ حدود

---

(۱) اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ محرمات شرعیہ میں فطرت انسانی کے لئے ایسی کشش ہے کہ جو اس طرف نظر بھی اٹھائے گا وہ ضرور مبتلا ہو کر رہے گا اس لئے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ خدا کی قائم کردہ حدود سے دور ہی دور رہے تاکہ محرمات شرعیہ کی بو بھی نہ پاس آنے پائے۔ قرآن کریم خدا کا ذاتی علم رکھنے کا مدعی ہے اور واعظ [illegible] یعنی وہ واعظ جو ہر ظاہری فتنوں سے پہلے انسان کو نیک نصیحت کی دعوت دیتا رہتا ہے [illegible] ہوئے ہوا و ہوس [illegible] کسی ابہام کی وجہ سے کوئی شبہ رہ جائے یہاں شرعی ہدایت یہ ہے کہ ان حدود کو چھوڑ دینا چاہئے تاکہ [illegible] کی احتمالی معصیت سے بھی حفاظت رہے یہی تو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا یہ خدا کی حدود ہیں لہٰذا ان کے قریب بھی نہ آؤ۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

لو كان موسى حيا ما وسعه إلا اتباعه صلى الله عليه وسلم

(١٧) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُوْكُمْ وَقَدْ ضَلُّوْا فَإِنَّكُمْ إِمَّا أَنْ تُصَدِّقُوْا بِبَاطِلٍ أَوْ تُكَذِّبُوْا بِحَقٍّ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِيْ۔

(رواہ احمد۔ وابن ابی شیبہ۔ والبزار)

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو آج انھیں بھی آنحضرت کی پیروی کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا

(١٧) جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کیونکہ جو خود گمراہ ہو چکے ہیں وہ بھلا تمہیں کیا راہ دکھلائیں گے اگر تم ان کی تصدیق کرتے ہو تو احتمال ہے کہ تم کسی غلط بات کی تصدیق کر بیٹھو اور اگر تکذیب کرتے ہو تو ممکن ہے کہ کسی حق بات کی تکذیب کر دو آج وہ زمانہ ہے کہ اگر خود موسیٰ علیہ السلام تم میں زندہ موجود ہوتے تو انھیں بھی سوائے میری پیروی کے تورات کی پیروی کرنا حلال نہ ہوتا۔ (اس حدیث کو امام احمد ابن ابی شیبہ اور بزار نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور وہ بھی تجربہ اور یقین ہیں صرف نفسانی حرص اور طمع یا تجذب ان کو بیدار کرنا [illegible] باوثیقہ [illegible] کا مزن ہوتے ہیں اگر کوئی آمدنی اضطراب محسوس ہو تو وہ راہ کی ناہمواری نہیں بلکہ پردوں کی طرف سے دعوت شیطانی کے اثرات ہیں جتنا ادھر کان لگاؤ گے اس اضطراب میں اضافہ ہوتا رہے گا اور جتنا ان سے غافل رہو گے اسی قدر اپنے قلب میں اطمینان و سکون دیکھو گے۔

(١٧) . . . . یہاں امت کے سامنے ایک اصولی مسئلہ رکھ گیا ہے اور وہ یہ کہ جب قیامت تک کے لئے ایک شریعت آچکی ہے تو اب پہلی شریعت سے بحث کرنا ہی غلط ہے ظاہر ہے کہ اگر پہلی شریعت کا قائم رکھنا منظور ہوتا تو ضرور اس کو محفوظ بھی رکھا جاتا لیکن جب اس کو محفوظ نہیں رکھا گیا تو معلوم ہوا کہ آئندہ قدرت کو اس پر عمل کرانا بھی منظور نہ تھا۔ شریعت سماویہ گو سب حق تھیں مگر تحریف کے بعد ان میں بہت سا باطل کا عنصر داخل ہو چکا ہے جو نامعلوم ہے اب اس سے بحث کو [illegible] کہا ہے کہ اگر تصدیق کرتے ہو تو باطل کی تصدیق کا احتمال اور تکذیب کرتے ہو تو حق کی تکذیب کا احتمال باقی رہتا ہے اس لئے جب عمل کے لئے ایک راہ موجود ہے تو پھر ان کی [illegible] میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان میں تحریف نہیں ہوئی تو بھی ہر صداقت پر عمل کرنا اسی وقت موجب نجات ہو سکتا ہے جبکہ وہ وقت کی شریعت بھی ہو اگر اس کی بجائے دوسری شریعت آچکی ہے تو اب پہلی صداقت پر عمل کرنا وقتی شریعت کی توہین ہوگی۔ اگر دین صرف انہی باتوں پر ہوتا تو شریعتوں کی بعثت نہ تھی اور جب شریعت کی ضرورت مسلم ہے تو صرف کسی صداقت کا معتقد ہونا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک اس کا وقتی شریعت ہونا بھی ثابت نہ ہو جائے ہر صداقت کا شریعت ہونا [illegible] [illegible] ہے اس [illegible] شریعت کو صداقت پر مبنی ہونا ضروری ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۴۲) وعنه أن عمر بن الخطاب أتى النبي صلى الله عليه وسلم بكتاب أصابه من بعض أهل الكتب فقرأه النبي صلى الله عليه وسلم فغضب فقال أمتهوكون فيها يا ابن الخطاب والذي نفسي بيده لقد جئتكم بها بيضاء نقية لا تسألوهم عن شيء فيخبروكم بحق فتكذبوا به أو بباطل فتصدقوا به والذي نفسي بيده لو أن موسى كان حيا ما وسعه إلا أن يتبعني. رواه أحمد وابن ماجة عن ابن عباس وابن حبان عن جابر وغيره عمرو في الباب عن عبد الله بن ثابت الأنصاري عند أحمد وابن سعد والحاكم في الكنى والطبراني والبيهقي في شعب الإيمان وعن جابر عند الدارمي.

(۴۳) وعن الشعبي عن عبد الله بن ثابت قال جاء عمر بن الخطاب إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله إني مررت بأخ لي من قريظة فكتب لي

---

(۴۲) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کتاب لے کر آئے جو انہوں نے کسی اہل کتاب سے لی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تو ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اے ابن الخطاب کیا اپنے دین کے معاملہ میں تم لوگ بھی حیرت میں مبتلا ہو، اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمہارے پاس ایک روشن اور صاف شریعت لیکر آیا ہوں اہل کتاب کو دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کہیں وہ تمہیں کوئی سچی بات بتلائیں اور تم اس کی تکذیب کر دو یا غلط بات بتائیں اور تم اس کی تصدیق کر دو اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی اس کے سوا گنجائش نہ تھی کہ میری ہی پیروی کرتے۔ اس حدیث کو احمد نے اور ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے اور ابن حبان نے جابرؓ سے روایت کیا ہے اور یہی مضمون امام احمد نے عبد اللہ بن ثابت انصاری سے روایت کیا ہے اور اسی طرح ابن سعد اور حاکم نے کنی میں اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کیا ہے اور دارمی نے جابرؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

(۴۳) شعبی عبد اللہ بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن الخطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں قبیلہ بنی قریظہ کے اپنے ایک رفیق کے پاس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس لئے یہ حقیقت یکسر بے بنیاد ہے کہ جب سب ادیان [illegible] ہیں تو ان پر عمل کرنا بھی نجات کے لئے کافی ہونا چاہئے جس دور میں خود موسیٰ علیہ السلام کو بھی [illegible] عمل کی ضرورت ہی کیا ہو [illegible] ان کی کتاب کا تذکرہ کرنا ایک سعی لاحاصل ہے۔ دراصل اس بحث کا منشا [illegible] ہمارا ایک مسلم مسئلہ ہے علماء کا اگر اختلاف ہے تو دین اسلام کے احکام کے نسخ میں ہے [illegible] یہاں ہمارا مقصد [illegible] یہ دوسری بات ہے۔

بجوامع من التوراة ألا أعرضها عليك؟ فتغير وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم قال عبد الله فقلت له ألا ترى ما بوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال عمر رضينا بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد صلى الله عليه وسلم رسولا قال فسري عن النبي صلى الله عليه وسلم ثم قال والذي نفسي بيده لو أصبح فيكم موسى ثم اتبعتموه وتركتموني لضللتم إنكم حظي من الأمم وأنا حظكم من النبيين۔ رواه احمد۔ وعزاه صاحب المشكوة للدارمي وقال صاحب التنقيح رواه ايضا ابن حبان بسند صحيح واحمد باسناد حسن۔

(۴۷) عن جابر أن عمر بن الخطاب أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بنسخة من التوراة فقال يا رسول الله هذه نسخة من التوراة فسكت فجعل يقرأ ووجهه

گذرا تھا تو اس نے میرے فائدہ کی غرض سے تورات سے کچھ جامع کلمات لکھ دیئے تھے اجازت ہو تو آپ کے سامنے پیش کروں۔ راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ عبداللہ کہتے ہیں میں نے کہا اے عمرؓ آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار ناگواری نہیں دیکھتے! (عمرؓ فوراً متنبہ ہوئے) اور کہنے لگے ہم اللہ کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر راضی ہو چکے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ کلمات سن کر آپ کے چہرے سے وہ اثر زائل ہو گیا اور آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر موسیٰ تم میں موجود ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کا اتباع کرو تو گمراہ ہو گے امتوں میں تم میرا حصہ ہو اور پیغمبروں میں تمہارا حصہ ہوں۔ اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اس روایت کو دارمی کی طرف منسوب کیا ہے۔ صاحب تنقیح کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن حبان نے بھی باسناد صحیح روایت کیا ہے اور امام احمدؒ نے باسناد حسن روایت کیا ہے۔

(۴۷) جابرؓ کہتے ہیں کہ عمر بن خطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لیکر گئے اور بولے یا رسول اللہ یہ تورات کا نسخہ ہے آپ خاموش ہو گئے (یہ ناگواری کی خاموشی

---

(۴۷) یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے سامنے شریعت موسوی کا متلاشی ہے وہ گویا آپ کی نبوت کو چھوڑ کر نبوت موسوی کا قائل ہونا چاہتا ہے۔ جس طرح خدا اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی اسی طرح رسول اور اس کی شریعت کے درمیان بھی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ ایمان بالرسالة یہ ہے کہ اس کے لائے ہوئے دین کو مانے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نبوت محمدی مان کر شریعت موسوی کی پیروی کی جائے۔

من عصى النبي صلى الله عليه وسلم فقد أبى

(۷۵) عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كل أمتي يدخلون الجنة إلا من أبى قالوا يا رسول الله ومن يأبى قال من أطاعني دخل الجنة ومن عصاني فقد أبى (رواه البخاري)

لا يؤمن أحدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به

(۷۶) عن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يؤمن

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے وہ آپ کا انکار کرتا ہے

(۷۵) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری تمام امت جنت میں جائے گی مگر جو انکار کرے صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ وہ کون ہے جو آپ کا انکار کرتا ہو آپ نے جواب دیا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے مجھے نہ مانا اور میرا انکار کیا۔ (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

کوئی شخص پورا ایماندار نہیں ہوتا جب تک اس کی خواہشات شریعت کے تابع نہیں ہوتیں

(۷۶) عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ اس عالم میں تشریف لانے سے پہلے مردہ کہلا سکتا ہے جیسا کہ عام مومن دوسرے عالم میں منتقل ہونے پر مگر اس جہان میں ان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ رہا یہ اپنے حواس اور معاشرے کے موافق بولی ہے۔ یہ شریعت کی اطلاع ہے کہ ان عظیم القدر ہستی جن کے متعلق کسی کا گمان ہو سکتا ہے اور کسی کا نہیں کہ زندہ ہیں وہ صحیح و سلامت موجود ہے اور اپنے وقت پر پھر آنے والی ہے۔ تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی۔

(۷۵) انکار دو قسم پر ہے ایک یہ کہ زبان سے انکار کرے ایسا منکر کافر ہے اور کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا دوسرا یہ کہ زبان سے اقرار کرتا ہے مگر اپنے طرز عمل میں کھلے منکر کے مشابہ ہے۔ یہ گو اقرار کرتا ہے مگر جب نافرمانی کرنے میں زبان سے انکار کرنے والے کے برابر ہے تو ایک نظر میں یہ بھی گویا منکر ہے لہٰذا اسے بھی ان منکرین کے ساتھ کچھ دن رہنا ہو گا۔ گو اپنے قلبی اقرار کی وجہ سے پھر نجات ہو جائے۔ رسول کے لائے ہوئے دین کو تسلیم کرنا ہے اور اس کی اطاعت کرنا اس قلبی ایمان کی علامت ہے۔ نافرمان اور منکر صورت میں یکساں ہیں۔

أحدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به- (رواه في شرح السنة قال النووي في أربعين هذا حديث صحيح رويناه في كتاب الحجة بإسناد صحيح)۔

وجوب محبة النبي صلى الله عليه وسلم أكثر من نفسه والناس أجمعين

(۷۷) عن أنس بن مالك قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من والده وولده والناس أجمعين. (رواه الشيخان)

شخص ایماندار نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش اس دین کی تابع نہ بن جائے جو میں لایا ہوں۔ اس حدیث کو شرح السنہ میں روایت کیا ہے نووی اپنی کتاب اربعین میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور کتاب الحجہ میں ہم نے اس کو صحیح اسناد سے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنی جان بلکہ سب جہان سے زیادہ کرنا ضروری ہے

(۷۷) انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں کوئی مومن نہیں ہے جب تک کہ میں اس کے اپنے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

ہو ایمان کامل یہ ہے کہ متابعت شریعت میں وہ لطف و لذت محسوس ہونے لگے جو طبعی رغبت میں محسوس ہوتی ہے اذان کے وقت نماز اور ماہ رمضان میں روزہ اور نصاب پر زکوٰۃ کی وہ خواہش ہو جو سردی میں گرم کپڑے اور گرمی میں ٹھنڈک حاصل کرنے کی ہوتی ہے یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ نفس اپنی سرشت چھوڑ کر شریعت کے تابع ہو جائے اسی کا نام نفس مطمئنہ ہے ظاہر ہے کہ جب نفس میں یہ روحانی پیدا ہو جائے گا تو پھر لطف شریعت پیدا ہو کر اس کی عمل جستجو آ جائے گا اور اسی وقت وہ ایمان حاصل ہو گا جو بڑی حد تک زوال کے خطرہ سے مامون ہو گا۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اسی کا نام ولایت کبریٰ ہے شریعت میں اس کو ایمان کامل کہا جاتا ہے۔

(۷۷) علماء محققین لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں کمال، جمال، احسان۔ یہ تینوں اوصاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں۔ آپ کا کمال شریعت مطہرہ سے ظاہر ہے آپ کا جمال اخبار شمائل میں مذکور ہے۔ آپ کی سیرت و احسان و بخشش و کرم کا اندازہ کون لگا سکتا ہے پھر آپ کی محبت تمام مخلوق سے زیادہ کیوں نہ ضروری ہو۔ ماں باپ بیٹے کی محبت طبعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت محبت عقلی ہے حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آ جائے ایمان کی تفصیلی بحث آپ پڑھ چکے ہیں معرفت [illegible] کیفیات کا نام ہے ذہن سے [illegible] مومن [illegible] قلب [illegible] نہیں ہو جاتا [illegible]

إليّ إلا من نفسي فقال لا والذي نفسي بيده حتى أكون أحب إليك من نفسك فقال عمر

عزیز ہیں۔ آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب تک تم کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں تم مومن نہیں ہو۔ عمرؓ نے عرض کیا اچھا اب آپ مجھے اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مگر آپ کی نیکی صحبت کی یہ پہلی تاثیر عقل انسانی کے لئے موجب حیرت بن رہا ہے۔ اب سوچ کر جہاں سکندری کی صحبت کے ۔۔۔ ہوں وہاں بھی عیبوں اور دسوں کے اثرات کہاں ہوں گے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اس مضمون کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے جسے آپ پڑھیے یہ حدیث کا مطلب ہے۔

يا ايها الذين آمنوا لا تتخذوا آباءكم
وإخوانكم أولياء إن استحبوا الكفر على
الإيمان ومن يتولهم منكم فأولئك
هم الظالمون. قل إن كان آباؤكم
وأبناؤكم وإخوانكم وأزواجكم وعشيرتكم
وأموال اقترفتموها وتجارة تخشون
كسادها ومساكن ترضونها أحب إليكم
من الله ورسوله وجهاد في سبيله فتربصوا
حتى يأتي الله بأمره والله لا يهدي
القوم الفاسقين - (توبہ ع ۹)

اے مومنو اگر تمہارے باپ بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھتے ہوں تو انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور جو ایسا کریگا تو یہی لوگ ظالم ہوں گے۔ اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ، اولاد، بھائی، بیویاں، کنبہ، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے، تمہارے وہ مکان جو تمہیں بہت پسند ہیں یہ سب چیزیں اگر خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو خدا کرنے والا ہے تمہارے سامنے آجائے۔ خدا فاسقوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا۔

آیت بالا میں تفصیل کے ساتھ ان جملہ عواقب کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جو اسلامی زندگی اختیار کر لینے کے بعد غیر متوقع نہیں ہوتے بلکہ پیش آ سکتے ہیں کہ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے بھائی اپنے بھائی سے شوہر بیوی سے علیحدہ ہو جائے، کنبہ قبیلہ دور ہو جائے، اپنا کمایا ہوا مال ہاتھوں سے نکل جائے، چلتی ہوئی تجارت میں گھاٹا آ جائے، اپنے رہائشی اچھے مکان ترک کرنے پڑ جائیں مگر بتلاؤ ایسے وقت میں تم کس کا ساتھ دو گے۔ اگر تمہیں عزیزوں کا ساتھ دینا ہے تو یہ اس کا ثبوت ہوگا کہ جو ایثار و قربانی کا عہد تم نے اپنے خدا سے باندھا تھا وہ غلط تھا پھر اس عہد شکنی کی پاداش پھر اس کا انتظار تمہیں کرنا چاہئے۔

اسلام بتاتا ہے کہ عزیزوں کے ذمہ حقوق ہیں اور سب حقوق کی رعایت کرنا انسان کا فرض ہے مگر خدا و رسول کا حق سب سے مقدم ہے اور اسی لئے جب کسی کے حق کی ادائیگی میں ان کا حق فوت ہو تو پھر ان کا حق مقدم کرنا ہوگا۔ والدین اپنی جگہ بہت بڑے حقدار ہیں مگر خدا و رسول کا حق ان سے بہت زیادہ ہے اسی لئے آیت کے شروع میں پہلے ہی ان کا اعتبار کیا گیا ہے کہ اگر تمہارے والدین ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور خدا کے حق کو فراموش کر دیں تو پھر تمہارا حق ہے کہ تم بھی ان کے حق کو فراموش کر دو۔ اسی لئے دوسری جگہ فرمایا۔

لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر
يوادون من حاد الله ورسوله ولو كانوا

یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والے
ان سے محبت رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف

(۷۹) عَنْ أَنَسٍ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ (رواه الشيخان)

حب الرسول لحب الله

(۸۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا

---

(۷۹) انس سے روایت ہے کہ جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا (۱) اللہ و رسول اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوں (۲) جب وہ کسی سے محبت کرے تو خدا کے لئے کرے (۳) کفر میں پھر واپس جانا اس کو اتنا ہی برا لگے جیسے کہ آگ میں داخل ہونا۔

رسول کی محبت خدا کی محبت کی وجہ سے کرنا چاہئے

(۸۰) ابن عباس روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کو محبت رکھو

---

(۱) اس حدیث میں تیسری بات قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَ كَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ۔ یہ خدا کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو خوشنما بنا دیا ہے اور کفر و فسق اور عصیان کی نفرت پیدا کر دی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں یہاں ایمان کی طرف فرائض و مستحبات وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے اور اس کے مقابلہ میں کفر، فسوق و عصیان کی تفصیل اختیار کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کامل فرائض و مستحبات کے مجموعہ کا نام ہے اس لئے ایمان کی محبت یہ ہے کہ بلا تفصیل اس کے تمام احکام کی محبت ہو اور اس کے مقابل جو بات بعض مرتبہ کفر ہوگی اور بعض مرتبہ صرف فسق و عصیان کی حد تک رہے گی مومن کامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف کفر سے نہیں بلکہ فسق و عصیان سے بھی نفرت رکھے۔ تین الفاظ اسی لئے رکھے گئے ہیں کہ ہر فسق و عصیان کفر نہیں ہے اور نہ ہر عصیان فسق ہے (کتاب الایمان ص ۱۰)

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام اشخاص و افراد سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔ ہاں زشت افعال سے نفرت و بیزاری کی ضرور تعلیم دیتا ہے۔ حضرت سید الشہداء کا قاتل اسلام قبول کر کے مسلمانوں کا بھائی بن سکتا ہے اور ایک کاتب وحی مرتد ہو کر ہمیشہ کا مستوجب لعن بن جاتا ہے اس لئے کفر سے نفرت کرنا اسلام کی تعلیم کا جزو ہے۔ آپ بالآخر معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی محبت اور کفر کی نفرت دونوں باتیں لازم ہیں جسے اسلام سے محبت ہوگی اسے کفر سے نفرت اور جسے کفر سے رغبت ہوگی اسے اسلام سے نفرت ہونا ضروری ہے۔ اسلام یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ خدا کی زمین پر کسی ظلم و عدوان سے قانون کی حرمت بھی اسی طرح کی ملنی چاہئے جیسا کہ عدل و انصاف کے آئین کی کی جاتی ہے اس لئے اسلام و کفر کے درمیان کوئی صلح و آشتی ہونی بے معنی ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

إِذَا تَلَاقَوْا بَيْنَهُمْ تَلَاقَوْا بِوُجُوهٍ مُبْشِرَةٍ وَإِذَا لَقُونَا لَقُونَا بِغَيْرِ ذَلِكَ فَغَضِبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى احْمَرَّ وَجْهُهُ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الْإِيمَانُ حَتَّى يُحِبَّكُمْ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ ثُمَّ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ آذَى عَمِّي فَقَدْ آذَانِي فَإِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ أَبِيهِ (رواه الترمذی)

(۸۲) عَنْ أُسَامَةَ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا إِذْ جَاءَ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ يَسْتَأْذِنَانِ فَقَالَا يَا أُسَامَةُ اسْتَأْذِنْ لَنَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ عَلِيٌّ

ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بہت خوش خوش ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو اس طرح نہیں ملتے اس پر آپ کو اتنا غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا پھر فرمایا اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس وقت تک آدمی کے قلب میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی خاطر تم سے بھی محبت نہ رکھے۔ اس کے بعد کہا اے لوگو دیکھو جو میرے چچا کو تکلیف دے گا اس نے مجھے تکلیف دی۔ آدمی کا چچا اس کے باپ ہی کے برابر ہوتا ہے (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۲) اسامہؓ سے روایت ہے کہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے اجازت طلب کرنے لگے اور اسامہ سے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اپنے خود تراشیدہ خیالات پر رسول کی محبت کرنا صحیح محبت نہیں۔ عیسائی بھی حضرت مسیح سے محبت کرتے ہیں مگر خدا کا رسول سمجھ کر نہیں بلکہ اس کا بیٹا بنا کر کیا تم اس کو صحیح محبت کہو گے یہود ان سے بغض و دشمنی رکھتے ہیں مگر نہیں خدا کا دشمن سمجھ کر کیا تم اسے صحیح دشمنی کہو گے پس صحیح دوستی اور صحیح دشمنی وہ ہے جو صرف اس ایک ذات پاک کے نام پر ہو اس کے سوا جتنی اقسام ہیں سب آمیزش سے خالی نہیں۔ اس علاقہ کو [illegible] وسعت دو تو رسول کی یاد لا دیتا ہے آل سے بجان ہے محبت اس لئے ضروری ہے کہ رسول کی محبت ضروری ہے گویا ان کی محبت پیدا کرنے کے لئے رسول کی ذات سامنے رکھنا چاہئے تو ان کی محبت آپ سے آپ پیدا ہو جائے گی جیسا کہ رسول کی محبت کے لئے خدا کی ذات پیش نظر رکھنا چاہئے اور اس طرح اگرچہ محبت کا دائرہ بہت پھیلتا چلا جائے گا مگر اصل مرکزی نقطہ پھر یہی ایک ذات پاک کی محبت رہے گی اب اگر کوئی شخص رسول کی محبت کا دعویدار ہے مگر اہل بیت کی محبت نہیں رکھتا یا اہل بیت کی محبت کا مدعی ہے مگر خدا و رسول کی محبت کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے تو کہنا ہوگا کہ صحیح محبت نہیں رکھتا۔ رسول کا رشتہ جس طرح اہل بیت کے ساتھ ہے اسی طرح اس جماعت کے ساتھ بھی ہے جس نے اپنے سب وطن [illegible] چھوڑ دیئے جنہوں نے ان کے لئے جانیں قربان کیں اور اس کی رفاقت میں تمام علائق ختم کر دیئے [illegible] اگر کوئی شخص اس جانثار جماعت سے بغض رکھے تو کیا تم اسے رسول کا محب کہو گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں غلو سے بچائے اور صحیح محبت کی توفیق بخشے۔

والعباس يستأذنان فقال أتدري ما جاء بهما قلت لا قال لكني أدري فأذن لهما فدخلا فقالا يا رسول الله جئناك نسألك أي أهلك أحب إليك قال فاطمة بنت محمد قالا ما جئناك نسألك عن أهلك قال أحب أهلي إلي من قد أنعم الله عليه وأنعمت عليه أسامة بن زيد قالا ثم من قال ثم علي بن أبي طالب فقال العباس يا رسول الله جعلت عمك آخرهم قال إن عليا سبقك بالهجرة. رواه الترمذي

(۸۳) عن عمر أنه فرض لأسامة في ثلاثة آلاف وخمسمائة وفرض لعبد الله بن عمر في ثلاثة آلاف فقال عبد الله بن عمر لأبيه لم فضلت أسامة علي فوالله ما سبقني إلى مشهد قال لأن زيدا كان أحب إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم من أبيك وكان أسامة أحب إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم منك فآثرت حب رسول الله صلى الله عليه وسلم على حبي. رواه الترمذي

لیا چاہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری کی اجازت لے رہے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ علی اور عباسؓ اجازت چاہتے ہیں آپ نے فرمایا جانتے ہو کیوں آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا نہیں فرمایا لیکن میں جانتا ہوں اچھا انہیں آنے کی اجازت دیدو۔ دونوں آگئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ہم آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو اپنے گھر میں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے آپ نے فرمایا اپنی بیٹی فاطمہ سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے گھر والوں کے متعلق نہیں پوچھتے فرمایا تو پھر۔۔۔ جس پر اسلام کی توفیق دے کر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا اور آزاد کر کے میں نے احسان کیا یعنی اسامہ بن زید۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ علیؓ۔ عباسؓ بولے یا رسول اللہ آپ نے اپنے چچا کو سب سے آخر میں ڈال دیا۔ فرمایا اس لئے کہ علیؓ ہجرت میں تم سے سبقت لے جا چکے ہیں۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(۸۳) عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اسامہؓ کا وظیفہ ساڑھے تین ہزار اور اپنے بیٹے کا تین ہزار مقرر کیا تو اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد سے عرض کیا آپ نے اسامہ کو مجھ پر کس وجہ کی بنا پر فوقیت دی خدا کی قسم کسی معرکہ میں وہ مجھ سے آگے نہیں پہنچے۔ عمرؓ نے جواب دیا اس بنا پر کہ اسامہ کے والد زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے والد سے زیادہ پیارے تھے اور خود اسامہ تجھ سے زیادہ پیارا تھا اس لئے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے کو اپنے پیارے پر ترجیح دی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

لہ حاشیہ صفحہ آئندہ ملاحظہ فرمائیے

محبۃ العرب

(۸۵) عن سلمان قال قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تبغضني فتفارق دينك قلت يا رسول الله كيف أبغضك وبك هدانا الله قال تبغض العرب فتبغضني. (رواه الترمذي وقال هذا حديث حسن غريب)۔

(۸۶) عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أحبوا العرب لثلاث لأني عربي والقرآن عربي وكلام أهل الجنة عربي (رواه البيهقي في شعب الإيمان)

[illegible] قال الحاكم [illegible] وقال الذهبي الحديث ضعيف [illegible] موضوع [illegible] تذكرة الموضوعات [illegible]
[illegible] المستدرك [illegible] حب العرب [illegible] (۲۳۲)

عرب کی محبت

(۸۵) سلمانؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا دیکھو مجھ سے بغض نہ رکھنا ورنہ دین سے بالکل جدا ہو جاؤ گے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ بھلا آپ سے کیسے بغض رکھ سکتا ہوں آپ ہی کے طفیل میں تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت نصیب فرمائی ہے فرمایا عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے لگو گے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۶) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت رکھو اس لئے کہ میں عربی ہوں اس لئے کہ قرآن عربی ہے اس لئے کہ اہل جنت کی گفتگو بھی عربی زبان میں ہوگی۔ (اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) جنت میں آپ کے ساتھ ہونے کا مطلب ٹھیک اسی منزل و مرتبہ میں ہونا نہیں ہے بلکہ زیارت و ملاقات کی سہولت مراد ہے۔ جنت عالم کی تمام ایک مکان کی مثال سے [illegible] سب ایک ہی جگہ رہنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ علاقہ محبت کا اثر ہے کہ جنت میں ہر شخص کا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے اپنی علاقہ محبت کے بقدر قریب رکھا جائے گا۔

(۸۵) ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام میں محبت کا مرکز صرف حق کی ذات ہے پھر جہاں تک بھی اس کی شاخیں پھیلتی رہیں سب کا نقطہ بنیاد اسی کی ذات ہے۔ رسول کی محبت خدا کی محبت کی وجہ سے ہے اور عرب کی محبت اس لئے ہے کہ یہ [illegible] رسول کا محبوب وطن اور محبوب قوم ہے محبت اور عداوت دونوں متعدی صفات ہیں جب محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات [illegible] پھیلتی ہیں [illegible] کہ ایک شخص کی وجہ سے تمام جہان نظر میں محبوب یا دشمن بن جاتا ہے۔ عرب کی محبت اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے تو پھر ان کی دشمنی یقیناً آپ سے عداوت ہی کا نتیجہ ہوگا۔ [illegible] کسی خاص شخص سے کسی کی بداعمالی کی وجہ سے عداوت [illegible] کی عداوت نہیں کہلاتی۔ عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم [illegible] (بقیہ حاشیہ آئندہ)

(۸۹) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى صِبْيَانًا وَنِسَاءً مُقْبِلِيْنَ مِنْ عُرْسٍ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْتُمْ مِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ اَللّٰهُمَّ اَنْتُمْ مِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ يعني الانصار (متفق عليه)

(۹۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ عَلٰى عَاتِقِهٖ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ (متفق عليه) وفي رواية عن ابي هريرة عنه اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ وَاَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهٗ۔

(۸۹) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بچوں اور عورتوں کو ایک شادی سے واپس آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا سب لوگوں میں تم مجھے بہت ہی محبوب ہو بہت ہی محبوب ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ خطاب آپ کا انصار کے بچوں اور عورتوں کو تھا (متفق علیہ)

(۹۰) براءؓ کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت حسنؓ آپ کے کاندھے پر - - - - ہیں اور ان کے لئے آپ یہ دعا فرما رہے ہیں اے اللہ میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں شیخینؒ نے یہ روایت کیا ہے اے اللہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے ان کو بھی محبت فرما

(۸۹) شرح السنہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امت میں میرے صحابہ کی مثال ایسی ہے جیسا کھانے میں نمک کی ایسا کوئی کھانا بغیر نمک درست ہو سکتا ہے حسنؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا نمک ہی ختم ہو گیا تو ہم کیسے درست ہوں۔ (مشکوٰۃ شریف)

(۹۰) احبہ فاحبہ (یا اللہ اس سے محبت کر) جلد دعا بہر ہو جاتے تو بھی ممکن ہے یعنی خدا ان سے محبت کرے اور خدا ان سے بغض رکھے اس حدیث کی تشریح کتاب الایمان میں کی جا چکی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۳۵۸/۹۰) ہماری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ و خاندان تھے انصار نے غیر ہو کر جو آپ کی مدد کی اس میں خدا کے رسول سے محبت کے سوا اور کیا جذبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے بجز تعجب آپ بھی ان سے محبت میں کمالات فرما کر ان کی محبت افزونی فرمایا کرتے اور بتلایا کرتے تھے کہ خدا کے رسول کو ان کی اس جاں نثاری کی کتنی قدر ہے۔

جو رسول کی محبت رکھیں گے تو خدا کی محبت پیدا ہو جائے گی اور اگر رسول تم سے محبت کرے گا تو تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اگر تم محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس آیت میں اتباع رسول کا ثمرہ خدا تعالیٰ کی محبوبیت قرار دیا ہے۔ یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے بعد میں خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ درخواست کی ہے کہ وہ بھی انہیں اپنا محبوب بنا لے۔ اصل یہ ہے کہ محبت میں خدا و رسول کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی۔ ایک کا حب دوسرے کا حب ہے اور ایک کا محبوب دوسرے کا محبوب بن کر رہتا ہے۔ پہلی روایت میں گذر چکا ہے ... کہ اہل بیت کی محبت کا اصل راز خدا کے رسول ہی کی ذات ہے۔

اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت بھی اسی ایمانی رشتہ سے وابستہ ہے۔

محبۃ کل ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یحبہ

(۹۱) عن عبید بن جریج أنه قال لابن عمر رأیتك تلبس النعال السبتیة قال إني رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یلبس النعال التي لیس فیها شعر ویتوضأ فیها فأنا أحب أن ألبسها. (رواه الترمذي وغیره)

(۹۲) عن أنس بن مالك قال إن خیاطا دعا رسول الله صلی الله علیه وسلم لطعام صنعه قال أنس فذهبت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم إلی ذلك الطعام فقرب إلی رسول الله صلی الله علیه وسلم خبزا من شعیر ومرقا فیه دباء وقدید قال أنس فرأیت النبي صلی الله علیه وسلم یتتبع الدباء من حوالي الصحفة فلم أزل أحب الدباء من یومئذ. رواه الشیخان وفي روایة للترمذي قال أنس فما صنع لي طعام أقدر علی أن یصنع فیه دباء إلا صنع.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرغوب چیز کا مرغوب ہو جانا

(۹۱) عبید بن جریج نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا میں دیکھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ بے بال چمڑے کے چپل پہنا کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی چپل پہنے دیکھا تھا جس پر بال نہ ہوا کرتے تھے اس لئے مجھ کو بھی ایسے ہی چپل پہننا پسند ہیں (اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے)

(۹۲) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ کھانا تیار کیا اور آپ کی دعوت کر دی۔ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے پر گیا۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کی روٹی اور شوربا پیش کیا جس میں لوکی اور گوشت کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوکی کے ٹکڑے پیالے میں چاروں طرف تلاش کر رہے ہیں بس اسی دن سے لوکی مجھے محبوب ہو گئی۔ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ انسؓ فرماتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے جس سالن میں بھی لوکی ڈالا جا سکتا تھا ڈلوا لیتا تھا۔

(۹۲) عالم محبت کی جب رسوخ پیدا کر لیتی ہے تو نعتیں و طبیعات بلکہ شکل و شباہت پر اس کا اثر پڑنے لگتا ہے یہی محبت کا عالم ایمان ہے جس میں محبوب کی طبیعت بھی شامل ہو جاتی ہے اسی سے ایمان کا ذوق بھی ملتا ہے۔ شیخ بدرالدین عینی لکھتے ہیں۔ ذکر الاصمعی أن انس قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب القرع فقال رجل لا أحب القرع [illegible] من الکفر (ج ۲ ص ۲۰۴) ہمارے علماء صاحب نے بیان کیا ہے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

الزهادة في الدنيا وإيثار الفقر على الغنى

(۹۳) عن عبد الله بن مغفل قال جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال انى لاحبك قال انظر ما تقول فقال والله انى لاحبك ثلث مرات قال ان كنت صادقا فاعد للفقر تجفافا للفقر اسرع الى من يحبنى من السيل الى منتهاه رواه الترمذى

دنیا سے بے رغبتی اور فقر کی زندگی کو ترجیح دینا

(۹۳) عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا دیکھ کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، تین بار کہا۔ آپ نے فرمایا اگر تو سچا ہوتا ہے تو پھر فقر کی تکلیفوں کے لئے اپنے واسطے ایک آہنی جھول تیار کر لے کیونکہ فقر مجھ سے محبت رکھنے والے کی طرف اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آتا ہے جیسا نشیب میں رو کا پانی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن غریب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند فرماتے تھے اور اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بول اٹھے کہ مجھے تو یہ لکی پسند نہیں ہے تو یہ بے محل انکار بلاشبہ کفر کا اندیشہ ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کے لئے امراض میں مبتلا ہونے اور اس پر صبر کے ثواب کا ذکر فرمایا تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ وما الاسقام والله ما مرضت قط فقال قم عنا فلست منا یا رسول اللہ میں بیماری کا نام بھی نہیں جانتا اور خدا کی قسم میں کبھی بیمار نہیں ہوا آپ نے فرمایا جا ہمارے پاس سے اٹھ تیرا ہم سے کوئی واسطہ نہیں یا جیسا صحیح مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکنے کی ممانعت کی ہے۔ اس پر ان کے ایک فرزند نے کہا واللہ ہم تو ان کو ضرور روکیں گے اس پر ابن عمرؓ نے اتنا برا بھلا کہا کہ شاید ہی کسی کو کبھی کہا تھا۔ اور مسند امام احمد میں ہے کہ پھر مرتے دم تک ان کی بات نہ کی۔ ان سب مقامات پر بات فرق [illegible] مگر انداز گفتگو گستاخانہ تھا اس لئے دونوں جگہ عتاب ہوا۔ اس وقت جبکہ رسول مسلمانوں کے حق میں بیماری کے فضائل بیان کر رہا ہے یہ کہنا کہ میں تو بیماری کو جانتا بھی نہیں یہ کہنے کے یہی معنی ہیں یا حدیث رسول سن کر یہ کہنا کہ ہم تو روکیں گے خود رسول اور حدیث رسول کا صریح مقابلہ کرنا ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ ...... کی پسندیدہ چیز کو سن کر یہ کہنا کہ مجھے پسند نہیں انتہائی گستاخی و بدتہذیبی ہے اسی لئے امام ابو یوسفؒ نے تو ایسے شخص کے قتل کا حکم دیا تھا۔ مگر جب [illegible] پیدا ہو گئی ہے تو ابعض آپ کے اوضاع و اطوار نقلیات و طبیعیات کی حد میں سے اگر یہ معلوم ہو کہ نہیں ہے تو ہمارے حق میں تقلید کرنے کی دعوت بھی کیا ہے اگر آپ کو کوئی مرغوب نہیں کرتے تھے آنحضرت کی محبت میں آپ نے خاص لباس وعمامہ شکل وشبہ بنانے کو جو حال پایا ہے یکسر ترجمہ دل اس پر غور کیجئے۔ بہر حال یہاں آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرغوبات کے متعلق یہی حال کہ دونوں کو الگ سمجھ لینا چاہئے۔

(دوسرا حاشیہ صفحہ ۳۶۲ پر ملاحظہ ہو)

صلی اللہ علیہ وسلم قد جلدہ فی الشراب فاتی بہ یوما فامر بہ فجلد فقال رجل من القوم اللھم العنہ ما اکثر ما یؤتی بہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تلعنوہ فواللہ ما علمت انہ یحب اللہ ورسولہ۔ رواہ البخاری

ثواب محبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۹۴) عن انس بن مالک ان رجلا سال النبی صلی اللہ علیہ وسلم متی الساعۃ

شراب پینے کے جرم میں ایک مرتبہ اس کے کوڑے لگانے کا حکم دے چکے تھے، ایک دن پھر وہ شراب کی شکایت میں گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پیش ہوا پھر اس کے کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا گیا کوڑے لگائے گئے اس پر ایک شخص بولا یہ شراب کے مقدمہ میں کتنی کثرت سے گرفتار کر کے لایا جاتا ہے (اور [illegible]) اے خدا تو اس پر لعنت فرما، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر لعنت مت بھیجو، واللہ میں تو یہ جانتا ہوں یہ خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ

(۹۴) انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا

(۹۳) ہر دور میں کچھ لوگوں کے مزاج میں خوش طبعی کا مضمون ہوتا ہے اور یہ خوش طبعی [illegible] کے متعلق [illegible] جہاں بیٹھتے ہیں ہنسی کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر اتنی بات اپنی حدود میں رہے تو کچھ برا بھی نہیں۔ فتح الباری میں ان کے مذاق کی ایک دلچسپ داستان [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] عرب کی [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] ہو گئی ہے۔ [illegible] آزاد طبائع سے [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] لعنت [illegible] خدا اور رسول کی محبت کی [illegible] موجود ہو اور دوسری طرف تقاضائے بشریت سے [illegible] ہو سکے۔

اسی قسم کے ایک دوسرے واقعہ میں مذکور ہے کہ صحابہ نے اس شخص کو اخزاک اللہ (خدا تجھ کو رسوا کرے) کہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تقولوا ھکذا لا تعینوا علیہ الشیطان (بخاری) اور دوسری روایت میں ہے ولکن قولوا اللھم اغفر لہ اللھم ارحمہ (ابوداؤد) یہ کلمات مت کہو اور اس کے مقابلہ میں شیطان کی اعانت مت کرو۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۹۵) عن صفوان بن قدامة قال هاجرت الى النبي صلى الله عليه وسلم فاتيته فقلت يا رسول الله ناولني يدك ابايعك فناولني يده فقلت يا رسول الله اني احبك قال المرء مع من احب (رواه القاضي في الشفاء)

(۹۶) عن عائشة قالت كان رجل عند النبي صلى الله عليه وسلم ينظر اليه لا يطرف فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما بالك قال بابي انت وامي اتمتع بالنظر اليك فاذا كان يوم القيامة رفعك الله بتفضيلك فانزل الله تعالى ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا (رواه الطبراني وابن مردويه كذا في الشفاء)

---

(۹۵) صفوان بن قدامہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ہجرت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، رسول اللہ اپنا ہاتھ لائیے میں آپ سے بیعت کروں۔ آپ نے اپنا دست مبارک بڑھایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے آپ نے فرمایا جس سے محبت ہوگی، آدمی اسی کے ساتھ ہوگا۔ (اس حدیث کو شفا میں روایت کیا ہے)

(۹۶) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ٹکٹکی لگائے ایک نظر دیکھ رہا تھا پلک تک نہ جھپکاتا تھا آپ نے فرمایا تجھے کیا ہو گیا ہے اس نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا ہوں جب قیامت آئے گی اس وقت تو اللہ تعالیٰ آپ کی فضیلتوں کی وجہ سے آپ کو بلند بلند مراتب مرحمت فرمائے گا (پھر ہم کہاں اور آپ کہاں) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی حکم برداری کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہی ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی نبی، صدیق، شہداء اور صالحین اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔ (اس حدیث کو طبرانی اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے)

---

(۹۵) حدیث میں محبت کی جزا معیت بتلائی گئی ہے اور قرآن کریم میں معیت اطاعت کا صلہ قرار دیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح محبت، اطاعت ہی کا نام ہے۔ دعوی محبت اور نافرمانی یہ دو باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ نافرمانی یہ ہے کہ جان بوجھ کر خلاف کرنا، بھول چوک، غلطی، تقصیر، کوتاہی، نافرمانی نہیں ہے اسی لیے پہلی صورت میں ندامت نہیں ہوتی اور ان سب صورتوں میں ندامت ہوتی ہے پھر محبت کے بھی مراتب ہیں پھر ہر مرتبہ کا تقاضہ علیحدہ ہے اس کے ثمرات بھی جدا ہیں اور ان مراتب کے بقدر معیت کے بھی مراتب ہیں جس کی محبت جتنی کامل اور سچی ہوگی اس کو معیت بھی اسی کے موافق نصیب ہوگی۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

(١٠٠) قال عروة بن مسعود حين وجهته قريش إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم
عام القضية ورأى من تعظيم أصحابه له ما رأى أنه لا يتوضأ إلا ابتدروا وضوءه
وكادوا أن يقتتلوا عليه ولا يبصق بصاقا ولا يتنخم نخامة إلا تلقوها بأكفهم فدلكوا بها
وجوههم وأجسادهم ولا تسقط منه شعرة إلا ابتدروها وإذا أمرهم بأمر ابتدروا أمره وإذا
تكلم خفضوا أصواتهم عنده وما يحدون إليه النظر تعظيما له فلما رجع إلى قريش قال
يا معشر قريش إني جئت كسرى في ملكه وقيصر في ملكه والنجاشي في ملكه وإني والله
ما رأيت ملكا في قوم قط مثل محمد في أصحابه - هذا بعض من حديث طويل [illegible] الالفاظ
ومن هذه المادة قول قريش لعثمان في الطواف بالبيت حين وجهه في القضية إليهم وقال ما كنت
لأفعل حتى يطوف به رسول الله صلى الله عليه وسلم ذكره اصحاب السير۔

(١٠١) وفي حديث طلحة أن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قالوا
لأعرابي جاهل سله عمن قضى نحبه من هو وكانوا يهابونه ويوقرونه فسأله فأعرض

---

(١٠٠) ساتویں سال جب قریش نے عروہ بن مسعود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صلح کی گفتگو
کرنے کے لئے بھیجا اور اس نے آپ کے صحابہ کی حیرت انگیز تعظیم کا جو نقشہ کھینچا وہ ذیل کے الفاظ میں بیان
کیا ہے۔ وہ وضو کرتے ہیں تو آپ کے وضو کے پانی پر خلقت اس طرح ٹوٹ پڑتی ہے کہ اب ان میں جنگ
ہوئی اور جب آپ کا بلغم یا تھوک گرتا ہے تو وہ ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر مل لیتے ہیں جب
ان کا کوئی بال گرتا ہے تو جلدی سے اس کو لپک لے جاتے ہیں جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو اس کو پورا
کرنے کے لئے دوڑتے ہیں جب بات کرتے ہیں تو ان پر خاموشی چھا جاتی ہے کوئی شخص نظر بھر کر ان کی طرف
دیکھ نہیں سکتا۔ عروہ جب واپس ہوا تو اس نے کہا اے گروہ قریش میں نے کسریٰ و قیصر و نجاشی کے دربار
دیکھے ہیں خدا کی قسم کسی بادشاہ کو اپنی رعایا کے درمیان ایسا باعظمت و رعب نہیں دیکھا جیسا اپنے رفقا
میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ یہ بخاری کی طویل روایت کا ایک مختصر ٹکڑا ہے۔ اس واقعہ میں اصحاب سیر نے یہ
بھی ذکر کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے عثمان غنی کو قریش کے پاس بھیجا اور ان سے
صلح کرنے کی اجازت مانگی تو قریش نے کہا اے عثمان اگر صرف تم چاہو تو طواف کر سکتے ہو۔ حضرت نے انکار کر دیا اور
کہا کہ مجھ سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف کرنے سے پہلے میں طواف کر لوں۔

(١٠١) طلحہ کے قصہ میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپ کی ہیبت و عظمت کی وجہ

(۱۰۴) عن المغيرة بن شعبة كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرعون بابه بالأظافير (رواه الحاكم والبيهقي)

(۱۰۵) عن البراء بن عازب قال لقد كنت أريد أن أسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الأمر فأؤخر سنتين من هيبته (رواه أبو يعلى)

النهي عن رفع الصوت فوق صوت النبي صلى الله عليه وسلم

(۱۰۶) عن ابن جريج قال أخبرني ابن أبي مليكة أن عبد الله بن الزبير أخبرهم

---

(۱۰۴) مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (ضرورت کے وقت) آپ کا دروازہ ناخنوں سے کھٹکھٹایا کرتے تھے۔ (حاکم۔ بیہقی)

(۱۰۵) براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ میں کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہتا تو آپ کے رعب سے دو دو سال تک نہ پوچھ سکتا تھا۔ (اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے بولنے کی ممانعت

(۱۰۶) ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ عبد اللہ بن زبیرؓ نے ان سے بیان کیا کہ بنو تمیم کا ایک قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو ابو بکرؓ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لوگ جس سے متاثر ہو کر سربلند ہوتا ہے ان کا نام ایمان ہے۔ ملہ

(۱۰۳) قرفصہ ایک خاص قسم کی سرسری اور نہایت معمولی نشست ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اپنی رانیں پیٹ سے لگالی جائیں اور ہاتھوں کو پنڈلیوں سے باندھ کر سرین کے بل بیٹھ جائے۔ یہ ایک عاجزانہ اور فقیرانہ نشست ہے جس کی نظروں میں کسی کی ہیبت و عظمت سمائی ہوئی ہو وہ جب دربار میں دیکھے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے یا یوں کہئے کہ خدا کی بے تکلفی ہے یہاں عظمت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۱۰۴) اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ خطابی نے یہاں کچھ موزونی کی ہے چلتے تھے ایک دروازے کی روایت کے گئے پہلی حدیث کے الفاظ صادق آ سکتے ہیں عرف میں دروازہ کی چوکھٹ کو بھی دروازہ کہا جاتا ہے جس سے کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا دروازہ لکڑی کا ہو بلکہ اگر دروازہ پر پردہ پڑا ہو جب بھی یہ حدیث بلا تکلف صادق آ سکتی ہے۔

(۱۰۵) یہ انتہائی حالات اور انتہائی ہیبت کی بات ہے اس لئے کلیہ بنانا نہیں چاہئے۔

ملہ تفسیر الریاض ج ۲ ص ۴۰۴۔

أنه قدم ركب من بني تميم على النبي صلى الله عليه وسلم فقال أبو بكر أمّر القعقاع
بن معبد وقال عمر أمّر الأقرع بن حابس فقال أبو بكر ما أردت إلى أو إلا خلافي
فقال عمر ما أردت خلافك فتماريا حتى ارتفعت أصواتهما فنزل في ذلك
يا أيها الذين آمنوا لا تقدموا بين يدي الله ورسوله حتى انقضت الآية رواه البخاري
وفي رواية نافع فما كان عمر يسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد هذه الآية حتى يستفهمه
وفي الفتح عن أبي بكر قلت يا رسول الله والله لا أكلمك إلا كأخي السرار۔

(۱۰۷) عن أنس قال كان ثابت بن قيس بن شماس خطيب الأنصار فلما نزلت
يا أيها الذين آمنوا لا ترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي إلى آخر الآية جلس ثابت في بيته

بن معبد کو ان کا امیر بنا دیجئے عمرؓ بولے اقرع بن حابس کو بنا دیجئے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا تم نے تو بس میری
مخالفت ہی پکڑ باندھ رکھی ہے۔ عمرؓ نے فرمایا کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کرتا (بلکہ میری رائے ہی یہ ہے)
دونوں میں جھگڑا بڑھ گیا حتیٰ کہ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں اس پر یہ آیت اتری۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو
خدا اور اس کے رسول کے سامنے ان سے آگے نہ بڑھا کرو (بلکہ ہر بات میں ان کے فیصلہ کا انتظار کیا کرو)
آخر آیت تک اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ نافع جو اس حدیث کے دوسرے طریق میں ایک
راوی ہیں یہ روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد عمرؓ اتنی آہستہ گفتگو کرنے لگے کہ جب تک
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دوبارہ دریافت نہ کرتے کچھ سمجھ میں نہ آتا کیا فرماتے ہیں۔ فتح الباری میں
ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ اس آیت کے بعد میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے قسم کھالی ہے کہ اب میں
آپ سے اس طرح آہستہ بات کیا کروں گا جیسے کوئی اپنا راز آہستہ آہستہ کہتا ہے۔

(۱۰۷) انسؓ فرماتے ہیں کہ ثابت بن قیس انصار کے خطیب تھے جب یہ آیت نازل ہوئی۔ اے
ایمان والو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کرو۔ آخر آیت تک، تو ثابت اپنے گھر بیٹھ رہے اور آپ کی خدمت

یہ سورۂ حجرات کی ابتدائی آیتیں بارگاہ نبوت کا ادب سکھلانے کے لئے اتری ہیں عرب اپنی سادہ فطرت سے
ان رسمی آداب سے عاری تک نا آشنا تھے ان کو نبوت کا نازک مقام سمجھنا تھا۔ اسلام نے اگر چہ ان کو بتدریج بھائی
بھائی ماں باپ اور تمام باہمی رشتوں کے آداب بتلائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی اب وقت آگیا تھا کہ انہیں خدا اور رسول کے
وہ آداب بھی بتلا دیئے جائیں جن سے غفلت اختیار کرنے کو زمانہ اعمال کو اکارت کر دیتا ہے۔ ان میں سے ایک ادب
یہ تھا کہ رسول کے سامنے اس طرح زور زور سے بے باکانہ گفتگو نہ کی جائے جیسے باہمی ایک دوسرے کے سامنے کی جاتی ہے
مصنف اسی طرح اس کو بلایا جائے جب کہ آواز نہ ایک دوسرے کو نام لیکر بلایا جاتا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

وَاحْتَبَسَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعْدَ بْنَ مُعَاذٍ فَقَالَ مَا شَأْنُ ثَابِتٍ أَيَشْتَكِي قَالَ فَأَتَاهُ سَعْدٌ فَذَكَرَ لَهُ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ثَابِتٌ أُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي مِنْ أَرْفَعِكُمْ صَوْتًا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ هُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ (رواہ مسلم والبخاری مثلہ)

میں آنا جانا بند کر دیا۔ آپ نے سعد بن معاذ رضی سے دریافت کیا کہ ثابت کیسے ہیں؟ کیا بیمار ہیں؟ سعد ان کے پاس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کا حال ان سے بیان کیا۔ ثابت بولے کہ وہ آیت میرے بولنے کی حالت میں نازل ہو چکی ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں تم سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ تو مجھے غم ہے کہ میں کہیں دوزخی نہ ہوں۔ سعد نے آکر یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تو آپ نے فرمایا کہ وہ دوزخی نہیں بلکہ جنتی شخص ہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری نے بھی اسی کے قریب روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) یہ طریق احترام نبوت کے خلاف ہے اور جو نبوت کا احترام نہیں کرتا خطرہ ہے کہ اس کے عمل اکارت نہ ہو جائیں۔ ثابت بن قیس قدرۃً بلند آواز تھے یہ سن کر ڈر گئے اور سمجھے کہ بارگاہ نبوت میں یہ گستاخی مجھ سے بار بار سرزد ہو چکی ہے اس لئے میرا اب کہاں ٹھکانا ہے۔ رحمۃ للعالمین کو جب یہ خبر پہنچی تو ان کی اس بے قراری پر آپ کا دل بھر آیا اور آپ نے اس ادب کی وجہ سے جس سے ان کا قلب معمور تھا ان کو جنت کی بشارت سنا دی۔ معلوم ہوا کہ ان کی اس بلند آوازی کو جو قدرۃً تھی قابل عفو سمجھا۔ معلوم ہوا کہ ادب کا اصل دارومدار قلب پر ہے جو ظاہر ہیں اس کے لئے کچھ علامات بھی مقرر ہیں۔ اگر قلب کی گہرائی میں ادب موجود ہے تو ظاہر کی فروگذاشت سے اغماض کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے کلام یعنی حدیث شریف کو سن کر اس کا معارضہ و مقابلہ کرنا اس کا مذاق اڑانا اس آسانی اور بے باکی سے اس کی تاویلات کرنا، یہ سب آپ کی گستاخی کے برابر ہے۔ دنیا اگر کسی شاعر کا احترام کرتی ہے تو اس کے کلام کو بھی بنظر احترام دیکھتی ہے پھر انصاف کرو کہ کیا رسول کا مرتبہ ایک شاعر سے بھی کم ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے اور اپنے رسول کے صحیح احترام و ادب کی توفیق دے

آمین یا رب العالمین

النهي عن رفع الصوت في مسجد رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد وفاته صلى الله عليه وسلم

(۱۰۸) عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ كُنْتُ قَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِي رَجُلٌ فَنَظَرْتُ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اذْهَبْ فَأْتِنِي بِهَذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا قَالَ مَنْ أَنْتُمَا أَوْ مِنْ أَيْنَ أَنْتُمَا قَالَا مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ قَالَ لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْبَلَدِ لَأَوْجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواه البخاري)

رفع الصوت اذا كان عن الازواج في امرهن او عن اعرابي جاهل

(۱۰۹) عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ قَالَ اسْتَأْذَنَ عُمَرُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهُ نِسَاءٌ مِنْ قُرَيْشٍ يُكَلِّمْنَهُ وَيَسْتَكْثِرْنَهُ عَالِيَةً أَصْوَاتُهُنَّ فَلَمَّا اسْتَأْذَنَ عُمَرُ قُمْنَ يَبْتَدِرْنَ

وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت

(۱۰۸) سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں مسجد میں کھڑا ہوا تھا ایک شخص نے تیر کنکری ماری میں نے دیکھا تو وہ عمر بن الخطاب تھے انھوں نے فرمایا جاؤ ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ میں انھیں لے آیا فرمایا تم کون لوگ ہو؟ یا فرمایا کہاں کے ہو؟ انھوں نے جواب دیا طائف کے باشندہ ہیں فرمایا اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں اس وقت تمہیں سزا دیتا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آوازیں بلند کر رہے ہو (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)۔

خانگی معاملات میں اہل خانہ کی یا ناواقف بادیہ نشین کی آواز بلند ہو جانا قابل اعتراض نہیں

(۱۰۹) سعد بن وقاصؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے اجازت طلب کی اس وقت آپ کے پاس قریش کی چند بیبیاں باتیں کر رہی تھیں اور آپ کی اپنی مقررہ معاش سے زیادہ کا مطالبہ کر رہی تھیں اس گفت و شنید میں ان کی آوازیں کچھ بلند ہو گئی تھیں

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ لوگ باہر کے رہنے والے تھے اس لئے ان کو معاف کر دیا گیا اہل مدینہ چونکہ ان آداب سے آشنا ہو چکے تھے اس لئے اگر ان سے یہی غفلت ہوتی تو قابل اغماض نہ ہوتی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب وفات کے بعد بھی اسی طرح تھا جیسا کہ زندگی میں۔

الحجاب فاذن له رسول الله صلى الله عليه وسلم ورسول الله صلى الله عليه وسلم يضحك فقال عمر اضحك الله سنك يا رسول الله قال عجبت من هؤلاء اللاتي كن عندي فلما سمعن صوتك ابتدرن الحجاب قال عمر فانت يا رسول الله كنت احق ان يهبن ثم قال اي عدوات انفسهن اتهبنني ولا تهبن رسول الله صلى الله عليه وسلم قلن نعم انت افظ واغلظ من رسول الله صلى الله عليه وسلم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذي نفسي بيده ما لقيك الشيطان قط سالكا فجا الا سلك فجا غير فجك. (رواه البخاري)

(۱۱۰) وعن زر بن حبيش في طويل حديث قال اتيت صفوان بن عسال المرادي

جب حضرت عمرؓ نے اجازت مانگی تو فوراً وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور جلدی جلدی پردہ میں جا بیٹھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت دیدی (عمرؓ آئے) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے پوچھا یا رسول اللہ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے کیا بات ہے. فرمایا مجھے ان عورتوں پر تعجب ہے جو ابھی میرے پاس تھیں جب تمہاری آواز سنی تو سب جلدی جلدی پردہ میں چلی گئیں. عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ خوف تو حضور سے کرنا چاہئے تھا حق تو آپ ہی کا ہے اس کے بعد ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا اپنی جانوں کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتی ہو انہوں نے کہا بیشک آپ زبان کے تیز اور مزاج کے سخت بھی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نہیں. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کبھی شیطان راستہ چلتے تمہیں مل جاتا ہے تو فوراً تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ لیتا ہے (یعنی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا)

(۱۱۰) زر بن حبیش ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں میں صفوان بن عسال (رضی اللہ عنہ) کی خدمت میں حاضر ہوا

---

(۱) شارحین بخاری تصریح کرتے ہیں کہ قریشی مستورات سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں ہیں اور سوال سے مراد [illegible] کے متعلق تھی. باہم بیٹھے ہوئے [illegible] بات چیت ہو رہی تھی کہ آپ غصہ میں آ گئے ان کے درمیان سے ایک شخص سے کہا ایک [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حرکت پر سخت ناگواری ہوئی. آپ اپنا [illegible] حق ہے ... جب تک [illegible] آپ کی مسکراہٹ ... حضرت عمرؓ آپ کے [illegible] کو ادب مناسب ہے کہ [illegible]

التوجه بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم الی اللہ سبحانہ

(۱۱) عن عثمان بن حنیف قال إن رجلا ضریر البصر أتى النبي صلى الله عليه وسلم فقال ادع الله أن يعافيني فقال إن شئت دعوت وإن شئت صبرت فهو خير لك قال فادعه قال فأمره أن يتوضأ فيحسن الوضوء ويدعو بهذا الدعاء اللهم إني أسألك وأتوجه إليك بنبيك محمد نبي الرحمة إني توجهت بك إلى ربي ليقضي لي في حاجتي هذه اللهم فشفعه في۔ رواہ الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب۔

(۱۲) عن أنس أن عمر بن الخطاب كان إذا قحطوا استسقى بالعباس بن عبد المطلب فقال اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا فتسقينا وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا فيسقوا۔ (رواہ البخاری)

اللہ تعالیٰ کے دربار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اختیار کرنا

(۱۱) عثمان بن حنیف کہتے ہیں کہ ایک شخص کی نظر میں کچھ نقصان تھا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی آپ اللہ تعالیٰ سے میری صحت کے لئے دعا فرما دیجئے آپ نے فرمایا چاہو تو دعا کر دوں اور چاہو تو صبر کرو کیونکہ یہ رضا بقضاء کا مقام تمہارے لئے بہتر ہے اس نے عرض کیا آپ دعا ہی فرما دیجئے آپ نے فرمایا اچھا تو اچھی طرح وضو کرو پھر اس طرح دعا کرو اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نبی الرحمۃ ہیں تیرے دربار میں وسیلہ اختیار کرتا ہوں۔ اے نبی میں نے اپنے رب کے دربار میں آپ کا وسیلہ اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ وہ میری یہ ضرورت پوری فرما دے۔ اے اللہ تو ان کی سفارش میرے حق میں قبول فرمالے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح اور غریب ہے)

(۱۲) انسؓ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو عمر بن الخطابؓ حضرت عباسؓ کے وسیلے سے بارش کی دعا مانگتے اور کہتے اے اللہ پہلے ہم تیرے دربار میں اپنے نبی کا وسیلہ اختیار کیا کرتے تھے اور تو بارش برسا دیتا تھا اب ہم اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں۔ تو بارش برسا دے بارش ہو جاتی تھی۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

(۳) حافظ بدرالدین عینی کہتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے نبی کے اہل بیت کے وسیلے سے بارش مانگنا ان میں بھی رائج تھا۔ (ج ۳ ص ۴۳۱) (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

جعل النبي صلى الله عليه وسلم خاتم النبيين وآدم بين الماء والطين

(۱۱۵) عن عرباض بن سارية عن النبي صلى الله عليه وسلم قال إني عند الله مكتوب خاتم النبيين وإن آدم لمنجدل في طينته. رواه في شرح السنة وأحمد في مسنده كما في المشكوة والبيهقي والحاكم كما في المواهب وقال الحاكم صحيح الإسناد وصححه ابن حبان في صحيحه أيضا وفي الكنز في لفظ من الحديث عند ابن سعد في أم الكتاب خاتم النبيين الحديث۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خاتم النبیین بنا دیئے گئے تھے جبکہ حضرت آدم ابھی آب و گل ہی میں تھے

(۱۱۵) عرباض بن ساریہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں خدا کے نزدیک اس وقت خاتم النبیین مقرر ہو چکا تھا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام ابھی مٹی کی شکل ہی میں پڑے ہوئے تھے (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی) اس حدیث کو شرح السنہ میں اور امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور کنز العمال میں بحوالہ ابن سعد اس حدیث کے لفظ میں بجائے عند اللہ کے ام الکتاب کا لفظ ہے اب حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ میں لوحِ محفوظ میں خاتم النبیین لکھا جا چکا تھا۔ گویا ابن سعد کے لفظ کو مسند امام احمد کی شرح سمجھنا چاہئے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ)

فذاك الرسول الأبطحي محمد	وہ آپ کی ذات والا صفات ہی ہے جن کا نام نامی محمد ہے اور
له في العلى مجد تليد وطارف	جن کو بزرگی کی نئی پرانی بزرگیاں حاصل ہیں۔
أتى بزمان السعد في آخر المدى	آپ کی آمد سعادتوں بھرا ایک زمانہ لے کر زمانہ کے آخر میں ہوئی۔
وكانت له في كل عصر مواقف	مگر آپ کی شہرت ہر دور میں رہی ہے۔
أتى لانكسار الدهر يجبر صدعه	آپ عالم کی شکستہ حالی اور تباہی کی اصلاح کرنے کے لئے آئے۔
فأثنت عليه ألسن وعوارف	اس لئے زبان خلق اور محسنین آپ کی ثناخواں ہے۔
إذا رام أمرا لا يكون خلافه	جب آپ کسی بات کا عزم کر لیتے ہیں تو اس کا خلاف نہیں ہوتا۔
وليس لذاك الأمر في الكون صارف	تمام عالم میں اس سے کوئی مانع نظر آتا ہے۔

(۱۱۵) مواہب میں ہے۔ وأخرج مسلم من حديث عبد الله بن عمرو بن العاص عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال إن الله عز وجل كتب مقادير الخلق قبل أن يخلق السموات والأرض بخمسين ألف سنة وكتب في الذكر أن محمدا خاتم النبيين۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

جعل النبی ﷺ اول النبیین و آخرھم وکذٰلک امتہ آخر الامم ثم تکون اولھم یوم القیامۃ

(١١٩) عن انس فی حدیث طویل مرفوعًا قال تبارک وتعالیٰ جعلت امتک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے نبی بنا دیئے گئے تھے اور سب سے آخر میں تشریف لائے ہیں اور اسی طرح آپ کی امت بھی سب سے آخر میں آئی ہے اور قیامت کے دن سب سے مقدم ہو جائیگی

(١١٩) انس سے ایک طویل حدیث میں مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیری امت کو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ابھی ہر مخلوق کا افسانہ لکھ رہا تھا اور لوح محفوظ میں یہ بھی لکھ رہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی جب عالم تکوین کی ہر منزل سے پہلی جز مقدم پہلی تحریر کے بعد ہی عالم تکوین کی آبادی کا مرحلہ تھا آپ کا خاتم النبیین ہونا بھی اسی وقت مقدر ہو چکا تھا۔ اس روایت کا آخری فقرہ اگرچہ صحیح مسلم کے موجودہ نسخوں میں نہیں ہے مگر جب مصنف ہو جیسے شخص اس کو ذکر کر رہا ہے تو ظاہر یہی ہے کہ ان کے نسخہ میں موجود ہوگا۔

واضح رہے کہ اس حدیث کا منشا یہی صرف تحریر کا ثبوت نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خلعت ختم نبوت آپ کو اسی وقت پہنایا جا چکا تھا جبکہ ابو البشر نے خلعت وجود بھی نہیں پہنا تھا۔ اسی کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے۔ عن ابن عباس فی حدیث الشفاعۃ عنہ قال ان عیسیٰ فیقولون اشفع لنا الی ربک فلیقض بیننا فیقول انی لست ھناکم انی اتخذت وامی الٰھین من دون اللہ ولکن ارأیتم لو ان متاعا فی وعاء قد ختم علیہ اکان یوصل الی ما فی الوعاء حتی یفض الخاتم فیقولون لا فیقول فان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم قد حضر الیوم وقد غفر لہ ما تقدم من ذنبہ وما تأخر رواہ الطیالسی وغیرہ۔ وفی لفظ احمد وابی یعلی ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قد حضر الیوم۔

ابن عباس شفاعت کی طویل حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ (قیامت میں شفاعت کے لئے) آخر میں لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ ہی ہمارے پروردگار سے سفارش کیجئے کہ ہمارا حساب صاف ہو جائے وہ فرمائیں گے میں یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے شرمندہ ہوں کہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لیا گیا تھا لیکن بتلاؤ اگر کسی برتن کو بند کر کے اس پر مہر لگا دی جائے کیا اس میں رکھی ہوئی چیز مہر توڑے بغیر نکالی جا سکتی ہے جب تک اس کی مہر نہ توڑی جائے لوگ کہیں گے ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جو انبیاء علیہم السلام کے خاتم ہیں) بھی آج موجود ہیں ان کی اگلی پچھلی سب لغزشیں معاف ہو چکی ہیں (ان کے پاس جاؤ) مسند احمد اور ابو یعلیٰ کے الفاظ یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور آج یہیں موجود ہیں۔ ان الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف حضور کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اس لطیف تعبیر کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو انبیاء میں خلعت ختم نبوت پہنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکی تھی۔ اس لئے شفاعت کا حق ان ہی کا ہے۔

و بعض کہ اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالم کی ہدایت کے وقت بھی اس کی ہدایت آپ کے دور نبوت پر مقدر ہو چکی تھی اسی لئے آپ نے فرمایا ہے عن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت انا والساعۃ جمیعا ان کادت لتسبقنی (اخرجہ ابن جریر وابو نعیم بسند حسن)

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

هُمُ الْآخِرُوْنَ وَهُمُ الْأَوَّلُوْنَ وَإِلَّا فَلِمَ جَعَلْتَنِيْ أَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ خَلْقًا وَآخِرَهُمْ (إِلَى قَوْلِهِ)
وَجَعَلْتُكَ فَاتِحًا وَخَاتِمًا (اخرجه ابو نعيم) (من الخصائص ج ۱ ص ۱۰)

(۱۱۷) عَنْ سَلْمَانَ فِيْ حَدِيْثِ الشَّفَاعَةِ. يَأْتُوْنَ مُحَمَّدًا فَيَقُوْلُوْنَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ أَنْتَ
الَّذِيْ فَتَحَ اللّٰهُ بِكَ وَخَتَمَ وَغَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ وَمَا تَأَخَّرَ (اخرجه ابن ابي شيبة. فتح الباري ج ۱۱ ص ...)

(۱۱۸) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ فِيْ حَدِيْثِ الْإِسْرَاءِ قَالُوْا يَا جِبْرِيْلُ مَنْ هٰذَا مَعَكَ قَالَ
هٰذَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ ... إِلٰى أَنْ قَالَ. فَقَالَ لَهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى ...

میں نے سب سے آخر میں بھیجا ہے اور وہ مطلب یہ سب سے پہلے ہوگی اور میں نے تجھ کو نبیوں میں سب سے
پہلے پیدا کیا اور سب سے آخر میں بھیجا ہے تجھ کو میں نے فاتح یعنی دورۂ نبوت شروع کرنے والا بنایا ہے
اور تجھ کو ہی اس کا ختم کرنے والا بنایا ہے۔ اس حدیث کو ابو نعیم نے روایت کیا ہے۔

(۱۱۷) سلمانؓ شفاعت کی حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے
اور کہیں گے اے اللہ کے نبی آپ ہی وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو شروع کیا تھا اور جن پہ ختم کیا ہے
اور آپ کی پچھلی اگلی سب لغزشیں معاف کردی ہیں۔ (اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے)۔

(۱۱۸) ابوہریرہؓ معراج کی حدیث میں روایت فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے جبرئیلؑ سے دریافت
کیا تمہارے ساتھ یہ کون ہیں وہ بولے محمدؐ ہیں جو اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ (جب آپ
کی دربار الٰہی تک رسائی ہوئی) تو ارشاد ہوا (اے محمدؐ) میں نے پیدائش کے لحاظ سے تم کو سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں اور قیامت ساتھ ساتھ
بھیجے گئے ہیں (اور بیچ کی انگلی کے ساتھ فرمایا) تو قریب تھی کہ مجھ سے بھی پہلے آجاتی۔ اور بخاری میں ہے بعثت انا
والساعۃ کہاتین آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا میں اور قیامت اس طرح ساتھ بھیجے گئے ہیں
یعنی آپ کے زمانۂ نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبوت حائل نہیں۔ قیامت جب بھی آئے آپ ہی کے
دور نبوت میں آئے گی۔

خلاصہ یہ کہ آپ کا دنیا کے آخری دور میں آنا یہ وقت طے ہو چکا تھا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام میں نفخ روح ہوا تھا
گویا کہ حیات عالم کے وجود سے بھی پہلے ایک طے شدہ بات تھی اب اس روایت کی کیا گنجائش رہ گئی ہے۔

(۱۱۸) چونکہ رسولوں کے سلسلہ میں بظاہر سب سے پہلے آنے والے رسول حضرت آدم علیہ السلام ہی تھے
اس لئے حدیث بالا میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل اولیت نبی باعتبار خلق واقعی وصف نبوت آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ گو بلحاظ وجود عنصری حضرت آدم علیہ السلام کی تشریف آوری سب سے اول
ہوگئی ہے۔

(۱۲۴) عن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في حديث طويل يا عمر فأنتم الأولون ونحن الآخرون السابقون يوم القيامة - اخرجه ابن راهويه في مسنده وابن ابي شيبة في المصنف (المطالب ج ۴ ص ۲۰۹)

(۱۲۵) عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جده مرفوعًا نكمل يوم القيامة سبعين امة نحن آخرها وخيرها - رواه ابن ماجه والدارمي كذا في الكنز ج ۶ ص ۲۲۲ - ورواه الترمذي وقال هذا حديث حسن (المشكوة ص ۵۸۳)

(۱۲۶) عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن آخر الامم واول من يحاسب - اين الامة الامية ونبيها فنحن الآخرون الاولون رواه ابن ماجه

(۱۲۷) عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن الآخرون السابقون يوم القيامة بيد انهم اوتوا الكتاب من قبلنا واوتيناه من بعدهم - رواه الشيخان والنسائي (الكنز ج ۶ ص ۲۲۰) ومثله عند ابي نعيم في الدلائل ص ۹ -

---

(۱۲۴) حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا اے عمر! تم لوگ ہم سے پہلے ہوا اور ہم گو تم سے آخر میں ہیں مگر قیامت کے دن حساب میں تم سے پہلے ہوں گے۔ اس حدیث کو ابن راہویہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے۔

(۱۲۵) بہز بن حکیم اپنے باپ حکیم اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ستر امتیں پوری ہو جائیں گی ہم ان سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ، دارمی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(۱۲۶) ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم سب سے آخری امت ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہمارا حساب ہوگا۔ پکارا جائے گا امت امیہ اور اس کا نبی کہاں ہیں؟ اس لئے گو ہم سب سے آخر میں ہیں مگر (قیامت کے دن) سب سے پہلے ہو جائیں گے۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

(۱۲۷) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم سب سے آخر ہیں، اور قیامت میں سب سے پہلے ہو جائیں گے صرف اتنی بات ہے کہ پہلی امتوں کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی ہے اور ہمیں ان کے بعد ملی ہے۔ اس حدیث کو شیخین اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

(۱۲۸) عن حذيفة بمثله ولفظه نحن الآخرون من أهل الدنيا والأولون يوم القيامة - رواه مسلم

مسجد النبي صلى الله عليه وسلم كان آخر مساجد الأنبياء

(۱۲۹) عن عبد الله بن إبراهيم بن قارظ أشهد إني سمعت أبا هريرة يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فإني آخر الأنبياء ومسجدي آخر المساجد - رواه مسلم والنسائي ولفظه خاتم الأنبياء وخاتم المساجد

(۱۳۰) عن أبي أمامة الباهلي عن النبي صلى الله عليه وسلم في حديث طويل أنا

---

(۱۲۸) حذیفہ سے بھی یہی مضمون مروی ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ ہم دنیا میں سب سے آخری امت ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہوں گے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد انبیاء کی مسجدوں میں آخری مسجد ہے

(۱۲۹) عبد اللہ بن ابراہیم بن قارظ کہتے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ابو ہریرہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں سب انبیاء کے آخر میں ہوں اور میری مسجد بھی سب آخری مسجد ہے اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور نسائی کے لفظ میں آخر کے بجائے لفظ خاتم ہے

(۱۳۰) ابو امامہ باہلی ایک طویل حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

---

(۱) انجیل متی کے باب ۱۹ میں آیت ۲۷ سے لیکر ۳۰ تک امت محمدیہ کے اس وصف کی طرف اشارہ موجود ہے۔
"پطرس نے جواب میں اس سے کہا کہ دیکھ ہم تو سب کچھ چھوڑ کے تیرے پیچھے ہو لئے ہیں پس ہم کو کیا ملے گا یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔ لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول۔"
اس مضمون میں قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی طرف بھی اشارہ ہے قل ان کان اباؤکم وابناؤکم
وعشیرتکم الخ۔

(۲) آپ کی مسجد کے آخری مسجد ہونے کی شرح حدیث ۱۳۲ میں آ رہی ہے۔

آخر الانبياء وانتم آخر الامم. رواه ابن ماجه في باب فتنة الدجال وابن خزيمة والحاكم والضياء (منتخب الكنز ج ۵ ص [illegible])

(۳۱) عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انا خاتم الانبياء ومسجدي خاتم مساجد الانبياء. رواه الديلمي وابن النجار والبزار (الكنز)

قال الرب تبارك وتعالى ليلة الاسراء انه جعلك خاتم النبيين

(۳۲) عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لما اسري بي الى السماء قربني ربي تعالى حتى كان بيني وبينه كقاب قوسين او ادنى قال يا حبيبي يا محمد قلت لبيك يا رب قال هل غمك ان جعلتك آخر النبيين قلت

کہ میں انبیاء میں آخر ہوں اور تم امتوں میں آخر ہو۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے فتنہ دجال کے باب میں روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ، حاکم اور ضیاء مقدسی نے روایت کیا ہے۔

(۳۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں انبیاء میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد انبیاء کی مسجدوں میں آخری مسجد ہے۔ اس حدیث کو دیلمی، ابن النجار اور بزار نے روایت کیا ہے۔

شب معراج میں پروردگار عالم کا از راہ تلطف یہ کہنا کہ اس نے آپ کو خاتم النبیین بنایا ہے

(۳۲) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شب معراج میں مجھے آسمان پر لے گئے تو میرے پروردگار نے مجھے قریب بلایا، اور بہت قریب بلایا۔ اور کہا اے میرے حبیب، اے محمد! میں نے کہا حاضر ہوں اے پروردگار۔ ارشاد ہوا اگر ہم نے تمہیں آخر النبیین بنایا تو تم ناخوش تو نہ ہو گے۔ میں نے عرض کیا اے پروردگار نہیں۔ پھر ارشاد ہوا اگر تمہاری امت کو

(۱) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی ہوتا تو اس امت کے بعد کوئی دوسری امت ہوتی مگر چونکہ عالم کا نظام ختم ہو چکا ہے اس لئے نہ کوئی نبی ہے نہ کوئی نئی امت۔ یہ نبی بھی آخری نبی ہے اور اس کی امت بھی آخری امت ہے۔

(۲) اس حدیث کو مسلم کی حدیث کی شرح سمجھو اور معلوم ہو گا کہ اس کا مطلب [illegible] انبیاء علیہم السلام کے [illegible] آپ کی مسجد [illegible] آخری [illegible] انبیاء علیہم السلام کی [illegible] آخری مسجد ہے۔

قُوْا يَا رَبِّ قَالَ حَبِيْبِيْ مِنْ كُلِّهِمْ أَكْرَمُهُمْ جَعَلْتُهُمْ آخِرَ الْأُمَمِ قُلْتُ يَا رَبِّ وَلِمَ قَالَ لِيُبَلِّغْهُمْ عَنِّي
السَّلَامَ وَأَخْبِرْهُمْ أَنِّيْ جَعَلْتُهُمْ آخِرَ الْأُمَمِ. رواه الخطيب البغدادي. الكنز ج ۶ ص ۱۱۲

قال الرب لآدم ان ابنه احمد هو الاول والآخر

(۱۳۲) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَخْبَرَ بَنِيْهِ فَجَعَلَ يَرَى فَضَائِلَ بَعْضِهِمْ عَلَى بَعْضٍ فَرَأَى نُوْرًا سَاطِعًا فِيْ أَسْفَلِهِمْ فَقَالَ يَا رَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا ابْنُكَ أَحْمَدُ هُوَ الْأَوَّلُ وَهُوَ الْآخِرُ وَهُوَ أَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ. رواه ابن عساكر كما في الكنز.

قال جبريل لآدم ان محمدا صلى الله عليه وسلم آخر ولدك من الانبياء

(۱۳۳) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَلَ آدَمُ بِالْهِنْدِ

آخری امت بنادیں تو وہ خوش تر ہوگی میں نے عرض کیا انہیں اے پروردگار ارشاد ہوا کہ اچھا تو اپنی امت کو میرا سلام کہنا اور انہیں بتلا دینا کہ میں نے انہیں آخری امت بنا دیا ہے۔ (کنز العمال)

حضرت آدم کو حق تعالیٰ کا ارشاد کہ ان کے فرزند احمد و محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اور سب سے آخری نبی ہیں

(۱۳۲) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو انہیں ان کی اولاد بھی دکھلائی تو وہ علیہ السلام انہیں دیکھنے لگے کہ بعض بعض پر فضیلت رکھتے ہیں ان سب کے آخر میں ایک بلند نور دیکھا تو عرض کیا اے میرے پروردگار یہ کون ہیں ارشاد ہوا یہ تمہارے فرزند احمد ہیں یہی سب سے پہلے نبی ہیں اور یہی سب سے آخری نبی ہیں قیامت میں سب سے پہلے شفاعت کریں گے اور ان ہی کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے

حضرت آدم کو جبرئیل کا ارشاد کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں آپ کے سب سے آخری بیٹے ہیں

(۱۳۳) ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آدم علیہ السلام جب ہندوستان میں نازل ہوئے اور تنہائی کی وجہ سے گھبرائے تو جبرئیل علیہ السلام تشریف

وَسَلَّمَ وَحْشَةً فَنَزَلَ جِبْرِيلُ فَنَادَى بِالْأَذَانِ اللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ مَرَّتَيْنِ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مَرَّتَيْنِ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ قَالَ آدَمُ يَا جِبْرِيلُ مَنْ مُحَمَّدٌ قَالَ آخِرُ وَلَدِكَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ - رواہ ابن عساکر (الکنز ج ۶ ص ۲۱۱ والخصائص ج ۱ ص ۸)

قال جبریل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم انک خاتم النبیین کما ان آدم صفی اللہ

(۱۳۵) عَنْ سَلْمَانَ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ قَالَ قَالَ جِبْرِيلُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ رَبَّكَ يَقُولُ إِنْ كُنْتُ اصْطَفَيْتُ آدَمَ فَقَدْ خَتَمْتُ بِكَ الْأَنْبِيَاءَ وَمَا خَلَقْتُ خَلْقًا أَكْرَمَ مِنْكَ عَلَيَّ (خصائص ج ۲ ص ۱۹۳)

لئے اذان کہی اللہ اکبر اللہ اکبر دو مرتبہ اشہد ان لا الہ الا اللہ دو مرتبہ اشہد ان محمدا رسول اللہ دو مرتبہ (جب حضرت آدم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنا تو) فرمایا کہ یہ محمد کون ہیں؟ جبریل نے کہا کہ انبیاء میں آپ کے سب سے آخری بیٹے ہیں۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریل کا فرمان کہ جس طرح حضرت آدم کا لقب صفی اللہ تھا آپ کا لقب خاتم النبیین ہے

(۱۳۵) سلمان سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کا پروردگار کہتا ہے کہ میں نے آدم کو صفی اللہ کا خطاب دیا ہے تو آپ پر تمام انبیاء کو ختم کر کے (خاتم النبیین کا خطاب دیا ہے) اور میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز ہو۔

(۱۳۴) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان ابتداء عالم ہی کی چلی آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس حدیث کے طرق جمع کئے جائیں تاکہ اس کے تفصیلی کلمات کا پتہ بھی مل جائے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اذان کا ایک نفع دفع وحشت بھی ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ہبوط کے نزول ہندوستان میں کوئی جگہ ہے اگر صحت کو پہنچ جائے تو تاریخی لحاظ سے ایک بڑی حقیقت کا انکشاف ہوگا۔ ہم نے اس حدیث کو یہاں صرف آخری جزء کی وجہ سے نقل کیا ہے۔

(۱۳۵) اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ کا نبیوں میں آخر ہونا صرف ایک زمانی تأخر نہیں ہے بلکہ خدا کے نزدیک یہ خاص فضیلت ہے جو دیگر انبیاء علیہم السلام کے خصوصیات کے بالمقابل آپ کو مرحمت ہوئی ہے۔ عالم کا تدریجی ارتقاء بھی اسی کو مقتضی تھا کہ اس کی آخری کڑی سب میں کامل و برتر ہو۔ اس لئے آخری نبی وہی ہونا چاہئے جو سب میں کامل اور سب سے اکرم ہو۔

مکتوب بین کتفی آدم محمد رسول اللہ خاتم النبیین

(۳۶) عن جابر قال بین کتفی آدم مکتوب محمد رسول اللہ خاتم النبیین۔ رواہ ابن عساکر۔ (خصائص ۱ ص ۱۰)

الشهادة بختم النبوة جزء من الايمان كالشهادة بكلمة التوحيد

(۳۷) عن زید بن حارثة فی قصة طویلة له حتی جاءت عشیرته یطلبونه من عند رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بعد ما أسلم فقالوا له امض معنا یا زید فقال ما ارید برسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بدلا ولا غیره احدا فقالوا یا محمد انا معطوک

حضرت آدمؑ کے دونوں شانوں کے درمیان لکھا ہوا تھا محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہیں

(۳۶) جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان یہ لکھا ہوا تھا محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہیں۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

عقیدۂ ختم نبوۃ کلمۂ شہادت کی طرح ایمان کا جزء ہے

(۳۷) زید بن حارثہ اپنا ایک طویل قصہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر مسلمان ہو گیا تو میرا قبیلہ مجھے تلاش کرتا ہوا آپ کے پاس آیا اور مجھ سے کہا اے زید ہمارے ساتھ چلو۔ زید بولے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلے میں کسی کو پسند نہیں کر سکتا اور نہ آپ کے سوا کسی دوسرے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا

(۱۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوۃ تو دونوں شانوں کے درمیان تھی مگر دجال کا کفر اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوگا یعنی مہر نبوۃ کا مقام دونوں شانوں کے درمیان اور مہر دجال کفر کا محل پیشانی منتخب ہوا ہے۔ اس کی حکمتیں بھی علماء نے لکھی ہیں۔

(۱۵) اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح حق کی توحید پر یقین لانے کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح اپنی ختم نبوت پر بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان آپ کی ختم نبوت پر ایمان لائے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ولکن رسول اللہ کے ساتھ وخاتم النبیین کا لفظ اسی لئے رکھا گیا کہ آپ بحیثیت رسول آخر نبی ہیں یعنی خاتم النبیین بھی ہیں۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

بهذا الغلام ديات فسموا ما شئتم فإنا جابلوه بذلك فقال أسألكم أن تشهدوا أن لا إله إلا الله وأني خاتم أنبيائه ورسله وأرسله معكم الحديث۔

اخرجه الحاكم متصلاً في المستدرك (ج ۲ ص ۱۲۶)

ختم النبوة من خصائص النبي صلى الله عليه وسلم

(۱۳۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ

(رواه مسلم والبخاري)

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اس لڑکے کے عوض میں ہم آپ کو بہت سامان دے سکتے ہیں جو آپ چاہیں بتلا دیجئے ہم اسے ادا کر دیں گے آپ نے ارشاد فرمایا میں تو تم سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں وہ یہ کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اور اس کی کہ میں اس کے سب نبیوں اور سب رسولوں میں آخری نبی اور رسول ہوں لہٰذا میں اس لڑکے کو اسی بشارت کے ساتھ تمہیں دیتا ہوں۔ (مستدرک)

ختم نبوت انبیاء علیہم السلام میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طغرۂ امتیاز ہے

(۱۳۸) ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے انبیاء علیہم السلام پر چھ فضیلتیں دی گئی ہیں (۱) مجھے مختصر کلمات معانی کثیرہ کے حامل دیے گئے ہیں (۲) دشمن پر رعب سے میری مدد کی گئی ہے (۳) میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے۔ (۴) تمام زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے کا آلہ بنا دی گئی ہے (۵) تمام مخلوق کی طرف مجھے بھیجا گیا ہے۔ (۶) انبیاء کا سلسلہ میری ذات پر ختم کر دیا گیا ہے۔ (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ سے پیشتر جتنے رسول ہوئے وہ صرف رسول اللہ تھے اسی لئے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں خاتم النبیین ہوں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص لقب ہے اور آپ نے ہی اس کا دعویٰ کیا ہے اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لقب محض مدح نہیں بلکہ بحیثیت عقیدہ کے ایک حقیقت ہے۔ خاتم الشعراء اور خاتم المحدثین کی طرح صرف ایک مدحیہ کلمہ نہیں۔

(۱۳۸) اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات شمار کی گئی ہیں جو خصوصیات صرف چھ تک محدود نہیں بلکہ بہت ہیں حافظ سیوطی نے اسی موضوع پر ضخیم جلدوں کی ایک کتاب تصنیف کی ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

خاتم النبوة كان دليلا على كونه خاتم النبيين

(۳۹) عن علي قال بين كتفيه خاتم النبوة وهو خاتم النبيين (رواه الترمذي في شمائله)

دعوى النبي صلى الله عليه وسلم انه خاتم النبيين وآخرهم

(۴۰) عن عرباض بن سارية قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اني عبد الله وخاتم النبيين۔ رواه البيهقي واحمد وصححه (كذا في الدر المنثور ج ۵ ص ۲۰۴)

مہر نبوۃ خود اس کی دلیل تھی کہ آپ خاتم النبیین ہیں

(۳۹) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوۃ تھی۔ کیونکہ آپ خاتم النبیین تھے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنا کہ خاتم النبیین اور آخری نبی میں ہوں

(۴۰) عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عبد اللہ ہوں۔ (اللہ کا بندہ) اور میں خاتم النبیین ہوں (آخری نبی) (اس حدیث کو بیہقی اور احمد نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح بتایا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جو خصائص الکبریٰ کے نام سے مشہور ہے مطبوعہ حیدرآباد کے نزدیک [illegible] کے وقتی تقاضا اور اس کے کوئی اہمیت کی بات ہوتی ہے بیان ہو۔ دو خصوصیتیں تو یہ ہیں جو خصوصیات پر اپنی جگہ [illegible] خصوصیت ہے۔ یہ مطلب علماء کے نزدیک یہ ہے کہ آپ کی بعثت آپ کے زمانے سے لے کر قیامت تک کے لئے ہے لیکن [illegible] کی قوموں میں آپ کی بعثت آپ سے پہلے اور آپ کے بعد تمام زمانوں کو شامل ہے۔ تو جیسا کہ ... تمام آنے والی ... آپ کی بعثت۔ کتب ... کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ ختم النبیین آپ کی ایک خصوصیت تھی صرف عرفی لقب نہ تھا۔ دوسروں پر بھی اطلاق ہو سکے۔

(۳۹) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس معنوی خصوصیت کو حسی شکل میں بھی نمایاں کر دیا گیا تھا کتب سابقہ میں بھی مہر نبوۃ آپ کی ایک علامت بتلائی گئی تھی اسی لئے بعض طالبین حق نے تمام علامات کے ساتھ آپ کی مہر نبوۃ کو بھی تلاش کیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خاتم النبیین آپ کا شاہانہ لقب نہ تھا بلکہ مہر نبوۃ اور آخری نبی ہونے کی وجہ سے آپ کو خاتم النبیین کہا جاتا تھا۔

(۴۰) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معنی ترکیبی کے کیا معنی "عبد اللہ" نہیں ہیں بلکہ ایک علم تھے۔ اسلام میں عبد اللہ آپ کا لقب بھی تھا۔ ... سب سے بڑا ... تھا۔

وصیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ لا نبی بعدہ

(۴۳) عن ابن عمر یقول خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً کالمودع فقال انا النبی الامی ثلاثاً ولا نبی بعدی (الی قولہ) فاسمعوا واطیعوا ما دمت فیکم فاذا ذھب بی فعلیکم بکتاب اللہ تعالیٰ احلوا حلالہ وحرموا حرامہ رواہ احمد فی مسندہ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۹۰)

(۴۴) عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبتہ یوم حجۃ الوداع ایھا الناس انہ لا نبی بعدی ولا امۃ بعدکم الا فاعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شھرکم وادوا زکوۃ اموالکم طیبۃ بھا انفسکم واطیعوا ولاۃ امرکم تدخلوا جنۃ ربکم (منتخب الکنز علی ھامش مسند احمد ج ۵ ص ۲۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۴۳) ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور اس طرح تقریر فرمائی جیسے کوئی رخصت ہونے والا تقریر کیا کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "نبی امی" (جن کے آنے کی خبر تھی وہ) میں ہی ہوں اور میرے بعد اب کوئی نبی نہ ہوگا۔ (اسی تقریر میں یہ بھی فرمایا) جب تک میں تمہارے اندر موجود ہوں میرے احکام سنو اور ان کی اتباع کرتے رہو اور جب مجھے دنیا سے اٹھا لیا جائے تو تم کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے رہنا جو اس میں حلال ہے اس کو حلال اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھتے رہنا۔ اس حدیث کو احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

(۴۴) ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ لوگو نہ میرے بعد اب کوئی نبی ہوگا اور نہ تمہارے بعد کوئی امت۔ پس اپنے رب کی عبادت کرتے رہو اور اپنی پانچ نمازیں پڑھتے رہو اور رمضان کے روزے رکھتے جاؤ۔ اور اپنے مالوں کی زکوۃ خوشی خوشی سے دیا کرو اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرتے رہو تو اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(۴۴) مطلب یہ ہے کہ نجات اب صرف ان فرائض اسلام پر عمل کرنے ہی میں منحصر ہو گئی ہے اگر بالفرض آئندہ کوئی سلسلہ نبوت ہوتا تو اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہوتا۔ یہ ایمان کا معاملہ تو مکمل ہو چکا ہے صرف عمل کا مرحلہ باقی ہے وہ بھی اتنا مختصر ہے کہ ان فرائض کی بجا آوری میں طے ہوا اور آگے جنت ہے۔

(۱۳۵) عن ابی قتیلة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا نبی بعدی ولا امة بعدکم فاعبدوا ربکم واقیموا خمسکم وصوموا شهرکم واطیعوا ولاة امرکم تدخلوا جنة ربکم۔ رواه الطبرانی والبغوی (کذا فی الکنز)

(۱۳۶) عن الضحاک بن نوفل قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا نبی بعدی ولا امة بعد امتی۔ رواه البیهقی فی کتاب الرؤیا۔

تصدیق ماهان عامل الروم ان النبی صلی الله علیه وسلم لا نبی بعده

(۱۳۷) عن خالد بن الولید فی حدیث طویل ان ماهان عامل ملک الروم قال هل کان رسولکم اخبرکم انه یأتی بعده رسول قال لا ولکن اخبر انه لا نبی بعده واخبر ان عیسی بن مریم قد بشر به قومه قال ماهان وانا علی ذلک من الشاهدین (خصائص ج ۲)

---

(۱۳۵) ابو قتیلہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوگا اور تمہارے بعد اب کوئی امت نہیں آنے کی پس تم اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو پانچوں نمازیں ٹھیک ٹھیک پڑھتے رہو ماہ رمضان کے روزے رکھتے رہو اور اپنے حکام کی اطاعت کیجیو اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(۱۳۶) ضحاک بن نوفلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور میری امت کے بعد کوئی امت نہیں ہوگی۔ اس حدیث کو بیہقی نے کتاب الرؤیا میں روایت کیا ہے۔

ملک روم کے گورنر کی تصدیق کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۱۳۷) خالد بن ولیدؓ نے ایک طویل حدیث میں کہا کہ ماہان نے جو شاہ روم کا عامل تھا ان کو دریافت کیا کیا تمہارے رسول نے تم سے یہ کہا ہے کہ ان کے بعد کوئی اور رسول آئیگا۔ انھوں نے کہا نہیں بلکہ یہ خبر دی ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے ان کی آمد کی بشارت اپنی قوم کو دی تھی۔ ماہان رومی نے کہا کہ میں بھی اس پر گواہی دینے والوں میں ہوں۔

---

(۱) حضرت ابو عبیدہؓ جب یرموک پہنچے تو روم کے لشکر کے سردار نے ان کے پاس ایک قاصد بھیجا اس نے کہا کہ میں ماہان گورنر کے پاس سے آیا ہوں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی جماعت میں سے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

سُبْحَانَهُ رَبِّي الْجَنَّةُ رَحْمَتُهُ وَالنَّارُ عِقَابُهُ قَالَ فَمَنْ أَنَا قَالَ أَنْتَ رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ. الحديث. أخرجه الطبراني في الأوسط والصغير وابن عدي والحاكم في المعجزات والبيهقي وأبو نعيم وابن عساكر وليس في إسناده من ينظر في حاله سوى محمد بن علي بن الوليد البصري السلمي شيخ الطبراني وابن عدي وقال السيوطي في الخصائص قلت لحديث عمر طريق آخر ليس فيه محمد بن علي بن الوليد أخرجه أبو نعيم ويروى عن عائشة وأبي هريرة وعلي رضي الله تعالى عنهم مثله كذا في الخصائص ج ٢ ص ٦٠۔

شهادة زيد بن خارجة بعد وفاته أنه صلى الله عليه وسلم لا نبي بعده

(١٣٩) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ زَيْدُ بْنُ خَارِجَةَ مِنْ سَرَاةِ الْأَنْصَارِ فَبَيْنَمَا هُوَ يَمْشِيْ فِيْ طَرِيْقٍ مِنْ طُرُقِ الْمَدِيْنَةِ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ إِذْ خَرَّ فَتُوُفِّيَ فَأُعْلِمَتْ بِهِ الْأَنْصَارُ فَأَتَوْهُ فَاحْتَمَلُوْهُ إِلَى بَيْتِهِ وَسَجَّوْهُ كِسَاءً وَبُرْدَيْنِ وَفِي الْبَيْتِ نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءِ الْأَنْصَارِ

رب نے بنائے جس کی رحمت کا مظہر جنت ہے جس کے عذاب کا مظہر دوزخ ہے۔ آپ نے فرمایا میں کون ہوں اس نے جواب دیا آپ جہان کے پروردگار کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اس حدیث کو طبرانی نے اوسط اور معجم صغیر میں اور ابن عدی نے اور حاکم نے معجزات اور بیہقی ابو نعیم اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں سوائے محمد بن علی بن الولید کے کوئی راوی ایسا نہیں ہے جس کے حالات میں غور کرنے کی ضرورت ہو یہ طبرانی اور ابن عدی کے شیخ ہیں۔ سیوطی خصائص الکبریٰ میں فرماتے ہیں۔ کہ حدیث عمرؓ کے لئے ایک دوسرا طریق بھی ہے جس میں یہ راوی نہیں ہے ابو نعیم نے اس کو بیان کیا ہے نیز حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ اور . . . حضرت علیؓ سے بھی اسی کے ہم معنی مضمون مروی ہے۔

وفات کے بعد زید بن خارجہ کی شہادت کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(١٣٩) نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ زید بن خارجہ انصار کے سرداروں میں تھے ایک دن وہ ظہر عصر کے درمیان مدینہ کے کسی راستہ پر جا رہے تھے کہ یکایک گرے اور فوراً وفات ہو گئی انصار کو اس بات کی خبر ہوئی وہ آئے اور انہیں اٹھا کر گھر لے گئے اور ایک کمبل اور دو چادروں سے ان کو ڈھانک دیا۔ گھر میں انصار کی کچھ عورتیں اور مرد ان پر رو رہے تھے یہ گریہ و زاری ہو رہا تھا کہ جب مغرب و عشاء کا

توضيح النبي صلى الله عليه وسلم ختم النبوة بمثال

(۱۵۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مَثَلِيْ وَمَثَلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا فَأَحْسَنَهٗ وَأَجْمَلَهٗ إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَيَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَيَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ. رواه الشيخان واحمد والنسائي والترمذي وفي بعض الالفاظ فَكُنْتُ أَنَا سَدَدْتُ مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ وَخُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ. رواه ابن عساكر كما في الكنز

(۱۵۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِيْ وَمَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَأَتَمَّهَا وَأَكْمَلَهَا إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَكَانَ مَنْ دَخَلَهَا فَنَظَرَ إِلَيْهَا قَالَ مَا أَحْسَنَهَا إِلَّا مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ فَأَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ خُتِمَ بِيَ الْأَنْبِيَاءُ. رواه الشيخان والترمذي واللفظ له

(۱۵۳) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِيْ وَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ختم نبوت کو ایک مثال دیکر واضح کرنا

(۱۵۱) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری مثال مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اسے خوب آراستہ و پیراستہ کیا مگر اس کے ایک گوشہ میں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی .. لوگ آ آ کر اس کے ارد گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھدی گئی (کہ یہ عیب بھی نہ رہتا) اس کے بعض الفاظ میں یہ ہے کہ میں نے آکر اس اینٹ کی جگہ کو پُر کر دیا ہے اور اب قصر نبوت میری آمد سے مکمل ہو گیا ہے اور مجھ پر تمام رسول ختم کر دیئے گئے۔ (کنز العمال)

(۱۵۲) جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور خوب عمدہ اور مکمل بنایا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی جو شخص اس میں داخل ہوتا اور اسے دیکھتا تو کہتا تمام گھر کس قدر خوبصورت ہے مگر یہ ایک اینٹ کی جگہ (وہ اینٹ میں ہی تھا) اور نبی مجھ پر ختم کر دیئے گئے ہیں۔

(۱۵۳) ابوسعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا میری اور نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور اس کو پورا بنا دیا مگر ایک اینٹ کی جگہ

مَثَلُ النَّبِيِّينَ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَأَتَمَّهَا اِلَّا لَبِنَةً وَّاحِدَةً فَجِئْتُ اَنَا فَاَتْمَمْتُ تِلْكَ اللَّبِنَةَ۔ (رواہ مسلم واحمد)

(۱۵۴) عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلِيْ فِي النَّبِيِّينَ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَاَحْسَنَهَا وَاَكْمَلَهَا وَاَجْمَلَهَا وَتَرَكَ مِنْهَا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِالْبِنَاءِ وَيَعْجَبُونَ مِنْهُ وَيَقُولُونَ لَوْ تَمَّ مَوْضِعُ تِلْكَ اللَّبِنَةِ وَاَنَا فِي النَّبِيِّينَ مَوْضِعُ تِلْكَ اللَّبِنَةِ۔ رواہ الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب۔

لا نبی بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان کان من غیر تشریع

(۱۵۵) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (رواہ البخاری ومسلم فی غزوۃ تبوک)

اب تو میں آگیا اور اس اینٹ کی جگہ پُر کر دیا۔ اس حدیث کو مسلم و احمد نے روایت کیا ہے۔

(۱۵۴) ابی بن کعب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نبیوں میں میری مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور نہایت خوشنما مکمل اور آراستہ بنایا لیکن اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ اس محل کے ارد گرد گھومتے اور اس سے تعجب سے دیکھ کر کہتے ہیں کاش اس اینٹ کی جگہ بھی پُر ہو جاتی تو میں نبیوں میں ایسا ہی ہوں جیسے یہ اینٹ اس محل میں۔ اس حدیث کو ترمذی نے صحیح کہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں خواہ غیر تشریعی نبی ہو

(۱۵۵) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو حضرت موسیٰ سے تھی اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

---

(۱۵۴) ان تشبیہات کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اس قصر میں اب وہ مکمل ہو چکا ہے کسی اور اینٹ کی کوئی گنجائش نہیں رہی اسی طرح نبوت میں آپ کے بعد اب کسی اور نبی کے آنے کا احتمال نہیں رہا۔ باقی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ خاتم ہونے کے اس وصف سے مستند کر دیا ہو ہو یہ طریقہ بھی طریقہ تعریف انبیاء سمجھا جاتا ہے۔ تب آپ کا آخری نبی ہونا کوئی فضیلت نہیں سمجھی گئی تو آپ کی ختم کی صاحبیت پر کچھ اہمیت کیوں ہے۔ اس کا جواب آپ کو ان احادیث کے مطالعہ کے بعد خود واضح ہو جائے گا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدعیان نبوت کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے۔

(۱۵۷) عن زيد بن أبي أوفى قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يا علي والذي بعثني بالحق ما أخرتك إلا لنفسي وأنت مني بمنزلة هارون من موسى إلا أنه لا نبي بعدي (رواه أحمد وابن عساكر الكنز)

(۱۵۸) عن علي قال وجعت وجعا فأتيت النبي صلى الله عليه وسلم فأقامني في مقامه وقام يصلي وألقى علي طرف ثوبه ثم قال برئت يا ابن أبي طالب فلا بأس عليك ما سألت الله شيئا إلا سألت لك مثله ولا سألت الله شيئا إلا أعطانيه غير أنه قيل لي أنه لا نبي بعدي فقمت كأني ما اشتكيت. (رواه ابن جرير وصححه وابن شاهين في السنة والطبراني في الأوسط وأبو نعيم في خصائص الصحابة كذا في الكنز)

(۱۵۷) زید بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علیؓ اس ذات کی قسم ہے جس نے مجھے دین حق دے کر بھیجا ہے میں نے تم کو صرف اپنے لئے پسند کیا ہے اور تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے حاصل تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ (الکنز)

(۱۵۸) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے درد اٹھا میں آپ کی خدمت میں آیا آپ نے مجھے اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور اپنے لباس کا ایک کنارہ میرے اوپر ڈال دیا پھر فرمایا اے علیؓ تم شفایاب ہو گئے اب تم کو کوئی مرض نہیں رہا میں نے جو دعا اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے کی ہے وہی تمہارے لئے مانگی ہے اور جو دعا میں نے مانگی ہے وہ اس نے قبول فرمائی ہے بجز اس کے کہ مجھ سے یہ کہہ دیا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے کبھی بیماری نہ ہوا تھا۔ (کنز العمال)

(۱۵۷) یہی مضمون ابو سعید، سعد، جعفر بن ابی طالب، عقیل بن ابی طالب اور ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ دیکھو کنز العمال

(۱۵۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے نبوت کی دعا فرمائی تھی اور وہ قبول ہو گئی تھی۔ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي اور میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اس کے ذریعہ سے میری کمر مضبوط فرما اور میرا شریک کار بنا دے۔ اس دعا کے بموجب ان کو نبی بنا دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ عالم تقدیر میں یہ طے پا چکا تھا کہ اب کوئی نبی نہ ہوگا اس لئے یہ مناسب تھا کہ دعا کے بعد آپ کو عالم تقدیر کے اس فیصلہ کی اطلاع دی جائے اس لئے اس سے قبل کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ حضرت علیؓ کے لئے نبوت کی دعا فرماتے یہ کہہ دیا گیا۔ آپ کی ہر دعا قبول ہو گی مگر نبوت کے لئے آپ دعا بھی نہ فرمائیے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(۱۶۳) عن أبي سعيد الخدري قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يبعث نبي قط إلا كان في أمته من يحدث وإن يكن في أمتي منهم أحد فهو عمر (رواه ابن عساكر - كنز)

(۱۶۴) عن عائشة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال ما كان نبي إلا كان في أمته معلم أو معلمان وإن يكن في أمتي منهم أحد فهو عمر بن الخطاب [illegible]

سياسة الأمة وإصلاح ما فيها من تغيير الدين ليس بنبوة

(۱۶۵) عن أبي حازم قال قاعدت أبا هريرة خمس سنين فسمعته يحدث عن النبي صلى الله عليه وسلم قال كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما

---

(۱۶۳) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا جس کی امت میں کوئی نہ کوئی محدث نہ ہو اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہے (کنز)

(۱۶۴) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا کوئی نبی نہیں گذرا جس کی امت میں ایک دو معلم (محدث) نہ گذرے ہوں، اگر میری امت میں کوئی معلم ہے تو وہ عمر بن الخطاب ہے۔

امت کا انتظام اور ان کے دینی تحریفات کی اصلاح کرنا بھی نبوۃ نہیں

(۱۶۵) ابوحازم کہتے ہیں کہ میں ابوہریرہؓ کے ساتھ پانچ سال رہا ہوں میں نے انھیں یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کا انتظام خود ان کے انبیاء

---

(۱۶۵) حافظ ابن حجرؒ انبیاء بنی اسرائیل کی سیاست کی تشریح میں لکھتے ہیں اذا ظهر فيهم فساد بعث الله لهم نبيا يقيم لهم امرهم ويزيل ما غيروا من احكام التوراة - یعنی بنی اسرائیل میں جب کوئی فساد ظاہر ہوتا تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو ان میں بھیج دیتا جو ان کی اصلاح کرتا۔ اور شریعت تورات میں ان کی تحریفات کو دور کر دیتا۔ امت محمدیہ میں یہ خدمات خلفاء کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھے خواب دیکھنا، الہام اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ کرنا، امت کا دینی اور دنیوی نظم و نسق قائم رکھنا یہ سب محدثین اور خلفاء کے وظائف ہیں۔ منصب نبوت اب ختم ہو گیا اور یہ وظائف نبوۃ امت محمدیہ کے خلفاء کی طرف منتقل کر دیے گئے۔ اس سے امت محمدیہ کے کمالات و فضیلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن خدمات کے لئے پہلے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے اب اس امت کے علماء و خلفاء انھیں انجام دیا کریں گے۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

من زعم بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نبی فہو کذاب

(۱۶۷) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ کَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ کُلُّھُمْ یَزْعَمُ اَنَّہٗ نَبِیٌّ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (رواہ مسلم)

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ نبی ہے وہ پرلے درجہ کا جھوٹا ہے

(۱۶۷) ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آئندہ میری امت میں تیس صفت جھوٹے پیدا ہوں گے ان میں ہر ایک اپنے متعلق گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں سب نبیوں کے آخر میں آیا ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (مسلم)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس لئے اس منصب کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم کے سلسلہ میں تو ان کی جگہ ہونے [illegible] ہونے کی بعثت سے پہلے عمر کی بحث حائل ہو گئی تھی اس لئے ان کے حق میں (لو عاش [illegible]) کی بحث دوسرے نمبر کی بحث تھی حضرت عمرؓ کے سلسلہ میں عمر کی بحث نہ تھی اور منصب نبوۃ ختم ہونے کا مرحلہ سامنے آ گیا۔ بہر صورت ان مختلف اسباب و وجوہ کے باوجود جو واقعہ تھا وہ اپنی جگہ ہے مقصد یہ تھا کہ ختم نبوۃ بالتخصیص اپنے عموم پر باقی [illegible] بعد کی [illegible] اب صرف زیر بحث [illegible] کہ فلاں کو نبوت کیوں نہیں ملی۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حیثیت نبوت [illegible] تھی تو [illegible] ہے کہ آپ کی [illegible] سلسلہ میں کسی کے بعد کسی ایک کو نبوت نہ ملی کہ حضرت ابراہیم کے لئے کوئی [illegible] تھا تو کیا [illegible] کے تمام صحابہ محروم ہو گئے تھے۔ پھر حضرت ابراہیم کے سلسلہ میں ان کی نبوۃ کا تصور اس لئے [illegible] ہے کہ [illegible] نبوت [illegible] ایک بات [illegible] تھی بلکہ یہاں اس بات کو [illegible] جو خاص ان کے حق میں نبوت سے ملتی تھی۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ابراہیم اگر جیتے تو نبی ہوتے تو ممکن تھا کوئی شخص اس سے ان کی تصویر استعداد و لیاقت پر محمول کر لیتا۔ حالانکہ یہاں لیاقت و استعداد میں کوئی بحث نہ تھی اس لئے [illegible] کہ وہ [illegible] ہو جاتا [illegible] جو ان کی لیاقت پر روشنی ڈالے۔ یہاں [illegible] حضرت ابراہیم کی فرضی نبوت کے [illegible] پہلوؤں کی تفصیلات [illegible] انھوں نے یہ بحث [illegible] ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور فرض کر لو کہ نبی ہو جاتے تو [illegible] حضرت ابراہیم کی فرضی نبوت کا پہلو یہاں صرف [illegible] نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ [illegible] تفصیلات میں جانا [illegible] ضروری ہے [illegible] تاریخ نبوت بتلاتی ہے کہ نبوت [illegible] سے منتقل ہو کر ذریت ابراہیم علیہ السلام میں [illegible] اسمعیل [illegible] منتقل ہوئی۔ اب اگر نبوۃ آئندہ [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں منتقل ہوتا [illegible] لزوم [illegible] لیکن صرف نبوت کی تاریخ کی مناسبت [illegible] کہ اگر آپ کے بعد نبوۃ منتقل ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے فرزند مبارک کی [illegible] اس [illegible] مناسبت کے اظہار کے لئے یہ فرمایا گیا تھا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام زندہ رہتے تو نبی ہوتے [illegible] کہا گیا کہ اگر آپ جیتے تب بھی نبی نہ ہوتے بالکل بے معنی بات تھی [illegible] وقت مناسب تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

حتی یخرج ثلاثون کذاباً دجالاً منہم مسیلمۃ والعنسی والمختار (ابو یعلی۔ فتح الباری)

اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ تیس جھوٹے دجال نہ نکل آئیں جن میں سے مسیلمہ عنسی اور مختار بھی ہیں۔

(دیکھو حاشیہ از صفحہ گزشتہ) اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایک طرف تو احادیث میں ہر قسم کی نبوۃ کی نفی آرہی ہے بلکہ مدعیان نبوت کو کذاب و دجال کہا جا رہا ہے دوسری طرف کسی حدیث سے ظلی و بروزی کی قسم ثابت نہیں بلکہ اس کا نام تو حدیث میں ظلی بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ پھر آخر کس دلیل سے نبوت کی ایک تیسری قسم مان کر اس کو جاری قرار دیا جائے۔ یہاں یہ تحقیق بھی ضروری ہے کہ نبوت کی جو قسم بھی تسلیم کی جائے اس کا آغاز کب سے ہوا اور اس کے خاص افراد کون سے تھے جن کو ظلی نبی کہا جا سکتا ہے اور کیا یہ ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی ہو اور کیا کبھی ایسے نبی کی امت نے کبھی تصدیق کی ہے اگر ایسا کوئی نبی اب تک نہیں گزرا اور اگر گزرا ہے تو امت نے ہمیشہ اس کی تکذیب ہی کی ہے تو پھر کس دلیل سے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت اس امت میں نبوت کی کوئی قسم جاری ہے اور اتنی کثرت کے ساتھ جاری ہے کہ ان کی آمد دجالین کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ یہاں انجیل کا بیان بھی حدیث ہی کے موافق ہے۔

”جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لو گے کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔“ (متی باب ۷ — ۱۵ و ۱۶)

جس قدرت نے اس عالم کو تقابل و تضاد پر بنایا ہے۔ نور کے مقابلہ میں ظلمت، نیکی کے مقابلہ میں بدی، صحت کے مقابلہ میں مرض، بلندی کے مقابلہ میں پستی پیدا فرمائی ہے اسی نے عالم روحانیات میں ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت اور ملائکہ کے مقابلہ میں شیاطین اور انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں دجالین بنائے ہیں۔ پس جس طرح خاتم الرسل کی آمد سب رسولوں کے بعد ہوئی ہے اسی طرح مناسب ہے کہ دجال اکبر کے ظہور سے پہلے جو دجالین آ رہے ہیں ان کا بھی یہی حال ہو کہ ان کی تیس تک تعداد کا ظہور خاتم الرسل کے عہد ہی سے شروع ہو تاکہ دنیا کے خاتمہ پر ہدایت و ضلالت کی کشمکش بھی ختم ہو اور آزمائش کرکے ختم ہو جائے پھر قیامت آ جائے۔ وللہ الحکمۃ البالغۃ۔

خاتم النبیین

جہان کا سردار آگیا۔ اب کوئی رسول یا نبی نہیں آئے گا۔ دنیا اسی کے زیر رسالت و ہدایت ختم ہو جائے گی۔ عالم کی آبادی کا دارومدار اسی کی ہدایت پر ہے۔ دنیا کا نظام ہدایت جو تمام رسولوں کی ذات سے وابستہ تھا اس لئے عالم کی ابتدا سے انتہا تک رسالت کی ابتدا و انتہا بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ پروردگار عالم نے جب ایک طرف سے [illegible] کی آبادی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف قصر نبوت کی پہلی اینٹ بھی رکھی یعنی آدم علیہ السلام جن کو اپنا خلیفہ بنایا تھا اسی کو قصر نبوت کی خشت اول قرار دیا۔ اور جو عالم شہادت پر پھیلتا رہا اُدھر قصر نبوت کی تعمیر ہوتی رہی۔ آخر کار عالم کے لئے جو وقت پر پہنچنا مقدر تھا پہنچ گیا اور قصر نبوت بھی اب جلد ہی اپنی [illegible] کے ساتھ مکمل ہو گیا اور اس لئے ضروری ہوا کہ جس طرح عالم کی ابتدا میں رسولوں کی بعثت کی اطلاع دی گئی تھی اس کی انتہا پر رسولوں کے خاتم کا اعلان کر دیا جائے تاکہ قدیم سنت کے مطابق آئندہ اب کوئی شخص رسول کی آمد کا انتظار نہ کرے۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ — اے آدم کی اولاد اگر کبھی تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آئیں جو تم کو میری آیتیں پڑھ کر سنائیں تو جس نے تقویٰ کی راہ اختیار کی اور نیک ہو گیا تو اس پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غم۔

اس اعلان کے مطابق عالم آبادی میں [illegible] سے رسول آتے گئے کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیین ہے بلکہ ہر رسول نے اپنے بعد دوسرے رسول آنے کی بشارت سنائی حتیٰ کہ وہ زمانہ آگیا جبکہ اسرائیلی سلسلے کے آخری رسول نے اسماعیلی سلسلے کے نبی رسول کی بشارت دی جن کا نام مبارک احمد تھا۔ ومبشرا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد۔

عالم کے اس دستور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس مبشر رسول نے دنیا میں آکر ایک نیا اعلان کیا وہ یہ تھا کہ میں اب آخری رسول ہوں، خود عالم کا زمانہ بھی آخر ہے اور ساعت کی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں اور قیامت اسی طرح قریب قریب ہیں جیسا کہ اپنے [illegible] کو پہنچ چکا ہے۔ قصر نبوت میں ایک ہی اینٹ کی کسر باقی تھی وہ میری آمد سے پوری ہو گئی ہے دونوں تعمیریں مکمل ہو گئیں ہیں اب صلاح و تقویٰ کا نتیجہ دیکھنے کا زمانہ آگیا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کی ختم نبوت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ما كان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين وكان الله بكل شيء عليما۔ (احزاب)

یعنی اب تک جتنے رسول آئے وہ صرف رسول ہی تھے آپ رسول اللہ ہونے کے علاوہ خاتم النبیین بھی ہیں اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور کے لئے دو باتوں کا تصور ضروری ہے ایک آپ رسول اللہ ہیں دوسرے یہ کہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں۔ آپ کے متعلق صرف رسول اللہ کا تصور آپ کی ذات کا ادھورا اور نامکمل تصور ہے بلکہ ان ہر دو تصورات میں آپ کا امتیازی وصف خاتم النبیین ہی ہے۔ ختم نبوت کی اسی اہمیت کی وجہ سے گزشتہ احادیث میں آپ بالاستقرار بیان ہو چکا ہے کہ اس مسئلہ کی نشر و اشاعت نبوت آدم بلکہ وجود آدم علیہ السلام سے بھی پہلے

پھر یوں کہی گئی تھی اور کاتب تقدیر نے حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان آپ کے اسم مبارک کے ساتھ
آپ کی خاتم النبیین ہونے کی صفت بھی بصورت حروف نقش کر دی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نسل انسانی کی بنیاد تھے
لوح محفوظ جملہ حوادث عالم کی بنیاد تھا اور عرش عظیم ان اصول کے اعلان کا سب سے بلند بورڈ ہے جو خداوند برتر اپنی
علم کے طے شدہ اور ناقابل ترمیم تصور کئے گئے ہیں اس لئے ان مقامات پر اعلان کا یہ مطلب تھا کہ ختم نبوت بھی عالم
کے ان بنیادی اور عینی مسائل میں داخل ہے جن کا علم سب پر فرض ہے اور جن میں اب کسی تبدیل و ترمیم کی گنجائش
نہیں۔ اسی لئے آسمانوں پر فرشتوں سے زمین پر حیوانات سے محشر میں انبیاء علیہم السلام سے غرض ابتداء سے لے کر انتہا
تک عالم بالا سے لے کر عالم اسفل تک بڑی شد و مد اور غیر معمولی شہرت سے آپ کی ختم نبوت کا اعلان کیا گیا ہے۔ جب آپ عالم ناسوت
میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ کی یہ امتیازی شان مہر نبوت کی صورت میں بھی نمایاں کر دی گئی تاکہ جس کی آمد کا غلغلہ ہر عالم
عالم میں بلند ہو رہا تھا اس کی شناخت میں کوئی دشواری نہ رہے[1]۔ خدا تعالیٰ کی یہ عجیب حکمت ہے کہ مہر نبوت کے لئے
لئے آپ کے جسم مبارک میں بھی وہی جگہ منتخب ہوئی جو حضرت آدم علیہ السلام کے جسم مبارک میں منتخب ہوئی تھی۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عقیدہ ہر رسول کی دعوت کا جزء رہا ہے اس لئے قیاس کہتا ہے کہ
ہر رسول کے زمانہ سے قیامت کی آمد پر طالب اس کا تذکرہ بھی ان کا فرض منصبی رہا ہوگا۔ گویا ختم نبوت کا عقیدہ قیامت
کے عقیدہ کے دوش بدوش ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ... کنز العمال میں ایک ضعیف اسناد کے ساتھ
مروی ہے کہ تمام سب رسولوں نے خاتم الانبیاء کی آمد کی بشارت سنائی ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وقد أخبر الله تبارك وتعالى في كتابه ورسوله صلى الله عليه وسلم في السنة المتواترة عنه أنه لا نبي بعده ليعلموا أن كل من ادعى هذا المقام بعده فهو كذاب أفاك دجال ضال۔	اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے رسول نے احادیث متواترہ میں ختم نبوت کا اعلان اس لئے فرمایا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص اب اس منصب کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا افترا پرداز، دجال اور پرلے درجہ کا گمراہ ہوگا۔

علماء محققین لکھتے ہیں کہ ختم نبوت کے اعلان میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا متنبہ ہو جائے کہ اب یہ پیغمبر آخری
پیغمبر ہے اور یہ دین آخری دین ہے جس کو جو حاصل کرنا ہے کر لے اس کے بعد یہ دکان ہمیشہ بند ہونے والی ہے جیسا شام
کے وقت ایک دکاندار اعلان کرتا ہے کہ میں اب دکان بڑھاتا ہوں جسے جو سودا لینا ہے لے لے یا جیسا ایک معلم بوقت
رخصت آخری آکر یہ درس دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری تم سے اب یہ آخری ملاقات ہے جو کہتا ہوں خوب غور سے سن لو۔
اسی طرح خالق زمین و زمان کو جو آخری ہدایت دینا تھی بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دے کر یہ اعلان

---

[1] قرطبی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ خاتم نبوت کو اسی لئے خاتم نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ بھی منجملہ ان علامات کے آپ کی نبوت کی
ایک علامت تھی اسی لئے حضرت سلمان فارسی آپ کی تلاش میں جب آپ کی خدمت میں پہنچے تو بار بار جھانکتے تھے تاکہ
سے خاتم نبوت کو دیکھ لیں آپ نے ان کے طرز عمل سے ان کا مقصد سمجھ لیا اور چادر مبارک خاتم نبوت سے ہٹا دی جب خاتم
نبوت کو دیکھ چکے تو اسی عالم بیخودی میں اس کو بوسہ دینے لگے اور فوراً اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئے۔ بحیرا راہب کے قصہ میں
بھی موجود ہے کہ اس نے کہا "انی اعرفہ بخاتم النبوۃ" میں خاتم نبوت کی وجہ سے آپ کو پہچانتا ہوں۔ غرض علماء اہل کتاب
کے نزدیک نبی منتظر کی یہ ایک بڑی علامت تھی۔ (دیکھو زرقانی شرح مواہب)

کیونکہ اب یہ رسول آخری رسول ہے اس لیے عبادات، معاملات، اخلاقیات، معیشت، تمدن کے سب اصول مکمل کر دیئے گئے اس لئے یہ دین آخری دین ہے جسے عمل کرنا ہے کر لے جیسے نئی بعثت کا وقت نہیں رہا۔ بحث و جدل کی بجائے عمل کی فکر کرنی چاہیے وقت تھوڑا رہ گیا ہے اور حساب کی ذمہ داری سر پر ہے۔

اب نہ کوئی رسول آئے گا نہ نبی۔ نہ تشریعی نہ غیر تشریعی نہ ظلی نہ بروزی۔ ختم کے معنی یہ نہیں کہ آپ نے نبوت انسانیہ کو کمال و تکمیل سے معمور کر دیا ہے۔ بلکہ ان معنی سے کہ اب یہ منصب ہی ختم ہو گیا ہے جیسے عالم کی طرح بہت وسعت تھی اور اس منصب پر تقرری کی گنجائش بھی باقی تھی اس لئے انبیاء علیہم السلام برابر آتے رہے جیسا کہ لوگوں کی لیاقت نہیں ہو گی کہ اس میں بات تقرری کی گنجائش رہتی اس لئے اس کے خاتم آپ کو بھیج کر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا تا قیامت کسی کی۔

چونکہ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو ختم فرمانے کا ارادہ کرتا ہے تو کامل ہی ختم کرتا ہے ناقص ختم نہیں کرتا نبوت بھی اب چونکہ کمال کو پہنچ گئی تھی اس لئے مقدر یہی ہوا کہ اس کو بھی ختم کر دیا جائے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت جاری ہوتی تو لازم آتا کہ ان کا کمال نقصان پر موقوف ہے کہ ایک نہ ایک دن عالم کا خاتمہ ہونا ضروری ہے اس سے قبل کسی نہ کسی نبی کا آخری نبی ہونا بھی ضروری ہے اب اگر وہ آپ سے زیادہ کامل ہوا تو اس کے لئے اعلیٰ منصب میں گنجائش نہیں اور اگر ناقص ہوا تو نبوت کا خاتمہ نقصان پر تسلیم کرنا لازم ہو گا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب فطرت عالم پر نظر رکھو گے تو تم کو ہر کل میں ایک حرکت نظر آئے گی۔ یہ حرکت ایک انتہا اور کمال کی متلاشی ہوتی ہے۔ پھر ایک حد پر پہنچ کر حرکت ختم ہو جاتی ہے اور جہاں ختم ہوتی ہے وہی اس کا نقطۂ کمال کہا جاتا ہے۔ انواع پر نظر ڈالئے تو جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات پھر حیوانات سے انسان کی طرف ایک ارتقائی حرکت نظر آ رہی ہے مگر انسان پر پہنچ کر یہ ارتقائی حرکت ختم ہو جاتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان تمام انواع میں کامل تر نوع ہے خود انسان کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو وہ بھی نطفہ سے متحرک ہو کر علقہ و مضغہ کے مراتب طے کرتا ہوا حسن آخر پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور اسی کو اس کی استعداد فطرت کا آخری کمال کہا جاتا ہے پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء میں پھر ایک حرکت اور ایک نشو و نما نظر آتی ہے وہ بعد شباب پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اور اسی کو اس کا نقطۂ کمال کہا جاتا ہے نباتات پر نظر رکھیئے تو وہ بھی ایک چھوٹی سی گٹھلی سے حرکت کر کے ایک تناور درخت بن جاتے ہیں۔ آخر کار اس پر پھول نمودار ہوتے ہیں اور جب پھل نمودار ہو جاتے ہیں تو یہ اس کا کمال سمجھا جاتا ہے اس کمال پر پہنچ کر درخت کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے آئندہ اپنے دور جدید کے لئے پھلوں کو بہت سے تخم اور گٹھلیاں بنا کر دیتا ہے جن میں گٹھلی کر کے اس حد تک پہنچا تھا جس کے بعد اس کا ایک دور جدید کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر درخت کو اس کی پھر نشو و نما ہو تو پھر پھل آنا ہو چکی ہو تو پھر ختم ہو چکا ہوتا مگر چونکہ اس کو ابھی باقی رکھنا منظور ہوتا ہے اس لئے پھر آگے وہی سبز سبز پتیاں وہی ہری ہری ٹہنیاں لہلہانے لگ جاتی ہیں پھر اس پر پھول آتے ہیں اور آخر میں پھر پھل نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح جب تک یہ درخت موجود رہتا ہے اس کے ارتقائی مدارج کو ایک سمت سے ایک دور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ جو درخت اپنی انتہائی عمر کو پہنچ کر پھر نہیں بڑھتے وہ ایک مرتبہ پھل دے کر اپنی زندگی ختم کر دیتے ہیں جیسا کیلے کا درخت۔

مگر یہی ہے تو عالم نبوت میں بھی ایک تدریجی ارتقا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں۔ ہر پچھلی نبوت پہلی سے ارتقائی شکل میں نظر

آ رہی ہے اس لئے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جا کر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جائے لیکن جب خود نبوۃ ہمارے ادراک سے بالاتر حقیقت ہے تو اس کے آخری نقطہ کمال کا ادراک بدرجہ اولیٰ ہماری پہنچ سے باہر ہونا چاہئے اس لئے ضروری ہوا کہ قدرت خود ہی اس کا تکفل فرمائے اور خود ہی اس کا اعلان کرے کہ نبوت کا ارتقاء جہاں ختم ہوا ہے وہ مرکزی اور کامل ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہستی ہے اسی لئے ...
قرآن کریم میں ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کے بعد فرمایا ہے وکان اللہ بکل شیء علیما یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو ہر چیز کا علم ہے وہی یہ جانتا ہے کہ نبیوں میں خاتم النبیین اور آخری کون ہے یہ بات تمہاری دریافت سے باہر ہے کہ تم معلوم کر سکو کہ اس کے رسولوں کی جو لڑی شروع کی گئی ہے اس میں اول کون ہے اور آخر کون۔ اگر یہ عالم بقا اور متعلق ہوتا تو شاید وہ آپ کی آمد کچھ دن کے لئے اور موخر کر دیتا لیکن چونکہ دنیا کی اجل مقرر ہو چکی تھی اس لئے ضروری تھا کہ نبوت کی آخری اینٹ بھی لگا دی جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ قصر نبوۃ کی بھی تکمیل ہو گئی ہے۔ نبوت نے اپنا سفر پورا کر لیا ہے۔ آپ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئے گا کیونکہ اگر کوئی رسول آئے تو یا وہ آپ سے افضل ہو گا یا مفضول۔ اگر افضل ہو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت نے ابھی تک اپنے اس کمال کو نہیں پایا جس کے لئے وہ متحرک ہوئی تھی اور اگر مفضول ہو تو کمال کے بعد پھر یہ تنزل حرکت اسی وقت مناسب ہو سکتی ہے جبکہ عالم کی پھر نشاۃ ثانیہ تسلیم کی جائے۔ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نبوت اب اپنے ارتقائی کمال کو پہنچ چکی ہے اب کوئی اور کمال منتظر اس کے لئے باقی نہیں رہا اس لئے اسی فطری اصل کے مطابق اسے ختم ہو جانا چاہئے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ یعنی تمہارا دین کمال کو پہنچ چکا ہے اب ناقص نہ ہو گا۔ خدا کی نعمت پوری ہو چکی ہے اب کسی مزید نعمت کی توقع غلط ہے اور نظر یہ ہے کہ اب ہمیشہ کے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا گیا ہے اس لئے کوئی دین اس کا ناسخ بھی نہیں آئے گا۔ عربی زبان میں کمال و تمام دونوں لفظ نقصان کے مقابل ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ کمال اوصاف خارجیہ کے نقصان کے مقابل میں بولا جاتا ہے اور تمام اجزاء کے لحاظ سے مثلاً اگر انسان کا ایک ہاتھ نہ ہو وہ ناقص ہے یعنی ناتمام انسان کہا جائے گا خوبصورت حسین نہ ہو اس کے اعضاء پورے ہیں مگر صورت اچھی نہیں خلق نادرست ہیں تو اخلاق درشت و ناہموار ہیں تو اس کو بجائے ناتمام کے ناکمل انسان کہا جائے گا۔ آیت بالا میں یہاں دونوں لفظوں کو جمع کر کے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دین اسلام اب ہر پہلو سے مکمل ہو چکا ہے نہ اس میں اجزاء کا نقصان باقی ہے نہ اوصاف کا اس لئے اب اس کی حرکت ارتقائی ختم ہو گئی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ آپ کا آخری نبی ہونا صرف ایک تاخر زمانی نہیں ہے۔ کسی شخصیت کا صرف آخر میں آنا فضیلت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ مقصود ثبوت یہ ہے کہ مرتبے کا خاتمہ کمال پر کیا جائے اس لئے یہاں آپ کا آخر زمانی آپ کے انتہائی کمال کی دلیل ہے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر نبوۃ سے ایک بلیغ تشبیہ دے کر واضح فرما دیا تھا۔ یہود کو جب اس اکمال و اتمام کی خبر پہنچی قرآن سے روایتاً یا انہوں نے ازراہ حسد کہا اے عمر اگر یہ آیت ہمارے حق میں اترتی ہم تو اس دن کو عید کا دن بنا لیتے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں

ھذہ اکبر نعم اللہ علی ھذہ الامۃ حیث اکمل تعالیٰ لھم دینھم فلا یحتاجون الی دین غیرہ ولا الی نبی غیر نبیھم صلوات اللہ

اللہ تعالیٰ کا اس امت پر یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے اس امت کا دین کامل کر دیا ہے کہ اب اسے نہ کسی اور دین کی ضرورت رہی نہ کسی اور نبی کی اسی لئے آپ کو

صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی التوراۃ

(١٧٠) عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ لَقِيتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قُلْتُ أَخْبِرْنِي عَنْ صِفَةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرَاةِ قَالَ أَجَلْ وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَمَوْصُوفٌ فِي التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِي الْقُرْآنِ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَحِرْزًا لِلْأُمِّيِّينَ أَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ وَلَنْ يَقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتَّى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَقُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَيَفْتَحُ بِهَا أَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوبًا غُلْفًا. رواه البخاری وکذا الدارمی عن عطاء عن ابن سلام.

(١٧١) وَعَنْ كَعْبٍ يَحْكِي عَنِ التَّوْرَاةِ قَالَ نَجِدُ مَكْتُوبًا مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ عَبْدِيَ الْمُخْتَارُ لَا فَظٌّ وَلَا غَلِيظٌ وَلَا سَخَّابٌ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُو

توراۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض علامات

(١٧٠) عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے توراۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کے متعلق دریافت کیا انہوں نے فرمایا ہاں خدا کی قسم توراۃ میں بھی ان کی علامات قرآن کریم کے قریب قریب ہی مذکور تھیں چنانچہ توراۃ میں ہے اے نبی ہم نے آپ کو امت پر گواہ، خوشخبری سنانے والا، خدا کے عذاب سے ڈرانے والا اور ان پڑھ عربوں کے لئے حفاظت بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ہمارے بندہ اور رسول ہیں آپ کا نام ہم نے متوکل رکھا ہے (خدا پر بھروسہ رکھنے والا) آپ تندخو درشت نہیں، سخت دل نہیں، بازاروں میں شور مچانے والے بھی نہیں برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس وقت تک نہیں اٹھائے گا جب تک آپ کے ذریعے اس ملت کو جو ٹیڑھی ہو گئی ہے سیدھا نہ کر دے اس طرح پر کہ وہ یہ اقرار کر لیں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور جب تک اندھی آنکھوں سے پردے نہ اٹھا دے اور بہرے کانوں کو شنوا نہ بنا دے اور نافہم دلوں میں فہم نہ ڈال دے۔ (اس حدیث کو بخاری اور دارمی نے روایت کیا ہے مگر دارمی نے ابن سلام سے روایت کی ہے)

(١٧١) کعب توراۃ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ توراۃ میں ہم یہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں محمد رسول اللہ میرے بندہ ہیں چن کر میں نے بھیجے ہیں۔ تندخو درشت نہیں، سخت دل نہیں۔ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں

فِي التَّوْرَاةِ نَعْتَكَ وَصِفَتَكَ وَمَخْرَجَكَ وَإِنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقِيمُوا الْيَهُودَ مِنْ عِنْدِ رَأْسِهِ وَلُوا أَخَاكُمْ۔ رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي دَلَائِلِ النُّبُوَّةِ۔

(۱۴۳) وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّ يَهُودِيًّا كَانَ يُقَالُ لَهُ فُلَانٌ حَبْرٌ كَانَ لَهُ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَنَانِيرُ فَتَقَاضَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ يَا يَهُودِيُّ مَا عِنْدِي مَا أُعْطِيكَ قَالَ فَإِنِّي لَا أُفَارِقُكَ يَا مُحَمَّدُ حَتَّى تُعْطِيَنِي فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذًا أَجْلِسُ مَعَكَ فَجَلَسَ مَعَهُ فَصَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ

خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ اس یہودی کو اس کے سرہانے سے ہٹا دو اور اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کے تم خود متکفل ہو۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل نبوت میں روایت کیا ہے۔

(۱۴۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کے متعلق مشہور تھا کہ فلاں یہودی بڑا عالم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے کچھ دینار قرض تھے اس نے آپ پر تقاضا کیا آپ نے فرمایا اے یہودی تیرے دینے کے لئے اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ بولا اے محمد تو میں آپ سے اس وقت تک جدا نہیں ہوں گا جب تک کہ آپ میرا قرض ادا نہ کر دیں آپ نے فرمایا اچھا تو میں تمہارے پاس بیٹھا جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ اس کے پاس بیٹھ گئے اور ظہر، عصر اور مغرب و عشا اور صبح کی نماز وہیں ادا کی اور آپ کے صحابہ (پیچھے پیچھے) اسے دھمکیاں دیتے اور ڈراتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

(تشریح) اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت کے سوا چند مسائل اور بھی معلوم ہو گئے۔ (۱) کافر سے خدمت لینا درست ہے (۲) بیمار کا فرض خواہ یہودی ہی کیوں نہ ہو اس کی بھی عیادت کرنا چاہئے۔ (۳) بچہ کا اسلام معتبر ہے۔ (۴) مسلمان کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے ذمہ ہے۔

(۱۴۳) تورات میں آپ کی جو صفات مذکور تھیں اس کا بہت بڑا حصہ آپ کی اخلاقیات سے متعلق تھا حدیث بالا میں بھی یہی بتلایا گیا ہے کہ بعثت کا بڑا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل تھی جو شان انسانوں کے ساتھ اخلاقیات میں قبل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی انہیں ہو سکتا۔ اسلام میں انسانی بلندی کا معیار اخلاق کی بلندی پر رکھا گیا ہے۔ اس لئے جو شخص کہ اخلاقیات میں عوام سے جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اتنا ہی ان سے بلند ہونا چاہئے اور اسی لئے انبیاء علیہم السلام میں جو سب سے بڑے نبی ہیں وہ اخلاقیات میں بھی سب سے آگے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی نبوت کا معیار بھی ان کی اخلاقی آزمائش تھی اسی لئے اس یہودی نے اپنے نزدیک آپ کے اخلاق کو سب سے سخت کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا اور جو ننگ خاص سے خاص ہو سکتا تھا وہی آپ کے اخلاق کا دیکھ لیا۔

والعصر والمغرب والعشاء الآخرة والغداة وكان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم
يتهددونه ويتوعدونه ففطن رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ما الذي تصنعون به
فقالوا يا رسول الله يهودي يحبسك فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم منعني ربي
أن أظلم معاهدا ولا غيره فلما ترحل النهار قال اليهودي أشهد أن لا إله إلا الله
وأشهد أنك رسول الله وشطر مالي في سبيل الله أما والله ما فعلت بك الذي فعلت
إلا لأنظر إلى نعتك في التوراة محمد بن عبد الله مولده بمكة ومهاجره بطيبة و
ملكه بالشام ليس بفظ ولا غليظ ولا سخاب في الأسواق ولا متزي بالفحش ولا قول
الخنا أشهد أن لا إله إلا الله وأنك رسول الله وهذا مالي فاحكم فيه بما أراك الله
وكان اليهودي كثير المال۔ (رواه البيهقي في دلائل النبوة)

صحابہ کی اس حرکت کو محسوس فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک یہودی اور
آپ کو روکے بیٹھا ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پروردگار نے مجھے اس بات سے منع کیا ہے کہ
میں معاہد یا کسی اور شخص کا حق دباؤں۔ جب دن چڑھ گیا تو یہودی نے کہا میں اس بات کی گواہی دیتا
ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ۔ اور اس بات کی کہ آپ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں یہ میرا نصف
مال اللہ کے راستے میں ہے خدا کی قسم جو حرکت بھی میں نے آپ کے ساتھ کی تھی وہ صرف اس لئے
کی کہ جو صفت آپ کی توراۃ میں موجود ہے اس کو آزما دیکھوں۔ وہ محمد بن عبد اللہ ہے ان کی
پیدائش کی جگہ مکہ ہے اور ہجرت کی مدینہ ہے اور ان کا ملک شام تک ہے۔ سخت زبان نہیں، سخت
دل نہیں، بازاروں میں شور مچانے والے نہیں، فحش اور بیہودہ گوئی سے متصف نہیں، میں اس
بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور بلاشبہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔
لیجئے یہ میرا مال حاضر ہے آپ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں حکم فرمائیں۔ (راوی کہتا ہے)
یہ یہودی بڑا مالدار شخص تھا۔

(اس حدیث کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔

الانبیاء تنام عینهم ولا تنام قلوبهم

(۱۷۵) عن شريك بن عبد الله قال سمعت أنس بن مالك يحدثنا عن ليلة أسري بالنبي صلى الله عليه وسلم من مسجد الكعبة جاءه ثلاثة نفر قبل أن يوحى إليه وهو نائم في المسجد الحرام فقال أولهم أيهم هو فقال أوسطهم هو خيرهم فقال آخرهم خذوا خيرهم فكانت تلك فلم يرهم حتى جاءوا ليلة أخرى فيما يرى قلبه والنبي صلى الله عليه وسلم نائمة عيناه ولا ينام قلبه وكذلك الأنبياء تنام أعينهم ولا تنام قلوبهم فتولاه جبريل ثم عرج به إلى السماء (رواه البخاری)

انبیاء علیہم السلام کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار رہتے ہیں

(۱۷۵) شریک بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شب کا واقعہ جس میں آپ کو مسجد حرام سے (راتوں رات اوپر آسمانوں پر) سیر کے لئے لے گئے تھے حضرت انس سے خود سنا ہے وہ ہم سے بیان کرتے تھے کہ وحی آنے سے پیشتر آپ کے پاس تین فرشتے آئے اس وقت آپ مسجد حرام میں (کعبۂ شامی کے درمیان لیٹے ہوئے) سو رہے تھے ان میں سے پہلے نے کہا بھلا ان میں وہ شخص کون ہیں؟ درمیانی فرشتہ بولا جو درمیان میں لیٹے ہوئے ہیں یہی سب میں افضل ہیں۔ آخری فرشتے نے کہا اچھا تو جو ان سب میں بہتر ہیں ان کو لے چلو۔ اس شب تو اتنی ہی بات ہو کر رہ گئی۔ پھر آئندہ کسی شب میں یہی فرشتے آ گئے خواب میں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ جب سوتے تو صرف آپ کی آنکھیں سوتی تھیں دل بیدار رہتا تھا اور تمام انبیاء علیہم السلام کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب سوتے ہیں تو صرف ان کی آنکھیں سوتی ہیں ان کے دل بیدار رہتے ہیں اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اپنی سپردگی میں لیا اور آسمان پر لے گئے۔ (بخاری)

(۱) شریک بن عبداللہ کی یہ روایت گو بخاری شریف میں موجود ہے مگر محدثین نے اس میں بہت سے اوہام شمار کئے ہیں۔ تفصیل یہاں کی ہیں معراج کا واقعہ نزول وحی سے پہلے قرار دیا ہے اور سب سے بڑی غلطی یہ کہ واقعہ اسراء جو بیداری کا واقعہ تھا خواب کا واقعہ بنا دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی بحث کہیں اور کی جائے گی یہاں صرف انبیاء علیہم السلام کی قلبی منقبت بیان کرنا مقصود ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفت تمام انبیاء علیہم السلام میں موجود ہوتی ہے پس جہاں آپ کے ساتھ خصوصیت کا شبہ ہو وہاں امت کے مقابلہ میں خصوصیت مراد لینا چاہئے نہ کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں۔ حافظ ابن حجر کا رجحان بھی اسی طرف ہے (دیکھو حاشیہ برصفحہ آئندہ ملاحظہ ہو)

بصر النبی

(۱۶۷) عَنْ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ اَشْرَفَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اُطُمٍ مِنْ آطَامِ الْمَدِیْنَۃِ فَقَالَ ھَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰی قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنِّیْ لَاَرَی الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُیُوْتِکُمْ کَوَقْعِ الْمَطَرِ۔ (متفق علیہ)

نبی کی نظر

(۱۶۷) اسامہ بن زیدؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بلند مکانوں میں سے کسی مکان پر چڑھے اور فرمایا کیا تم بھی دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں۔ صحابہؓ نے عرض کیا نہیں آپ نے فرمایا کہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں فتنے اس طرح برس رہے ہیں جیسے بارش۔ (متفق علیہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کتاب ہذا کے متعلق ہیں اس باب کی مناسبت کی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جن قلوب کو اللہ تعالیٰ سچا دین عطا فرماتا ہے ان کو عالم قدس سے ایک غیر معمولی اتصال میسر ہوتا ہے یہی بیداری کا ثمرہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی سمجھے جاتے ہیں اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذبح کرنے کا خواب دیکھا تھا کہ تیری قربانی کے لئے تیار ہوگئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی اس حقیقت کو سمجھ کر بول اٹھے یا ابت افعل ما تؤمر۔ اے باپ جو حکم آپ کو ملا ہے اسے بجا لائیے۔ یہاں خواب کی بات کو امر فرمایا ہے۔ اس کے بالمقابل جو دل خباثت کی باطنی طاقتیں رکھتے ہیں ان کو بھی ایک فطری بیداری حاصل ہوتی ہے مگر ان کی پیشگوئیاں کو نہ تو عالم قدس سے انھیں کوئی مناسبت نہیں ہوتی بلکہ انھیں شیاطین کے ساتھ اتصال میسر ہوتا ہے۔ اسی لئے جب ابن صیاد کے حالات کی تحقیق کے لئے آپ تشریف لے گئے تو اس نے بھی اپنی یہی صفت بیان کی کہ میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل بیدار رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس کا امتحان لیا اور اس کو بتلا دیا کہ عالم قدس سے اس کو کوئی اتصال حاصل نہیں ہے وہاں ہر بات صاف ستھری اور واضح مشہود ہوتی ہے اس کو صرف شیطانوں سے اتصال میسر ہے جو غیب پر اُن کو کوئی دسترس نہیں صرف قیاسات اور معمولی اندازے لگاتے تھے یہی وہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی صفت نوم کو یہ سمجھ رکھا ہے اسی لئے فرمایا اخسأ فلن تعدو قدرک۔ (جا بدنصیب تو اپنے رتبے سے آگے نہیں بڑھ سکتا) انبیاء علیہم السلام کی یہ صفت تیقظ دائمی ہوتی ہے صرف حالت نوم پر منحصر نہیں۔ اس بیداری کی پوری حقیقت سمجھنا ہمارے ادراک سے باہر بات ہے۔ الفاظ اس کی حقیقت کو پورا ادا نہیں کر سکتے۔ صوفیاء کرام کی نسبت یادداشت شاید اس سے کوئی بعید شباہت رکھتی ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

(۱۶۷) یہ وہ فتنے تھے جو صحابہ کے درمیان آنحضرت کے بعد آنے والے تھے آپ کی نظر برسوں سال پہلے انھیں دیکھ رہی تھی۔

(۱۷۷) عن عبد الله بن عباس في قصة صلوة الكسوف قالوا يا رسول الله رأيناك تناولت شيئا في مقامك هذا ثم رأيناك تكعكعت فقال إني رأيت الجنة فتناولت منها عنقودا ولو أخذته لأكلتم منه ما بقيت الدنيا ورأيت النار فلم أر كاليوم منظرا قط أفظع ورأيت أكثر أهلها النساء قالوا بم يا رسول الله قال بكفرهن قيل يكفرن بالله قال يكفرن العشير ويكفرن الإحسان لو أحسنت إلى إحداهن الدهر ثم رأت منك شيئا قالت ما رأيت منك خيرا قط. (متفق عليه)

(۱۷۸) عن أبي ذر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إني أرى ما لا ترون وأسمع ما لا تسمعون أطت السماء وحق لها أن تئط ما فيها موضع أربع أصابع

(۱۷۷) صلوٰۃ کسوف کے قصہ میں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ہم نے آپ کو دیکھا کہ اسی مقام پر آپ نے کسی چیز کے لینے کے لئے (ہاتھ) بڑھایا تھا پھر دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے (یہ کیا بات تھی) فرمایا میں نے جنت دیکھی تو ارادہ کیا تھا کہ اس میں سے ایک خوشہ لے لوں، اگر لے لیتا تو جب تک دنیا رہتی تم اس میں سے کھاتے رہتے پھر دوزخ دیکھی تو ایسا خوفناک منظر کبھی نہیں دیکھا جیسا آج دیکھا تھا میں نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیوں؟ فرمایا اپنی حق ناشناسی کی وجہ سے، پوچھا گیا کیا خدا کی حق ناشناس ہوتی ہیں؟ فرمایا اپنے شوہر کا حق نہیں پہچانتی اور احسان فراموش ہوتی ہیں اگر کسی کے ساتھ تم عمر بھر بھی احسان کرو گے پھر تمہاری جانب سے کوئی ادنیٰ کوتاہی دیکھ پائے تو یہی کہہ دیتی ہے کہ ہم نے تم سے کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔ (متفق علیہ)

(۱۷۸) ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ آوازیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے آسمان چرچر کر رہا ہے اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے کیونکہ اس میں کہیں چار انگشت برابر بھی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ

---

(۱) یہ جنت خود غیر فانی ہے اس کی ہر نعمت بھی غیر فانی ہے اس لئے اگر آپ اس کی کوئی چیز لے لیتے تو وہ بھی دائمی اور غیر فانی ہوتی۔ اس حقیقت کو ابھی منکشف کرنا منظور نہ تھا وہ عالم غیب کو غیب کی حد تک باقی رکھنا ہی منظور تھا اس لئے صرف اتنا بڑھا کر دست مبارک آگے بڑھے سا فاصلہ ہے قریب سے قریب کتنی قوی رویت ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام اس جہان میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں۔

(۱۸۲) عن رافع بن خديج قال قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يأبرون النخل فقال ما تصنعون قالوا كنا نصنعه قال لعلكم لو لم تفعلوا كان خيرا فتركوه فنقصت قال فذكروا ذلك له فقال إنما أنا بشر إذا أمرتكم بشيء من أمر دينكم فخذوا به وإذا أمرتكم بشيء من رأيي فإنما أنا بشر (رواه مسلم)

(۱۸۳) عن أنس أن النبي صلى الله عليه وسلم مر بقوم يلقحون فقال لو لم تفعلوا لصلح قال فخرج شيصا فمر بهم فقال ما لنخلكم قالوا قلت كذا وكذا قال

---

(۱۸۲) رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت لوگوں کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے کھجوروں کے درختوں کی "تابیر"[1] کیا کرتے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کیوں کرتے ہو انھوں نے عرض کیا (پھلوں میں زیادتی کے لئے) ہم یہ کام پہلے سے کرتے آتے ہیں آپ نے فرمایا اگر اب نہ کرو تو شاید بہتر ہو۔ یہ سن کر لوگوں نے تابیر کرنا چھوڑ دیا پھل کم آنے لگا اس پر لوگوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا دیکھو میں بشر ہوں جب تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کسی بات کا حکم دوں اسے تو فوراً بلا پس و پیش اختیار کرلو اور جب (دنیا کے معاملات میں) کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو میں صرف ایک بشر ہوں۔ (مسلم)

(۱۸۳) انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی طرف گذرے جو کھجوروں کے درختوں میں عمل تلقیح کیا کرتی تھی آپ نے ان سے فرمایا اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو اچھا ہو راوی کہتا ہے کہ (اس سال) ان درختوں پر ردی پھل آئے۔ پھر اس طرف جب آپ گذرے تو پوچھا تمہارے

---

[1] عرب میں تابیر اور تلقیح کا قدیم سے رواج تھا۔ اس عمل کی صورت یہ تھی کہ وہ نر کھل کا خوشہ لیکر مونث کے ساتھ ملا دیتے تھے اس کے بعد جب پھل آتا تو بہت کثرت سے آتا۔ پہلی حدیث میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا تو سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں۔ یہاں یہ ارشاد ہے کہ دنیا کے دھندوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تم ہو۔ یہ علوم نبوت نہیں ہیں بلکہ اہل فن کو تجربہ فن کا عمل ہونا مناسب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علوم تجربی نہیں کہ دنیا آسمان و زمین کیسے بنایا جاتا ہے کس زمین میں کیا کاشت کیا جاتا ہے کس فصل میں کیا بویا جاتا ہے۔ ان علوم کو دنیا ان کے آنے سے پہلے بھی جانتی تھی اور ان کے بعد بھی ان میں ہزاروں ترقیاں کرتی رہتی ہے۔ آج ہماری دنیا کے علوم جہاں تک پہنچ چکے ہیں ان کا مستقل تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ جنگ کے متعلق [illegible] ایجادات، زراعت [illegible] ہوائی جہاز، بجلی اور بھاپ کے ذریعے سے لوگ کیا کیا نہ آنکھوں کے سامنے ہیں یہ ان علوم میں سے کسی کی طرف صاحب نبوت نے تعرض فرمایا ہے۔ یہ سب تمہاری عقول کو [illegible] کی گئی ہے [illegible] جتنے ماہرین [illegible] اور دنیا کو جتنا مزین کرسکتے ہیں کئے جائیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(انتم اعلم بامر دنیاکم (رواہ مسلم فی کتاب الفضائل فی باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا))

درختوں کو کیا ہو گیا، انھوں نے عرض کیا آپ نے اس بارے میں ایسا ارشاد فرمایا تھا (جس سے ہم نے تلقیح نہیں کی) اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنی دنیوی زندگی کو تم خود بہتر جانتے ہو۔ (مسلم)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ان علوم میں شریعت کوئی دست اندازی نہیں کرتی جب تک کہ آپ اس سے کوئی بھی ایسی بات علوم کے لئے انبیاء علیہم السلام آتے ہیں وہ علوم ما بعد الطبیعیات ہیں اور وہ اب اتنے مکمل ہو چکے ہیں کہ ایک نقطہ کی کمی بیشی کی گنجائش نہیں رہی، یہ وہ علوم ہیں جن کو دنیا انبیاء علیہم السلام کی آمد سے جانتی ہے۔ ان کے ہدایات میں ایک نقطہ کا اضافہ کر سکتی ہے وہی ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہی ان کا کمال سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے سوا علوم علوم کا ان سے بحث کی ہوتا ہے وہ ان میں دخل اندازی وہ پسند کرتے ہیں۔ یہاں کسی کو یہ دھوکا نہ لگے کہ جب دنیا کی رہے لیے کہ اصلاح دنیا کا باب شریعت سے گویا بے نیاز ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا ایک شعبہ وہ ہے جس کا تعلق ہے مگر وہ خالص شریعت ہی دین کے علم سے سمجھا جاتا ہے۔ اس شعبہ میں انبیاء علیہم السلام کی شرکت ہوتی ہے بلکہ اس کے محسوس اور علم وہی ہوتے ہیں۔ دنیا کا دوسرا شعبہ وہ ہے جس کا دین سے تعلق نہیں یہ وہاں انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی نہیں ہوتی بلکہ وہ تجربات سے تم خود جانتے ہو۔ مثلاً زراعت کہ انسانی زندگی کے لئے کس حد تک مفید ہے اس کے اصول کیا ہیں۔ کب کس وقت کس طرح اس سے کرنا مناسب ہے۔ تجارت میں ایجاب و قبول بیع کے صیغے اور بائع و مشتری کے اختیارات اختلاف کی صورتوں میں فیصلہ کی راہ، جنگ و صلح کے متعلق ہدایات کے شرائط وغیرہ وغیرہ یہ سب انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی ہے جو خود کہا جاتے بتلاتے ہیں یہ ہی کے اصول مقرر ہیں۔ یہ اصول خود قائم کرتے ہیں اس دنیا کو دین بنا دیا ہے لیکن ان اصول کا کے بعد زراعت کی جزئیات کہ اس کے لئے کس کس سامان کے فراہم کرنے کی ضرورت ہے کس کس قسم کے مصنوعات دکان یہ تمہارا ہی حصہ ہے اسے تم خود جانتے اور سمجھتے ہو۔ اسی کی طرف حدیث مذکور میں لفظ "دنیا" سے اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ کہ دنیا کا ایک شعبہ خود دین کا جزء ہے۔ اس کی ہدایات بھی اسی کے ذمہ ہیں۔ اس کا دوسرا شعبہ دین کا جزء نہیں اس کو تمہارے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ تمہاری دنیا ہے تم اس میں خود مختار ہو۔ ان حدود کو جدا جدا پہچاننے کے لئے ان تفصیلات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو شرعی دنیا کے متعلق موجود ہیں ان کو پیش نظر رکھے بغیر صرف چند سطور لکھ کر کوئی ایسا واضح خط قائم نہیں کیا جا سکتا جو دنیا کے ان دونوں شعبوں میں پورا پورا امتیاز پیدا کر دے۔

شیخ عبد العزیز دباغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مشاہدہ کے سلسلہ میں حسب ذیل اس حدیث پر بھی گفتگو کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو کائنات عالم کے ہر ہر ذرہ میں قدرت کی کارفرمائی کا یہ استغراق حاصل ہوتا ہے کہ پھر حجابات کا اپنے اسباب کے ساتھ ارتباط صرف برائے بیت نظر آتا ہے یہ یقین و مشاہدہ ان پر ہر وقت مستولی رہتا ہے اس لئے وہ عالم کی ہر حرکت و سکون کا تعلق براہ راست حق تعالیٰ ہی کو دیکھتے ہیں اور اسی یقین کے ساتھ سمجھتے ہیں جیسا کہ ہم اسباب کو۔ ایک مومن کو بھی انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں اس نوع کا مشاہدہ نصیب ہو جاتا ہے مگر وہ اتنا قوی ہوتا ہے پس علم آخرت جلد اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے پھر اپنی طبعی کشش کے مطابق اسباب ہی کی کارفرمائی نظر آنے لگتی ہے۔ جس پر پہلا مشاہدہ غالب ہوتا ہے وہ بیشک اسباب کی ضعیف کڑیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا قدرت بھی اس کے مشاہدہ و یقین کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گی

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وللترمذی نحوہ عن ابن عباس ومعاذ بن جبل وزاد فیہ قال یا محمد ھل تدری فیم
یختصم الملأ الاعلی قلت نعم فی الکفارات والکفارات المکث فی المساجد بعد الصلوات
والمشی علی الاقدام الی الجماعات واسباغ الوضوء فی المکارہ ومن فعل ذالک عاش
بخیر ومات بخیر وکان من خطیئتہ کیوم ولدتہ امہ وقال یا محمد اذا صلیت فقل
اللھم انی اسئلک فعل الخیرات وترک المنکرات وحب المساکین واذا اردت بعبادک

اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ اقرار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا اے محمد اب بتلایئے کہ
ملائکہ مقربین کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا جی ہاں ان اعمال کے متعلق کر رہے ہیں جن سے گناہ مٹ
جاتے ہیں۔ وہ اعمال یہ ہیں نمازوں کے بعد دوسری نمازوں کے انتظار میں مسجدوں میں رہنا۔ پیادہ پا چل کر نماز
باجماعت کے لئے جانا۔ تکلیفیں اٹھا کر وضو پورا کرنا (جیسے جاڑوں میں) جس نے یہ عمل کئے اس کی زندگی
بھی بخیر اور موت بھی بخیر حالت میں ہوگی اور اس کی خطائیں ایسی رہ جائیں گی جیسا ماں سے پیدائش کے
دن تھیں (یعنی کچھ نہ رہیں گی) اور یہ بھی فرمایا کہ اے محمد نماز کے بعد یہ کلمات بھی پڑھ لیا کیجئے۔ اللھم انی اسئلک
اے اللہ میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ بھلائیاں کروں۔ برائیاں چھوڑ دوں۔ مسکینوں سے محبت رکھوں اور

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) جن کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ سے سوال کیا گیا تو یہ حیثیت کا وہ ابھی
کے کسی بناء پر علم کا سوال نہ تھا اور نہ عالم تکوینیات کے کسی باریک مسئلہ کا سوال تھا بلکہ ڈیوٹی کا سوال تھا۔ جو
انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہیں۔ رب العزت نے جب ان علوم کا افاضہ چاہا تو آپ کے علم میں ایسی وسعت ہو گئی
کہ تجلی مبشر تھا کی اور اس کے بعد جب پھر سوال ہوا تو وہی پہلا سوال تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں علم سے
مطلب دونوں کے درمیان میں علوم کا ذکر بعد استفادہ ہو یا افادہ وہی علوم تھے جو منصب نبوت سے متعلق ہیں۔ جب بحث علم
انبیاء کے عموم و خصوص پر ختم کرنی ہوئے دو مختلف علم و طلب کا عنوان بلا وجہ تحلیل کیا جائے تو کبھی صحیح مراد حاصل نہیں ہو سکتی
قرآن کریم میں ابلیس کے قصہ میں مذکور ہے واوتیت من کل شیء سے ہر چیز سے ایک مسئلہ تھا۔ سیاق و سباق کی
رعایت کرنے والے کے نزدیک تو یہ بات صاف ہے وہ جانتا ہے کہ یہاں ابلیس کی صرف مخالفت کا بیان کیا گیا ہے
اور اس میں انبیت کا مطلب یہ ہے کہ جو علم و حشم، سامان و سلطان کسی بادشاہ کو عطا ہوتے ہیں وہ سب اس کو بھی حاصل تھے لیکن
اگر صرف الفاظ کے عموم کو دیکھ کر بحث شروع کر دو کہ جب اس کو ہر چیز دی گئی تھی تو زمانہ کی بھی ضرورت نہیں ہوگی تو یہ غلط
ہوگا۔ قرآنیات کے متعلق اشارہ ہے تمہاری کتنی تھی۔ اس میں یہ چیز کا بیان ہے۔ اب اگر یہاں صرف سیاق سے ہی
فیصلہ کرو تو پھر قرآن کی ضرورت کیا رہتی ہے۔ حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ

قال قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم مقاما ما ترک شیئا یکون فی مقامہ
ذلک الی قیام الساعۃ الا حدث بہ حفظہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ وعظ فرمایا اور
قیامت تک جو ہونے والی تھی ان میں کوئی بات
نہیں چھوڑی جو بیان نہ کر دیا ہو جس نے یاد رکھا یاد رکھا

الانبیاء اشد الناس بلاء

(۱۸۶) عن سعد قال سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس اشد بلاء قال الانبیاء ثم الامثل فالامثل یبتلی الرجل حسب دینہ فان کان فی دینہ صلبا اشتد بلاؤہ وان کان فی دینہ رقۃ ھون علیہ فما زال کذلک حتی یمشی ما لہ ذنب۔

رواہ الترمذی وابن ماجہ والدارمی وقال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح۔

مخلوق میں سب سے شدید آزمائش انبیا کی ہوتی ہے

(۱۸۶) سعدؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش کس کی ہوتی ہے۔ فرمایا انبیاء کی۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ جو افضل ہو (قاعدہ یہ ہے) کہ آدمی کی آزمائش اس کی دینداری کے اندازہ کے مطابق ہوتی ہے اگر وہ اپنے دین میں سخت ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر نرم ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے آزمائشوں کا یہی سلسلہ رہتا ہے حتی کہ وہ اس طرح چلتا پھرتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا (ترمذی)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کا جواب وہ اسی وقت انہیں الگ کر دے گی جیسا کہ سیر معراج کے واقعہ میں جب آپ کا بیت المقدس کا سفر ختم ہو گیا تو بعد نزول آیا تو قریش نے آپ سے بیت المقدس کے متعلق سوالات شروع کئے حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت آپ کو اتنی بے چینی ہوئی کہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک سرسری دیکھنے والا اپنے دیکھتے وقت اتنے غور سے تو دیکھتا نہیں کہ ہر چیز کے سب خد و خال محفوظ کر لے۔ اب اگر آپ ان کے سوالات کے جوابات نہیں دیتے تو منکرین کو مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ لگتا ہے اور اگر جواب دیتے ہیں تو اس کا سامان سے آپ نے بیت المقدس کو دیکھا نہ تھا کہ قریش کو اس کا امتحان کیونکر دیتا ہے۔ بے چینی کی تاب کے مرتبے تک پہنچ گئی آپ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس میرے سامنے کر دیا گیا وہ کوئی سوال کرتے جاتے میں بڑی سہولت سے دیکھ دیکھ کر اس کا جواب دیتا جاتا یہ چونکہ اسی قسم کی جزئیات ہیں جو رسول کی نظر کی بیساختی ہیں مگر اس کا منصب رسالت و نبوت کا تقاضہ سمجھا جاتا ہے مگر کمال یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی اس وقت مشیت پر موقوف ہو اگر چاہے تو انہوں کی تسلی کے لئے خرق عادت کے طور پر اس قسم کا انکشاف بھی کر دے یہی حال تمام معجزات کا ہے وہ بھی نبی کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں اس کی طاقت سے ظاہر نہیں ہوتے نہ اصولی طور پر ان کی کوئی طاقت معین ہوتی ہے بلکہ وقت و مصلحت کے لحاظ سے اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو غیر متناہی طاقت کا ان کے ہاتھوں پر اظہار کر دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا نہیں کرتا۔ اسی لئے کفار کے انہی قسم کی فرمائشوں کی جواب میں آپ سے کہہ دیا گیا تھا قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا۔ آپ کہہ دیجئے میرا رب پاک ہے میں تو صرف بشر اور رسول ہوں۔ انہی بیانات سے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو فتح کے ساتھ شکست بھی اٹھانی پڑتی ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۱۸۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُوْعَكُ فَمَسِسْتُهُ بِيَدِيْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ لَتُوْعَكُ وَعْكًا شَدِيْدًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجَلْ اِنِّيْ اُوْعَكُ كَمَا يُوْعَكُ رَجُلَانِ مِنْكُمْ قَالَ فَقُلْتُ ذٰلِكَ لِاَنَّ لَكَ اَجْرَيْنِ فَقَالَ اَجَلْ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيْبُهُ اَذًى مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاهُ اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ سَيِّئَاتِهٖ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا۔ (متفق علیہ)

(۱۸۸) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَاَيْتُ اَحَدًا الْوَجَعُ عَلَيْهِ اَشَدُّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

(۱۸۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ

---

(۱۸۷) عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ کو بخار چڑھ رہا تھا میں نے آپ کے جسم کو ہاتھ لگایا تو بخار بہت تیز تھا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو تو بخار بہت تیز ہے فرمایا ہاں مجھے اتنا تیز بخار ہوتا ہے جتنا تم میں دو شخصوں کو ہوتا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ اس لئے ہے کہ آپ کو اجر بھی تو دوگنا ملتا ہے۔ فرمایا ہاں اس کے بعد فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو مرض وغیرہ کی کوئی تکلیف لاحق ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی برائیاں اس طرح ساقط کر دیتا ہے جیسا درخت اپنے پتے

(۱۸۸) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے بیماری کی تکلیف اتنی سخت کسی پر نہیں دیکھی جتنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دیکھی تھی۔ (متفق علیہ)

(۱۸۹) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثواب کی زیادتی کا مدار آزمائش کی سختی پر ہے جتنی سخت آزمائش اسی قدر زیادہ ثواب۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بلکہ دوسرے انسانوں کی طرح بہت سی آزمائشوں میں سے بھی گزرنا پڑتا ہے بلکہ ان کو تو کچھ جو مراحل انھیں طے کرنا پڑتے ہیں وہ کسی اور کو طے کرنا نہیں پڑتے بلکہ ان کی زندگیاں اور پیغمبروں کا معیاری ہی ان کا یہی تو وہ دل خراش داستان ہوتا ہے یہ آزمائشوں کی بھٹی ہوتی ہے جن میں سے نکل کر ہی بشریت کا ثبوت دیا کرتے ہیں دنیا اپنی نظریات کے مطابق اسے مختلف رنگ دیا کرتی ہے من یرجو غائلہ و ... یہ خیال۔

(۱۸۹) ان روایات سے معلوم ہوا کہ ابتلاء اور آزمائش نقص و عیب کی دلیل نہیں بلکہ کمال کی دلیل ہے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مقبولین وہی ہیں جو مرتبہ سے ... تکلیف جو بہ نسبت کہ محبوبیت سے نکل کر آزمائش میں قدم رکھیں۔ سیرت انبیاء علیہم السلام یہ بتاتی ہے کہ جو جتنا بزرگ ہے وہ اتنا ہی زیادہ بلا میں ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

احمد - یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں "احمد الحامدین لربہ" یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں سے اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔ دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں "احق الناس واولاھم بان یحمد" یعنی تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور تعریف کا مستحق۔ اس بنا پر محمد و احمد میں فرق یہ ہے کہ محمد وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے بار بار کی جائے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جائے پس محمد میں کمیت ہے اور احمد میں کیفیت۔ دونوں معنوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنے خلق و خصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپ کی ہو۔ اس تحقیق کے بعد ان دونوں مفہوموں کے لحاظ سے عالم پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ اعلیٰ ترین تعریف حقیقی صداقت کے ساتھ آپ کی ذات مبارک پر جہاں میں صادق آتی ہے کسی اور پر نہیں۔ اگر یہاں اسم تفضیل کو اسم مفعول کے معنی میں سمجھئے تو خالق سے مخلوق تک انبیاء علیہم السلام سے لیکر جن و ملک تک حیوانات سے لیکر جمادات تک ہر قسم کی مدح اور تعریف سب ہی نے آپ کی تعریفیں کی ہیں اور آج بھی چالیس کروڑ انسانوں کی زبانیں دن رات میں نہ معلوم کتنی بار آپ کی تعریف کے لئے حرکت کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ کفار میں بھی ایک معقول جماعت ایسی ہے جو اگرچہ آپ کی رسالت تسلیم نہیں کرتی مگر آپ کی دیانت و امانت، عدل و انصاف، صداقت و راستبازی، جوش و خروش کا ثنا خواں ہے۔ اس لئے اگر آپ خیال میں آپ خدا علیہ ہو کر ازل سے ابد تک ساری دنیا کی طرف کان لگائیں تو جس کی سب سے زیادہ اور سب سے بہتر تعریف آپ کے کان میں آئے گی وہ مبارک ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہوگی ؎

خدا خود آں گلی را چناں چوں بیارد ۔۔۔ کہ مرغ ہر چمنے گفتگو ہے دارد

اس لئے آپ احمد بمعنی اسم مفعول بھی ہیں کہ آپ ہی مستحق تعریف ہیں کہ آپ کی صفات ہر معنی سے اتنی کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر احمد کو اسم فاعل کے معنی میں سمجھئے تو بھی اس اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپ ہی کی ذات پاک ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی تعریف آپ نے کی ہے کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح اپنی امت کو بھی محمد خدا کی اتنی ہو سکتی ہے کہ کتب متقدمہ میں اس امت کا لقب ہی حمادون ہے۔ یعنی خدا کی بہت تعریف کرنے والی امت۔ صحیح بخاری میں ہے کہ محشر میں جب شفاعت کے لئے آپ تشریف لے جائیں گے تو آپ پر خدا کی حمد و ثنا کا دروازہ کھولا جائے گا جس سے پہلے کسی پر نہیں کھولا گیا تھا۔ یہی وجہ انبیاء کو تعارف ہیں اور ان صفات میں آپ احمد ہیں۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ پہلے آپ احمد تھے پھر محمد ہوئے کیونکہ سب سے پہلے آپ نے خدا کی تعریف کی پھر آپ کے بعد مخلوق نے آپ کی تعریف کی۔ اسی طرح محشر میں سب سے پہلے آپ خدا کی حمد کریں گے جب آپ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا تو پھر اہل محشر آپ کی حمد کریں گے اس لئے آپ پہلے احمد ہیں اور بعد میں محمد یعنی جو بھی پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد اسی وجہ سے کتب سابقہ میں آپ کی بشارت اسم احمد سے دی گئی اور جب عالم وجود میں تشریف لائے تو محمد کے نام سے پکارے گئے۔ (دیکھو فتح الباری) [1]

---

[1] حافظ سہیلی لکھتے ہیں کہ لوگ کلام میں بیشتر مگر رہتے معنی کو واضح کرتے ہیں اس لئے محمد اس کو کہا جائے گا جس کی بار بار تعریف کی جائے اور احمد وہ ہے جو سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں نام واقع کے مطابق ہیں یعنی آپ احمد بھی ہیں اور محمد بھی لیکن پہلے آپ احمد ہیں پھر محمد کیا احمد ہونے کی وجہ سے ہی آپ محمد ہوئے آپ نے پہلے خدا کی تعریف کی اس لئے آپ احمد ہوئے نبوت سے سرفرازی کے بعد مخلوق نے آپ کی تعریف کی اس لئے بعد میں محمد ہوئے محشر میں بھی پہلے آپ خدا کی تعریف کریں گے اس لئے احمد پہلے ہوں گے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

اسلام میں رسول کا تصور

اسلام میں خدا کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب سے جداگانہ اور بالاتر تصور ہے۔ یہاں انسانِ کامل کی آخری سرحد اور لاہوت و جبروت کے ابتدائی تصور میں کوئی نقطہ مشترک نہیں نکلتا۔ ایک انسان اپنی فطرت اور جہد و استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تصور کے قابل بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول و اتحاد، ولادت و قرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنی سے اس کو احد و صمد کہا جاتا ہے۔

دورِ خوبانِ بارگاہِ الست — جز ازیں نیست پردہ اندر کہ ہست

رسول مخلوق ہوتا ہے

اسی لئے اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے کہ خدا اس میں حلول کر سکتا اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ ہیکلِ انسانی میں جلوہ نما ہو۔ رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے جو عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے برابر کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بہ مصداق نا ممکن اور محال ہیں۔ عام مخلوقات کو دیکھئے قدرت نے ان میں ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور حد بندی بنائی ہیں۔ جس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خطِ فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع اپنے ہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے اس عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔

نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے سب کے سب اپنے فلک میں چکر کی گردش کھا رہے ہیں۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنی حد سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے بجز جاہلانہ خوش اعتقادی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ ارتقاء (Evolution) تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی مخلوقات کی کسی کڑی کا عالمِ قدس سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ اسی لئے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنیٰ شائبۂ تشبیہ کے یہ ہے کہ وہ ایک انسانِ کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمت اور علو و قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

حقانیتِ رسول کا ایک پہلو

رسول ایک انسان ہوتا ہے اور یہ انسانوں ہی کی ترقی کے لئے اس کا کمال ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے۔ اس کی جانب سے منصبِ اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اسی لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں عمل کی بھی ضرورت ہے۔ جو شخص نہیں کھا سکتا وہ ایک بھوکے کی بھوک کی تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے ناآشنا ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ ہمدردی کا حق بھی ادا نہیں کر سکتا اور جو فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں کا علاج بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا بعثت

اس تقاضائے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرت انسانی میں موجود ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدیں بھی محفوظ رہتی ہیں جو کہ توحید باری تعالیٰ کا لازمی جزو ہیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے سب رسولوں سے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ خاتم الرسل کا تعارف بھی قرآن کریم نے سب سے افضل اور سب سے بہتر رسول کا تعارف بھی اسی لفظ سے پیش کیا ہے اور یہی لفظ رسول ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔

(۲) وما محمد الا رسول۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے۔

معلوم ہوا کہ یہ لفظ ایسا پر عظمت لفظ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لئے بھی اس سے زیادہ محتاط کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے خطابات کے ہوتے ہوئے جو اکثر استعمال کئے گئے ہیں جیسے مظہر ذات اولی، حقیقۃ المحمدیہ یا روح الکبری۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے کہہ دینے کے بعد قرآن تو چپ ہے لیکن آپ کا صحیح مقام اور اصلیت یہی تھی کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر عربی شخص جو موصوف تھا اس کے لوازم سب کو معلوم تھے اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھے اس کی شخصیت و حیثیت سے سب واقف تھے اور یہ لفظ کسی نام سے بھی انسان ہی پر پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فرق [illegible] کی اور سلطنت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اس لئے جب کوئی رسول بنا کر آتا تو یہی کہہ دیتا کہ میں حکم الٰہی [illegible] ملک الملوک کا ایلچی ہوں۔ رسول جب کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں۔ یہی وہ ایک لفظ ہے جس کے ادا ہوتے ہی سارے مخاطب سمجھ لیتے ہیں محبت و توقیر اطاعت و فرمانبرداری کے وہ جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں جو ایسے رسول کے ساتھ رکھنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدیں بھی نظروں کے سامنے آ جاتی ہیں جو ایک جلیل القدر اور اس کے رسول کے درمیان فاصل ہونی چاہئیں۔ اس لئے محبت و اطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر [illegible] کفر و شرک کی آلودگی سے پاک رہتا

رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے

در حقیقت یہ مسئلہ ایک عجیب مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی تعلیم توحید خداوندی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے ساتھ رسول کی محبت و اطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی بار نبوت و رسالت کے عہدہ کی حقیقت بیان کی صرف ایک [illegible] حل ہے۔ [illegible] اس کی اطاعت و محبت خدا ہی کی محبت و اطاعت ہو جاتی ہے اسی لئے فرمایا

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ — جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہا مانا

یعنی اصل فرمانبرداری تو خدا کی چاہئے ظاہری سطح پر رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی فرمانبرداری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت و محبت کے بغیر خدا کی محبت و اطاعت کا کوئی راستہ ہی نہیں اور اس طرح یہ اطاعت و محبت کتنی ہی پھیلتی چلی جائے مگر اس کا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

رسول وکیل نہیں

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا کہ رسول خدا نہیں اس کا اوتار [illegible] وہ اس کا بیٹا بھی نہیں ہو سکتے مگر وہ اس کا وکیل و نائب بھی نہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت سر انجام دینے کے لئے دو لفظ ہیں (۱) رسول (۲) وکیل۔ ان دونوں کا تعارف وسائل دوسرے کے لئے ہوتا ہے [illegible] مگر ان دونوں میں فرق ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور مستقل ہوتا ہے۔ وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے اسی لئے [illegible] کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچانے

ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ تشریعی تعلق تھا تو اور تبع کا تعلق تھا اس لئے یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت و ریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں۔ قرآن کریم کے لفظ "یا بنی آدم اِمَّا یَأتِیَنَّکُم رُسُلٌ مِّنکُم" میں بھی اسی کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی خود عبادت کر کے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آتے ہیں جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حاکم مقرر ہو کر آتا ہے اگر ہاں یہی ہے جیسی حاصل کی جا سکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب حکومت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت واستعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظر حکومت اگر اسے انتخاب کرنا چاہے تو کرے۔ اسی طرح رسالت و نبوت کی حیثیت ہے یہ ایک منصب اور عہدہ ہے نہ کمالات کے مکمل الحصول یا ترقی کمالات میں کوئی کمال۔ ہاں اس منصب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اس منصب پر موقوف ہیں۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لو کان بعدی نبی لکان عمر یعنی میری امت میں اگر عمر ہوتا تو کمال دیکھا جائے تو عمر میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصب نبوت پر تقرر کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس لئے نبی نہیں ہیں۔ ایسی طرح فرمایا۔

لو عاش ابراهیم لکان	ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے تو
صدیقا نبیا۔	صدیق نبی ہوتے۔

یعنی ان کا جوہر استعداد نبی بننے ہی کے قابل تھا اس لئے وہ نبی ہی نہیں بلکہ صدیق نبی بننے کے لائق تھے مگر یہاں ایک دوسرا قاعدہ آگیا تھا وہ کون ان کی عمر وفا کر سکی۔ امت میں ان دو شخصوں کے متعلق تو صرف لیاقت نبوت سے تعریف آگئی کہ جہاں تک لیاقت و کمال ہے دونوں منصب نبوت کے قابل تھے۔ یہیں سے حضرت ابراہیم کی تو عمر ہی نے وفا نہ کی حضرت عمر کی عمر ہوئی تو تقرر نبوت کا زمانہ ختم ہو گیا ان کے علاوہ خدا تعالیٰ ہی کو معلوم کہ اس امت میں اور کتنے انسان ایسے گزرے ہوں گے جو عملاً نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر قانون تقدیر میں چونکہ دنیا کی ختم کر دیا گیا تھا اس لئے کوئی اس منصب پر فراز نہیں کیا گیا اور دنیا کی تاریخ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سے پہلے شروع ہوا تھا الگ رسولوں کی آمد آمد برقرار رہی تھی اب یہ سلسلہ مکمل ہو چکی کہ دنیا کا آخری رسول آچکا اب اس کے بعد کوئی رسول نہیں ہوگا۔ بہرحال تمام رسولوں کی تاریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت و عبادت کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ بعض لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصب رسالت پر مامور ہو جاتے ہیں

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ ابھی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کا کوئی ذکر فکر بھی نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے بھائی میرے شریک کار ہو جائیں تو شاید فرائض نبوت کی ادائیگی میں میرے لئے سہولت ہو لیکن منصب نبوت چونکہ براہ راست حق تعالیٰ کے انتخاب پر موقوف تھا اس لئے ان کو اسی ایک بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرنی پڑی۔

وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۝ هَارُونَ أَخِي	میرے بھائی کو میرے گھرانے سے میرا وزیر بنا دے اور
اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۝ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي	ان کے ذریعہ میری کمر مضبوط کر اور میرا انھیں شریک کار بنا دے۔

اگر نبوت انسانی ہوتی تو یہاں حضرت موسیٰ کے ان تعریفات کے ایسے اوصاف کا ذکر کرنا مناسب ہوتا جو نبوت کا سبب بن سکتے ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں۔

وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ	میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے اسے میری
مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ	مدد کے لئے میرے ساتھ کر دے وہ میری تصدیق کرے گا

ایمان کی تعریف پر اجمالی نظر

کامل ایمان کی تعریف

شریعت میں ایمان و اسلام صفت انقیاد و اطاعت کی اس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد دوسرا الٰہیات و شرعیات کے قبول کرنے میں قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبر صادق پر وہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ پھولوں کی تمام خوشنمائی اور رنگ کا کل سرمایہ اس کی تصدیق میں مختصر نظر آنے لگے۔ گویا یہ جذبہ وفاداری طلب دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ بالحق یہی ہیجز قربانی ایک نئی لذت ہو اور ایک ادنیٰ تزلزل وہ تلخ گھونٹ ہو جائے جو کسی طرح گوارا نہ ہو۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ)

(وہ کتاب) راہ بتلانے والی ہے ان پرہیزگاروں کو جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا۔

ایمان بالغیب ایمان کی سب سے اونچی صفت ہے

اس آیت میں ان ہی سرفروشوں کی اس منزل کا ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ وہ جماعت ہے جو محض جذبۂ اعتماد میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کر چکی ہے۔ آنکھ اگر دیکھتی اور تصدیق کرتی ہے، کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں تو یہ ان کا فطری اقتضاء ہو سکتا ہے لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتیں، کان اگر نہیں سنتے صرف آنکھوں اور کانوں کے اعتماد پر کسی کی صداقت پر سارا جان و قربان اعتماد کر لیتے ہیں تو بلاشبہ یہ ان کے ایثار و انقیاد کی آخری دلیل ہوگی۔ یہی وثوق اور اعتماد ایمان کی روح ہے۔

دلائل کی روشنی بھی کوئی روشنی ہے جو ایک قدم پر چمکتی ہے تو دوسرے ہی قدم پر گل ہو جاتی ہے۔

دلائل کی حیثیت اساس کا تعلق

اگر نبی صاحب وحی ہے اور جو کہتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کہتا ہے تو اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا ایک اقتضاء طبعی ہونا چاہیے۔ کسی حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد بھی دلائل کی تلاش درحقیقت کمال نہیں بلکہ ایک مختصر راہ کو دور دراز کر دینا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد دعوت مناظرہ کے بجائے شروع سے عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مدار صرف دلائل پر ہو تو دلائل کبھی کبھی پھر دو طرفہ پیدا ہو جاتے ہیں یا سرے سے مطالب کی نزاکت کبھی دلائل کی رسائی سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر مزاج کا تفاوت ہے اور فہم کا اختلاف اس پر وہم انسانی کی ہزیمت۔ یہ سب وہ موانع ہیں جو اگر نفس تصدیق کے لیے نہیں مگر کم از کم عمل کے لیے تو یقیناً سد راہ بن جاتے ہیں اسی لیے قرآن کریم نے صرف اطاعت و انقیاد ہی کی ایک راہ بتلائی ہے۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا — جو کچھ رسول تمہارے پاس بھیج کر لائے اس کو اختیار کرلو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دلائل کا وسیع دائرہ بھی بہرحال جو کر آخر اسی صفت اعتبار پر ختم ہو جاتا ہے ورنہ ایک مقصد کے حصول کے لئے مقدمات کی اتنی بے شمار کڑیاں ہوں گی کہ اگر سب کو طے کرنا ضروری سمجھا جائے تو پھر تمام عمر میں ایک مقصد کا حصول بھی خواب و خیال سمجھ لینا چاہئے۔ بر بنائے انصاف ایک تجربہ کار محقق کا قول خود اپنی جگہ دلیل ہوتی ہے جو تنہا ہزار دلائل کا وزن لئے اندر رکھتی ہے۔ آج بھی ہم اپنے دلائل و براہین کا سلسلہ آخر میں بڑے بڑے فلاسفروں کی تصدیقات پر جاکر ختم کر دیتے ہیں اور صرف ان کے اسماء کا حوالہ دے دینا دلائل کی وہ معراج تصور کرتے ہیں جس کے بعد تمام دلائل سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ تصدیقات بے دلیل مسلم ہونے کے قابل ہیں بلکہ اس کی تہ میں وہ علم یقین پہلے حاصل ہوتا ہے کہ یہ تصدیقات ان فلاسفروں کے نزدیک چونکہ اپنے دلائل سے ثابت شدہ ہیں لہٰذا ان دلائل کا تلاش کرنا اور دہرانا ایک مسافت کا طول کرنا ہو جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علوم کا مرتبہ

ٹھیک اسی پر علوم انبیاء کو قیاس کر لینا چاہئے۔ اگرچہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ان کے علوم بھی اپنی جگہ ایسے دلائل سے ثابت شدہ ہوتے ہیں جہاں باطل کو کہیں سے راہ نہیں ملتی بلکہ وہ علم یقین کے اس مقام پر پہنچے ہیں جس کے بعد ان کا انتساب برہان تسلیم ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا — اے لوگو پہنچ چکی ہے تمہارے پاس ایک سند تمہارے رب کی طرف سے اور بھیجی تم پر روشنی واضح۔

نبوت کا کمال تقلید بھی تسلیم ہے

اس لئے انبیاء علیہم السلام کے علوم ان کے اعتماد پر تسلیم کر لینا کورانہ تقلید نہیں بلکہ مجسم ایک برہان اور حجت کی تقلید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمان کی تمام قیمت صرف یہ لاتا ہے کہ وہ رسول وقت کے سامنے اپنی ساری لن ترانیاں ختم کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی ایک زبردست قربانی ہے جسے وہ اپنے ضعیف و ناتواں ہاتھوں سے اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ انسان کی بے صبر فطرت اپنی جیسی مخلوق کو ایسے مقام پر کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی جہاں بے دلیل سرنگوں ہو جانا تمام انسانوں کے لئے وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو جائے (یعنی رسول) وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اسی کی اطاعت بلا شرکت غیر تصور کر سکتا ہے۔ اسی لئے مشرکین عرب میں بھی تمام جہالتوں کے باوجود ایک جماعت خدا پرست تھی اور بڑے ہم خود توحید کا اقرار کرتی تھی۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ — اور جب کہا جاتا ان سے کہ سوائے اللہ کے کوئی الٰہ

جام ہی کی کیفیت و راحت کا احساس باقی تھا ۔

ازاں افیوں کہ ساقی کردہ در مست   حریفاں را نہ سر ماند نہ دستار

ایمان میں اسی منزل کا اسم مقام یقین ہے دیکھو حجۃ اللہ صفحہ ۹۶ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عقل انسانی جب نشہ یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالم غیب پر ان کو محسوسات کی طرح یقین نصیب ہوتا ہے، فقر و فاقہ، خوف و موت کے خرخشہ سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے اب سب کے قید و بند سے رستگاری میسر آجاتی ہے۔

ایمان مذہب کی روح اور بنیاد ہے

یہی وہ ایمان جس پر مذہب کی تمام بنیاد قائم ہے کوئی عقیدہ لے لیجئے وہ اس میں خواہ کتنی ہی نزاہت اور حقیقت کیوں نہ رکھتا ہو مگر اس روح ایمانی کے بغیر نظر شریعت میں وہ صرف ایک ظلمکدہ اور سرتاسر تاریکی ہے۔ کوئی عمل عبادات و ریاضات کے خواہ کتنے ہی مرحلے کیوں نہ طے کر چکا ہو مگر بدون اس روح ایمانی کے ایک تن مردہ اور میزان آخرت میں قطعاً بے وزن ہے۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (پس ہم ان کے لئے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے) عقائد و اعمال کا تو ذکر کیا ہے کوئی معمولی سی معمولی نیت بھی خواہ کتنی ہی صاف و ستھری کیوں نہ ہو اس سرمایہ ایمان کے بغیر بارگاہ بے نیاز میں کوئی اعتبار نہیں رکھتی۔ یہ ایمان عقائد و اعمال و نیتوں کی وہ روح ہے جس کے بعد کفر کی گھٹا ٹوپ تاریکیاں چشم زدن میں کافور ہو سکتی ہیں۔ آتش کدۂ جہنم اس کے وجود سے سرد ہو سکتا ہے اور گلزار عدن اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ اور ضمنی نتیجہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی سجدہ طاعات صد سالہ کے لئے مایۂ رشک اور مٹھی بھر جو کا صدقہ بے شمار تضاعیف زیادہ خدا کا مستحق تقرب بننے لگتا ہے۔ غرض سعادت ابدیہ اسی مبداء کی خیر ہے اور شقاوت ازلیہ اس سے محرومی کا نشان ہے۔ یہ سب کچھ اس کی کتاب میں موجود ہے جو غلط گوئی کی بالکل منزہ اور مبالغہ آمیزی سے یکسر بری ہے۔

ایمان کی تعریف پہ تفصیلی نظر

اشیاء کے وجود کی تین صورتیں

کسی چیز کے وجود کی عالم میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) عینی۔
ان ہر سہ اصناف میں لفظی وجود سب سے ضعیف اور کمزور وجود ہے۔ جو مقاصد و اغراض کسی شے کے
وجود میں محفوظ ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس وجود پر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر اس وجود کو عدم کے
برابر کہہ دیا جائے تو بیجا نہیں ہے۔ پانی کا لفظی وجود کسی تشنہ کی پیاس نہیں بجھاتا اور نہ روٹی کا صرف
زبانی تذکرہ کسی بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے۔

وجود لفظی ایک ناتمام وجود ہے

(۲) وجود ذہنی گو لفظی وجود سے قوی تر ہے مگر شے کے تمام آثار و احکام مرتب ہونے کے لئے یہ بھی
ناکافی ہے۔

وجود ذہنی لفظی سے قوی ہے

(۳) وجود عینی وہ وجود ہے جو خارج میں کسی کے اعتبار کے بغیر موجود ہوتا ہے اسی وجود کو درحقیقت
وجود کہا جا سکتا ہے بقیہ اصناف اس کے توابع اور فروع ہیں۔ یہی ہے جو آثار ہے اور اسی پر شے کے
سب احکام مرتب ہوتے ہیں آنکھوں کی تروتازگی قلب و جگر کی سیرابی اشجار و ثمار کی سرسبزی یہ سب
پانی کے وجود عینی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی لئے جب کوئی پیاسا پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد
پانی کا یہی عینی وجود سمجھا جاتا ہے اور اس کا لفظی یا ذہنی وجود کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتا۔

کسی چیز کا وجود عینی ہی اس کا اصل وجود ہوتا ہے

اسی طرح ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) عینی۔
سابق تمہید کی بنا پر ان کا لفظی وجود بیکار معلوم ہوتا ہے۔ جب کسی تشنہ کے لئے پانی کا صرف
لفظی وجود کارآمد نہیں ہوتا تو اب پیغمبر اسلام کی دعوت کے جواب میں ایمان کا صرف لفظی وجود کیا مفید
ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ عالم بشریت کی سرتا سر جناب اس کی اجازت
نہیں دیتی کہ وہ اپنے ذہنی تصور کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا کر سکے۔ اس کی تعبیر ترجمانی کا
بھی ایک ناتمام آلہ ہے، گر وہ بھی ناقابل اعتبار ٹھہرے تو عالم انسانی کا تمام کاروبار معطل اور بیکار محض
ہو جائے۔ اس لئے مجبوراً ایمان کا لفظی وجود بھی شریعت میں ایک حد تک قابل اعتبار کیا گیا ہے۔

[illegible] اس حتیٰ یقروا   [illegible] لا الٰہ الا اللہ
[illegible]   [illegible]

اب جائے ایمان کی رفعت اور بلندی دیکھئے یا اس کی تہا جی سے تعبیر کیجئے کہ محض زبانی کلمہ توحید پر اس نے نجات بخشی کا اعلان کر دیا ہے اور کسی کے سرائر اور مکنونات صدور کے راز سے کوئی بحث نہیں کی اس جگہ یہ دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ اسلام میں تصدیق قلبی کے بغیر صرف زبانی اقرار کر لینا ہی کوئی وزن رکھتا ہے کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی کسی حالت میں قطع نظر کے قابل نہیں سمجھا گیا حتیٰ کہ بحالت اکراہ جبکہ اپنی جان پر بن رہی ہو زبان سے کلمہ کفر ادا کرنے کی صرف اسی شرط سے اجازت دی گئی ہے کہ قلب کی گہرائیاں ایمان و ایقان سے لبریز اور مطمئن ہیں۔

إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ - مگر جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار رہے۔

جو صورت حدیث میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ اگر زبان اقرار کر لیتی ہے اور دوسری کوئی دلیل جو قلبی انحراف پر دلالت کر سکے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی تو اس وقت ہم اس بات کے مامور ہیں کہ اس اقرار ہی کو قلبی تصدیق کی دلیل سمجھیں۔

اسلام جو اخلاق عالیہ کا سب سے اول معلم ہے کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان کو بلا وجہ جھوٹا قرار دے یا اس کے متعلق کسی نامعقول کمزوری کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف برے کا تصور لائے۔ دنیا میں بڑے سے بڑا انسان خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام تک نہ پہنچ چکا ہو کبھی اپنے حریف پر وہ بھی بحالت جنگ اعتماد کا خیال نہیں کر سکتا۔ یہ اسلام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کرو اور اس تفتیش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، اگر ان میں کوئی سچا مدعی ہو گا تو ایک دن وہ خود بخود ابھرے گا اس صدق نا کذب پر نادم ہو کر سچے دلوں کی زبان کی طرح اسلام کا کلمہ پڑھنے پر مجبور ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ میدان جنگ میں ایک غنیق دشمن کی نگاہات میں اتنا بڑا ہی مال ہے۔ صحابہؓ نے دوڑ کر چاہا کہ اس کی بکریاں چھین لیں۔ اس نے اپنا انجام قریب دیکھا اور وہ وقت آ گیا کہ وہ اسلام جو مدت سے اس کے سینہ میں گھوم رہا تھا اب دل میں اتر آئے وہ اسلام لے آیا۔ مگر اس عمل میں دشمن کا اقرار وفاداری انسان کی کمزور فطرت کب قبول کرتی۔ اس لئے صحابہ کرامؓ نے اس

لہ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی مخفی چیز پر ہو جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے مگر منافقین کے دلوں کے علم پر اس کا فیصلہ موقوف ہوتا تو منافقین گروہ کفار میں شمار ہو کر جب ان کو قتل کیا جاتا تو ان میں حق بجانب سمجھا جاتا یہ الزام ہونے کا موقعہ ہاتھ آ جاتا کہ آپ اپنے اصحاب و رفقاء کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لئے کلمہ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام قبول کرنے کا معیار ٹھہرا دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و اختتام کا دار و مدار رکھا گیا

(کتاب الایمان ص ۱۴۳)

اسلام کو صرف مال کے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھا اور اس کی بکریاں غنیمت کا مال بنالی گئیں۔ لیکن اسلام جو اخلاق کے کانٹوں منازل صرف زبانی سکھانے نہیں آیا تھا بلکہ طے کرانے آیا تھا اس کمزوری کو کب برداشت کرتا۔ اس واقعہ کی بابت مسلموں کی بڑی سرزنش کی گئی کہ وحی الٰہی کو دخل دینا پڑا اور نہایت تنبیہ آمیز لہجہ میں ارشاد ہوا۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ — اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو
مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا — مسلمان نہیں، تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا۔

کتب احادیث میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں جہاں نہ صرف اسلام کے لفظی وجود ہی کو صرف اقرار باللسان کو ذمہ داری احکام کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔

حضرت مقداد فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ اگر دوران جنگ میں دشمن میرا ایک بازو کاٹ دے اور جب میں اس پر حملہ کرنے لگوں تو وہ جان بچا کر درخت کی آڑ میں آجائے اور کلمہ شہادت پڑھ لے تو کیا میں اس کے اس جرم ناروا کے بعد بھی اس کا یہ مبہم اسلام قبول کر لوں۔ ارشاد ہوا ضرور۔ اور اگر اس کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر دیا تو یاد رکھنا تم اب اسی طرح مباح الدم سمجھے جاؤ گے جیسا وہ اپنے اسلام لانے سے قبل مباح الدم تھا (مسلم شریف)

دیکھو! یہاں بھی انسان کی کمزور فطرت کس طرح اپنے حریف کا اسلام مبہم کہہ کر ٹالنا چاہتی ہے کہ اس کے انتقام میں یہ لفظی اسلام حائل نہ ہونے پائے مگر یہ اسلام ہے جو اپنے متبعوں کے جذبات انتقام دشمنوں کی ایک زبان پر نثار کر دیتا ہے۔ انتقام گو فطری حق ہی سہی مگر اسلام اس نازک ماحول میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ایک کلمہ حق کے احترام میں وہ اپنے فطری اور ذاتی حق سے بھی دست بردار ہو سکتا ہے۔

احادیث میں کچھ واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دشمنوں کی جان و مال کا تحفظ اور ان کی عزت و احترام کا استحقاق کچھ خاص اس کلمہ کے ادا کرنے ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ صرف اقرار و فرمانبرداری کی ضرورت ہے خواہ کسی زبان سے ہو اور کسی شکل سے۔

حضرت خالد نے مسافروں کا ایک دستہ لیے ہوئے مصروف پیکار تھے۔ دشمن چاہتا تھا کہ اسلام قبول کرلے مگر نا واقفی اور جہالت کی وجہ سے اسلمنا (ہم نے اسلام قبول کیا) کا لفظ نہ کہہ سکا اور اس کے بجائے صبأنا صبأنا کی صدا بلند کرنے لگا (جو لفظاً اس زبان میں بددین ہونے کے معنی میں مستعمل ہے) اسی کمزوری فطرت کی وجہ سے یہاں بھی یہ تک کہ اسلام قبول نہ ہوا اور آخر اسی حالت میں سب کو موت کا جام پی لینا پڑا۔ رحمۃ للعالمین کو جب اطلاع ملی تو آپ بے حد مضطرب ہوئے اور اسی اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھ اس قصور سے

آسمان کی طرف اٹھ گئے کہ یا خدا ابو طالب کا فرزند مظلوموں کا انتقام لینے کے لئے کھڑا ہو جائے اور یہی بات ہم شامل سمجھا جائے اس لئے فرمایا! اسے پہرہ دو کہ اس کے ذریعہ فائدے سے محروم ہیں اس سے بڑے ہوں۔[1]

ختم بالایمان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ نفلی وجود کو ضعیف تر لیکن مراد عدم ہے پھر اسلام نے اس کا کیوں اعتبار کر لیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقرار سے مراد بیان دلی۔ اقرار ہے جیسے ضمیر کی صحیح آواز کہا جائے ورنہ لسانی اقرار ہی نہ کہا جائے گا۔ بلکہ صرف انکار کی صرف ایک اقرار نما صورت ہو گی۔ اسلام کے اس نفلی وجود کو فقہا کی اصطلاح میں اقرار باللسان کہا جاتا ہے۔

اقرار باللسان فقہاء کو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا رکھنی چاہئے، ایک جماعت رکن کی حیثیت تجویز کرتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک نوع کی تصدیق ہی کا نام ہے فرق ہے تو یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے اور اقرار زبان کی تصدیق ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن اور دوسری شرط قرار دی جائے۔ علاوہ بات یہ ہے کہ تصدیق قلبی رکن اصلی ہے یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اقرار رکن زائد یعنی بعض صورتوں میں یہاں خاص چشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے جب کہ اکراہ میں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی، شیخ ابو الحسن اشعری، امام مسلم کا میلان بظاہر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوت اسلام سے قبل ہی احکام اسلام کا نافذ کرنا تو غیر معقول ہے اور باطنی اقرار کے بغیر ہمارے پاس اسلام پر کوئی شہادت نہیں ہے اس لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ نفاذ احکام اسلامیہ کے لئے اقرار باللسان کو شرط کیا جائے۔

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر اس اقرار کا صرف یہ مقصد ہے تو زبانی اقرار کافی نہ ہونا چاہئے بلکہ کم از کم مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہئے تاکہ اجرائے احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ اس بحث میں فریقین کا اتفاق ہے کہ مطالبہ کے بعد زبان سے اقرار کرنا بہرکیف ضروری ہے کیونکہ اب اقرار نہ کرنے کے معنی گویا انکار کرنا ہی ہے جو کفر عناد کہلاتا ہے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ (نمل) — ان کا انکار کیا ان آیات کا حالانکہ اپنے دلوں میں ان کا یقین کر چکے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کبھی دل اندر سے یقین کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے مگر زبان پھر انکار سے باز نہیں آتی اس کا نام اصطلاح میں کفر عناد ہے۔ حضرت استاذ قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ شاید فقہاء نے ایمان کی تعریف میں اسی لئے اقرار کا اضافہ کر دیا ہے کہ جو تصدیق قلبی زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف

[1] بخاری شریف

ایمان کا وجود ذہنی

تصدیق قلبی کو ایمان کا وجود ذہنی کہا جاتا ہے۔ تصدیق مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے (۱) کبھی دلائل و براہین کا قاہرانہ تسلط یقین کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے (۲) کبھی انسان از خود دلائل و براہین کا مدبرانہ جائزہ لے کر علم یقین تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ (۳) کبھی مبادی و وسائل و اسباب بلا واسطہ یقین میسر آ جاتا ہے۔ (۴) کبھی نہ دلائل کا شعور ہوتا ہے نہ دلیل کا فطری احساس صرف تقلید کے طور پر ایک اذعان پیدا ہو جاتا ہے۔ (۵) کبھی شرح صدر حجاب غفلت اٹھا دیتی ہے اور صداقت اسلام کا عکس پڑنے لگتا ہے (۶) کبھی جان آپ کی حفاظت کی طمع قلب کو تصدیق کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔

ان سب صورتوں میں گو اختیاری یا اضطراری طور پر تصدیق تو حاصل ہو جاتی ہے مگر ایمان کا وجود ذہنی اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک کہ غضب اقرار و طاعت اور عہد فرمانبرداری نہ کرے اسی کا نام التزام باطن ہے یہ علم نہیں ایک عمل قلب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی التزام پر ایمان کا مفہوم مرتب ہے اسی کو عقد قلبی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فقہاء کی عبارات میں یہ مذکور ہے کہ تصدیق سے اسی خاص نوع کا ارادہ کیا جائے یا اقرار سے مراد التزام طاعت لیا جائے ورنہ تصدیق و اقرار کے دو لفظ بھی ایمان کا پورا مفہوم شرعی ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الایمان میں اس جز پر بہت زور دیا ہے۔ عام طور پر ایمان کی اصطلاحات و تعریفوں میں کھٹک رہ جاتی ہے اور بہت سے قلم جواب کے لئے جنبش کرتے نظر آتے ہیں مگر تشفی بخش جواب صرف حافظ ابن تیمیہ کا ہے۔

انسان ایک ضعیف مخلوق ہے مگر کبھی ایسی جسارت کر لیتا ہے کہ تصدیق اس کو حاصل ہوتی ہے مگر اقرار پھر بھی نہیں کرتا اور کبھی اس سے بڑھ کر غضب ڈھاتا ہے کہ دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار بھی کر لیتا ہے مگر اس کو اپنا عقیدہ بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۔ انسان مارا جائے کس قدر ناشکرا ہے۔

ہرقل جیسے عالم کتب سابقہ کی تصدیق کا حال اس کے اور ابوسفیان کے مکالمہ سے ظاہر ہے اہل کتاب کی عام صورت معرفت کا تذکرہ قرآن کریم نے بڑے پر زور الفاظ میں کیا ہے۔

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۔ اس رسول کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو

مگر با ایں ہمہ ان کے کفر میں کسی کو مجال شبہ نہیں ہے ..... ابوطالب کی داستان جان نثاری کتب سیر کے صفحات میں جلی نظر آتے ہیں مگر یہاں بھی جمہور محققین ان کے کفر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔[1]

---

[1] بعض اہل نظر کا یہ خیال ہے کہ جیسی تعبیر جان نثاری جناب ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر فرمائی تھی وہ یقیناً کبھی خالی از تعجب نہیں ہو سکتی اس لئے ان کا رجحان ان کے اسلام کی طرف ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمایئے)

معلوم ہوگیا کہ شرعی تصدیق ہی کا نام ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے جو الفاظ خود شارع علیہ السلام کے بیان اور مسلسل استعمالات سے کسی معنی کے لئے متعین ہو چکے ہیں بس وہی اس کے صحیح معنی ہوں گے۔ لغت میں عموم یا خصوص اس کے معنی پر کچھ اثر انداز نہ ہوگا۔ ایک متکلم جب بار بار کے استعمال سے ایک لفظ کے معنی خود متعین کر دیتا ہے تو پھر کسی کو حق نہیں رہتا کہ لغت کی امکانات یا دیگر توجیہات سے اس کے کلام میں کوئی دوسرے معنی مراد لے۔ مثلاً یہی ایمان کا لفظ لے لیجئے۔ گو یہ لفظ تصدیق کے لئے موضوع ہے مگر شارع علیہ السلام نے اس لفظ کو جب استعمال کیا ہے تو ایک خاص نوع کی تصدیق کے لئے ہی استعمال کیا ہے اس لئے اب احادیث میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد لی جائے گی جو اس کے تکرر سے کثیر بیانات سے متعین ہو چکی ہے۔ فرض کرو ایک شخص دربار نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور تصدیق کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں نہ آپ کے احکام بجا لاؤں گا نہ جن چیزوں سے آپ منع فرمائیں گے باز رہوں گا نہ فرائض ادا کروں گا ہاں شراب پیوں گا چوری زنا نکاح محارم کروں گا غرض ہر وہ کام جو گناہ ہے وہ سب کچھ کروں گا۔ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ محض لغوی تصدیق کے بعد رسول خدا اس کے لئے ایمان کا پروانہ تحریر فرما دیں گے، اس کی شفاعت کا وعدہ فرمائیں گے، جہنم سے نجات ابدی کی بشارت سنا دیں گے یا یہی جواب دیں گے کہ تو صرف کافر نہیں بلکہ بدترین کافر ہے تیرا یہ ایمان ایمان نہیں استہزاء ہے یہ تصدیق نہیں بلکہ تکذیب کا بدترین مظاہرہ ہے اور اگر یہ بھی ایمان ہے تو پھر ابلیس کے ایمان میں کیا کسر تھی جس نے صرف ایک ہی سجدہ کا تو انکار کیا تھا پھر قرآن نے کیوں اس کو کافروں میں شمار کر لیا ہے۔ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔

حضرت استاذؒ فرماتے تھے کہ ایمان کا ترجمہ جاننا یا یقین کرنا یا تصدیق کرنا اچھا نہیں ہے۔ ان تراجم سے ایمان کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی بلکہ صحیح ترجمہ ماننا ہے جس سے التزام طاعت کا مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں　　کہنا نہیں مانتے کسی کا

ناظرین حضرات کو حضرت استاذ کا یہ ترجمہ ہماری اس ساری تفصیل سے بے نیاز کر سکتا ہے۔

یہ ہے ایمان کا وجود ذہنی یہی ایمان کا جزو اشرف ہے۔ نجات ابدی اسی پر موقوف ہے اور آخرت کی ساری خوشیاں اسی کی ثمرات و برکات ہیں۔

۱؎ کتاب الایمان ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ تصدیق و معرفت حاصل ہونے کے بعد انکار کیونکر ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے
کہ ایک انسان تحصیل انسانیت سے پہلے انسان نہیں بنتا وہ ہمیشہ خصائل بہیمہ کا محکوم بنا رہتا ہے اس کے
علوم و معارف میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فطری و خلقی جذبات کو شکست دے سکے۔ دیکھا جاتا ہے
کہ اس کی رحمت ابدی صرف ایک انبیاء کی اتباعت میں منحصر ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایمان
لاابالیت سے علائق و مرغوبات کا ترک کر دینا اور بہت سے مکروہات میں اپنی جان کو مبتلا کر دینا ہے اس لئے
محبوبان کی لذت سے ناآشنا اپنے ہاتھوں بچا ہوا رہے آزادی کی ترنگ میں کبھی اتراتا اور کبھی لرزتا ہے۔
ابلیس کے علم و تصدیق کا حال تو مشہور ہی ہے۔ فرعون کی تصدیق کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی سن لو

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰؤُلَاءِ اِلَّا — آپ جان چکے ہیں کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ (بنی اسرائیل) — کے مالک نے سمجھانے کے واسطے۔

معلوم ہوا کہ فرعون جیسا شقی بھی ان عجیب آیات کے منشاء کا صحیح علم رکھتا تھا مگر اس کے بعد بھی جو کفر اس نے
کیا ہے کیا دنیا میں ضرب المثل نہیں؟ کیا اس کی وجہ بے علمی تھی؟ دیکھا جاتا ہے اس کا علاوہ سرکشی کا جنون۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ — فرعون ملک میں بڑائی کر رہا تھا اور وہاں کے لوگوں کو
اَهْلَهَا شِيَعًا۔ (قصص) — پارٹیاں بنا رکھا تھا۔
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (النازعات) — فرعون کی طرف جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔

اکثر کفار اسی طغیان کے شکار تھے اور یہی وجہ ہے کہ جو کچھ بھی انھوں نے نبی وقت کے بالمقابل کبھی کی کوئی
اس میں ایک حرف بھی ایسا پیش نہیں کیا جس کو ایک صحیح الدماغ انسان ایک منٹ کے لئے نبوت میں
کا دخل سمجھ سکتا ہو صرف اپنے حسد و بغض کا مظاہرہ کیا ہے اور یہیں معلوم ہوا کہ نبی جگہ ان کی تجویزوں میں کفار
کو کوئی شبہ تھا جو کبھی ایک دلیل تو ایسی بیان کرتے جو ان کی کفر اختیار کی کچھ تو وجہ بن سکتی۔ آیات ذیل کا
بغور ملاحظہ کرو اور فیصلہ کرو۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے۔

اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ۔ — کیا ہم تیری نبوت پر ایمان لائیں حالانکہ تیری پیروی تو ذلیل لوگوں نے کی؟

کیا اتباع اراذل بھی صدق نبی کے منافی ہے یا کذب نبی کی کوئی دلیل بن سکتی ہے ہرگز نہیں۔ بات یہ
تھی کہ متکبر اور مغرور انسان کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ ایک مکرم و ذلیل انسان کو اپنے برابر یا اپنے نفس کو اس
کے برابر بیٹھا دیکھ سکے اور یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اسلام میں سب کا ایک ہی فاسد عقیدہ برگزیدہ نہیں کر سکتا۔
اس فرق کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ مشرکین عرب نے بھی سرور کائنات کے سامنے یہ درخواست
پیش کی کہ سعد بن ابی وقاص، ابن مسعود، خباب بن الارت، عمار بن یاسر، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے

اور غرباء کو اپنی مجلس سے نکال دیجئے تاکہ ہمارے آنے جانے کی جگہ ہو جائے۔ اس پر قرآن کریم نے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ	اور مت دور کیجئے ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و
وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ	شام، چاہتے ہیں اس کی رضا، آپ پر ان کے حساب میں سے کچھ
حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم	بھی نہیں آپ کے حساب میں سے ان پر کچھ ہے کہ آپ ان کو دور کرنے
مِّن شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ	لگیں تو بے انصافوں میں ہو جائیں اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے
وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِّيَقُولُوا	بعض لوگوں کو بعض سے تاکہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے
أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا	فضل کیا ہم سب میں، کیا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو خوب
أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ (انعام)	جاننے والا نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا متکبرانہ جواب۔

أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا	کیا ہم ایمان لائیں اپنے دو آدمیوں پر جو ہم جیسے ہیں
لَنَا عَابِدُونَ (المومنون)	اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے
أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ	کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے بیچ لڑکا سا اور رہا تو ہم
عُمُرِكَ سِنِينَ. وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ	میں اپنی عمر میں سے کئی برس
وَأَنتَ مِنَ الْكَافِرِينَ - (شعراء)	

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی تمسخرانہ تقریر۔

أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا	کیا تجھے تیری نماز اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کی
يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا	عبادت ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا
مَا نَشَاءُ.	کرتے تھے یا اپنے مالوں میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

مشرکین عرب کا ایک لغو اعتراض۔

لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ	یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ
مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (زخرف)	اتارا گیا۔

ان بیانات کو پڑھ کر کیا آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کفار کو ان انبیاء کے متعلق کوئی شبہ درپیش تھا کیا ان بیانات میں ان کے صدق و کذب پر کوئی بحث ہے یا محض بے جا حسد و بغض کی ترجمانی ہے۔

مشرکین عرب کا ایک بے معنی عقیدہ۔

حضرت مجاہدؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت مسلمانوں کو شریعت کے ہر ہر جزو پر التزام طاعت کی دعوت دیتی ہے، خواہ وہ فرائض ہوں یا مستحبات، واجب علی الکفایہ ہوں یا علی الاعیان، اگر اسلام کے فرائض علی الاعیان ہیں تو اعتقادِ فرضیت کے ساتھ ہر ہر شخص پر اس کا ادا کرنا بھی فرض ہوگا اور اگر واجب علی الکفایہ ہیں تو اس کے وجوب کا اعتقاد ضروری ہوگا اور اگر مستحبات ہیں تو اس کے استحباب کا اعتقاد لازم ہوگا۔ غرضیکہ جس چیز کا دینِ محمدی میں داخل ہونا بداہتہً معلوم ہو چکا ہے وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں اور کیوں نہ ہوں کیا ایمان رسولِ خدا کی مطلق فرمانبرداری کا نام نہیں؟ کیا التزامِ طاعت میں بھی کوئی تفصیل ہے؟ اگر رسولؐ کا فرمان اس لئے واجب العمل ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغمبر ہے جو کہتا ہے وحی ہی کہتا ہے تو پھر انقیاد و تسلیم کا دائرہ اس کے سب اوامر و نواہی پر کیوں محیط نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانۂ رسالت میں چونکہ وسائط نہ تھے، ہر بات براہِ راست سنی جاتی اور دریافت کی جاتی تھی اور اگر وسائط تھے بھی تو بھی اس کی تحقیق بلا واسطہ ممکن تھی اس لئے التزام طاعت بلا استثناء لازم تھا لیکن بعد میں سند کا طویل سلسلہ حائل ہو گیا، جرح و تعدیل کے بے شمار مباحث نے احادیث میں ضعیف و قوی کی تقسیم پیدا کر دی اس لئے اب یہ بحث قائم ہو گئی کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کیا چیزیں ایمانیات میں داخل نہیں۔ جواب اب بھی وہی ہے یعنی جو فرمانِ رسول ہے اس سب کا ماننا فرض ہے مگر اب اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ بات درحقیقت رسولِ خدا کی فرمودہ بھی ہے؟ اس لئے علماء نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جس چیز کا دینِ محمدی میں ہونا اتنا روشن ہو جائے کہ محتاجِ دلیل نہ رہے ان سب کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ اسی کو ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے۔ مثلاً فرائضِ خمسہ، زکوٰۃ، حج، روزہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا، آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہونا، عذابِ قبر، قیامت، قرآن کریم وغیرہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے ثبوت میں دلائل کی حاجت نہیں بلکہ کفار بھی ان چیزوں کا دین میں داخل ہونا جانتے ہیں اس لئے اس کا انکار اسی طرح کفر ہوگا جیسا کہ توحید یا رسالت کا۔

ایمان اور ایمانیات سے مراد کیا تعریف	چونکہ علماء نے ایمان کی تعریف میں عموماً تصدیق کا ہی تذکرہ کیا ہے اس لئے عام طور پر ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ایمان گویا تصدیق کے مرادف ہے

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن و سنت میں جہاں جہاں یہ لفظ مستعمل تھا اس کی تشریح کے لئے بس تصدیق کا لفظ کافی سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ ان ہر دو لفظوں میں بہت بڑا فرق ہے اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو ان احادیث و آیات کی اصل مراد کبھی واضح نہیں ہو سکتی۔ حافظ ابن تیمیہؒ کا خدا بھلا کرے جنھوں نے اس موقع کا فرق کر بیان فرما کر ان بے شمار آیات و احادیث کے معانی سے حجابِ غفلت اٹھا دیا ہے اور

ان کی صحیح مرادیں ہمارے سامنے واضح کر دی ہیں۔ ضروری ہے کہ پورے اعتناء کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لئے امانت و اعتماد کے معنی اس میں ہمیشہ ملحوظ رہتے ہیں۔ لفظ تصدیق کے معنی میں چونکہ یہ خصوصیت نہیں ہے اس لئے ہر خبر میں خواہ وہاں مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو تصدیق کا لفظ یکساں مستعمل ہو سکتا ہے، ایمان کے معنیٰ بھی گو تصدیق کے ہیں مگر اس کا استعمال صرف ان خبروں تک محدود رہے گا جو اپنی چشم دید نہ ہوں بلکہ عدم موجودگی کی ہوں کیونکہ یہاں اگر تصدیق کی جائے گی تو وہ صرف مخبر کی امانت و دیانت اس کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کی جائے گی۔ اسی لئے اگر ایک شخص طلوع آفتاب یا زوئیت آسمان کی خبر دیتا ہو تو اس کے جواب میں "آمنت" نہیں کہہ سکتے۔ یا دو شخص اگر ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو لغتاً ایک دوسرے کی تصدیق کے لئے "صدق لسانہ له" کہا جاتا ہے "امن له" نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں تصدیق کے لئے دوسرے پر اعتماد و وثوق کی کیا ضرورت ہے، یہ خود اپنے مشاہدہ کی خبر ہے۔ اس لئے یہاں ایمان کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں۔

اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپس آ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں جب اپنے بھائی کے قتل کا غلط افسانہ عرض کیا تو "وما انت بمؤمن لنا" کہا "وما انت بمصدق لنا" نہیں کہا۔ چونکہ یہ واقعہ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی عدم موجودگی میں تیار کیا گیا تھا اس لئے اگر وہ اس کی تصدیق کر سکتے تو صرف ان کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کر سکتے تھے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر چونکہ ان کو اعتماد نہیں تھا اس لئے اس بے اطمینانی و بے اعتمادی کے موقع پر "وما انت بمؤمن لنا" سے زیادہ خوبصورت لفظ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ہمارے بیان کی تصدیق ہو تو کیونکر خود آپ تشریف فرما نہ تھے اور ہم پر آپ کو اطمینان و اعتماد نہیں لیکن بات یہ ہے کہ یہی ہم سچے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں حضرت لوط علیہ السلام کی تصدیق کو قرآن کریم نے اسی لفظ ایمان سے ادا کیا ہے کیونکہ انھوں نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان کی تصدیق صرف ان کے اعتماد پر کی تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فآمن له لوط" یہاں بھی "فصدق له لوط" نہیں فرمایا۔

غائبات اور ایمان کی اسی خصوصیت کو سورۂ بقرہ میں "یؤمنون بالغیب" کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے۔ یہاں غیب کا لفظ صرف بطور بیان واقع نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہے کہ ایمان کا تعلق صرف غائبات کے ساتھ ہے۔ مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر یہ حقیقت پوری طرح سمجھ لی جاتی تو اخبار غائبہ میں بحث و تمحیص کا ایک مرحلہ بڑی حد تک ختم ہو جاتا۔ ناواقف صاحبان ابھی تک یہ نہیں سمجھے کہ ایمان کا تعلق سب سے کس چیز سے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دین کے جملہ غائبات پہلے اس طرح معقول بنائے جائیں کہ پھر ان کی تصدیق کے لئے اعتماد رسول کا واسطہ بیچ میں سے اور نہیں جاتے کہ دلائل کی بحث سے گذر کر صرف رسول کے اعتماد پر اس کے اقوال و افعال کو تسلیم کر لینے کا نام ہی تو ایمان ہے۔ اسی تسلیم و رضا میں انسانی عقول کی آزمائش ہے۔ تجربہ کار جانتے ہیں کہ ایک صادق القول پر اعتماد کرنے سے بڑھ کر کوئی اور دلیل طمانیت بخش نہیں ہو سکتی مگر ایک عالم کا ارتقی نارسائی اور بے شعوری سے کہ باوجود دلائل کے بغیر شفا حاصل نہیں کرتا۔

حالانکہ دلائل کا راستہ سرتاسر پر خطر و شبہ کا راستہ ہے۔ عقل انسانی اگر غائبات پر ایک طرف کوئی دلیل قائم کر بھی لے تو دوسری عقل اس کے خلاف بھی دلائل قائم کرنے سے عاجز نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عقلاء میدان بحث میں کبھی کسی امر پر متفق نظر نہیں آتے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف دلائل کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں۔ آئے دن ان کی تحقیقات کی دنیا بدلتی رہتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اسی ایک عالم جہالت سے دوسرے عالم جہالت کی طرف منتقل ہونے کا نام (ریسرچ) یعنی تحقیق رکھ لیا جاتا ہے کاش کہ صاحب عقل کی ریسرچ پر اعتماد و وثوق کر لیتے تو یہ عمر عزیز ساحل کی تلاش میں بے حاصل صرف نہ ہوتی۔ حقیقت کا راستہ شریعت نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔ اب جو کام ہمارا رہ جاتا ہے وہ اس پر چل کر منزل مقصود کو پہنچ جانا ہے اور بس۔

ایمان بالغیب کا راستہ یہی ایک راستہ ہے جس میں مدعی کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے ماسوا جس قدر راہیں ہیں وہ تذبذب کی راہیں ہیں تردد کی راہیں ہیں۔ مدعی کے لئے ان میں کچھ تسلی ہے نہ نفس کی کوئی تشفی۔

اِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ — یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں اس کی سیدھی راہ سے جدا کر دیں گے۔

مذکورہ بالا بیان کا مقصد غور و فکر کی راہ بند کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اس کا ایک دائرہ بتلانا ہے اس کا نام عقل کا تعطل نہیں بلکہ طریق استعمال کی صحیح تعلیم ہے آیات آفاق و انفس کا دائرہ کیا کم ہے کہ اس کو چھوڑ کر عالم غائبات پر عقل کے تیر چلائے جائیں۔ جو دائرہ عقل ہے اس میں خوب غور کرو اور جو دائرہ عقل سے باہر ہے اسے احکم الحاکمین کے حوالہ کر دو۔

ایمان بالغیب اور عقل | جب تک ایمان کا مقام اعتقاد میسر نہیں آتا آپ کو حجت بازی کا موقع رہتا ہے۔

لیکن جب رسالت کی تصدیق دلیل یا بے دلیل حاصل ہو گئی تو اب انقیاد باطن کا یہ نازک مقام زیادہ لن ترانیوں کا متحمل نہیں رہتا اور آپ کا صرف ایک ہی فرض رہ جاتا ہے کہ رسول کہے اور آپ خاموش سنیں وہ حکم دے اور آپ مانیں اور کیوں نہ مانیں اگر قلب طوقِ غلامی پہن چکا ہے تو زبان کو سرتابی کا حق کیا ہے۔ بقول غالب ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو ۔ نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

رسول کی تصدیق کا ہی دعویٰ ہے پھر بات بات پر شبہات اور حجت بازی کی خلش بھی جاری ہے کیا بیک وقت یہ دو متضاد باتیں نہیں؟ کیا وثوق اور اعتماد اسی کا نام ہے کہ رسول جو کہتا ہے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا، خود فیصلہ کیجئے اور دیانت سے وہ پہلو اختیار کیجئے۔

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۔ وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۔ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۔ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ (نور)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو اور رسول کو مانا اور ہم ان کے فرمانبردار بن گئے ہیں اس کے بعد ان میں کا ایک فریق پھر جاتا ہے اور وہ لوگ ایمان والے نہیں ہیں جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف کہ ان میں فیصلہ کرے تبھی ایک فریق ان میں منہ پھیر لیتا ہے اگر ان کو کچھ ملنا ہوتا تو چلے آئیں اس کی طرف قبول کر کے۔ کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا شبہ میں پڑے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ بے انصافی کرے ان پر اللہ اور اس کا رسول۔ یہ بات نہیں بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بلائے اللہ اور رسول کی طرف ان میں فیصلہ کرنے کے لئے جائیں تو کہیں ہم نے سنا اور حکم مان لیا۔ اور کامیاب یہی لوگ ہیں۔

اشاعرہ اور امام ابو منصور ماتریدی تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان اسی بے دلیل انقیاد و اطاعت کا نام ہے۔ (اتحاف ج ۲ ص ۲۳۰)

اب آپ یہ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ ایمان کا وجود ذہنی یا شرعی تصدیق کوئی سرسری تصور نہیں ہے جس کی حیثیت صرف ایک خواب و خیال کی سی ہو بلکہ قلب انسانی پر یہ وہ نقش ہے جو ایک لمحہ میں آبائی عقائد کے سب نقوش محو کر دیتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے متوارث آنکھوں میں مصائب

نظر آنے لگتے ہیں حتیٰ کہ طعام وشراب زوجہ۔ قطع۔ رفتار و گفتار سب میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو جاتی ہے
بلکہ سمع وبصر ذوق وشم یعنی حواس خمسہ کی دنیا کی دنیا منقلب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو نغمہ پہلے
دلکش تھا جو صورت پہلے دلفریب تھی جو کھانا لذیذ معلوم ہوتا تھا جو خوشبو بھلی لگا کرتی تھی، اب اسی نغمہ
میں وہ دلکشی، اسی صورت میں وہ دلبری، اسی کھانے میں وہ لذت، اسی خوشبو میں وہ کشش باقی نہیں رہتی
مردوں کی صحبت سے طبیعت اگر کسی مجلس بھی جاتی ہے تو دل اندر ہی اندر سمجھانے لگتا ہے اور آخر تصدیق
قلبی کی مضبوط کڑیاں آئین اسلام سے ادھر ادھر ہو جانے نہیں دیتیں۔ نفس چاہتا ہے کہ قدیم لذائذ کا پھر
مزہ لوٹے مگر صفت ایمان کا ذائقہ انھیں بے مزہ بنائے دیتا ہے۔ اسی لئے ہمارے فقہاء نے کفر کے بعد
اسلام کو ایک جنم نو سمجھا ہے اور کفر واسلام پر بہت سے ایسے احکام متفرع کر دیئے ہیں جو حقیقی موت وحیات
پر ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے کفر واسلام کی یہ معمولی تبدیلی انسان کے آخرت کی تبدیلی بن جاتی ہے اگر کسی کو
تمنا ہے کہ وہ عالم نقمت کو عالم نعمت سے اور عالم عذاب کو عالم ثواب سے بدل دے تو اس کو چاہئے کہ
آج عالم کفر کو عالم اسلام سے بدل لے۔ قدرت کے اس دست فیاض پر قربان جس نے عالم فانی کی
اس ترمیم سے عالم جاودانی کی ترمیم کا وعدہ فرمالیا ہے بلکہ اس ابدی مقام کو اس عارضی ترمیم کا تابع بنا دیا ہے
کیا اب بھی آپ سمجھ گئے کہ تصدیق قلبی کسے کہتے ہیں اور ایمان کا وجود ذہنی کیا ہے؟

ایمان کا جسم مثالی ایمان کا تشکل اعتقادی وجود آپ سن چکے یہ وجود جب اور رسوخ وپختگی اختیار کر لیتا ہے
تو یہی ایمان جو اس منزل تک صرف ایک معنی تھا اب رفتہ رفتہ شکل وصورت اختیار کرنے لگتا ہے۔
ارباب حقائق کے نزدیک تو معانی کا تجسد ثابت شدہ حقیقت ہے اور موجودہ تحقیقات کے مطابق
بھی آج وزن جیسی حقیقت اور کی صفت تھی حرارت کے لیے ثابت ہو چکی ہے بلکہ اس کے وزن کے
لئے ایک مقیاس الحرارت بھی تیار کر لیا گیا ہے اور اب آسانی ہر شخص اپنی حرارت کا وزن کر سکتا ہے۔
اسی طرح آواز کو مدت تک محض ایک معنی تصور کیا گیا تھا جو ہوا میں آتی اور فنا ہو جاتی ہے مگر حال
کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالم کی پیدائش سے لیکر آج تک جتنی اصوات اس (فضا) میں
نکلی ہیں وہ سب کی سب محفوظ وموجود ہیں اور ان سے استفادہ کی سعی جستجو جاری ہے۔ ریڈیو کی
محیر العقول ایجاد کی بنیاد یہی جدید انکشاف ہے۔ یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ تحقیقات عصریہ باوجود
ان تمام جدوجہد کے اب تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکیں جہاں ہمارے ارباب حقائق کی نظریں آج سے
سینکڑوں سال پیشتر پہنچ چکی تھیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات مکیہ میں اصوات کے صرف وجود
کی تصریح نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی صورتوں کے بھی قائل ہیں اور یہ بھی کسی دلیل کو نہیں

بلکہ اپنے جسم و جثہ سے ہوتے ہیں۔ دیکھئے کہ سانس اپنی اس برق رفتاری کے باوجود کب اس تمام تمکین تک پہنچتی ہے

اسی طرح ایمان بھی ابتداءً تو تصدیقِ قلبی کا نام ہے مگر تصدیق اعمال صالحہ کی آبیاری سے نشو و نما پا کر ایک درخت کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہی نورِ ایمان کا وجودِ عینی کہلاتا ہے۔ حضرت لقمان کی وصیت میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا اے بیٹے جس طرح کھیتی بلا آبیاری کے سرسبز نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایمان بلا علم و عمل کے تحقیقی نہیں ہو سکتا[1]

امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی اور امام ابو عبید اور امام اصبہانی نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ پہلے ایمان ایک سفید نقطہ کی شکل پر قلب میں نمودار ہوتا ہے اور جتنا ایمان بڑھتا جاتا ہے اسی قدر یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو سارا قلب سفید ہو جاتا ہے۔ یہی حال نفاق کا ہے کہ پہلے سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بالآخر تمام قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم ایک مومن کا قلب نکال کر دیکھو تو بالکل سفید پاؤ گے اور ایک منافق کا قلب دیکھو تو بالکل سیاہ دیکھو گے[2] لیکن معانی کے اس تجسد کے مشاہدہ کے لئے وہی تیز آنکھیں درکار ہیں جن کا ذکر اس آیت میں موجود ہے۔ فبصرك اليوم حديد۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک شق کیا گیا تھا تو ایک سونے کا طشت ایمان و حکمت سے لبریز لایا گیا اور اسے آپ کے صدرِ مبارک میں الٹ دیا گیا تھا۔ عجب نہیں کہ اس سے مراد ایمان کا یہی وجودِ عینی ہو۔ انبیاء کے کمالات اکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے بلکہ قدرت اسی طرح ان کے مناسب کمالات خود عطا کر دیتی ہے۔

یہ نورِ تصدیق جس قدر عروج پیدا کرتا جاتا ہے اتنا ہی خواہشاتِ نفسانیہ کے حجابات اٹھتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے حجابات اٹھتے جاتے ہیں اسی قدر نور اور منبسط ہوتا جاتا ہے [illegible] پھیل جاتا ہے کہ انسان کے تمام جوارح کا احاطہ کر لیتا ہے اور یہ مومن گویا خود ایمان مجسم بن جاتا ہے جسے دیکھ کر بے ساختہ خدا یاد آنے لگتا ہے۔

حضرت عبد الرحمن بن غنم (بفتح غین و سکون نون) اور اسماء بنت یزید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بہتر بندے وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو خدا یاد آ جائے۔[3]

اس نور کی وسعت کی بقدر اوامر الٰہیہ کے امتثال اور منکرات شرعیہ سے اجتناب کا جذبۂ کامل پیدا

---

[1] اتحاف ج ۲ ص ۲۵۰ و [2] تفسیر ج ص ۱۰۶ [3] مسند احمد و شعب الایمان، مشکوٰۃ شریف باب حفظ اللسان والغیبۃ

ہوجاتا ہے۔ اخلاق رذیلہ زائل ہوجاتے ہیں اور اخلاق فاضلہ اس کی جگہ لے لیتے ہیں اور قلب کو وہ وسعت میسر آجاتی ہے کہ سارا عالم اس کے پہلو میں مثل ایک نقطے کے نظر آنے لگتا ہے کیوں نہ ہو کہ مومن کا یہ وہ قلب ہے جو اس کے پروردگار کی تجلی گاہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ فرمایئے۔

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ — بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے لئے کھول دیا

فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ — سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔

پھر دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَمَن يُرِدِ اللَّهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ — جس کسی کی ہدایت کا اللہ ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ

صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ۔ — اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔

یہ شرح صدر بھی گو ایک معنی میں جس کا مطلب صرف اسلام کا فراخدلی سے بلا پس و پیش قبول کر لینا سمجھا جا سکتا ہے مگر اس معنی کا بھی ایک وجدانی پہلو ہے وہ صرف یہ معنوی فراخی نہیں بلکہ وہ وسعت ہے جو مومن کامل اپنے قلب میں حسًا بھی مشاہدہ کرتا ہے اب حضرت رسالت ﷺ کے حق میں شرح صدر کا جو مصداق ہو سکتا ہے اس کا خود اندازہ کر لو۔ قرآن امتنان کے لہجہ میں فرماتا ہے۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ — کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جب نور یقین قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں ایک فراخی اور کشادگی نمودار ہو جاتی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کی کچھ علامت بیان فرمایئے۔ ارشاد ہوا اس کی تین علامتیں ہیں۔

(۱) آخرت کی طرف میلان۔

(۲) دنیا سے نفرت اور یکسوئی۔

(۳) موت سے پہلے اس کی تیاری۔ [۲]

یہ ہے ایمان کا وجدانی پہلو۔ یہی دعوت انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہے اور اسی پر نجات مطلقہ (یعنی بلا عذاب) اور فلاح ابدی کا مدار ہے۔ اس ایمان کے بعد مومن کے کانوں میں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی جو کیفیت سامنے لگتی ہیں اس مومن کو اگر جلا کر خاک بھی کر دیا جائے۔ اس کے جسم و جان کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے تو بھی اس کے ذرہ ذرہ سے ایمانیات کی صدا بلند ہوگی۔ یہ ایمان صرف ذہنی اور عقلی نہیں رہتا بلکہ دیگر

---

[۱] علامہ عبدالوہاب شعرانی نے اس شرح صدر کی تحقیق میں سفر السعادۃ میں مستقل ایک فصل لکھی ہے مراجعت کی جائے

[۲] شعب الایمان للبیہقی۔ مشکوٰۃ شریف

محسوسات کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے اس کا ذوق چکھیں دیکھی ہیں۔

بینما قلوبهم فی ذوی مجمعهم تنزل السجود — جیسے کہ شہد کے مزے سے زبان کی حلاوت ظاہر ہو

قلب اس کی حلاوت و شیرینی اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسا کہ زبان مٹھائی کی۔ یہ ایمان
فطرت انسانی کا ایک مقتضا بن جاتا ہے اور جس طرح فطری تقاضے زوال پذیر نہیں ہوتے اسی طرح یہ ایمان
بھی زوال کے خطرہ سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے۔

ہرقل جو بہت بڑا عالم کتاب تھا اس وجدانی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جب اس نے اپنے دوران مکالمہ میں
ایک سوال ابوسفیان سے یہ بھی کیا تھا کہ اس پر ایمان لا کر کیا کوئی شخص مرتد ہوتا ہے۔ اس پر حریف عداوت کے
باوجود جو جواب ابوسفیان کی زبان سے نکلا وہ صرف نفی میں تھا۔ یہ سن کر ہرقل نے جو کلمات کہے ان کی
علمی گہرائی کا خوب پتہ دیتے ہیں۔

وکذلک الایمان اذا خالطت — یعنی ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ جب اس کی بشاشت اور تراوت دلوں میں
بشاشته القلوب۔ — رچ جاتی ہے تو پھر نکلا نہیں کرتا۔

یہ ایمان کے وجدانی ہی کی طرف اشارہ ہے اسی کا نام ایمان کامل ہے اسی کو معرفت بھی کہا جاتا ہے
علوم ابتداء میں صرف علوم ہوتے ہیں مگر کچھ رسوخ کے بعد قلب میں اپنا ایک رنگ پیدا کر دیتے ہیں جس کے
بعد قلب میں لطف اندوزی یا انقباض کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت ان کا نام حال ہو جاتا ہے
پھر اگر ترقی کر کے یہ لون اور رسوخ اور پختگی اختیار کر لیتا ہے تو اسی کا نام معرفت بن جاتا ہے اور اسی کو مرتبہ
احسان سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ علوم کی انتہائی معراج ہے۔ پھر اس معرفت میں بے نہایت مراتب و مدارج ہیں اور
ان ہی مراتب کے لحاظ سے مومنین کو تفاضل ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات) — عزت اللہ کے یہاں اسی کو جو تم میں کا زیادہ پرہیزگار ہو۔

عمل و ایمان کا فرق | ایک ظاہری صرف عمل پر نظر رکھتا ہے اور اسی پر فضیلت و مفضولیت کا فیصلہ کر ڈالتا
ہے۔ مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ اصل روح انسان باطن ہے اور عمل اس کا صرف ایک قالب اور ڈھانچہ
اس لئے اس کی نظر روح ایمان پر ہوتی ہے اور یہی اس کا معیار فضیلت رہتا ہے۔ حدیث میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب مذکور ہے کہ گویا آپ کنویں پر ایک ڈول پڑا ہے۔ چنانچہ میں نے جب تک خدا نے چاہا
اسے کھینچا اس کے بعد پھر اسے ابوبکر نے لیا اور ایک دو ڈول نکالے مگر کچھ ضعف کے ساتھ پھر ان سے عمر فاروق
نے لیا تو اس قوت سے ڈول کھینچے کہ ڈول والوں نے اپنے اونٹوں کے پانی پی کر بیٹھنے کی جگہ وہاں بنا
ڈالی۔ بعض علماء نے بیان ضعف سے ابوبکر کی مدت خلافت مراد لی ہے اور یہ ظاہر ہے مدت بہ نسبت

خلافت عمرؓ کے نہایت قلیل تھی مگر کسی نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ جو قوتی شدت و شوکت عہد فاروقی میں نظر آتی
وہ عہد صدیقی میں ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ شاید اسی خصوصیت کے پیش نظر حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کے
اسلام کے بعد ہم ہمیشہ معزز رہے اور کبھی ذلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اب اگر تسلیم کر لو کہ عملی قوت کے لحاظ سے عمر فاروقؓ حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ تھے تو یہ بھی ایک ناقابل
انکار حقیقت ہے کہ قوت ایمانی کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے کہیں فائق تھے۔ نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے حادثہ انتقال پر عمر فاروقؓ کی بے صبری و اضطراب اور حضرت ابوبکرؓ کا صبر و استقلال تاریخی
واقعہ ہے جب قوت عملیہ جواب دے بیٹھی ہیں تو ایسے ہی وقت قوت ایمانیہ کا امتحان ہوتا ہے اگر کہیں حضرت
صدیق اکبرؓ کی قوت ایمانیہ نے فاروق اعظمؓ کو نہ سنبھالا ہوتا تو معلوم نہیں کہ اس جان گداز واقعہ نے ان کو
کتنا اور مدہوش بنا دیا ہوتا۔ خدا ہی جانے کہ اس ہنگامۂ بے صبری میں ابوبکرؓ کی زبان وہ چند کلمات کیا تھے
جن کے سنتے ہی جلتے ہوئے سینوں کی آگ بجھ گئی مدہوش عقول کو ہوش آگیا اور جو موت کا تصور کرنے پر قادر نہ تھے
تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے۔ اگر ابوبکرؓ کی قوت ایمانیہ اس طرح قلوب کا پانسہ پلٹ دیتی تو نہیں معلوم
واقعات کیا شکل نزاکت اختیار کر لیتے۔ ایسے نازک دور میں صحابہؓ کی جماعت میں بجلی کی طرح یہ
انقلاب پیدا کر دینا صدیق اکبرؓ کی فضیلت کی وہ بین دلیل تھی جس کے بعد بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دینا
ہر مسلمان کا ایک اضطراری فرض ہو گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ عمل و ایمان کا توازن عالم میں لگا رہا تھا
حق تعالیٰ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ساری دنیا گویا ایک دن ہے جس میں امت محمدیہ کا وقت صرف عصر
سے غروب تک ہے اور دوسری امتوں کا فجر سے ظہر تک مگر قدرت کا فیصلہ یہ ہے کہ آخر ہوئی امت محمدیہ
کو دوسری امتوں سے دوگنی ملتی ہے۔ بات وہی ہے کہ مدار قوت عمل پر نہیں بلکہ قوت ایمان پر ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ — تم سب امتوں میں سے افضل ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا شعار ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم اپنے خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

آیت مذکورہ نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا کہ کچھ افراد ہی نہیں بلکہ جماعات و امم میں بھی فضیلت کا قانون
وہی ایک ہے اس کے بعد اگر انبیاء کی سوانح پر غور کرو تو حیات نبی خاتم النبیین کو مرحمت ہوئی وہ صرف
چند سال ہیں اور جو زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کو ملا وہ بقول قرآن ہزار سال تھے پھر کون نہیں جانتا کہ
فضیلت کا تاج کس کے سر پر ہے۔ الغرض افراد و امم اور انبیاء علیہم السلام میں افضلیت کا ایک ہی قانون ہے
یعنی ایمانی روح اور الٰہی معرفت جہاں یہ روح نہیں وہاں عمل کی کوئی قیمت نہیں

بل بیّن ابن تیمیة ان اکثر التنازع بین اهل السنة فی هذه المسئلة هو نزاع لفظی (ص [illegible])	بھی یہ بات منصوص طور پر ظاہر کی جا چکی کہ اہل سنت والجماعت میں ایمان کے مسئلے کے متعلق جتنے بھی اختلافات لفظ ہی میں درحقیقت وہ صرف نزاع لفظی ہیں۔

ایک غریب عالم کی محنت اور جانفشانی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اپنی بے سکون راتوں کو دن بنا بنا کر ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر ڈالتا ہے اور جب کسی نتیجہ کے لئے اس کا قلب مضطر ہونے لگتا ہے تو کسی مصنف کی ایک سطر اس کے سامنے نصیحت یہ کہکر حال میں طاری ہے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اب ملاحظہ فرمایئے کہ حافظ ابن تیمیہؒ ۱۱۱ صفحات کی تحقیقات کے بعد یا بیان کرتے ہیں اختلافات اور جانبین کے پُر زور دلائل سے عقل حیرت میں پڑ جاتی ہے وہ جانتی ہے کہ کوئی راستہ تلاش ہو مگر اختلافات کے اس بحر بے کنار میں جب کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور جب آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر حصہ صرف نزاع لفظی تھا تو تھک کر بیٹھ جاتی ہے اور پھر اس بے دردی کی فریاد کا موقعہ بھی نہیں رکھتی۔ خوب کہا ہے کہ عمر کہاں ہے؟ کہ کنم دل دکاہ ہر آو دلی۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جنگ کچھ نہ تھی تو پھر یہ بات فقط کیوں بنائے گئے۔ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ محدثین کو سارا غصہ اس پر ہے کہ جو لفظ سلف سے منقول ہوتے چلے آرہے تھے فقہا نے ان کو کیوں ترک کیا۔ بالخصوص جبکہ ان کے ترک سے فرق باطلہ کو بہانہ ملتی گئی۔ حافظ ابن تیمیہؒ تصریح فرماتے ہیں کہ کسی نے فقہاء کو مرجئہ میں شامل کیا ہے اس نے معنی کے لحاظ سے نہیں کیا بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کیا ہے جن سے مرجئہ کی موافقت کی بو آتی ہے[1]۔

مرجئہ ایک فرقہ ہے جس کا یہ خیال تھا کہ ایمان کے لئے صرف زبانی اقرار کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جہمیہ ان سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہہ گئے کہ اقرار کی بھی کوئی ضرورت نہیں، صرف معرفت قلبیہ کافی ہے۔ ان فرق باطلہ کے مقابلہ میں محدثین کو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی عنوان ایسا اختیار کر لیا جائے کہ وہ عنوان ہی خود ان کی تردید کا ایک اعلان بن جائے۔ اس لئے ایمان کی تعبیر میں ہی اقرار و عمل دونوں شامل کر لئے گئے۔ اور الایمان قول و عمل مشہور ہو گیا یعنی ایمان اقرار و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ متعین کردہ شدہ جو عبارت اس مصلحت سے اختیار کی گئی تھی کچھ زمانہ کے بعد اہل سنت کے شعائر میں شمار ہونے لگی۔ اب جو شخص ایمان کی تعریف میں قول و عمل کہتا اہل سنت تھا اور جو شخص اس تعبیر کو ترک کرتا

[1] کتاب الایمان ص ۱۹۰۔

وہ صرف اس جرم میں ارجاء و جہمیت کے القاب سے متہم ہوتا۔ [1]

آج بھی اگر تم ان کے اختلافات پر نظر کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بناء یہی چند الفاظ تھے جن کو نا اہلوں نے اصول اختلاف بنا ڈالا ہے حتیٰ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

ہماری بعض کتب میں امام اعظم سے ایمان کی تعریف میں معرفت کا لفظ منقول ہے۔ یہی تھی بات جس کی طرف جہمیت کے انتساب کے لئے بہانہ بن گئی

الایمان ھو الاقرار والمعرفۃ باللّٰہ	یعنی ایمان کیا ہے؟ (۱) توحید و رسالت کا اقرار (۲) خدا تعالیٰ
عزوجل والتسلیم والمحبۃ لہ و	کی معرفت (۳) اس کے سامنے سر تا سر نیاز ہو جانا (۴) اس کی
ترک الاستخفاف بحقہ۔ [2]	محبت۔ (۵) اس کے کسی حق کو معمولی نہ سمجھنا۔

پہلے تو یہی امام صاحب کی طرف اس تعریف کے انتساب میں ہی کلام ہے اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو صرف اس بات سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ معرفت سے امام صاحب کی وہی مراد ہے جو جہم بن صفوان کے نزدیک ہے۔ جہم کے نزدیک ایمان کے لئے نہ عمل کی ضرورت ہے نہ اقرار کی بلکہ انکار کے بعد بھی ایمان کامل رہ سکتا ہے اور یہاں اقرار کی رکنیت و شرطیت کی بحث چھڑی ہے۔ رہ گیا انکار تو بلا اختلاف ایک یقینی کفر ہے۔ پھر جہم اور امام صاحب کے مذہب میں کیا اشتراک ہو سکتا ہے۔ بعض مصنفین نے یہاں معرفت کی تفسیر تصدیق کر دی ہے تاکہ یہ تعریف بھی مشہور کے موافق ہو جائے مگر ہمارے نزدیک اس جگہ معرفت سے وہ عام تصدیق مراد نہیں بلکہ تصدیق کا وہ جزو یعنی مراد ہے جسے ایمان کامل کہا جاتا ہے اور بلا شبہ ایمان کامل بلا معرفت تامہ حاصل نہیں ہوتا۔

حافظ ابن تیمیہ نے ایمان میں بھی تقسیم پیدا کر دی ہے۔ [3] (۱) ایمان واجب (۲) ایمان مستحب۔ ایمان واجب ہر شخص پر فرض ہے اور اسی مومن کا شمار زمرۂ ابرار اور اصحاب یمین میں ہے۔ ایمان کی دوسری قسم مقربین و سابقین کا حصہ ہے۔ شاید بالا تعریف اسی قسم ثانی کی ہے جیسا کہ تعریف مذکور کے بقیہ الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں۔ معلوم ہے کہ عبد القاہر بغدادی نے جمہور ائمہ و محدثین کا مذہب نقل کر کے اس کی تصریح کی ہے کہ ان کے نزدیک بھی ایمان کے مراتب میں اعلیٰ مرتبہ یہی معرفت ہے۔

اعلی الایمان معرفۃ بالقلب والاقرار	یعنی ایمان کا اعلیٰ مرتبہ معرفت قلبیہ، زبان سے اقرار اور اعضاء کا
باللسان وعمل بالارکان یزید	عمل ہوتا ہے۔ یہ ایمان طاعات سے ترقی پذیر ہوتا ہے اور معاصی
بالطاعۃ وینقص بالمعصیۃ [4]	سے ناقص بھی ہوتا ہے۔

[1] دیکھو کتاب الایمان ص ۲۲۲ و ۱۵ [2] اتحاف ج ۲ ص ۲۴۰ [3] کتاب الایمان ص ۲۰۰ [4] اتحاف ج ۲ ص ۲۴۴

اس کے سوا حافظ ابن تیمیہ نے تو محدثین سے ایمان کی تعریف میں معرفت کا لفظ نقل کیا ہے بلکہ جمہور ائمہ کے
بھی یہ لفظ منقول کئے ہیں ؎[1]

اب ذرا انصاف کرو کہ اگر ایمان کی تعریف میں ایک لفظ معرفت استعمال کر لینا ہی کوئی جرم تھا تو
کیا امام صاحب ہی اکیلے اس جرم کے مرتکب تھے، پھر ایک حنفیہ ہی کو کیوں ہدف ملامت بنا لیا گیا۔

اسی طرح اگر حنفیہ نے ایمان میں عمل کو داخل نہیں کیا تو اس کے لئے بھی ان کے پاس دلائل ہیں مگر کیا
اتنی سی بات سے ان کو مرجیہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے! حالانکہ مرجیہ کے نزدیک ایمان کے لئے معاصی کچھ مضرت
رساں نہیں اور حنفیہ کے نزدیک اعمال مکمل ایمان ہیں لہٰذا اگر صرف لفظی گرفت ہی کوئی چیز ہے تو کیا عمل کو
جزو ایمان بنانے سے معتزلہ و خوارج کو تقویت نہیں ہوتی (معتزلہ و خوارج محدثین سے بھی ایک قدم آگے
بڑھا کر عمل کو ایسا جزو کہتے ہیں کہ ایک عاصی ان کے نزدیک مومن کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے) اب
اگر ایمان میں عمل داخل نہ کرنے سے مرجیہ اور جہمیہ کو تقویت ہوتی ہے تو عمل کو جزو بنانے سے معتزلہ و خوارج
کو شہ ملتی ہے پھر محدثین کے غیظ و غضب کا نزلہ حنفیہ ہی پر کیوں گرتا ہے۔ فصبر جمیل واللہ المستعان
علی ما تصفون۔

اعمال کی حیثیت ایمان میں | یہ بحث نہایت دلچسپ ہے کہ عمل کی ایمان میں کیا حیثیت رہنی چاہئے محدثین
و فقہاء کا یہاں بھی خوب نزاع ہے فریقین کے دلائل ذکر کرنے کا یہ محل نہیں، ہمارے نزدیک یہاں حقیقت
حال امام غزالیؒ کی ایک تحقیق ہے اور یہی وہی فیصلہ کن ہے اس کے بعض الفاظ تو ادھر ادھر ہیں جو محدثین استعمال
کرتے ہیں یا وہ جو فقہاء نے استعمال کئے ہیں (یعنی اعمال کو جزو کہو) چونکہ محدثین کا مذہب بھی ایمان سے خارج
قرار دینا جیسا کہ فقہاء کا مسلک ہے، ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:-

کہ باطن و ظاہر بالکل دو جداگانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ ہر دو کا باہمی ایسا گہرا
تعلق ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر عکس پڑتا رہتا ہے۔ گویا اعتقاد باطن، اعمال ظاہرہ کا مقتضی ہوتا ہے
تو اعمال ظاہرہ اعتقاد باطن کے ممد و معاون رہتے ہیں، دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم
کرنا انسانیت کا اولین فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ اقتضا ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے مجسم ہمدردی
دلسوزی بن جائے پھر جب اس کے اعضاء و جوارح اس دلسوزی کے لئے حرکت کرنے لگتے ہیں تو وہ محسوس
کرتا ہے کہ اس کے اعتقاد میں ایک نئی روح داخل ہو چکی ہے اور جتنا جتنا اس کا یہ عمل تلطف و ترحم
ترقی کرتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں شفقت و رحمت کا جوش اور بڑھتا ہے۔ یا اگر ایک شخص تواضع

؎[1] دیکھو کتاب الایمان ص ۱۹۰ و ۱۹۳ و ۱۹۴ و ۲۸۵۔

کیونکہ نیک خصلت بتقاضائے خود اس کا تعلق ہے تواضع کا مسئلہ یقیناً اس سے کسی اعتقاد میں اور پختگی کا باعث بنتا ہے۔ غرض یہ صفات قلبیہ جس قدر بھی ہیں سب کا حال یہی ہے پہلے وہ اعضاء پر اپنا اثر کر کے جنس عمل کے لئے مستعد کرتی ہیں اور جب جوارح مصروف عمل ہو جاتے ہیں تو ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کر دیتے ہیں۔ ایمان و اعمال کا حال بھی اسی پر قیاس کر لو۔ ایمان ایک عقیدہ ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ جوارح توحید خالص اور تصدیق رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دیں اور جب اعضاء اس اقتضاء کو پورا کرنا شروع کرتے ہیں تو یہ عقیدہ اور راسخ اور تروتازہ و سرسبز ہونے لگتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں۔

لیس الایمان بالتحلی ولا بالتمنی / یعنی ایمان صرف ظاہر داری کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان
ولکن ما وقر فی القلب وصدقته الاعمال / وہ ہے جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال
(کتاب الایمان ص [illegible]) / اس کی تصدیق بھی کریں۔

اس کلام سے ان کا مقصد یہ ہے کہ عمل انسان کی کیفیات قلبیہ کا آئینہ ہیں اب اگر وہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے قلبی تصدیق کی دلیل ہوگی ورنہ اس کی بد عملی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد بن جائے گی۔

محمد بن نصر مروزی نقل فرماتے ہیں کہ عبد الملک نے سعید بن جبیر سے چند سوالات کئے تھے ان کے ایمان اور تصدیق کے متعلق بھی ایک سوال تھا انہوں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ ایمان اللہ تعالیٰ اس کے ملائکہ اور رسولوں اور قیامت کی تصدیق کا نام ہے مگر تصدیق کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کے حروف حدود پر عمل ہو اور جس کی کوتاہی ہو جائے وہ گناہ نظر آئے اس پر استغفار کرے اور آئندہ مصر نہ ہو۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اسلام اقرار کا نام ہے اور ایمان عمل کا۔ یہ برہان آیت میں بھی قرین ہیں جس شخص کا قول و عمل تولا جائے گا اگر اس کا عمل درست ہے تو مقبول ہوگا اور آسمان کی طرف صعود کرے گا اور اگر قول درست ہے تو اس کا عمل مقبول رہے گا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ایمان بلا اقرار صحیح نہیں ہوتا اور ایمان و اقرار بلا عمل درست نہیں ہوتے اور ان تینوں کا اعتبار بلا نیت صحیحہ کے نہیں ہوتا۔

ان سب ائمہ کے اقوال سے ظاہر ہے کہ اعمال جوارح تصدیق قلبی کے لئے بڑی حد تک ضروری ہیں گویا اس کے لوازم ہیں۔ حضرت مجاہد روایت کرتے ہیں کہ ابو ذر غفاریؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان زبان سے اقرار کرنا اور اپنے عمل سے اس کی تصدیق کرنے کا نام ہے اس کے بعد آپ نے اس بیان کی شہادت میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ / یعنی نیکی یہی نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کو منہ کر لیا کرو (الخ)

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ۔۔۔ بلکہ اصل مدار ایمان پر ہے۔

ایمان و عمل کے اس نازک ارتباط کو صرف ایک اہل سنت نے سمجھا ہے۔ مرجئہ و جہمیہ نے ان دونوں کو ایسا علیحدہ کردیا کہ تصدیق قلبی کے لئے عمل کی کوئی ضرورت نہ رہی اور معتزلہ و خوارج نے ان کو ایسا لازم بنا دیا کہ عملی کوتاہی کو تصدیق قلبی کا ضعف قرار دیدیا۔ اسی اختلاف پر بحث قائم ہوگئی کہ مرتکب کبیرہ کا کیا حکم ہونا چاہئے۔

تصدیق قلبی پر معصیت کا اثر | قدرت جو فطرت انسانی کی سب سے بڑی ماہر راز ہے خوب جانتی ہے کہ یہ مجموعۂ عناصر اتنا پابند عہد نہیں رہ سکتا کہ عالم امکان کی نقاشی اس کی نظروں کو کبھی خیرہ نہ کرسکیں، خواہشات نفسانی کی باد صرصر اس کی شمع تصدیق کو کبھی حرکت نہ دے سکے، وہ کمزور ہے اور بہت کمزور ہے اس سے صدور خلاف منشاء پر اس کا نام وفاداروں کی فہرست سے نہیں کاٹتی اور اس حد تک اسے معذور سمجھ جاتی ہے کہ وہ خود ہی نقض عہد کا اعلان کر گذرے۔ ارباب ارجاء و اعتزال اگر تصدیق کے شرعی مفہوم اور ضعف انسانی کے دونوں پہلوؤں کی رعایت کرلیتے تو نہ ارباب ارجاء کو صرف تصدیق، عمل کے بغیر کافی نظر آتی اور نہ ارباب اعتزال صرف ایک عاصی کے لئے وہ سزا تجویز کرتے جو ایک باغی کے مناسب تھی حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں

ولیس من الحکمۃ ان یفعل بصاحب الکبیرۃ مثل ما یفعل بالکافر۔[1]	یہ حکمت سے بعید ہے کہ مرتکب کبیرہ کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو کافر سے ہوتا ہے۔

یہ سعادت صرف اہل سنت والجماعت کا حصہ تھا کہ ہر پہلو کی رعایت کی توفیق ان کو میسر آگئی اور ایمان و عمل کے پورے ارتباط کو انھوں نے ملحوظ رکھا نہ اتنی سخت گیری کی کہ عمل کی کوتاہی کفر کے برابر ہوجائے اور نہ اتنا تساہل کیا کہ اتنا بڑا قصور تصدیق قلبی پر ذرا داغ بھی نہ لگاسکے اور یہ اعلان کردیا کہ انسان کی بدعملی اس کے دامن پر فسق کا ایک بدنما دھبہ ہے۔

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۔ (الحجرات)	برا نام ہے گنہگاری ایمان کے بعد

حافظ ابن تیمیہ آیت مذکورہ کی تفسیر پر مفسرین کے اقوال نقل فرماکر لکھتے ہیں کہ اس آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ایمان کے بعد پھر تمہارا فاسق ہوجانا بہت بری بات ہے۔[2] قرآن کریم جگہ جگہ مرتکب کبیرہ کو فاسق کہتا ہے۔

إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا	اگر ایک فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلو۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ص ۹۰۔ [2] کتاب الایمان ص ۲۰۰۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا — یعنی جو لوگ زنا کی تہمت لگاتے ہیں آئندہ ان کی شہادت قبول کی جائے

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ — یہ لوگ اس جرم کے بعد شریعت کی نظر میں فاسق ٹھہر چکے ہیں۔

یہ وہ بدترین لقب ہے جسے قرآن نے ایمان کے بعد بہت ہی ناپسند کیا ہے۔ اس علو و برتری کے بعد یہ خفیف اُترا و نہایت نازیبا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے۔

سباب المسلم فسوق — یعنی کسی مسلمان کو برا کہنا فسق کی بات ہے۔

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ یہ قبیح حرکت اس کو اس کا مستحق بنا دیتی ہے کہ اس کو فاسق کہہ دیا جائے

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا۔ — یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن اور ایک فاسق برابر ہو جائیں۔

ان آیات و احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ معصیت کا ارتکاب مسلمان کو منکر تو کافر نہیں بنا دیتا ہے اور نہ اس کے دعویٰ اتقیاء کو یہ داغ سہنے پڑتا ہے۔ وہ مومن ہے مگر فسق سے اس کا دامن ملوث ہو چکا ہے۔ اس جسم طہارت و پاکیزگی کے لئے لازم ہے کہ نجاست فسق سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھے اور جو لقب اس کے مولیٰ نے اس کے لئے پسند نہیں فرمایا خود بھی اس سے متنفر رہے۔ بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔ [1]

اسلام و ایمان میں کیا فرق ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلہ پر بہت طویل بحث کی ہے مگر اس قدر منتشر ہے کہ اس کا خلاصہ نکالنا مشکل ہے۔ جہاں تک ہم نے ان کے کلام کا ملخص سمجھا ہے یہ ہے کہ لغت میں اسلام کے معنی اپنے نفس کو کسی کے سامنے جھکا دینا اور ذلیل بنا دینا ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ پھر اس کے سوا کسی کی عبادت کا رخ نہ کر سکے۔ یہ جھکنا اور ذلیل ہونا ایک عمل ہے۔ اس لئے اسلام دراصل ایک عمل ہی کا نام ہے۔ اور ایمان تصدیق قلبی کو کہتے ہیں۔ یہ تصدیق قلب کا اسی طرح ایک کلام ہے جیسا کہ اقرار زبان کا۔ یہ ضرور ہے کہ جب دل اپنی گہرائیوں سے کسی کے لئے بس جائے گا تو اس کے سامنے جھکنا اور ذلیل بن جانا بھی اس کا اقتضاء طبعی ہوگا۔ مگر فرق یہ ہے کہ اسلام [2] دراصل عمل ہی عمل ہے اور ایمان ایک علم ہے۔ عمل ایمان کا ثمرہ ہے اس کے بعد اب اگر احادیث پر ایک اجمالی نظر ڈالو تو تم کو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی اسی فرق کی رعایت کی گئی ہے یعنی اسلام کا تعلق ظاہر عمل اور تصدیق کا باطن سے قرار دیا گیا ہے۔

[3] (۱) حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اسلام ظاہر ہے اور ایمان دل میں ہے گویا حدیث مذکور میں اسلام کو علانیہ اسی بنا پر فرمایا ہے کہ اعمال ظاہرہ کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے۔ لیکن

---

[1] کتاب الایمان ص ۲۰۰۔ [2] ایضاً ص ۲۹۰۔ [3] مسند احمد۔

سو رغبت الیہا اس کی محبت اس کا خوف یہ سب وصائف قلبیہ ہیں یہ باطنی چیزیں ہیں اس لئے ایمان کو علانیہ نہیں فرمایا بلکہ قلب میں بتایا گیا ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی مسلمان کو ایذا نہ پہنچے اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے جان و مال کی طرف سے خطرہ میں نہ رہیں۔

یہاں بھی اسلام کی علامت ایک ظاہری چیز قرار دی گئی ہے یعنی لوگوں کو ایذا نہ دینا اور ایمان کی علامت ایک باطنی چیز یعنی دلوں میں اس کی طرف سے خطرہ باقی نہ رہنا یہ دوسری صفت پہلی صفت سے اعلیٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایسا مجسم پیغام امن بن جائے کہ قلوب میں اس کی طرف سے کوئی برا خطرہ تک باقی نہ رہ جائے کب کسی کو ایذا دے سکتا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی کمزوری کی بناء پر یا کسی لالچ سے ایذا رسانی ترک کردے اس لئے حدیث مذکور میں جو صفت ایمان کی بیان ہوئی ہے وہ اسلام کی صفت سے بالاتر ہے۔

(۳) عمرو بن عبسہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کسے کہتے ہیں آپ نے فرمایا لوگوں کو کھانا کھلانا اور نرم گفتگو کرنا۔ اس نے کہا کہ اچھا ایمان کیا چیز ہے فرمایا سخاوت اور صبر [1]

پہلی دو باتیں ظاہری عمل ہیں اور آخری دونوں باتیں نفس انسانی کی ایک صفت ہیں اس لئے ان کو اسلام سے اور ان کو ایمان سے زیادہ تعلق ہے۔ اسی طرح اکثر احادیث میں اسلام کی تفسیر میں اعمال ظاہرہ کا تذکرہ برابر پایا جاتا ہے اور ایمان کا بیشتر تعلق باطن سے معلوم ہوتا ہے۔ حدیث جبرئیل جو اس باب کی نہایت اہم حدیث ہے اسی فرق پر مبنی ہے اس کی تفصیل عنقریب آپ کے سامنے آنے والی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے اسلام و ایمان کا باہمی ربط بھی حل ہو گیا یعنی کیا اسلام بلا ایمان کے یا ایمان بلا اسلام کے پایا جا سکتا ہے۔ اختلافات کی کثرت نے یہاں بھی حیرت میں مبتلا کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک امام سبکیؒ کی رائے بہت وزنی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اسلام تو انقیاد ظاہری کا نام ہے مگر ایمان باطن اس کے لئے شرط ہے۔ اسی طرح ایمان تو انقیاد باطن کو کہتے ہیں مگر انقیاد ظاہری بھی

---

[1] سماحت و صبر حضرت حسنؒ کی تفسیر میں قرآن کریم کی آیت اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا یعنی انسان بڑا ہی بے صبرا ہے جب اسے مصیبت پہنچے تو گھبرا جاتا ہے اور جب راحت نصیب ہو تو بخیل بن جاتا ہے ان دونوں صفتوں کے منافی ہے۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ [2] تہذیب ج ۱۲ ص ۲۰۲۔

اس کے لئے ضروری ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام بلا ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے شرعاً معتبر نہیں ہوتا۔ علامہ زبیدیؒ[1] نے اس تلازم پر شافعیہ اور حنفیہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ حدیث کے عام نظریہ میں ایمان و اسلام بالکل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف خصوصیات کا کچھ فرق ہے ورنہ کم از کم تلازم ضرور ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ[2] نے یہاں قرآن کریم سے ایک لطیف استنباط فرمایا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ	کیوں نہیں؟ جس نے تسلیم کر دیا اپنی ذات کو اللہ کے
مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ	اور وہ نیک کام بھی کرتا ہے تو اسی کے لئے ہے اس کا
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ[3]	ثواب اس کے رب کے پاس۔ اور نہ ان پر خوف ہے اور
(بقرہ)	نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارٰى	بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے
وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	اور نصاریٰ اور صابئین، جو ایمان لایا ان میں سے اللہ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	اور روز قیامت پر اور نیک کام کئے تو ان کے لئے ہے
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ)	پروردگار کے پاس ان کا ثواب ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں اسلام اور عمل صالح پر جو وعدہ فرمایا گیا ہے دوسری آیت میں وہی وعدہ ایمان اور عمل صالح پر کیا گیا ہے۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام دونوں متلازم چیزیں ہیں۔ ابو طالب مکیؒ نے اس مضمون پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے اور اس کی خوب ایضاح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مثال ایسی ہے جیسی شہادتین کی۔ کہ گو شہادت وحدانیت اور شہادت رسالت دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر ان میں ایسا ارتباط ہے کہ حکماً گویا ایک ہی ہیں۔ رسالت کے بغیر شہادت وحدانیت کا اعتبار نہیں ہوتا اور شہادت وحدانیت بلا شہادت رسالت کے بیکار رہتی ہے۔ ایک انسان کے لئے جس طرح قلب کی ضرورت ہے اسی طرح جسم کی ضرورت بھی ہے نہ کوئی قالب بلا قلب کے زندہ رہ سکتا ہے نہ قلب بلا قالب کے بسر کر سکتا ہے۔ جیسے کہ دو حصے ہوتے ہیں ایک اوپر کا کپڑا دوسرا اندرونی جیب نہ کپڑا بلا ... جیب کے تنہا رہ سکتا ہے اور نہ صرف

---

[1] اتحاف ج ۲ ص ۲۵۲۔ [2] کتاب الایمان ص ۲۰۔ [3] لا خوف علیہم میں جملہ صیغہ واحد اور لا ہم یحزنون میں جمع کے صیغے استعمال کرنے کا نکتہ حافظ ابن تیمیہؒ نے بہت لطیف لکھا ہے دیکھو کتاب الایمان ص ۲۰۲۔

جوب بالکل پڑے کے غیر کہا ئی جا سکتی ہے کلام کی حقیقت دو ہونٹ اور ایک زبان سے قائم ہے دونوں ہونٹ حروف جمع کر دیتے ہیں اور زبان ان کو بشکل کلام ادا کر دیتی ہے اگر ایک ہونٹ نہ رہے تو کلام کی حقیقت باطل ہو جاتی ہے ٹھیک اسی طرح اعمال ظاہرہ اور اعتقاد باطن یعنی اسلام و ایمان کا ارتباط ہے صرف اعمال ظاہرہ بلا اعتقاد باطن کھلا ہوا نفاق ہیں اور محض اعتقاد باطن بدون اعمال ظاہرہ کے کفر کی ایک صورت ہے۔ اسلام یا ایمان کو اسی وقت معتبر کہا جا سکتا ہے جبکہ اعمال ظاہرہ کے ساتھ تصدیق باطن ہو اور تصدیق باطن کے ساتھ اعمال ظاہرہ بھی ہوں۔ قرآن کریم نے کفر کو ایمان و اسلام ہر دو کا مقابل قرار دیکر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ — خدا تعالیٰ بھلا اس قوم کو کیسے ہدایت دے جنھوں نے ایمان جیسی نعمت کے بعد پھر کفر اختیار کیا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ — یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مسلمان ہو چکو اور پھر تم کو کفر کا حکم دے

پہلی آیت میں کفر کو ایمان کے بالمقابل اور دوسری آیت میں اسلام کے بالمقابل رکھا گیا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام و ایمان ایک دوسرے سے جدا چیزیں نہیں ہیں اسلام کا ترک کرنا ایمان کا ترک کرنا ہے اور ایمان کا ترک کرنا اسلام کا ترک کر دینا ہے اور نتیجہ ہر دو کا ہی ایک کفر ہے۔[1]

غرض اعمال ظاہرہ بلا اعتقاد باطن صحیح نہیں ہو سکتے اور نہ اعتقاد باطن بلا اعمال ظاہرہ کی شہادت کے ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہر مسلم کے لئے ایمان اور ہر مومن کے لئے اسلام ضروری اور ناگزیر ہے۔ حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ تصدیق قلبی جب پھوٹ کر جوارح پر نمودار ہو جاتی ہے تو اس کا نام اسلام ہو جاتا ہے اور اسلام جب دل میں اتر جاتا ہے تو ایمان کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ ایک ہی حقیقت ہے اختلاف مواطن سے اس کے نام مختلف ہو گئے ہیں ہمارے نزدیک استاذ مرحوم کا بیان اسلام کامل اور ایمان کامل سے متعلق ہے اور غالباً اس کا منشا امام غزالی کی وہ تحقیق ہے جس کا بیان آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہر ایک مذہب کے اختلافات بھی اپنی جگہ صحیح وجوہ و اسباب پر مبنی ہیں مگر جو تعبیر یہاں بیان ہوئی ہے وہ عامۃ الناس کے حق میں زیادہ نافع ہے تفصیل کے لئے علم کلام ہے۔

ایمان میں زیادت و نقصان کی بحث

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایمان قلب میں مختلف راستوں سے داخل ہوتا ہے کبھی ایمان ربانی کا تحفظ التزام طاعت کا داعی ہوتا ہے جیسا کہ عطفاء کرام کا اسلام کبھی چند

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۱۰۰

اسلام مع حسن نوشی کی طرح التزام طاعت پر مجبور کر دیتی ہے جیسا کہ مؤلفۃ القلوب کا اسلام کبھی محض قومی تقلید اور مجبوریوں کا اتباع اس کا محرک بن جاتا ہے جیسا کہ اکثر اعراب کا اسلام ان سب صورتوں میں اگر سینہ ان کی ملوثوں سے خالی ہو چکا ہے اور نفس نے دین الٰہی میں داخل ہو جانے کی تیاری کر لی ہے تو وہ یقیناً مسلمان ہے مگر ایسا اسلام ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ شبہات اس کے یقین کو متزلزل کر سکتے ہیں۔ ذرا ذرا سی تکلیفیں اس کو اپنے مذہب سے پھیر سکتی ہیں۔ مذہب کے لئے قربانی کا اس میں کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ جہاد کی دعوت اس کے لئے پیام موت ہوتی ہے۔ آیات ربانیہ کا پیہم نزول اس کے ایمان میں کچھ افزونی نہیں بخشتا اور اسی امن و عافیت کی زندگی میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہی ایک اسلام ہے اور آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا ولما يدخل الايمان في قلوبكم.	یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ ابھی آپ کہیے کہ ایمان تو نہیں لائے البتہ اسلام صرف تو ابھی ظاہر تک ہے۔ ایمان ابھی ہے کہ آئندہ دلوں تک اتر جائے۔

یہ اسلام کے وجود شخصی کے ابتدائی حالات ہیں لیکن جب یہ ایمان اور ترقی کرتا ہے تو اس کی صورت کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ اہل ایمان کی صحبت سے یہ اسلام رنگ جاتا ہے کبھی آیات قرآنی پر غور و تفکر ایمان کی ترو تازگی کا باعث بن جاتا ہے کبھی محض موعظہ حسنہ کشاں کشاں ایمان حقیقی تک لے آتی ہے۔ یہاں تک وہ دیکھتا ہے کہ پہلے جو قلب ظلمت کدہ تھا اب نور ایمانی سے وہی آئینہ بن گیا ہے حقائق ایمانیہ آنکھوں کا منکشف ہونے لگی ہیں۔ یہ اسلام اب ہر روز ایک نئی تازگی بخشتی ہے جبلی جنگ کی آواز صدائے سروش نظارہ شعبان روحانی معلوم ہوتی ہے۔ آیات قرآنیہ کی تلاوت وہ کام کرتی ہے جو ابر رحمت کے قطرے کھیتوں میں۔ قسمت اس کو جس طرح آزماتی ہے مگر ہر امتحان اس کے لئے ایک نیا یقین بخشتا ہے۔ عبادت میں دلچسپی کا سوال درمیان سے ہٹ جاتا ہے۔ فتح و ظفر اور شکست و ہزیمت سب برابر نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح انقیاد باطن کی ایک کیفیت تام طاری ہو جاتی ہے۔ آپس کے تعلقات نظر سے گر جاتے ہیں اور صرف ایک تعلق رہ جاتا ہے اور وہ خدا کا تعلق ہے اب جس سے محبت ہے اسی کی خاطر ہے اور جس سے جنگ ہے اسی کے نام پر ہے ایک دن مومن تھا اور اب یہ یک مومن ہے اسی کا نام ایمان کی زیادتی ہے اب آیات ذیل کو غور سے پڑھو۔

(۱) انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله	مومن صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ	نام آئے تو خوف زدہ ہو جائیں اور جب اس کی آیات ان
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا	پر تلاوت کی جائیں تو ان کے ایمان اور بڑھ جائیں
اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا	نہایت خلوص کے ساتھ پڑھیں اور ہمارے بخشے ہوئے مال میں
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ	سے کچھ مصارف خیر میں بھی صرف کرتے رہیں۔ یہی نیک
الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔	مومن تو ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زیادتی سے مراد صرف تصدیق ہے ہرگز نہیں بلکہ جب کبھی ایک مومن کو ثبات و استقامت اور طاعت سے کلام پاک کو سنتا ہے تو ہر بار رسائی پر غور و فکر اس کے قلب میں جنت کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف، خدا تعالیٰ کی ایک نئی محبت اس کی طاعت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور اسی کا نام قرآن کریم نے ایمان کی زیادتی رکھا ہے۔

عمرو بن حبیب صحابی فرماتے ہیں کہ جب ہم خدا کی تسبیح و حمد میں مشغول ہوں تو یہی ایمان کی زیادتی ہے اور جب غفلت و نسیان میں مبتلا ہو جائیں تو یہی کا نام ایمان کا نقصان ہے حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لئے سمجھ کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی نگرانی کرتا رہے کہ بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے۔

صحابہ کرام کا چونکہ دن رات کا یہی ایک مشغلہ تھا کہ وہ اپنے ایمان کا جائزہ لیا کرتے جب کوئی آیت اترتی تو اپنے سینے میں ایک نئی زیادتی اور تازگی محسوس کرتے اور کفار کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ اس جذبہ کا تمسخر اڑاتے اور مذاق بنایا کرتے۔

فَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ	جب کوئی سورت اترتی تو ان میں ایک جماعت ایسی
يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا	بھی تھی جو یہ پوچھتی بھلا تم میں سے کس کا ایمان بڑھا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ	یہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں ان کے ایمان میں تو ترقی ہوئی
يَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ	اور انہوں نے تری بشارت حاصل کی لیکن جن کے دلوں میں
مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ	روگ تھا ان کی نجاست میں اور اضافہ ہو گیا۔

آیات قرآنی کا ادب و یقین سے مطالعہ یقیناً ایمان میں ترقی بخشتا ہے۔ یہ ترقی کبھی جدید جدید علوم حاصل ہونے سے پیدا ہوتی ہے کبھی سکینت و فرحت کی صورت میں میسر آتی ہے۔ کبھی ہدایت کے نام سے موسوم ہوتی ہے پہلی آیت میں اسی کا نام استبشار ہے۔

(۲) وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ	اس روز مومنین خدا کی نصرت پر مسرور ہوں گے۔

یہاں اس زیادتی کو فرح و مسرور سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ

خدا ہی کی وہ ذات تھی جس نے مومنین کے دلوں پر سکینت و اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی تاکہ ان کے پہلے ایمان میں مزید ترقی ہو۔

(۴) فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا۔

خدا تعالیٰ نے اپنا سکینہ اپنے رسول اور مومنین پر نازل فرمایا اور ایسا لشکر بھیجا جس کو تمہاری آنکھوں نے دیکھا (یعنی فرشتے)۔

(۵) إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا۔

جبکہ وہ دونوں غار میں پوشیدہ تھے اور رسول خدا اپنے رفیق کو سمجھا رہے تھے کہ غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے تو خدا نے اس پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکر کے ذریعے سے قوت پہنچائی جس کو تم نے نہیں دیکھا۔

(۶) وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔

جو لوگ ہدایت یافتہ تھے خدا نے ان کو مزید ہدایت عطا فرمائی۔

آیات بالا میں سکینہ، یقین و ہدیٰ سب صفات قلبیہ ہی کے مراتب ہیں۔ یہ یقین کر لینا کہ یہ سب مقدرات ہیں جو ضرور پیش آ کر رہیں گی تقدیر پر ایمان کا ثمرہ ہے اور اسی کا نتیجہ سکینہ و اطمینان و تسلیم ہے۔

یہ ایمان جب اور عروج کرتا ہے تو رب ایک ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ پر وہ توکل و اعتماد میسر آتا ہے کہ دشمن کی دھمکی اور دلیری کا باعث بن جاتی ہے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ۔

یہ وہ جماعت ہے جن کو کفار نے دھمکی دی کہ تم سے لڑنے کو بڑی فوج تیار کی گئی ہے تو ڈر جاؤ تو اس پر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور بولے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

اس قسم کا ایک امتحان نہیں بلکہ سخت سے سخت مصائب میں مبتلا کر کے ان کا بار بار امتحان لیا جاتا ہے۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا۔ مگر شک و تردد کا ایک کانٹا بھی ان کے دامن یقین پر نہیں چبھتا۔ وہ کوہ استقامت اور یقین کی ایک چٹان بن جاتے ہیں کہ مصائب کے لشکر اگر ان سے ٹکراتے ہیں تو خود پاش پاش ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنی جگہ سے ذرا حرکت نہیں دے سکتے۔ جان و مال کی قربانی ان کے نزدیک ایک معمولی بات ہوتی ہے۔ اس امتحان

کے بعد اب ایک مومن اپنے دعوی میں سچا مان لیا جاتا ہے۔

(۸) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔

مومن صرف وہ لوگ ہیں جو ایک مرتبہ جب خدا رسول پر ایمان لے آئے تو پھر شک و شبہ کے پاس نہ پھٹکے بلکہ جان سے مال سے خدا کے راستے میں قربان ہو گئے یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

اگر بتقاضائے بشریت کبھی ان سے ذرا کمزوری ظاہر ہو جاتی تو قرآن فوراً تنبیہ کر دیتا ہے اور تفہیم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا کہ ایمان جو صرف عشق کی راہ ہے کمزوری اور بزدلی سے طے ہونے والی نہیں ہے ؎

ایں مشربِ عاشقیست خسرو
بے خونِ جگر چشید نتواں

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ

تم نے کیا یہ خیال کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تو اللہ نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جان و مال کی قربانی کے لئے تم میں کون کون تیار ہے۔

خدا کی راہ میں ایک بڑی قربانی یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے باپ، بیٹا، بھائی، قبیلہ سب کو ایک طرف رکھ دیا جائے یعنی ساری محبتوں اور عداوتوں کا محور ایک خدا کی ذات رہ جائے۔

(۹) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ

یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو آپ خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کا برتاؤ کرتا دیکھیں خواہ وہ ان کے والد یا اولاد یا بھائی یا قبیلہ کے کیوں نہ ہوں یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان نہایت مضبوط قائم ہو چکا ہے۔

اسی لئے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ۔

حالانکہ اگر کہیں یہ لوگ اللہ، نبی اور نبی پر نازل شدہ دین کا یقین رکھتے تو ان کو دوست بناتے مگر بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ حکم عدولی کرنے والے ہیں۔

تیسری جگہ ارشاد ہے

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ
وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ
اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ
إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي
سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ
بِأَمْرِهِ ۔ (توبہ)

اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر ایسا ہو کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے
بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے،
تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، تمہارے
رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں یہ ساری چیزیں تمہیں
اللہ سے، اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے
زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ
تمہارے سامنے آ جائے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جو ایمان کے زیادت و نقصان پر برہان قاطع ہیں مگر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس کا تعلق ایمان کے دوسرے معنی سے ہے جو وجود ذہنی یعنی نفس تصدیق سے نہیں [1]

اسلام و ایمان کے چند مباحث ہیں ان کی روشنی میں اب آپ بسم اللہ کرکے کتاب الایمان کی احادیث پڑھنا شروع کیجئے۔ جو مباحث یہاں رہ گئے ہیں وہ تشریحی نوٹوں میں موقع بموقع آپ کے ملاحظہ کے لئے آئیں گے لیکن ہر بحث کو پڑھتے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ان بحثوں اور تفصیلوں کے صحیح مخاطب وہی افراد و اشخاص ہیں جو اسلام و ایمان کی روشنی خود اپنے قلب میں رکھتے ہیں۔ اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اس کو اور روشن کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جن افراد کے قلوب میں سرے سے مذہب کے حقوق ہی نہیں رہا ہے تو بٹے ہوئے اور الجھے ہوئے ہیں ایسے اصحاب کو اس سلسلہ کے لئے پہلے کسی اور کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے جن کے نقطۂ نظر سے جو مباحث ضروری ہیں وہ اس کتاب میں غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیئے گئے کیونکہ ان کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف احادیث نبویہ کی تشریح منظور ہے اور ان متن میں جو تفصیل طلب امور ہیں یا جو شبہات پیدا ہو سکتے ہیں ان کی حسب مقدور توضیح و تفصیل کی گئی ہے۔ توحید و رسالت کے عقلی اثبات کا محل علم کلام ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ واللہ الموفق۔

---

[1] حافظ ابن تیمیہ نفس تصدیق میں بھی تشکیک کے قائل ہیں دیکھو کتاب الایمان ص ۲۰۹ و ۱۹۶۔

كتاب الايمان والاسلام

فضل الايمان والاسلام

آية محبة الله عز وجل التوفيق للايمان

(۱۹۳) عن عبد الله قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن الله قسم بينكم أخلاقكم كما قسم بينكم أرزاقكم وإن الله يعطي الدنيا من يحب ومن لا يحب ولا يعطي الإيمان إلا من يحب۔ (رواه الحاكم في المستدرك ج۱ وقال الذهبي صحيح الاسناد۔)

کتاب الایمان والاسلام

ایمان اور اسلام کی فضیلت

خدا کے یہاں مقبولیت کی پہچان ایمان جو سرمایۂ دولت ہے

(۱۹۳) عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس طرح تم میں روزی کی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے اخلاق کی بھی تقسیم کر دی ہے (جیسے رزق تنگ و فراخ ملتا ہے ایسے ہی اخلاق بھی کسی کے تنگ اور کسی کے وسیع ملے ہیں) اور دنیا تو (سب ہی کو دیتا ہے) اس کو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبت نہیں کرتا لیکن دولت ایمان صرف اسی کو دیتا ہے جس کو محبوب رکھتا ہے

(۱۹۳) انسان کی تمام شرافت و کمال اس کی قوت نظریہ اور قوت عملیہ کے کمال پر موقوف ہے ان دونوں کے سنور جانے کا دوسرا نام ایمان اور عمل صالح ہے کفر و ایمان کی تقسیم انہی کے بگڑنے اور سنورنے پر دائر ہے جس کی یہ دونوں قوتیں سنور گئیں وہ مشرف بایمان ہو گیا اس کی تکمیل ہو گئی۔ اسی لئے سورۂ والتین اور سورۂ والعصر میں انسانی شرافت کو ان ہی کے ساتھ بیان فرما کر بتایا گیا ہے کہ اس کے اسفل سافلین اور ابدی خسارہ سے نجات کی صرف یہی راہ ہے اور وہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ حریت انسان کی سب سے بڑی شرافت ہے اور عبدیت اس کے لئے بڑا عیب ہے لیکن اگر حریت کے ساتھ ایمان اور عمل صالح نہ ہو اور عبدیت کے ساتھ ایمان میسر آجائے تو حریت کی شرافت شرافت نہیں رہتی اور عبدیت کا عیب عیب نہیں رہتا۔ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ ایک مسلمان غلام ایک آزاد مشرک سے بدرجہا افضل ہے۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون

(۳۰۴) عَنْ عُمَرَ قَالَ لَمَّا کَانَ یَوْمُ خَیْبَرَ قُتِلَ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَہِیْدٌ حَتّٰی مَرُّوْا عَلٰی رَجُلٍ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَہِیْدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَلَّا اِنِّیْ رَاَیْتُہٗ فِی النَّارِ فِیْ بُرْدَۃٍ اَوْ عَبَاءَۃٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْہَبْ فَنَادِ فِی النَّاسِ اَنَّہٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ. فَنَادَیْتُ اَلَا اِنَّہٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (اخرجہ ابن ابی شیبۃ واحمد ومسلم والترمذی والدارمی وابن حبان)

جنت میں صرف مومن جائیں گے

(۳۰۴) عمرؓ سے روایت ہے کہ جب خیبر کی جنگ ہوئی تو اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ شہید ہوگئے۔ لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ فلاں فلاں شہید ہوگئے یہاں تک کہ وہ ایک اور مقتول پر گذرے تو اس کے متعلق بھی یہی کہا کہ فلاں صحابی شہید ہوگیا۔ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں میں نے اس کو ایک چادر یا عبا چرانے کی سزا میں دوزخ میں دیکھا ہے۔ اس کے بعد آپ نے عمرؓ سے فرمایا جاؤ اور لوگوں میں یہ اعلان کردو کہ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو مومن یعنی پورے پورے ایماندار ہیں۔ میں گیا اور میں نے یہ اعلان کردیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہاں معلوم ہوں خدا کے دوست و دشمن کی تقسیم کا معیار دولت نہیں بلکہ ایمان و کفر ہے۔ دنیا کی دولت دوست و دشمن سب کے مشترک رکھی گئی ہے لیکن ایمان کی دولت صرف دوستوں کے حصہ میں دی گئی ہے۔

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند　　سوز دل پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار　　این دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

(حاشیہ صفحہ ھذا) (۳۰۴) یہ حدیث یہاں کچھ صرف یہ بتاتی ہے کہ جنت صرف مومنوں کا حصہ ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان مومن کے خطاب کو حاصل کرنے میں ایک بے قیمت چادر بھی کس طرح سے مانع ہوسکتی ہے۔ یہ بھی کہ جنت کی سہولت بغیر خدا تعالیٰ کی توثیق کے حاصل نہیں ہوسکتی اور یہ کہ محض خطاب بھی کچھ نہیں دیتا۔ زمانہ یا ایک شخص کو شہید کہہ دیتا ہے لیکن اسلام اب بھی اس کو امتیاز کا خطاب نہیں دیتا۔ کوئی شخص صرف ایک بار کلمہ طیبہ پڑھ لینے سے تو عذاب الٰہی کی گرفت سے نجات پانے کا مستحق ہوجاتا ہے لیکن مومن کے معزز خطاب کا اس وقت تک مستحق نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی نظری اور عملی زندگیوں کی ترتیب کامل نہ ہوجائے یعنی وہ معتقدات اور اعمال کا پورے طور پر پابند ہوجائے اور اس پابندی میں وہ کچھ آزادی محسوس کرنے لگ جائے۔ اس کے بعد جنت کا مستحق نہیں بلکہ جنت اس کی مستحق ہوجائے گی۔

(۱۹۴) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تدخلوا الجنۃ حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا اولا ادلکم علی شیء اذا فعلتموہ تحاببتم افشوا السلام بینکم۔ (رواہ مسلم)

بشارۃ کمال الدین لم یعط احد من الامم

(۱۹۵) عن عمر بن الخطاب ان رجلا من الیہود قال لہ یا امیر المؤمنین آیۃ فی کتابکم تقرؤنہا لو علینا معشر الیہود نزلت لاتخذنا ذلک الیوم عیدا قال ای آیۃ قال (الیوم

(۱۹۴) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک باہمی محبت نہ کرو گے پورے مومن نہیں ہو گے تو کیا میں تم کو وہ بات نہ بتلاؤں کہ جب اس کے خوگر ہو جاؤ تو باہمی محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے) کہ آپس میں ہر شخص کو سلام کیا کرو خواہ وہ آشنا ہو یا ناآشنا۔

کمال دین کی بشارت اس امت کے سوا کسی کو نہیں دی گئی

(۱۹۵) عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے کہا اے امیر المؤمنین آپ کے قرآن میں ایک آیت ہے جسے آپ لوگ پڑھتے ہیں اگر کہیں وہ ہم یہودیوں کے لئے نازل ہوتی تو ہم اس دن عید منایا کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے، اس نے کہا یہ آیت (آج ہم تمہارا دین کامل کر چکے

(۱۹۴) اس حدیث میں ایمان کو محبت پر اور محبت کو سلام پر معلق کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض اعمال باہمی [illegible] کو معمولی نظر آتے ہیں مگر دوسرے اہم مقصد کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں سلام بظاہر ایک معمولی عمل ہے لیکن اس کا نتیجہ باہمی الفت و محبت ہے محبت صرف ایک جذبہ ہے [illegible] مگر اس کے بعد وہ ایمان کا ایک مستقل سبب بن جاتی ہے اصل بات یہ ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہی کا دوسرا نام ہے خدا کی محبت کی بنا پر رسول کی محبت [illegible] صحابہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اسی طرح درجہ بدرجہ مومنین کی محبت [illegible] ان کی محبت کا معیار [illegible] مسلمانوں کی محبت کا نتیجہ ایمان باللہ [illegible] مومنین کی محبت [illegible] ہے اسی لئے مومن سے بغض و کینہ کی [illegible] آدمی کے اسلام پر [illegible] قرآن کریم میں یہ دعا تعلیم کی گئی ہے ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا (اور ہمارے دلوں میں اس جماعت سے کینہ نہ رکھ جو ایمان لا چکی ہے) اس کینہ کو دور کرنے کا سب سے سہل اور فطری تدبیر سلام ہے اسی لئے [illegible] سلام ہے۔ اس بیان کا اقتضا [illegible] اسلام [illegible] ایک رکن کی حیثیت [illegible] لیکن [illegible] ان کی اہمیت کے باوجود شریعت نے ان کو رکن کا درجہ نہیں دیا بلکہ ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے [illegible] ایمان کا صرف ایک شعبہ قرار دی گئی ہے [illegible]

أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواه البخاري ومسلم والترمذي عن ابن عباس)

بشارة المغفرة للمؤمن العاصي

(۱۹۶) عَنْ أَبِي ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَتَانِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَبَشَّرَنِي أَنَّهُ مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِكَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَإِنْ زَنَى وَإِنْ سَرَقَ

تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے حق میں دین صرف اسلام کو پسند کر لیا۔ عمرؓ نے فرمایا ہم وہ دن بھی جانتے ہیں اور وہ جگہ بھی جانتے ہیں جہاں یہ آیت آپ پر اتری تھی جمعہ کا دن تھا اور عرفات کا میدان تھا جہاں آپ کھڑے ہو کر وقوف فرما رہے تھے (یعنی اس دن ہماری دو عیدیں تھیں)۔

مومن عاصی کے حق میں مغفرت کی بشارت

(۱۹۶) ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور یہ خوشخبری لائے کہ آپ کی امت میں جو شخص اس حال پر مرے کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھہرایا ہو تو وہ جنت میں جائے گا میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنا (جیسے کبائر کا) ارتکاب کیا ہو آپ نے فرمایا

(۱) یہود و نصاریٰ اسلام کے ساتھ جس رقابت کا تعلق رکھتے تھے اس پر تو یہاں بحث نہیں [illegible] دین کی بے تعلقی اسلام کی کتنی [illegible] کرتے تھے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ آیت نازل ہوئی تو ان کی حسرت کی صدا یہ تھی کہ ان کے پاس شریعت تورات جیسی بسیط شریعت موجود ہونے کے باوجود تکمیل دین کی جو داستان ان کے حصہ میں نہ آئی اور آج قرآن کے حصہ میں جو بشارت ان کے رقیب اسلام کے مقابل میں آئی تھی اس سے جب ان سے کچھ بس نہ چلا تو کہا کہ اگر یہ آیت ہمارے حق میں اترتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو عید منایا کرتے۔ ان کے اس کلام پر حضرت عمرؓ نے یہ جواب دیا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس دن تو قدرتی طور پر ہماری دو عیدیں تھیں۔ قرآن کریم کی یہ ایک ہی بشارت درحقیقت کئی جملوں پر مشتمل ہے۔ اگر ان کی جداجدا تفصیل کی جائے تو ایک مستقل کتابچہ بن جائے گا ہم یہاں ابن عباسؓ کے صرف وہ کلمات نقل کرنے پر کفایت کرتے ہیں جو انہوں نے اس بشارت کی تشریح میں بحیثیت مفسر قرآن بیان فرمائے تھے۔

ترجمہ: ہم تمہارا [illegible] تو اب تمہیں کبھی کسی زیادتی کی ضرورت نہ پڑے گی اور اپنی نعمت پوری کر چکے تو اب یہ دین کبھی ناقص نہ ہوگا اور تمہارے حق میں ہمیشہ کے لئے یہی دین پسند کر چکے تو کبھی اس سے ناراض نہ ہوں گے (ابن کثیر ج ۲ ص ۱۳)

شریعت موسویہ چند امور میں گو کامل ہی شریعت تھی مگر چونکہ ان کے بعد ان میں پھر زیادتی کی ضرورت پیش آگئی مزید برآں یہ کہ وہ دین عرصہ تک محفوظ بھی نہ رہ سکا [illegible] اتباع منصب نبیہم وحقائق کی تعیین کی [illegible]۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(١٩٨) عن أبي ذر قال خرجت ليلة من الليالي فإذا رسول الله صلى الله عليه وسلم يمشي وحده
ليس معه إنسان قال فظننت أنه يكره أن يمشي معه أحد فجعلت أمشي في ظل القمر فالتفت
فرآني فقال من هذا قلت أبو ذر جعلني الله فداءك قال يا أبا ذر تعاله قال فمشيت معه ساعة فقال
إن المكثرين هم المقلون يوم القيامة إلا من أعطاه الله خيرا فنفح فيه يمينه وشماله وبين يديه
ووراءه وعمل فيه خيرا قال فمشيت معه ساعة فقال لي اجلس هاهنا قال فأجلسني في قاع
حوله حجارة فقال لي اجلس هاهنا حتى أرجع إليك قال فانطلق في الحرة حتى لا أراه فلبث عني
فأطال اللبث (وفي باب من أجاب بلبيك وسعديك فسمعت لغطا وصوتا فتخوفت أن يكون عرض لرسول الله
صلى الله عليه وسلم فأردت أن أذهب ثم ذكرت قول رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تبرح فمكثت قلت يا رسول الله سمعت
صوتا تخوفت أن يكون عرض لك) ثم إني سمعته وهو مقبل وهو يقول وإن سرق وإن زنى قال
فلما جاء لم أصبر حتى قلت يا نبي الله جعلني الله فداءك من تكلم في جانب الحرة ما سمعت أحدا
يرجع إليك شيئا قال ذلك جبريل عرض لي في جانب الحرة قال بشر أمتك أنه من مات لا يشرك
بالله شيئا دخل الجنة قلت يا جبريل وإن سرق وإن زنى قال نعم قال قلت وإن سرق وإن زنى قال
نعم قلت وإن سرق وإن زنى قال نعم وإن شرب الخمر (رواه البخاري في الرقاق)

(١٩٨) ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رات کو باہر نکلا کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
تن تنہا جا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں ہے میں نے سمجھا کہ آپ نے اپنے ساتھ کسی کو لینا مناسب نہیں سمجھا ہو گا
لہذا میں چاندنی سے ہٹ کر اندھیرے سایہ میں چلتا رہا آپ نے رخ پھیرا تو مجھے دیکھا فرمایا کون ہے میں نے کہا آپ پر قربان
میں ہوں ابوذر۔ فرمایا اے ابوذر یہاں آؤ میں کچھ دیر آپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر آپ نے فرمایا جو لوگ یہاں بہت مالدار
ہیں قیامت میں وہی سب سے زیادہ نادار ہوں گے مگر صرف وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا تو اس نے دائیں بائیں
آگے پیچھے ہر طرف خیرات کو خوب لٹایا اور خوب اچھے اچھے کام کئے۔ پھر میں تھوڑی دیر ساتھ چلا تو مجھ سے فرمایا
یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ایک صاف میدان میں بٹھا دیا جس کے ارد گرد پتھریلی زمین تھی اور فرمایا کہ جب تک میں واپس
نہ آؤں یہیں بیٹھے رہنا اس کے بعد آپ اس سنگستان کی طرف تشریف لے گئے یہاں تک کہ میری نظروں سے غائب
ہو گئے آپ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی واپس آتے ہوئے میں نے سنا کہ آپ یہ فرماتے آ رہے تھے اگرچہ چوری کی ہو اگرچہ زنا کیا ہو
جب میرے پاس تشریف لے آئے تو مجھ سے نہ رہا گیا آخر میں نے پوچھ لیا یا نبی اللہ میں آپ پر قربان ہوں اس سنگستان میں
آپ کس سے بات چیت کرتے آ رہے تھے میں نے تو آپ کو جواب دیتے ہوئے کسی کی آواز نہیں سنی فرمایا۔ جبرئیلؑ تھے۔ اس
سنگستان میں میرے پاس آئے تھے یہ کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شرک سے پاک و صاف مر گیا*

* بقیہ حدیث یہ ہے کہ میں نے کہا اے جبرئیل اگرچہ اس نے چوری کی ہو یا زنا کیا ہو انہوں نے کہا ہاں میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو
انہوں نے کہا ہاں میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو انہوں نے فرمایا ہاں اگرچہ شراب بھی کیوں نہ پی ہو

الاسلام یھدم ما کان قبلہ من الذنوب

(۱۹۹) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ لَمَّا أَلْقَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي قَلْبِي الْإِسْلَامَ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَايِعَنِي فَبَسَطَ يَدَهُ إِلَيَّ فَقُلْتُ لَا أُبَايِعُكَ حَتَّى تَغْفِرَ لِي مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِي قَالَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَمْرُو أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَجُبُّ مَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوبِ يَا عَمْرُو أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَجُبُّ مَا قَبْلَهُ مِنَ الذُّنُوبِ

(رواہ احمد و سعید بن منصور فی سننہ)

اسلام زمانۂ کفر کے سب گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے

(۱۹۹) عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈالدی تو میں آپ کے پاس حاضر ہوا تاکہ آپ مجھے بیعت فرمالیں آپ نے بیعت کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا میں نے کہا میں اس وقت تک آپ سے بیعت نہیں کروں گا جب تک کہ میرے سب پچھلے گناہ معاف نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا اے عمرو کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہجرت پہلے سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اے عمرو کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام پہلے گناہوں کا تمام قصہ پاک کر دیتا ہے۔

(۱۹۹) قرآن کریم نے رحمت کے اس ضابطہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ۔ (آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ (اپنی ہٹ دھرمی سے) اب بھی باز آجائیں تو ان کے پچھلے قصور سب معاف کر دیئے جائیں گے) جو دین تمام ادیان کو ایک دین بنانا اور سب جتھوں کو ایک ملت بنا دینا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام اہل ملل کی سب سے زیادہ خیر خواہی کرے اور ان کی نجات کے لئے بے چین ہو کیونکہ مذہب کی تمام محنت اسی لئے ہے کہ ہر انسان اپنے خالق کے قریب ہو جائے اور نجات حاصل کرے اور یہ طور فطرت ہر ایک کا حق ہے۔ [illegible] اس لئے اسلام نے اس کا اعلان کیا ہے کہ ہر ایک وقت ہر نسل جنگ کا ہو یا صلح کا جو بھی اس کی آغوش میں آجائے گا اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کے لئے ضامن ہوگا۔

واضح رہنا چاہئے کہ مغفرت کا تعلق ذنوب اور گناہوں کے ساتھ ہے حقوق العباد کے ساتھ نہیں۔ جو قرض، عاریت، امانت اور خرید و فروخت کے سلسلے میں اس کے ذمہ باقی رہ جاتے ہیں۔ اسلام ان سب حقوق کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ اس کی ذمہ داری اور بڑھا دیتا ہے۔ قرض خواہ کا قرض ادا کرنا ہوگا۔ صاحب عاریت کی عاریت ضرور واپس کرنا ہوگی اور امانت والوں کی امانت بھی ان کو سپرد کرنی پڑے گی۔ آیت مذکورہ اور عمرو بن العاص کی حدیث کا تعلق زنا، شراب، قتل، غارت جیسے جرائم اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ ہے جو کفر کے زمانہ میں ارتکاب کئے گئے تھے۔ اسلام کے بعد اب وہ سب معاف ہو جائیں گے اور یہ اس لئے کہ اسلام اس کے کفر و شرک کی اصل بنیاد ہی اکھاڑ چکا ہے کفر ایک موت ہے اور اسلام اس کے بعد ایک حیات نو۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

قَالَ فَقَبَضْتُ يَدِي قَالَ مَا لَكَ يَا عَمْرُو قَالَ قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَاذَا قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِي قَالَ أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَمَا كَانَ أَحَدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا أَجَلَّ فِي عَيْنِي مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أُطِيقُ أَنْ أَمْلَأَ عَيْنِي مِنْهُ إِجْلَالًا لَهُ وَلَوْ سُئِلْتُ أَنْ أَصِفَهُ مَا أَطَقْتُ لِأَنِّي لَمْ أَكُنْ أَمْلَأُ عَيْنِي مِنْهُ وَلَوْ مُتُّ عَلَى تِلْكَ الْحَالِ لَرَجَوْتُ أَنْ أَكُونَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ وَلِينَا أَشْيَاءَ مَا أَدْرِي مَا حَالِي فِيهَا فَإِذَا أَنَا مُتُّ فَلَا تَصْحَبْنِي نَائِحَةٌ وَلَا نَارٌ فَإِذَا دَفَنْتُمُونِي فَشُنُّوا عَلَيَّ التُّرَابَ شَنًّا ثُمَّ أَقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْرَ مَا تُنْحَرُ جَزُورٌ وَيُقْسَمُ لَحْمُهَا حَتَّى أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ وَأَنْظُرَ مَاذَا أُرَاجِعُ بِهِ رُسُلَ رَبِّي. (رواہ مسلم)

(۳۰۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَهْلِ الشِّرْكِ قَتَلُوا فَأَكْثَرُوا وَزَنَوْا فَأَكْثَرُوا فَأَتَوْا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا إِنَّ الَّذِي تَقُولُ وَتَدْعُو لَحَسَنٌ وَلَوْ تُخْبِرُنَا أَنَّ لِمَا عَمِلْنَا كَفَّارَةً فَنَزَلَ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ

عرض کیا میں کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں۔ فرمایا کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا یہ کہ میرے سب گناہوں کی مغفرت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا اے عمرو کیا تمہیں خبر نہیں کہ اسلام (قبول) کرنا پچھلی زندگی کے گناہوں کا تمام تر صفایا کر دیتا ہے اور ہجرت بھی پچھلے تمام گناہ معاف کر دیتی ہے اور حج بھی پہلے سب گناہ ختم کر دیتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آپ سے زیادہ پیارا مجھے عالم میں کوئی نہ تھا اور نہ میری نظروں میں کوئی آپ سے زیادہ با جلال شخص تھا۔ آپ کی عظمت کی وجہ سے میری یہ تاب نہ تھی کہ کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھ سکتا۔ اگر مجھ سے آپ کی صورت پوچھی جائے تو میں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے کبھی پوری طرح آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ کاش اگر میں اسی حال پر مر جاتا تو امید ہے کہ جنتی ہوتا۔ اس کے بعد ہم کچھ چیزوں کے متولی بنائے گئے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا حال ان میں کیا رہا (یہ اشارہ صفین کی طرف تھا) اچھا دیکھو جب میری وفات ہو جائے تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت نہ جانے پائے اور نہ زمانۂ جاہلیت کی طرح آگ میرے جنازے کے ساتھ ہو اور جب مجھے دفن کر چکو تو میری قبر پر اچھی طرح مٹی ڈالنا اور (جب فارغ ہو جاؤ) تو میری قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا جتنی دیر کہ اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم ہو سکتا ہے تاکہ تمہاری وجہ سے میرا دل لگا رہے اور میں یہ معلوم کر لوں کہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے سوالات کے جوابات کیا دیتا ہوں۔

(۳۰۱) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کچھ مشرکوں نے خوب قتل اور خوب زنا کیا پھر آپ کے پاس حاضر ہوئے اور بولے جو باتیں آپ فرماتے ہیں اور جس کی دعوت دیتے ہیں وہ سب ٹھیک۔ کاش آپ ہمیں اس کا بھی اطمینان

وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا) وَنَزَلَ (يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ)۔

(۲۰۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْخٌ كَبِيْرٌ يَدَّعِمُ عَلٰى عَصًا لَهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ غَدَرَاتٍ وَفَجَرَاتٍ فَهَلْ يُغْفَرُ لِيْ قَالَ اَلَسْتَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ بَلٰى وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ قَدْ غُفِرَ لَكَ غَدَرَاتُكَ وَفَجَرَاتُكَ۔ (رواہ احمد والطبرانی وسندہ جید)

(۲۰۳) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهُ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا وَكَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَّتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا (رواہ البخاری فی الایمان)

دلا دیئے کہ جن کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں اُن کے بخشش کی بھی کوئی صورت ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا نہیں مانتے اور جس کا خون اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر بجا طور پر اور زنا نہیں کرتے اور جو یہ باتیں کریں وہ بڑے گناہ میں جا پڑے) اور یہ آیت بھی اتری (اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)۔

(۲۰۲) عمرو بن عبسہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک بڑھا اپنی لکڑی کا سہارا لئے ہوئے آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی یا رسول اللہ میرے بہت سے گناہ ہیں بہت سی خطائیں اور قسم قسم کی بیہودگیاں کر چکا ہوں کیا اسلام کے بعد وہ سب معاف کر دی جائیں گی آپ نے فرمایا کیا تو گواہی نہیں دیتا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی اللہ نہیں اس نے کہا کیوں نہیں میں اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ بھی خدا تعالیٰ کے پیغمبر ہیں آپ نے فرمایا تو جا تیری سب خطائیں اور بیہودگیاں معاف ہو گئیں

(۲۰۳) ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب آدمی مسلمان ہو جاتا ہے اور اس کا اسلام خوبصورت مستحکم ہو جاتا ہے تو جتنی برائیاں وہ پہلے کر گذرا تھا اللہ تعالیٰ سب معاف کر دیتا ہے اور اس کے بعد حساب یہ رہتا ہے کہ ایک نیکی کے عوض میں دس نیکیوں سے سات سو گنا تک نیکیاں مل سکتی ہیں اور برائی کے بدلہ میں صرف ایک برائی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے۔ (تو اب برائی کے بدلہ ایک برائی بھی نہیں لکھی جاتی)۔

---

(۲۰۲) یہ حاصل ضرور اس کا منافی ہو سکتا ہے کہ ہر ہی سے گناہوں کی بخشش ہو جائے۔ اگر تبدیل مذہب کے بعد بھی گناہوں کا بوجھ سر سے ہلکا نہیں ہوتا۔ تو پھر تبدیلی مذہب کا فائدہ؟ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْإِيمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَكَأَنَّمَا ضُرِبَ جِلْدُهُ بِشَوْكِ طَلْحٍ مِنَ الْجُبْنِ أَتَاهُ سَهْمٌ غَرْبٌ فَقَتَلَهُ فَهُوَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّانِيَةِ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَاكَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّالِثَةِ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ أَسْرَفَ عَلٰى نَفْسِهِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَاكَ فِي الدَّرَجَةِ الرَّابِعَةِ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب)

(۲۰۵) عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ سَمِعْتُ الْبَرَاءَ يَقُولُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ بِالْحَدِيدِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أُقَاتِلُ وَأُسْلِمُ قَالَ أَسْلِمْ ثُمَّ قَاتِلْ فَأَسْلَمَ ثُمَّ قَاتَلَ فَقُتِلَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا (بخاری)

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا سر اٹھایا یہاں تک کہ ان کی ٹوپی سر سے گر گئی۔ راوی کہتا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ پہلے صحابی کی مراد کس کی ٹوپی تھی حضرت عمرؓ کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے بعد فرمایا دوسرا وہ شخص ہے جس کا ایمان تو کھرا تھا لیکن وہ (بہادر نہ تھا) جب دشمن کے آمنے سامنے ہوا تو مارے بزدلی کے اس کا حال یہ ہو گیا کہ گویا اس کے جسم میں طلح درخت کے کانٹے چبھو دیے گئے۔ پھر کسی نامعلوم سمت سے ایک تیر آ کر اس کے لگا اور اس کو ختم کر دیا۔ یہ دوسرے درجہ کا شہید ہے۔ تیسرا وہ مخلص درجہ کا مومن ہے جس نے اچھے عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کیے تھے جب دشمن سے لڑا تو ایسی جانبازی سے لڑا کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کی جو شان بیان فرمائی تھی اس کو سچ کر دکھایا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ تیسرے نمبر کا شہید ہے۔ چوتھا وہ شخص ہے جس نے گناہ کرنے کی حد باقی نہ رکھی تھی، مگر بہادر تھا، جب لڑا تو اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کو سچا ثابت کر دیا اور خوب بہادری سے لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ یہ چوتھے نمبر کا شہید ہے۔

(۲۰۵) ابو اسحاق سے مروی ہے کہ میں نے براء کو یہ کہتے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص (زرہ پہنے) سرتاپا لوہے میں ڈھکا ہوا آیا اس نے کہا یا رسول اللہ میں پہلے جہاد میں شریک ہو جاؤں یا پہلے اسلام لے آؤں پھر جہاد کروں آپ نے فرمایا پہلے اسلام قبول کر اس کے بعد جہاد کر چنانچہ وہ پہلے مسلمان ہوا اس کے بعد جہاد کیا اور شہید ہو گیا آپ نے فرمایا اس نے کام تو کم کیا مگر ثواب بہت پائے گا۔

---

(۲۰۵) یعنی زندگی بھر کا برا عمل بھی ایک وزن ہے اور ایمان کی تھوڑی سی گھڑی سب پر بھاری ہے۔ جان نثاری کی تمام قیمت اس وقت ہے جبکہ رضاداری کا طوق گلے میں پڑا ہو ورنہ صرف اتنا کہ خدا کی راہ میں موت ہے جس صورت سے بھی آ جائے جس کو جہاں پائے۔ اسی سے آپ نے اس شخص کو پہلے اسلام لانے کا مشورہ دیا۔ اس پر تعجب نہ کر کہ شرک و کفر تو اسلام سے معاف ہو گئے تھے پھر اس مختصر سی مدت میں جو عمل اس نے کیا وہ شہادت تھا اس لئے اس کے عمل کی مدت گو بہت قلیل رہی مگر ثواب کے لحاظ سے بڑی بیش بہا تھی۔ اس حدیث کو ایک لطیفہ سمجھا گیا ہے یعنی بخاری نے [illegible] ایمان کا مصداق ہے کہ عمل خیر کی برکت ثابت قدمی میں ہے۔

مثل الذي يقرأ القرآن ولا يؤمن كالريحانة ريحها طيب وطعمها مر

(٢٠٦) عن أبي موسى عن النبي صلى الله عليه وسلم قال المؤمن الذي يقرأ القرآن ويعمل به كالأترجة طعمها طيب وريحها طيب والمؤمن الذي لا يقرأ القرآن ويعمل به كالتمرة طعمها طيب ولا ريح لها ومثل المنافق الذي يقرأ القرآن كالريحانة ريحها طيب وطعمها مر ومثل المنافق الذي لا يقرأ القرآن كالحنظلة طعمها مر أو خبيث وريحها مر (بخاري)

بشارة التضعيف بعشر أمثالها لمن أسلم

(٢٠٧) حدثنا أبو هريرة عن محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الله تعالى إذا تحدث عبدي بأن يعمل حسنة فأنا

اس کی مثال جو ایمان نہیں رکھتا اور قرآن پڑھتا ہے ریحان کی طرح ہے کہ جس کی خوشبو اچھی مگر ذائقہ تلخ ہوتا ہے

(۲۰۶) ابو موسیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو مومن قرآن پڑھتا اور اس پر عمل بھی کرتا ہے وہ ترنج کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی اور جو قرآن نہیں پڑھتا مگر اس کے احکام پر عمل کرتا ہے وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ تو اچھا مگر خوشبو کچھ نہیں اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ریحان (ناز بو) کی سی ہے جس کی خوشبو تو بہت اچھی مگر ذائقہ تلخ اور جو قرآن بھی نہیں پڑھتا اس کی مثال درخت حنظل کی سی ہے جس کا ذائقہ بھی تلخ اور بو بھی ناگوار۔ (بخاری شریف)

جو اسلام لے آئے اس کے لئے ایک نیکی پر دس نیکیوں کی بشارت

(۲۰۷) ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرا بندہ جب اپنے دل میں کوئی نیک کام کرنے کا خیال کرتا ہے تو صرف اس خیال پر میں

---

(۲۰۶) یعنی جس طرح پھل کی صرف خوشبو سے اس کے ذائقہ کا اندازہ معلوم نہیں ہوتا اسی طرح صرف قرآن پڑھنے سے کسی کے ایمان کا حال نہیں کھلتا اور جس طرح پھل کی اصل تعریف یہی ہے کہ خوش ذائقہ ہوتا ہے صرف اس کی خوشبو ضمنی و طفیلی تعریف ہے اسی طرح مومن کی اصل خوبی ایمان ہے صرف تلاوت قرآن نہیں یہ مومن کے ایمان کی زینت ہے نہ کہ منافق کے نفاق کی گو مشک جس کے پاس ہوگا خوشبو بھی دے گا اسی طرح قرآن جو تلاوت کرے گا اس کی خوشبو ضرور مہکے گی مگر صرف اتنی بات پر دھوکا نہ کھانا چاہیے عمل کی اصل روح ایمان ہے۔

(۲۰۷) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عزم معصیت کے بعد اس پر عمل نہ کرنے پر نیکی صرف اس صورت میں لکھی جاتی ہے

من اساء فی اسلامہ یؤاخذ بما عمل فی الجاھلیۃ

(۲۱۰) عن عبد اللہ قال قال اناس لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا رسول اللہ انؤاخذ بما عملنا فی الجاھلیۃ قال اما من احسن منکم فی الاسلام فلا یؤاخذ بھا ومن اساء اخذ بعملہ فی الجاھلیۃ والاسلام۔ (رواہ الشیخان)

جس نے اپنے اسلام کو بدنما بنا دیا اس سے دور جاہلیت کے اعمال پر بھی مواخذہ ہوگا

(۲۱۰) عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہم سے ان اعمال کی بھی بازپرس ہوگی جو ہم نے اپنے کفر کے زمانہ میں کئے ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا جس نے اسلام میں اچھے کام کئے اس سے تو جاہلیت کی بازپرس نہ ہوگی لیکن جس نے اسلام میں بدعملی پیدا کی اور برے کام کئے اس سے کفر و اسلام دونوں زمانوں کے اعمال کی بازپرس کی جائے گی۔ (متفق علیہ)

(۲۱۰) حضرت ابن مسعودؓ کی یہ حدیث بظاہر عمرو بن العاص کی گذشتہ حدیث کے مخالف معلوم ہوتی ہے اس سے ثابت ہوا تھا کہ اسلام کسی تفصیل کے بغیر دور جاہلیت کی سب برائیوں کو ختم کر دیتا ہے اور اس حدیث سے کچھ تفصیل ثابت ہوتی ہے۔ شیخ محی الدین نووی وغیرہ نے اس کا یہ جواب لکھا ہے ان کے نزدیک اسلام کی خوبی یہ ہے کہ دل سے اسلام قبول کرے اور اس کی بدنمائی یہ ہے کہ صرف زبان پر کلمہ اسلام ہو دل ایمان و یقین سے یکسر خالی ہو درحقیقت یہ اسلام ہی نہیں۔ اس بناء پر اس حدیث کا خلاصہ یہ ہوگا کہ مذکورہ بالا فضیلت اس اسلام کی ہے جس میں نفاق نہ ہو۔ منافقانہ اسلام سے صرف دنیوی مصالح کی حفاظت تو حاصل ہو جاتی ہے مگر گذشتہ گناہوں کی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ ان کا بوجھ اور بڑھتا چلا جاتا ہے حضرت استاذی مرحوم فرماتے تھے کہ اسلام چونکہ اس کا مدعی ہے کہ وہ دنیا میں تہذیب اخلاق کے لئے بلا امتیاز شائستگی پھیلانے کے لئے آیا ہے وہ دعوت اولین ہی سے اپنے حلقہ بگوشوں سے یہ توقع کرنے لگا ہے کہ وہ اپنے عمل سے اس کے دعوے کا ثبوت پیش کریں جو لوگ اس کے اس تقاضے کو پورا کرتے ہیں ان کا اسلام بھلا اور خوبصورت اسلام شمار ہوتا ہے یہی اسلام کی خوبی ہے کہ جب اسلام لانے والوں کے سامنے اعلیٰ اخلاق اعلیٰ تہذیب کا نمونہ پیش کرے اپنے دلوں میں دور کفر کی بدکرداریوں اور بداخلاقیوں کی برائی محسوس کرے ان پر شرمندہ بھی ہو اور آئندہ اس کا عزم کرے کہ اب اسلام کی حلقہ بگوشی کے بعد ان کا اعادہ پھر کبھی نہیں کرے گا تو بے شک یہ مسلمان جو اپنے تمام گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو جاتا ہے جیسا ابھی ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے لیکن ایک وہ ہے جو مسلمان تو ہو گیا ہے مگر صرف ظاہری طور پر مسلمان ہوا ہے اور اب بھی تخریب بالکل طرح آزاد پھرتا ہے اس کی بداخلاقی بدستور قائم ہے جاہلیت کی درشتی نفس کی خست، مزاج میں خود غرضی طمع اور بدعملی باقی ہے غرضیکہ اس کی عملی زندگی میں کوئی نمایاں انقلاب پیدا نہیں ہوا۔ یہ بھی ایک مسلمان ہے لیکن اس کا اسلام خوبصورت اسلام نہیں ہے اس میں سب ہی کی بدنمائی موجود ہے اس نے اسلام کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تو اس عظیم الشان بشارت کا مستحق نہیں۔ جو گویا ایک خدائی فرمانی سے شرمندہ نہیں تھا اور آج بھی اس پر نادم نہیں ہوا۔ (دلائل بر مسئلہ آئندہ)

بشارة التجاوز عن حديث النفس والخطاء والنسيان

(۲۱۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِي مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسَهَا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوا أَوْ يَعْمَلُوا بِهِ (رواه مسلم)

دل کے خطرات اور بشری بھول چوک پر درگذر کی بشارت

(۲۱۳) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے خاص میری امت کے حق میں وہ وسوسے جو صرف ان کے دلوں میں گذریں معاف کر دیئے ہیں جب تک کہ وہ اپنی زبان سے ان کو ادا نہ کریں یا عمل جامہ نہ پہنائیں۔ (مسلم)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایک صحابی کا انتقال ہو گیا تو کسی نے کہا تجھے جنت کی بشارت ہو آپ نے فرمایا تمہیں کیا خبر شاید کبھی اس نے بیکار بات منہ سے نکالی ہو یا اپنی حاجت سے زیادہ چیز میں بخل کیا ہو۔ (ترمذی)

(۶) ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ میں اپنی قوم کا سردار ہوں جو کہتا ہوں میری بات مانتے ہیں آپ سے کیا پوچھوں آپ نے فرمایا کہ ہر کسی کو سلام کیا کرو اور غیر ضروری باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ (ابن ابی الدنیا)

(۷) ایک صحابی کو بیماری میں عیادت کے لئے لوگ گئے دیکھا تو بہت بشاش بشاش تھے۔ سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا دو عمل میرے پاس ایسے ہیں کہ ان سے زیادہ بخشش کا سبب مجھے کسی عمل پر نہیں ہے۔ ایک تو میں کبھی غیر ضروری باتیں نہ کرتا تھا۔ دوم یہ کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے میرا سینہ صاف اور کینہ سے محفوظ رہتا تھا۔ (ابن ابی الدنیا)

(۸) حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ کسی آدمی سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کرنے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اس کو بیکار باتوں کے مشغلہ میں الجھا دے۔

(۹) سہل تستریؒ فرماتے ہیں جو بے ضرورت باتیں کرے گا وہ راست گوئی سے محروم ہو جائے گا۔

(۱۰) معروف کرخیؒ فرماتے ہیں آدمی کی بیکار باتوں کا مشغلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رسوا کرنے کی ایک علامت ہے۔

اس قسم کی احادیث اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا زیادہ تر تعلق اقوال ہی کے ساتھ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان بیکار اور بے ضرورت قول و فعل چھوڑ دے اور ضرورت کے مطابق بات اور اسی کے مطابق کام کرنے کا عادی ہو جائے تو اسے بشارت ہو کہ حقیقت اسلام میں قدم رکھ دیا ہے۔ اب اس کی ایک نیکی صرف دس یا سات سو نیکیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کے لئے رحمت کا وہ وسیع میدان کھل گیا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب اسلام کا ادراک بھی بیکار و فضول کی عادی نفس کی برداشت نہیں کرتا پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کی غفلت اور بے سود باتوں کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہ سکتا ہے۔

(۲۱۳) جو مسلمان کہ اپنے اختیار کے بغیر جو بات ان کے دل میں آئے بلا ارادہ زبان سے نکل جائیں یا کچھ شرعی کراہی پر کا اظہار ہونے کی دلیل کی کوئی فکر نہ ہو یا کچھ فکر تو پیدا ہو مگر کسی ایک جانب میلان غالب نہ ہو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

برفق ولا تبغض إلى نفسك عبادة الله فإن المنبت لا أرضا قطع ولا ظهرا أبقى (قال العراقي في تخريج الأحياء رواه أحمد من حديث أنس والبيهقي من حديث جابر)

اور مضبوط ہے اس کو نرمی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرو (دل استوار ہو تو متحمل) اے اشاگرد خدا کی عبادت سے اپنے دل میں نفرت نہ پیدا کرو کیونکہ زیادہ تیز رو مسافر اپنی سواری ہلاک کر دیتا ہے اور منزل مقصود طے کرنے سے بھی رہ جاتا ہے (یہی مثال عبادت میں حد سے زیادہ جد و جہد کرنے والے کی ہے)۔

جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تحریر فرمائے ہیں ان کی روشنی میں آپ تمام شریعت کا جائزہ لیکر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس شریعت میں دوسرے ادیان کی نسبت سے کتنی سہولت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ تیسیر و سہولت کے سلسلے حسب ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے۔

(۱) کسی عبادت کے لئے ایسی چیز کو رکن و شرط کی حیثیت نہ دی جائے جس کی ادائیگی میں دشواری ہو۔ مثلاً یہی بات ہے کہ ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اس لئے لازم قرار نہیں دیا گیا۔ لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ کا مفہوم یہی ہے۔ یعنی اگر مجھے امت کے مشقت میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ انہیں مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

(۲) اگر کسی دشوار چیز کا حکم دیا جائے تو اس میں تدریج کا خیال رکھا جائے تاکہ اس دشواری میں بھی ایک سہولت پیدا ہو جائے شراب کی حرمت کا مسئلہ بالخصوص عرب کے لئے جتنی دشواری کا موجب ہو سکتا تھا ظاہر ہے لیکن اسی لئے حکم یکبارگی نازل نہیں کیا گیا اس کی صاف و صریح حرمت پہلے نازل نہیں کی گئی بلکہ رفتہ رفتہ اس کی مذمت اور برائیاں اس انداز سے بیان کی گئیں کہ آہستہ آہستہ حرمت کے لئے قلب میں جگہ پیدا ہوتی چلی گئی۔ آخر کار تیسری بار صاف صاف حکم نازل ہو گیا، اس طرح وہ حکم جو پہلے ناقابل عمل تھا اب خوشی خوشی قابل عمل بن گیا۔

(۳) طبعی میلان اور طبعی تنفر کا لحاظ بھی رکھا جائے اسی بنا پر اسلام میں غلام، اندھا، مجہول النسب شخص کی امامت کو پسند نہیں کیا گیا کیونکہ بہت سے حالات میں ان کی امامت تنفر کا موجب بن سکتی ہے اسی طرح لازم ہے کہ کسی مقتدی کو بزرگ کی موجودگی میں عوام کی طبیعت کی فطرت جیسی میلان ہوتا ہے اسی لئے ان کی موجودگی میں بدتر کی امامت ناپسندیدہ قرار دی گئی۔

(۴) انسان کی فطرت میں مسرت و غم کے موقعوں پر کچھ رسوم منانا بھی داخل ہے جن کی ادائیگی وہ اپنی زندگی کا ایک ثبوت سمجھتا ہے اس لئے اس اقتضاء کی بھی رعایت کی جائے۔ عیدین اور جمعہ کی مشروعیت اسی اقتضاء کے پورا کرنے کے لئے ہے۔

(۵) اس دین کا ایک حصہ ایسا بھی ہونا چاہئے جس کی طرف رغبت کرنے میں طبیعت کے ساتھ عقل بھی شریک ہو تاکہ طبیعت و عقل ہر دو کی اجتماعی رغبت سے عمل میں سہولت و سرعت پیدا ہو جائے۔ مسجد کی صفائی، جمعہ کے دن کا غسل، خوشبو لگانا، عمدہ لباس وغیرہ کا حکم اسی نظریہ کے ماتحت ہے۔

(۶) عوام کے جذبات کی تا امکان رعایت کی جائے۔ خانہ کعبہ میں آمد و رفت کے لئے دو دروازے قائم کرنے کا ارادہ آپ نے اسی لئے فسخ فرما دیا تھا کہ اس میں قریش کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا مبادا وہ یہ خیال کریں کہ آپ نے ان کے بزرگوں کی یادگار مسجد کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور ان کی قدیم یادگار کو توڑ کر نئی تعمیر کر ڈالی۔ یہاں بھی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کر دیا گیا مگر اس کے حدود کیا ہیں متعین ہوں گے یہ بہت طویل الذیل مسئلہ ہے۔

(۷) الغرض ان دشواریوں کی حد بندی متعین کی جائے تاکہ بجائے سہولت کے وہ مصیبت بن جائے ایک مدرک ان کو

من آمن من أهل الكتاب يؤتى له الأجر مرتين

(۲۲۰) حدثني أبو بردة عن أبيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاثة لهم أجران رجل من أهل الكتاب آمن بنبيه وآمن بمحمد والعبد المملوك إذا أدى حق الله وحق مواليه ورجل كانت عنده أمة فأدبها فأحسن تأديبها وعلمها فأحسن تعليمها ثم أعتقها فتزوجها فله أجران ثم قال عامر أعطيناكها بغير شيء وقد كان يركب فيما دونها إلى المدينة. (رواه البخاري وغيره)

اہل کتاب میں جو شخص ایمان لائیگا اس کو دو اجر ملیں گے

(۲۲۰) ابوبردہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخصوں کو دو اجر ملیں گے ایک وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے دوسرا وہ غلام جو خدا کا حق ادا کرے علاوہ اپنے آقاؤں کا بھی تیسرا وہ شخص جس کی باندی تھی وہ اس سے صحبت کرتا تھا پہلے اس کو خوب سلیقہ شعار بنایا خوب تعلیم دی پھر آزاد کیا اور اس سے نکاح کر لیا اس کو بھی دو اجر ملیں گے عامر راوی حدیث اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ ہم نے تو یہ بیش بہا حدیث تمہیں کسی سعی و تعب کے بغیر سنادی پہلے اس سے معمولی حدیث کے لئے مدینہ تک سفر کیا جاتا تھا۔ (متفق علیہ)

(۲۲۰) ہر شخص کی فطرت یہ ہے کہ اس کو اپنے دین سے لگاؤ ہوتا ہے البتہ محبت اور عصبیت دینی سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لئے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا فطرۃً شاق گزرتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ اولین حلقے میں کسی کی تابعیت نہیں ہے پانچوں نبیوں میں اس لئے ان مذاہب کے پیروؤں کو یہ بھی جذبہ رکھنا چاہئے کہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے اس لئے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ کرنا چاہئے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان ضائع ہو گیا۔ بلکہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے تو دو اجر کا مستحق ہوگا۔ ایسے ہی یہ بھی کہ اگر آپ پر ایمان نہ لایا تو پچھلے ایمان کا اجر بھی حبط ہو جائے گا۔ کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جا سکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر قرار دیا جائے گا۔ اس بشارت میں اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لے آئیں اور یہ ان کا ایمان نہ نیا ہے جبکہ ان سب نبیوں پر ایمان لاؤ آپ کی دعوت کا جزء ہے۔ پس آپ پر ایمان لانا ان سب پر ایمان لانا اور آپ کا انکار ان سب کا انکار ہے اس لئے اگر وہ خدا کے دین یا خدا کے رسولوں کے متعلق فرقہ پرستی کی اسپرٹ رکھیں گے تو ان کو مسلم ہونا چاہئے کہ اسلام اس کو برداشت نہیں کرے گا اور آخر ان کا حاصل کیا ہوا بھی برباد ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب انبیاء علیہم السلام پر ضروری۔ لیکن نجات و ہدایت صرف اسلام ہی میں منحصر ہے۔

المبايعة على الاسلام هو الحلف على الوفاء بذمة الله

(۲۲۱) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ (وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَهُوَ اَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِيْ عَلٰى اَنْ لَّا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَّفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (رواہ البخاری)

اسلام پر بیعت کرنا خدا کی اسٹیٹ میں حلف وفاداری کے ہم معنی ہے

(۲۲۱) عبادہ بن صامت سے روایت ہے (بدر میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ میں بیعت کرنے والوں میں شامل تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابہ کی ایک مختصر جماعت جمع ہوئی تھی آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے۔ چوری نہیں کرو گے۔ زنا نہیں کرو گے اپنے بچوں کو قتل نہیں کرو گے۔ دیدہ و دانستہ کسی پر افترا پردازی نہیں کرو گے اور ان احکام میں جو شریعت کے مطابق ہوں میری نافرمانی نہیں کرو گے۔ جو شخص تم میں اس عہد کو پورا کرے گا اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے اور جو (حسب اتفاق) ان باتوں میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا پھر دنیا میں اس کی سزا مل جائے گی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہو جائے گی اور اگر ایسی کو (سزا نہ ملی اور) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائی تو اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہوگا اگر چاہے تو آخرت میں بھی درگزر فرمائے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے۔ ہم نے ان سب شرطوں پر آپ سے بیعت کر لی۔ (بخاری شریف)

(۲۲۱) یہ ایک عام دستور ہے کہ ہر اسٹیٹ کی ابتدا اس کے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے سے ہوتی ہے کیونکہ جب تک کسی اسٹیٹ اور کسی نظام حکومت کے ساتھ پوری پوری وفاداری کا عہد کیا جاتا نہیں نظام کو چلانا ہی ممکن نہیں۔ اس عہد کر لینے کے بعد صرف یہی کہ اس نظام حکومت کو تسلیم کر لیا جاتا ہے بلکہ پھر اس کی مخالفت کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس کے ساتھ مطابقت بھی عہد اس کا ایک جزء لازمی شمار ہوتا ہے اسی طرح اسلامی نظام حکومت بھی اپنے ممبروں سے سب سے اول اپنے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہاں کی صورت یہاں کلمۂ توحید و رسالت کی شہادت مقرر کی گئی ہے اسی کا نام ایمان اسلام ہے اور اسی عہد کو پورا پورا مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے بیعت لی جاتی ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر صرف رسالت اور توحید کے اقرار کا نام ہے مگر درحقیقت یہ ہوتا ہے اسلامی اسٹیٹ کے ساتھ وفاداری کا ایک موکد اور معتبر اقرار ہے جو اس کے سربراہ

ورجل بايع إماما لا يبايعه إلا لدنيا فإن أعطاه ما يريد وفى له وإلا لم يف له ورجل يبايع رجلا بسلعة بعد العصر فحلف بالله لقد أعطي بها كذا وكذا فصدقه فأخذها ولم يعط بها. رواه البخاري

بيعة النساء

(٢٢٦) عن عائشة قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم يبايع النساء بالكلام بهذه الآية لا يشركن بالله شيئا قالت وما مست يد رسول الله صلى الله عليه وسلم يد امرأة إلا امرأة يملكها (بخاري)

بيعة الصغير

(٢٢٧) عن عبد الله بن هشام وكان قد أدرك النبي صلى الله عليه وسلم وذهبت به أمه زينب بنت حميد إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت يا رسول الله بايعه فقال النبي صلى الله عليه وسلم هو صغير فمسح رأسه ودعا له. رواه البخاري

دوسرے وہ شخص ہے جو امام وقت سے صرف دنیا کے لئے بیعت کرتا ہے اگر اس نے اس کے خیال کے مطابق کچھ دیا تب تو اس نے اس کے ساتھ وفا کی ورنہ نہ کی۔ تیسرے وہ شخص جس نے عصر کے بعد کسی کے ہاتھ مال بیچا اور جھوٹی قسم کھائی کہ اس چیز کی اس کو اتنی قیمت دی جاتی تھی حالانکہ اس کو وہ قیمت نہیں دی جاتی تھی اس بیچارہ نے اس کی بات کو سچ سمجھا اور اس قیمت کو دے لیا۔ (بخاری شریف)

عورتوں کی بیعت

(۲۲۶) عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو یہ آیت پڑھ کر صرف زبانی بیعت فرمایا کرتے تھے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گی۔ خدا کی قسم کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک سوائے آپ کی مملوکہ عورتوں کے کسی اجنبی عورت کو نہیں لگا۔ (بخاری شریف)

بچے کی بیعت

(۲۲۷) عبداللہ بن ہشام سے روایت ہے جو حضور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا اور ان کی والدہ زینب ان کو آپ کی خدمت میں لے گئی تھیں اور آپ سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ اس لڑکے کو بیعت فرما لیجئے آپ نے فرمایا یہ بچہ ہے اور آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لئے دعا فرمائی (بخاری شریف)

(۲۲۶) معلوم نہیں۔ کہ جب دنیا کی اس سب سے مقدس ہستی نے بھی عورتوں کو بیعت کرنے کے وقت ہاتھ نہیں لگایا تو پھر کسی اور شخص کو یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ بیان (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

بيعة الرقيق

(۲۲۸) عَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ عَبْدٌ فَبَايَعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَلَا يَشْعُرُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ عَبْدٌ فَجَاءَ سَيِّدُهُ يُرِيدُهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعْنِيهِ فَاشْتَرَاهُ بِعَبْدَيْنِ أَسْوَدَيْنِ ثُمَّ لَمْ يُبَايِعْ أَحَدًا بَعْدُ حَتَّى يَسْأَلَهُ أَعَبْدٌ هُوَ۔

رواه الترمذی وقال حديث حسن صحيح۔

غلام کی بیعت

(۲۲۸) جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک غلام آیا اور آپ سے ہجرت پر بیعت کی، آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ غلام ہے اس کے بعد اس کا مالک اس کو لینے کے لئے آیا آپ نے کہا اس کو میرے ہاتھ فروخت کر دو اور سیاہ رنگ کے دو غلام دے کر اس کو خرید لیا اور آنحضرت نے کبھی کسی کو اس وقت تک بیعت نہ کیا جب تک کہ یہ تحقیق نہ کر لی کہ کہیں وہ غلام تو نہیں ہے۔ (ترمذی)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ) ابھی اور بیعت کا سوال نہیں ہے جبکہ بیعت کے وقت بیعت کرنا تھا تو ان کا خواہ کسی حکم میں آئیں بیعت ہی نہیں رکھا گیا۔ درحقیقت شریعت کی دونوں میں حکمت نظر ہے کہ جن حالات پر انسان کوئی ادنیٰ خیانت کی کر سکتا تھا اس نے اس کا ذکر صرف ظاہر عمل پر رکھا ہے اور نیت سے کوئی بحث نہیں کی۔

(۲۲۷) بیعت کا مقصد شریعت پر عمل کرنے کا عہد لینا ہے جس پر اپنی خود اللہ تعالیٰ نے عمل کرنے کا وعدہ نہیں ڈالا اس پر عمل کا جو جذبہ ہو سکتے تھے اس رحمۃ للعالمین نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ اس کو وعدہ برکت دیے بغیر ہی رخصت کر دیا جائے۔ رسول خدا کی یہ دونوں شانیں حکمت و شفقت سے بھری نظر آتی ہیں۔

(۲۲۸) یہاں ایک مشکل تو یہ درپیش تھی کہ اس غلام کو تحقیق سے قبل بیعت کر لینا یہ تقاضہ کرتا تھا کہ اس کو فوراً اس کے مالک کے حوالہ کر دیا جاتا۔ دوسری مشکل اپنی بیعت کے احترام و لحاظ کی تھی جس کو بیعت کر کے ایک مرتبہ اپنی پناہ میں لے لیا گیا تھا اس کو دشمن کے حوالہ کر دینا خوشی سے کیونکر گوارا کر لیا جائے۔ اس لئے آپ نے ان دونوں پہلوؤں کو نبھایا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا۔ مالک کو بھی خوش کر دیا اور ایک غلام کے بدلہ دو غلام دے دیئے اور غلام کے بیعت کی بھی لاج رکھ لی کہ اس کی حمایت میں جو بڑے سے بڑا قدم بھی اٹھایا جا سکتا تھا اٹھا دیا۔ لیکن آئندہ کے لئے یہ دستور العمل ٹھیرا لیا کہ جب کسی کے متعلق شبہ ہوتا تو بیعت کرنے سے پہلے تحقیق فرما لیتے کہ کہیں وہ کسی کا غلام تو نہیں۔ اس قسم کے نادر واقعات سے یہ اندازہ کر لینا چاہئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عام معاملات میں کیسے معاملہ فہم تھے اور حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اپنے اور پرائے مسلمان اور کافر کی کیا رعایت رکھتے تھے۔

وجعل فيها ما جعل قال الله قال فبالذي خلق السماء وخلق الارض ونصب هذه الجبال آالله ارسلك قال نعم قال وزعم رسولك ان علينا خمس صلوات في يومنا وليلتنا قال صدق قال فبالذي ارسلك آالله امرك بهذا قال نعم قال وزعم رسولك ان علينا زكاة في اموالنا قال صدق قال فبالذي ارسلك آالله امرك بهذا قال نعم قال وزعم رسولك ان علينا صوم شهر رمضان في سنتنا قال صدق قال فبالذي ارسلك آالله امرك بهذا قال نعم قال وزعم رسولك ان علينا حج البيت من استطاع اليه سبيلا قال صدق قال ثم ولى قال والذي بعثك بالحق نبيا لا ازيد عليهن شيئا ولا انقص منهن شيئا فقال النبي صلى الله عليه وسلم لئن صدق ليدخلن الجنة۔ (رواه احمد والشيخان وابو داود)

کی چیزیں کس نے بنائیں؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ (یہ سن کر) وہ بولا اسی کی قسم ہے جس نے آسمان زمین بنایا اور ان پہاڑوں کو قائم کیا سچ بتائیے کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنایا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں پھر اس نے کہا آپ کے قاصد نے ہم سے یہی کہا تھا کہ شب وروز میں ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا سچ کہا (یہ سن کر) وہ کہنے لگا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے سچ بتائیے کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں پھر اس نے کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے مالوں میں زکوٰۃ بھی واجب ہے؟ آپ نے فرمایا سچ کہا۔ پھر اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے ٹھیک بتائیے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر اس نے کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم پر ہر ایک سال میں ماہ رمضان کے روزے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں اس نے سچ کہا پھر اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر اس نے کہا آپ کے قاصد کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم میں سے جس کے پاس سواری اور توشۂ سفر مہیا ہو اس پر بیت اللہ کا حج کرنا بھی فرض ہے؟ آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سوالات کر کے اس شخص نے پشت پھیری اور کہا اس ذات کی قسم ہے جس نے آپ کو سچا نبی بنایا ہے میں ان باتوں پر کچھ کم و بیشی نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر یہ سچ کہتا ہے تو یقیناً جنت میں جائے گا۔ (احمد، بخاری شریف، مسلم شریف، ابو داؤد)

(۲۳۰) مورخین کو ضمام بن ثعلبہ کی آمد کے سال میں اختلاف ہے۔ ابن اسحٰق و ابو عبیدہ وغیرہ کی رائے ہے کہ یہ ۹ھ میں آئے ہیں۔ واقدی ۵ھ بیان کرتے ہیں مگر محققین نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ دوسرا اختلاف ان کے اسلام کے بارے میں ہے امام بخاری وغیرہ کا میلان خاطر اس طرف ہے کہ جس وقت آپ کا قاصد پہنچا تھا اسی وقت مسلمان ہو چکے تھے اور اب ان کا

وَسَأَلَهُ عَنِ الصَّوْمِ قَالَ صِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ قَالَ لَا قَالَ وَذَكَرَ الزَّكَاةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا قَالَ وَاللّٰهِ لَا أَزِيدُ عَلَيْهِنَّ وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُنَّ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ - رواه الشيخان وابوداؤد وغيرهم - وفي كتاب الحيل من البخاري الا ان تطوع وفيه فعدد كل الصلوٰة والزكوٰة فاخبره بشرائع الاسلام قال والذي اكرمك لا اتطوع شيئا ولا انقص مما فرض الله علي شيئا۔

(۲) وفادة معاوية بن حيدة

(۴۴۲) عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ قَالَ أَتَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ مَا أَتَيْتُكَ حَتَّى حَلَفْتُ أَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ أُولَاءِ أَنْ لَا آتِيَكَ وَلَا آتِيَ دِينَكَ

بھی یہی چاہتے۔ فرمایا کچھ نہیں۔ راوی کہتا ہے پھر اس نے روزے کے متعلق دریافت کیا آپ نے فرمایا رمضان کے روزے۔ اس نے کہا ان کے سوا بھی میرے ذمہ کچھ اور روزے بھی ہیں؟ فرمایا کچھ نہیں۔ راوی کہتا ہے اس نے زکوٰۃ کا بھی ذکر اور دریافت کیا کیا میرے ذمہ صدقہ کے سوا اور بھی کچھ ادا کرنا ضروری ہے فرمایا کچھ نہیں۔ اس نے کہا خدا کی قسم ہے کہ میں ان باتوں پر کچھ کمی بیشی نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا ہے تو کامیاب ہو گیا (متفق علیہ وغیرہ) امام بخاری نے کتاب الحیل میں آپ کے جواب میں اتنا اور روایت فرمایا ہے کہ تجھ پر اور کچھ فرض نہیں مگر ہاں اگر تو اپنی طرف سے خود کرنا چاہے۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد راوی یہی نقل کرتا ہے کہ آپ نے اس کو اسلام کے اور احکام بھی سکھلائے تھے آخر میں یہی ہے کہ خدا کی قسم جس نے آپ کو عزت دی ہے نہ تو میں اپنی طرف سے کچھ اور اضافہ کروں گا اور نہ ان باتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض کی ہیں کوئی کمی کروں گا۔

(۲) معاویہ بن حیدۃ کی آمد

(۴۴۲) بہز بن حکیم اپنے دادا معاویہ بن حیدۃ سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم میں آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا مگر جبکہ ان انگلیوں کی گنتی سے زیادہ مرتبہ یہ قسم کھا چکا تھا کہ نہ تو میں آپ کے پاس آ کر پھٹکوں گا اور نہ آپ کا دین اختیار کروں گا

تعجب ہے لوگ ان لفظوں کی تنگ نائی کی وجہ سے صاف سمجھتے ہیں کہ اس کی اصل مراد اس لفظ سے یہی ہو گی کہ اس کا مفہوم تھا اپنا سمجھ کر تنفس سے نئے نئے نتائج پیدا کئے جاتے ہیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے ...... جب بھی ایک لفظ پر صرف اس کی تعبیر کی وجہ سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴۴۲) بہز بن حکیم کی اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے چند ایسے احکام کا بھی ذکر فرمایا ہے جن کا

قال: أن تقول أسلمت وجهي وتخليت، وتقيم الصلاة، وتؤتي الزكاة، وكل مسلم على مسلم محرم،
أخوان نصيران، لا يقبل الله عز وجل من مشرك يشرك بعد ما أسلم عملا أو يفارق المشركين
إلى المسلمين، ما لي أمسك بحجزكم عن النار، ألا إن ربي داعيّ وإنه سائلي هل بلغت عبادي، وأنا
قائل له: رب قد بلغتهم، ألا فليبلغ الشاهد منكم الغائب، ثم إنكم تدعون مفدمة
أفواهكم بالفدام، ثم إن أول ما يبين (وفي رواية يترجم) قال: وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم
بيده على فخذه (وفي رواية فخذه) ثم قال: أول ما يبين من أحدكم لفخذه وكفه، قال قلت: يا رسول الله
هذا ديننا؟ قال: هذا دينكم وأينما تحسن يكفك۔ رواه أحمد والحاكم وقال صحيح الاسناد
وأقره الذهبي۔ ونخرج النسائي مختصرا۔

فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو یہ اقرار کرے کہ میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرچکا اور شرک و کفر سب چھوڑ دیا، نماز پڑھے،
زکوٰۃ دے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے قابل احترام ہے، مسلمان باہم دو بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کا
مددگار ہے۔ جو شخص اسلام لانے کے بعد پھر شرک کرے اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ان کو چھوڑ کر
پھر مسلمانوں کے گروہ میں شامل نہ ہو جائے۔ کیا بات ہے کہ میں تو تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں دوزخ کی آگ سے بچا رہا
ہوں اور تم ایک نہیں مانتے (سن لو) میرا پروردگار (قیامت کے دن) مجھے بلائے گا، وہ مجھ سے یقیناً یہ سوال کرے گا
کہ آپ نے میرے بندوں کو تبلیغ کردی؟ میں عرض کروں گا پروردگار! کردی۔ سن لو تم میں جو لوگ یہاں موجود ہیں
وہ میرا یہ پیغام ان کو بھی پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں۔ پھر تم کو بھی بلایا جائے گا اور تمہارے منہ پر کپڑا لگا دیا جائے گا۔
(تاکہ تم بات نہ کر سکو) پھر سب سے پہلے انسان کا جو حصہ بیان کرنا شروع کرے گا (اور ایک روایت میں ترجمانی
کا لفظ ہے) راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اپنی ران کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ وہ حصہ
ہوگا (دوسری روایت میں ہے کہ سب سے پہلے تمہاری طرف سے جسم کا جو حصہ بولے گا وہ تمہاری ران اور تمہارے ہاتھ
ہوں گے) میں نے کہا یا رسول اللہ یہی ہمارا دین ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں یہ تمہارا دین ہے جہاں کہیں بھی نیکی کروگے کافی ہوگی

کسی سچائی کی سچائی ہونے پر آپ کو پورا پورا یقین اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے بلکہ باطل کے باطل ہونے کا بھی آپ کو
پورا پورا یقین ہو جائے اگر آپ کے قلب میں باطل پر بھی صداقت کا شبہ پڑ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حق و باطل
کو ابھی تک ٹھیک طور پر پہچانتے ہی نہیں۔ اسلام مذہب کے باب میں کوئی لچک نہیں رکھتا۔ ہاں جب دنیا کے ساتھ معاملات
کا نمبر آتا ہے تو معاملات میں بڑی سے بڑی رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور یہی وہ جاذبہ ہے جو بالتی ہی احسن کا مفہوم ہے
منہ پر کپڑا لگانا حقیقت نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے الیوم نختم علی افواههم وتکلمنا
ایدیهم الآیة ۔ آج ہم ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ہم سے ان کے ہاتھ اور پیر تمام واقعات جو انہوں نے کئے
تھے وہ خود بتائیں گے۔

(۳) وفادة أبي رزين العقيلي

(۲۲۳) عن أبي رزين العقيلي قال أتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت يا رسول الله ما الإيمان؟ قال أن تشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأن محمدا عبده ورسوله وأن يكون الله ورسوله أحب إليك مما سواهما وأن تحرق في النار أحب إليك من أن تشرك بالله وأن تحب غير ذي نسب لا تحبه إلا لله عز وجل فإذا كنت كذلك فقد دخل حب الإيمان في قلبك كما دخل حب الماء للظمآن في اليوم القائظ قلت يا رسول الله كيف لي بأن أعلم أني مؤمن؟ قال ما من أمتي أو هذه الأمة عبد يعمل حسنة فيعلم أنها حسنة وأن الله عز وجل جازيه بها خيرا ولا يعمل سيئة فيعلم أنها سيئة ويستغفر الله عز وجل منها ويعلم أنه لا يغفر إلا هو إلا وهو مؤمن

(أخرجه أحمد وفي إسناده سليمان بن موسى وثقه قوم وضعفه آخرون)

(۳) ابو رزین عقیلی کی آمد

(۲۲۳) ابو رزین عقیلی روایت کرتے ہیں کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ایمان کی حقیقت کیا ہے آپ نے فرمایا اس بات کی گواہی دے کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں اور اللہ اور اس کا رسول تجھ کو تمام ماسوی سے زیادہ محبوب ہو جائیں اور آگ میں جل کر خاک ہو جانا اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھیرانے سے زیادہ پسند ہو جائے اور جس شخص سے رشتہ داری کا کوئی تعلق بھی نہ ہو اُن سے اللہ ہی کے نام پر محبت ہو جائے جب یہ حالات پائی جائیں تو (سمجھ لو کہ) اب تمہارے دل میں ایمان کی محبت ایسی سما گئی ہے جیسے سخت گرمی میں پیاسے کے دل میں پانی کی محبت میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں یہ بات کیسے سمجھوں کہ میں مومن کامل ہو گیا۔ آپ نے فرمایا میری امت میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے یا یہ فرمایا کہ اس امت میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہے جو کوئی نیکی کرے جب نیکی کرے تو اس کو محسوس ہو کہ یہ نیکی ہے اور اس پر یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کا عوض بہتر دے گا اور جب کوئی برائی کرے تو اسے محسوس ہو کہ یہ برائی ہے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور یہ یقین ہو کہ بجز اس کے کوئی نہیں تو یقیناً وہ شخص کامل مومن ہے۔ (احمد)

---

(۲۲۳) حدیث مذکور میں پیاسے اور پانی کی تشبیہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا باطن جب ایمان کے رنگ سے رنگین ہو جاتا ہے تو پھر اس کی محبت صرف عقلی نہیں رہتی بلکہ تقاضا طبیعت بن جاتی ہے نفس کی چاہت

قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا نَأْتِيكَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِيدَةٍ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ وَلَسْنَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي شَهْرٍ حَرَامٍ فَأْخْبِرْنَا بِأَمْرٍ نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ وَنُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَنَا فَسَأَلُوا عَنِ الْأَشْرِبَةِ فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللّٰهِ قَالَ أَتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللّٰهِ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ وَإِقَامُ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ وَأَنْ تُعْطُوا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالنَّقِيرِ وَالْمُزَفَّتِ قَالَ وَرُبَّمَا قَالَ الْمُقَيَّرِ قَالَ احْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَرَاءَكُمْ رواه البخاري وغيره

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم بڑی دور دراز مسافت طے کرکے آئے ہیں ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا یہ مشہور بڑا جنگجو قبیلہ پڑتا ہے اس لیے ہم آپ کی خدمت میں صرف اُن مہینوں میں حاضر ہو سکتے ہیں جن میں کفار کے نزدیک جنگ کرنا حرام ہے اس لیے ہیں تو آپ کوئی ایسی مختصر بات بتا دیجیے جس پر عمل کر کے ہم جنت میں چلے جائیں اور جو لوگ ہم سے پیچھے رہ گئے ان سے بیان کر کے ان کو بھی اس کی اطلاع کر دیں اور اسی کے ساتھ انھوں نے اُن برتنوں کی بابت بھی پوچھا جن میں نبیذ بنائی جاتی تھی کہ کون سے استعمال میں لائے جا سکتے ہیں اور کون سے نہیں لائے جا سکتے؟ آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے روکا۔ پھر آپ نے اللہ پر ایمان لانے کا حکم یہ کہہ کر فرمایا جانتے بھی ہو اللہ پر ایمان لانا کس طرح ہوتا ہے انھوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر واقف ہیں۔ فرمایا اس بات کی گواہی دینا کہ قابلِ عبادت کوئی نہیں مگر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات اور یہ کہ محمد اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ باقاعدہ نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں پانچواں حصہ ادا کرنا اور چار برتنوں کے استعمال سے منع کیا۔ دباء سے، حنتم سے، نقیر سے اور مزفت سے (ابن عباس مزفت کے بجائے کبھی مقیر کہا کرتے تھے) اور فرمایا کہ ان باتوں کو یاد کر لو اور جو تمہاری طرف ملک میں رہ گئے ان کو بھی ان کی خبر کر دو۔

ھو قصبۃ [illegible] البحرین۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کے مقام جواثی میں عبد القیس کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔

[illegible] نے شرح [illegible] بیہقی سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس ابھی ایک قافلہ آنے والا ہے جو اہل مشرق میں سب سے بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ ان کے دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو انھیں ۱۳ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا انھوں نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی پھر اُن کے ساتھ ساتھ آپ کی خدمت میں آئے جب ان لوگوں نے دور سے آپ کو دیکھا تو بے تاب ہوگئے اور فرط اشتیاق سے اپنا سامان اسی طرح چھوڑ کر دوڑتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کا دست مبارک چومنے لگے۔ شیخ عبد القیس جو ان کے سردار تھے عمر میں سب سے چھوٹے تھے انھوں نے پیچھے سب کے اونٹ باندھے سامان اکٹھا کیا کھول کر سفر کے کپڑے اتارے اور عمدہ سفید لباس پہنا پھر اطمینان سے آپ کی

(۵) وفادة ابن المنتفق

(۲۳۵) عن المغيرة بن عبد الله اليشكري عن أبيه قال انطلقت إلى الكوفة لأجلب بغالا قال فأتيت السوق ولم تقم قال قلت لصاحب لي لو دخلنا المسجد وموضعه يومئذ في

(۵) ابن المنتفق کی آمد

(۲۳۵) مغیرہ بن عبداللہ یشکری اپنے والد عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں خچر خریدنے کے لئے کوفہ گیا بازار پہنچا تو اس وقت تک بازار ٹھیک سے لگا نہیں تھا میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا آؤ ذرا مسجد چلیں مسجد اس وقت اس کی جگہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ آدمی بدشکل تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ آدمی کی قیمت صرف اس کی ڈیل ڈول سے نہیں ہوتی دین کی قیمت صرف اس کے دو چھوٹے سے عضو سے ہوتی ہے زبان اور دل۔ آپ نے فرمایا تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ و رسول پسند کرتے ہیں حلم اور بردباری انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ خصلتیں مجھ میں پیدا کی گئی ہیں یا میں نے اپنے کسب سے حاصل کی ہیں فرمایا پیدائشی۔

ان کی روایت میں صاف طور پر حج کا ذکر نہیں ہے صرف بیہقی نے حضرت زہری کی کتاب الصیام میں ذکر حج والبیت الحرام کا لفظ روایت کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے اس کو شاذ قرار دیا ہے مسند امام احمد میں بھی ایک طریقہ میں حج کا ذکر موجود ہے۔

یہ بات آپ پہلے سمجھ چکے ہیں کہ اسلام کا قولی اور ایمانیات کا اصل مدعا صدق و تصدیق اور عقیدہ ہے، ان میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف الفاظ و مفہوم کا ہے۔ وفد عبد القیس آپ کی خدمت میں ایمان و اسلام کا فرق دریافت کرنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ صرف ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا تھا جس پر عمل کرکے وہ نجات پا جائے اس لئے آپ نے ان کے سامنے ان کے سوال کے مطابق ایک مختصر نظام عمل بیان فرما دیا تھا لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام (جن کی حدیث آئندہ آرہی ہے) اسلام و ایمان اور احسان کی جداگانہ حقیقتیں دریافت کرنے کے لئے آئے تھے ان کے سامنے صرف مختصر مجموعہ عمل بتا دینا ان کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ان سے ہر ایک کی حقیقت جدا جدا بیان کر دی جانی چاہئے تھی مقصد یہ ہے کہ ان دو حدیثوں میں آپ نے دو تعبیریں کیوں اختیار فرمائیں یہاں ایک وفد کا تذکرہ ہے اور حضرت جبرئیل کی حدیث میں ایک معلم و متعلم کا ایک مذکورہ واقعہ کا فرق مسئلہ بیان کے نہیں ہے صرف عمل کی ترغیب دینا ہے۔ متعلم کا فرض ہے کہ حقیقت کو واضح اور صاف کرے۔ ان دو تعبیروں کے ملانے کا طریقہ سمجھنا بھی ضروری ہے اس لئے یہ نقشہ کر دیا ہے کہ ایمان کی جو تشریح یہاں کی گئی ہے جبرئیل علیہ السلام کی حدیث میں وہی تشریح اسلام کی کی گئی ہے یہ بات یہ ہے کہ ایمان و اسلام کا جو ان کا مفہوم ہے حدیث جبرئیل میں ادا کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں چونکہ ایمان و اسلام جدا نہیں رہتیں اس لئے مقام کی مناسبت سے ان کی حقیقتوں پر جدا جدا روشنی ڈالنا غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔

(۲۳۵) امام بخاری نے باب فضل صلاة زمزم میں اس روایت کو بیان کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

وَمَا تُحِبُّ اَنْ يَفْعَلَهُ بِكَ النَّاسُ فَافْعَلْ بِهِمْ وَمَا تَكْرَهُ اَنْ يَأْتِيَ اِلَيْكَ النَّاسُ فَذَرِ النَّاسَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ خَلِّ سَبِيْلَ الرَّاحِلَةِ۔

وَعَنْهُ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِي الْمُنْتَفِقِ يُخْبِرُهُ وَدُنْيَهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُنَجِّيْنِيْ مِنَ النَّارِ قَالَ بَخٍ بَخٍ لَئِنْ كُنْتَ قَصَّرْتَ فِي الْخُطْبَةِ لَقَدْ اَبْلَغْتَ فِي الْمَسْئَلَةِ اِتَّقِ اللّٰهَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤَدِّي الزَّكٰوةَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ خَلِّ عَنْ طَرِيْقِ الرِّكَابِ (رواه احمد وفي البخاري وتصل الرحم وليس فيه ذكر الحج والاسلام)

(۶) وفد الازد

(۲۳۶) عَنْ سُوَيْدٍ الْاَزْدِيِّ قَالَ وَفَدْتُ سَابِعَ سَبْعَةٍ مِنْ قَوْمِيْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا دَخَلْنَا عَلَيْهِ وَكَلَّمْنَاهُ اَعْجَبَهُ مَا رَاٰى مِنْ سَمْتِنَا وَزِيِّنَا فَقَالَ مَا اَنْتُمْ قُلْنَا مُؤْمِنُوْنَ فَتَبَسَّمَ

دیا کر، رمضان کے روزے رکھا کر۔ اور جو بات تو چاہتا ہے کہ لوگ تیرے ساتھ کریں وہی تو ان کے ساتھ کیا کر اور جو بات تو نہیں چاہتا کہ لوگ تیرے ساتھ کریں دوسروں کو بھی اس سے معاف رکھا کر اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا اب سانڈنی کا راستہ چھوڑ دو۔

اس روایت کے دوسرے طریقہ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو جنت میں پہنچا دے اور دوزخ کی آگ سے بچا دے آپ نے فرمایا بہت خوب بہت خوب تم نے درخواست تو مختصر کی مگر سوال بہت گہرا کیا ہے اللہ سے ڈرا کر کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کر باقاعدہ نماز پڑھا کر زکوٰۃ دیا کر حج کر رمضان کے روزے رکھا کر اس کے بعد فرمایا اچھا اب میری سواری کے سامنے سے ہٹ جا۔

(۶) سوید ازدی کی آمد

(۲۳۶) سوید ازدی روایت فرماتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کے سات آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن میں ساتواں شخص میں تھا جب ہم آپ کی خدمت میں آئے اور آپ سے گفتگو کی تو ہمارا انداز آپ نے ہمارا دیکھا آپ کو بہت پسند آیا آپ نے فرمایا تم کون لوگ ہو ہم نے عرض کیا مسلمان آپ مسکرائے اور فرمایا ہر بات

اس سے زیادہ ادب کے الفاظ اور نہیں ہو سکتے اس لئے جو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا ہے اس نے ان ہی الفاظ کو دہرایا۔ الفاظ کی طرح نظر انداز کرکے معنی ان کی سطح سے سوال و جواب پیدا کرنا مناسب ہے۔

(۲۳۶) چونکہ یہ لوگ عام اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور نظر آرہے تھے اس لئے آپ نے ان کو اسلام کے ایک بلند مقام کی

عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَقَالَ إِنَّ لِكُلِّ قَوْلٍ حَقِيْقَةً فَمَا حَقِيْقَةُ قَوْلِكُمْ وَإِيْمَانِكُمْ قُلْنَا خَمْسَ عَشْرَةَ خَصْلَةً خَمْسٌ مِنْهَا أَمَرَتْنَا رُسُلُكَ أَنْ نُؤْمِنَ بِهَا وَخَمْسٌ أَمَرَتْنَا أَنْ نَعْمَلَ بِهَا وَخَمْسٌ تَخَلَّقْنَا بِهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَنَحْنُ عَلَيْهَا إِلَّا أَنْ تَكْرَهَ مِنْهَا شَيْئًا فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْخَمْسُ الَّتِي أَمَرَتْكُمْ بِهَا رُسُلِي قُلْنَا أَمَرَتْنَا أَنْ نُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ قَالَ وَمَا الْخَمْسُ الَّتِي أَمَرَتْكُمْ أَنْ تَعْمَلُوْا بِهَا قُلْنَا أَمَرَتْنَا أَنْ نَقُوْلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَنُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَنُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَنَصُوْمَ رَمَضَانَ وَنَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْنَا إِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ وَمَا الْخَمْسُ الَّتِي تَخَلَّقْتُمْ بِهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ قُلْنَا الشُّكْرُ عِنْدَ الرَّخَاءِ وَالصَّبْرُ عِنْدَ الْبَلَاءِ

کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے ہم نے عرض کیا پندرہ چیزیں ہیں جن میں پانچ تو ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کے قاصدوں نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم ان پر یقین رکھیں اور پانچ ایسی ہیں جن کے متعلق یہ حکم دیا کہ ہم عمل کیا کریں اور پانچ وہ ہیں جن کی عادت ہمیں زمانۂ جاہلیت سے پڑی ہوئی ہے اور اب تک ہم اُن پر قائم ہیں ہاں اگر آپ انہیں پسند نہ کریں تو البتہ ہم انہیں چھوڑ سکتے ہیں آپ نے فرمایا بتاؤ وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن پر میرے قاصدوں نے تم کو یقین رکھنے کے لئے کہا ہے، ہم نے عرض کیا یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے، اس کی کتابیں اس کے سب رسولوں کو مانیں اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا یقین کریں فرمایا وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے کہا ہے ہم نے عرض کیا یہ کہ ہم اقرار کریں کہ ایک اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں نماز پابندی سے پڑھیں، زکوٰۃ دیں، رمضان کے روزے رکھیں اور اگر زاد راہ موجود ہو تو بیت اللہ کا حج بھی کیا کریں فرمایا اچھا اب وہ پانچ باتیں بتاؤ جن کی تم کو زمانۂ کفر سے عادت ہے ہم نے عرض کیا فراخی میں شکر کرنا، مصیبت کے

تعلیم حق یعنی توکل کی جن پانچ چیزوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ان کا زیادہ تعلق بس صفت توکل کے ساتھ ہے توکل ترک اسباب کا نام نہیں بلکہ اسباب پر ترک اعتماد کا نام ہے۔ ترک اسباب آسان ہے اور اسباب کو لے کر پھر ترک اعتماد مشکل ہے۔ بقدر ضرورت مقدار کی تلاش و مال کا انتظام توکل کے منافی نہیں البتہ حاجت سے زیادہ مقدار ضرورت سے زیادہ تعمیر توکل کے منافی ہے اسی لئے یہاں آپ نے بقدر حاجت عمارت بنانے کی اجازت نہیں دی۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دین اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لئے اس میں ہر طبقہ اور مزاج کے مناسب تعلیمات موجود ہیں اگر کوئی ورع و تقویٰ لے کر جنگلوں میں نکل جانے پر مُصر ہے تو اس کے لئے زہد و توکل کے صاف اور کھلے ہوئے راستے موجود ہیں اور اگر کوئی جانفروشی و عشرتوں کی بجائے اُن رشتوں کو گزار دینوں میں گزرنے کی تلاش رکھتا ہو جن سے گذرنے کی تمنا ہر عاشق مزاج کو ہوا کرتی ہے تو شریعت قربان گاہوں کی بھی ہدایت کرتی ہے ان دونوں کے بیچ منزل کا راستہ بیچ میں ہے۔ وہ میر ہیں ہی ہے دشوار بن جاتا ہے یہاں اپنی حاجت سے زیادہ جمع کرنے اور ضرورت کو زیادہ مکانات تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی مگر دوسروں کے لئے جو حقوق کی بیگے ہیں ان کے ادا کرنے میں ہر اقتدار کو کھلا چھوڑ کر

اب یہ تمہارے پسند کی بات ہو تو وہ زندگی گزارنے جو سب سے بہتر ہے وہ بسر کیجئے عمل میں تحریرات ہیں۔

وَالرِّضَا بِمُرِّ الْقَضَاءِ وَالصِّدْقُ فِيْ مَوَاطِنِ اللِّقَاءِ وَتَرْكُ الشَّمَاتَةِ بِالْأَعْدَاءِ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُكَمَاءُ عُلَمَاءُ كَادُوْا مِنْ فِقْهِهِمْ أَنْ يَكُوْنُوْا أَنْبِيَاءَ ثُمَّ قَالَ وَأَنَا أَزِيْدُكُمْ خَمْسًا فَتَتِمُّ لَكُمْ عِشْرُوْنَ خَصْلَةً إِنْ كُنْتُمْ كَمَا تَقُوْلُوْنَ فَلَا تَجْمَعُوْا مَا لَا تَأْكُلُوْنَ وَلَا تَبْنُوْا مَا لَا تَسْكُنُوْنَ وَلَا تَنَافَسُوْا فِيْ شَيْءٍ أَنْتُمْ عَنْهُ غَدًا تَزُوْلُوْنَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ وَعَلَيْهِ تُعْرَضُوْنَ وَارْغَبُوْا فِيْمَا عَلَيْهِ تَقْدَمُوْنَ وَفِيْهِ تَخْلُدُوْنَ فَانْصَرَفُوْا وَقَدْ حَفِظُوْا وَصِيَّتَهُ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَعَمِلُوْا بِهَا (رواه ابو نعيم فى كتاب معرفة الصحابة كما فى شرح المواهب)

وفادة رجال من العرب لم يسموا

(۲۳۷) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْإِسْلَامُ قَالَ أَنْ يُسْلِمَ قَلْبُكَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَأَنْ يَسْلَمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِكَ وَيَدِكَ قَالَ فَأَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ قَالَ الْإِيْمَانُ

صبر کرنا، مقدرات جب سامنے آجائیں تو ان پر خوش رہنا، جنگ میں ثابت قدمی اور دشمنوں کی مصیبت پر خوشی نہ منانا۔ آپ نے فرمایا تم تو سب کے سب بڑے حکیم اور علم کے قریب تھا کہ اپنے اس علم و فہم کی بدولت نبی بن جاتے اگر نبوت جاری ہوتی۔ اچھا تو اب پانچ باتیں میں بھی بتا دیتا ہوں تاکہ کل بیس باتیں ہو جائیں اگر بات اسی طرح سے ہے جیسا تم کہتے ہو تو ضرورت سے زیادہ کھانا جمع نہ کرو اور ضرورت سے زیادہ مکانات نہ بناؤ اور جس چیز کو چھوڑ کر کل نہیں چلا جانا ہے اس میں ایک دوسرے کی حرص نہ کرو، اور بس ایک اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کی طرف لوٹ کر تمہیں جانا ہے اور جس کے سامنے حساب دینے کے لئے پیش ہونا ہے اور اس گھر کی فکر رکھنا جس میں تمہیں آخر جانا اور ہمیشہ رہنا ہے آپ کی یہ وصیت سن کر وہ اپنے وطن کو واپس ہو گئے اور اس پر عمل کیا۔

ان وفود کی آمد جن کا نام روایات میں مذکور نہیں

(۲۳۷) عمرو بن عبسہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ اسلام کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تیرا قلب اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائے اور تیری زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانی سے تمام مسلمان محفوظ رہیں پھر اس نے پوچھا اچھا اسلام کا سب سے بہتر درجہ کیا ہے آپ نے فرمایا ایمان! (ایک روایت میں

---

(۲۳۷) عمل کون بہتر ہے؟ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب نہیں ہو سکتا۔ فی نفسہ ان عمل کے وزن ... طالب کے حالات اور زمانوں کے مختلف تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مختلف ہو جاتا ہے اسی لئے حدیثوں میں بھی اس سوال کے جوابات مختلف ہیں۔

فَإِنَّهُ لَا يُحْسِنُ الْاِسْتِئْذَانَ فَقُولِي لَهُ فَلْيَقُلِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ فَقَالَ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ ذَالِكَ فَقُلْتُ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ قَالَ فَأَذِنَ لِي أَوْ قَالَ فَدَخَلْتُ فَقُلْتُ بِمَ أَتَيْتَنَا بِهِ قَالَ لَمْ آتِكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ أَتَيْتُكُمْ بِأَنْ تَعْبُدُوا اللهَ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ قَالَ شُعْبَةُ وَأَحْسِبُهُ قَالَ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَنْ تَدَعُوا اللَّاتَ وَالْعُزّٰى وَأَنْ تُصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَأَنْ تَصُومُوا مِنَ السَّنَةِ شَهْرًا وَأَنْ تَحُجُّوا الْبَيْتَ وَأَنْ تَأْخُذُوا مِنْ مَالِ أَغْنِيَائِكُمْ فَتَرُدُّوهَا عَلَى فُقَرَائِكُمْ قَالَ فَقَالَ هَلْ بَقِيَ مِنَ الْعِلْمِ شَيْءٌ لَا تَعْلَمُهُ قَالَ قَدْ عَلَّمَنِيَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ خَيْرًا وَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَا يَعْلَمُهُ إِلَّا اللهُ إِنَّ اللهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (قال الهيثمي اخرج ابو داود طرفا من اوله رواه احمد ورجاله كلهم ثقات ائمه)

دو استعمال شدہ اور کہا) کیا میں اندر گھس آؤں۔ آپ نے اپنی ایک باندی سے کہا اس شخص کو اجازت حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ جا کر اسے بتا کہ پہلے اسے السلام علیکم کہنا چاہئے اس کے بعد یوں کہنا چاہئے کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں۔ وہ شخص کہتا ہے کہ آپ کی یہ بات میں نے بھی سن لی تو اسی کے مطابق میں نے عرض کیا السلام علیکم کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ اُن کو اجازت مل گئی۔ یا یہ کہ میں اندر چلا آیا (راوی کو شک ہے) اور پوچھا آپ ہمارے پاس کیا دین لیکر آئے ہیں آپ نے فرمایا بھلا ہی بھلا، سب بہتری ہی بہتری ہے لیکر آیا ہوں کہ ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جس کا کوئی شریک نہیں۔ شعبہ (راوی حدیث) کہتا ہے کہ مجھے خیال ہے کہ وحدہ لاشریک کا لفظ بھی فرمایا اور یہ کہ لات و عزیٰ کو چھوڑ دو اور شب و روز میں پانچ نمازیں ادا کرو سال بھر میں ایک مہینے کے روزے رکھو بیت اللہ کا حج کرو اور اپنے مالداروں سے صدقہ لیکر اپنے غریبوں پر تقسیم کرو۔ اس نے پوچھا اچھا کوئی علم ایسا باقی ہے جو آپ نہ جانتے ہوں۔ آپ نے فرمایا ابھی تو بہت سی عمدہ عمدہ باتیں باقی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتائی ہیں ہاں علم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا (اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی) إِنَّ اللهَ تو قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے وہی بارش بھیجتا ہے وہی جانتا ہے کہ۔ نر و مادہ کے رحم میں کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا کہ کل اسے کیا کرنا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ وہ کس ملک اور کس بستی میں مرے گا اللہ ہی کو سب کچھ معلوم ہے وہی جاننے والا اور خبردار ہے۔

---

(۲۳۹) عن جریر بن عبد اللہ قال خرجنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما
برزنا من المدینۃ اذا راکب یوضع نحونا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ھذا
الراکب ایاکم یرید قال فانتھی الرجل الینا فسلم فرددنا علیہ فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
من این اقبلت قال من اھلی وولدی وعشیرتی قال فاین ترید قال اریدُ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال فقد اصبتہ قال یا رسول اللہ علمنی ما الایمان قال تشھد ان لا الٰہ
الا اللہ وان محمدا رسول اللہ وتقیم الصلوٰۃ وتؤتی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت
قال قد اقررت قال ثم ان بعیرہ دخلت یدہ فی شبکۃ جرذان فھوی بعیرہ وھوی
الرجل فوقع علی ھامتہ فمات فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی بالرجل فقال
فوثب الیہ عمار بن یاسر وحذیفۃ فاقعداہ فقالا یا رسول اللہ قبض الرجل قال فاعرض
عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال لھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما رایتما
اعراضی عن الرجل فانی رایت ملکین یدسان فی فیہ من ثمار الجنۃ فعلمت انہ

ترجمہ

(۲۳۹) جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جب مدینہ
سے باہر نکل گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سوار ہماری طرف اپنی سواری بھگاتا ہوا آرہا ہے آپ نے فرمایا ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہارے ہی پاس آرہا ہے اتنے میں وہ آدمی پہنچا اور سلام کیا ہم نے اس کے سلام کا جواب
دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کدھر سے آرہے ہو اس نے عرض کیا بیوی بچوں
اور اپنے خاندان کے پاس سے۔ آپ نے پوچھا کدھر کا قصد ہے اس نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا۔ آپ نے
فرمایا تو بیشک مقصد پر پہنچ گئے اس نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے سکھلائیے ایمان کیا چیز ہے آپ نے فرمایا
اس بات کی گواہی دو کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں نماز
اچھی طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو، اس نے عرض کیا میں نے ان
سب باتوں کا اقرار کیا۔ راوی کہتا ہے اس کے بعد اس کے اونٹ کا پیر کسی جنگلی چوہے کے سوراخ میں
جا پڑا وہ اونٹ گرا اور کھوپڑی کے بل یہ خود بھی جب گرا اور مر گیا۔ آپ نے فرمایا اس شخص کو ذرا بلا کر لانا فوراً
عمار بن یاسرؓ اور حذیفہؓ اس کو اٹھانے کے لیے پہنچے اس کو بٹھایا (تو وہ مر چکا تھا) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ
اس کا تو انتقال ہو گیا۔ راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی بجائے کسی اور سمت دیکھنے لگے
پھر آپ نے فرمایا تم نے دیکھا کہ میں اس شخص کی بجائے دوسری طرف متوجہ ہو گیا تھا میں نے دیکھا تھا کہ

ثُمَّ جَاءَنَا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا أَوْ هُوَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالَ اللّٰهُ فِيْهِمْ (الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُوْنَ) ثُمَّ قَالَ دُوْنَكُمْ أَخَاكُمْ قَالَ فَاحْتَمَلْنَاهُ إِلَى الْمَاءِ فَغَسَّلْنَاهُ وَحَنَّطْنَاهُ وَكَفَّنَّاهُ وَحَمَلْنَاهُ إِلَى الْقَبْرِ قَالَ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى جَلَسَ عَلٰى شَفِيْرِ الْقَبْرِ قَالَ فَقَالَ الْحَدُوْا وَلَا تَشُقُّوْا فَإِنَّ اللَّحْدَ لَنَا وَالشَّقَّ لِغَيْرِنَا۔

(وَعَنْهُ أَيْضًا مِنْ طَرِيْقٍ ثَانٍ) قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَيْنَا نَحْنُ نَسِيْرُ إِذْ نَحْنُ بِشَخْصٍ فَذَكَرَ نَحْوَهُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ وَقَعَتْ يَدُ بَكْرِهِ فِيْ بَعْضِ تِلْكَ الَّتِيْ تَحْفِرُ الْجُرْذَانُ وَقَالَ فِيْهِ هٰذَا مِمَّنْ عَمِلَ قَلِيْلًا وَأُجِرَ كَثِيْرًا۔

دو فرشتے اس کے منہ میں جنت کے میوے ڈال رہے ہیں یہ دیکھ کر میں سمجھا کہ ضرور یہ شخص بھوکا مرا ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا خدا کی قسم یہ اُن لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (جو لوگ ایمان لا چکے پھر انہوں نے اپنے ایمان میں معصیت کا ذرا بھی داغ لگنے نہیں دیا یہی لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) پھر فرمایا اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو، ہم اسے اٹھا کر پانی کے پاس لائے غسل دیا، خوشبو لگائی، کفن پہنایا اور قبر میں دفن کرنے کے لئے اٹھا کر لے چلے، راوی کہتا ہے آپ تشریف لائے اور قبر کے ایک کنارہ پر بیٹھ گئے اور فرمایا بغلی بناؤ صندوق نہ بناؤ کیونکہ ہمارے لئے بغلی ہی مناسب ہے صندوق دوسروں کے لئے ہے۔

(اسی روایت کے دوسرے طریقے میں ہے) ہم کسی سفر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے ابھی جا رہے تھے کہ دفعۃً ایک شخص نظر آیا اس کے بعد وہی مضمون مذکور ہے اس طریقے میں یہ لفظ ہیں کہ اس کے اونٹ کا پاؤں ان سوراخوں میں سے کسی سوراخ میں جا پڑا جو جنگلی چوہے کھود لیا کرتے ہیں اور یہ مضمون اور ہے کہ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے عمل تو تھوڑا کیا لیکن ثواب بہت پایا۔

---

(۲۳۹) عالم فانی سے گذرنے کے بعد ہی عالم آخرت کی منزلوں سے گذرنے کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی حال عذاب کا بھی ہے جو بہت حد تک برزخ ہے وعذاب قیامت کے بعد ہوگا۔ شہیدوں کے لئے رزق ملنا شریعت میں ثابت ہے۔ یہ شخص بھی کتنا خوش قسمت تھا کہ تعلیمات اسلامی حاصل کرنے کے بعد اس کو غفلت اور نافرمانی کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اِدھر اسلام لایا اُدھر شہادت کی موت نصیب ہوئی۔ فرشتوں نے فوراً آکر ایک مومن کے فرائض انجام دیئے اور اس کے لئے اسی عالم کی نعمتوں کا دروازہ کشادہ ہو گیا۔ رسول خدا نے یہ ماجرا دیکھ کر بے ساختہ فرمایا کہ اس خوش نصیب نے عمل تو بہت تھوڑا کیا مگر ثواب کتنا عظیم الشان پایا۔

(وعنہ ایضا من طریق ثالث) ان رجلا جاء فدخل فی الاسلام فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعلمہ الاسلام وھو فی مسیرہ فدخل خف بعیرہ فی جحر یربوع فوقصہ بعیرہ فمات فاتی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال عمل قلیلا واجر کثیرا قالہا حماد ثلاثا اللحد لنا والشق لغیرنا۔ (رواہ الطبرانی وابن ابی حاتم فی تفسیرہ والحکیم الترمذی ... وحدیث الباب فی سندہ زاذان ابو عمر الکندی قال ابن معین ثقۃ وقال الحافظ فی التقریب صدوق یرسل وفیہ شیعۃ وقال الذہبی ... ضعفہ النسائی والدارقطنی ضعیف قال الحافظ ... لکثرۃ تدلیسہ

حقیقۃ الایمان والاسلام والاحسان

(۲۴۰) عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال بینما نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر لا یری علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد حتی جلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ ووضع کفیہ علی فخذیہ وقال یا محمد اخبرنی عن الاسلام

(تیسرے طریق میں ہے) کہ ایک شخص آیا اور مسلمان ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر ہی میں اس کو اسلام کی تعلیم دیتے جاتے تھے اس کے اونٹ کا ایک پیر کسی جنگلی چوہے کے سوراخ میں جا پڑا وہ اونٹ گرا اور یہ بھی گرا گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اس شخص نے عمل تو تھوڑا ہی کیا مگر ثواب بہت پایا۔ حماد نے تین بار فرمایا۔ بغلی قبر ہمارے لئے ہے اور صندوق دوسروں کے لئے ہے۔

ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت

(۲۴۰) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے دفعۃً ایک شخص آیا اس کے کپڑے نہایت سفید بال نہایت سیاہ تھے اس پر کوئی سفر کی علامت تھی (کہ ہم نے مسافر سمجھتے) نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (کہ شہری سمجھتے) یہاں تک کہ آپ کے پاس آ کر بیٹھ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانوئے مبارک پر رکھ دیئے اور بولا۔ اے محمد مجھے بتائیے اسلام کیا چیز ہے؟ آپ نے

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا
رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ
إِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِيْمَانِ
قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَ
شَرِّهِ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ
فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ

ارشاد فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کا اقرار کرے کہ سوائے ایک خدا کے اور کوئی معبود نہیں محمد
صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اس کے رسول ہیں۔ نماز پورے طور پر ادا کرے، زکوٰۃ دے، رمضان شریف کے
روزے رکھے اور اگر طاقت ہو تو خدا کے گھر کا حج بھی کرے۔ وہ بولا کہ تو نے ٹھیک کہا۔ راوی کہتا ہے ہمیں
اس پر تعجب ہوا کہ یہ پہلے آپ سے دریافت کرتا ہے پھر (خود ہی) آپ کی تصدیق بھی کرتا ہے (گویا
واقف ہے) پھر بولا اچھا اب ایمان کے متعلق بتلائیے آپ نے فرمایا خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں
اس کے رسولوں اور قیامت کو دل سے مانو اور اس بات پر یقین کرو کہ برا بھلا جو کچھ ہے وہ سب نوشتۂ
تقدیر کے موافق ہے اس نے کہا تو نے صحیح کہا اب یہ بتلائیے احسان کیا چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ
کی اس طرح سے عبادت کر گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ تم اگر اس کو حقیقۃً نہیں دیکھتے مگر وہ تو تمہیں
حقیقۃً دیکھتا ہے (پھر اتنی ہی خشوع سے عبادت کرنا ہے جتنا کہ اس علم صحیح کا اقتضا ہے) اس کے
بعد اس نے قیامت کے متعلق سوال کیا (کب آئے گی؟) آپ نے فرمایا جس سے دریافت کرتے ہو

(۴۴۰) لہ ابن حبان نے شعر کی بجائے لحیۃ کا لفظ روایت کیا ہے یعنی اس کی ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے۔
(فتح الباری ج ۱ ص ۹۹) کپڑوں کی صفائی اور بالوں کی سیاہی میں اس طرف اشارہ تھا کہ طلب علم کے لئے اچھا فاخرہ
لباس پہننا اور نوعمری میں طلب علم کے لئے نکلنا مناسب ہے۔
سہ نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنہ مبارک پر ہاتھ رکھے
سہ بخاری شریف کتاب التفسیر میں "یا محمد" کی بجائے "یا رسول اللہ" کا لفظ آیا ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک روایت میں
السلام علیک کا لفظ بھی نقل کیا ہے چونکہ اس آنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقصد اول تا آخر تعلیم ہی تھا اس لئے
[illegible] کی تشریف آوری ہوئی کہ [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا پہلے آیا تھا [illegible] ایک روایت میں محمد
سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ [illegible] اس مرتبہ کے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے ہوں
اور میں نے انہیں نہ پہچانا ہو۔ اس لئے [illegible] کی زبان سے یا رسول اللہ کی بجائے یا محمد کا لفظ [illegible] نہیں ہے

من السائل قال فأخبرني عن أماراتها قال أن تلد الأمة ربتها وأن ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان قال ثم انطلق فلبثت مليا ثم قال لي يا عمر أتدري من السائل قلت الله ورسوله أعلم قال فإنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم. رواه الخمسة وزاد في رواية في خمس لا يعلمهن إلا الله ثم تلا النبي صلى الله عليه وسلم إن الله عنده علم الساعة الآية ثم أدبر فقال ردوه فلم يروا شيئا فقال هذا جبريل جاء يعلم الناس دينهم۔

اس کا تو وہ خود بھی سائل سے زیادہ عالم نہیں ہے۔ اس نے پوچھا اس کی کچھ علامات ہی بتلا دیجئے آپ نے فرمایا کہ (۱) باندی اپنی آقا کو جنے، اور برہنہ پا ننگے، محتاج، بکریوں کے چرانے والے عمارتوں میں باہم فخر کرنے لگیں۔ راوی کہتا ہے اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔ میں نے کچھ عرصہ توقف کیا اس کے بعد آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا اے عمر جانتے ہو یہ سائل کون تھا میں نے عرض کیا خدا اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ جبرئیل تھے تمہارا دین (دا سے یوں ہیں) تمہیں سکھلانے آئے تھے۔

اس حدیث کو پانچ کتابوں میں روایت کیا ہے اور ایک روایت میں اتنی بات اور ہے کہ قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں داخل ہے جنہیں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (یعنی قیامت کا علم صرف خدا کو ہے) آخر آیت تک۔ جب وہ شخص پشت پھیر کر چلا گیا تو آپ نے حکم دیا جاؤ اسے واپس بلا لاؤ وہ گئے تو انہیں کوئی نظر نہ آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا یہ جبرئیل تھے لوگوں کو دین سکھلانے تشریف لائے تھے۔

بقیہ صفحہ گذشتہ

اس وقت ان کے شاہد حال یہی تھا کہ اپنے نفس کو ایسے ہی شہود حالات کے ماتحت سمجھیں کہ گویا وہ ان کے [illegible] سامنے قائم ہی نہ کر سکے۔ [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] ادب یہ ہے کہ اپنے سلام کر رہا ہے۔

یہ ترجمہ شیخ محی الدین [illegible] کے تحفہ [illegible] ہے۔ ان کے بیان کا منشا یہ ہے کہ [illegible] غیبت کا بڑا فرق کرتا ہے ایک غلام ہے آقا کی خدمت جب اس کے سامنے انجام دیتا ہے تو خشوع و خضوع اور حسن ادب کے ساتھ [illegible] سب [illegible] سامنے سے [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] غیبت اور حضور کا یہ فرق درحقیقت ایک قسم کا نفاق ہے۔

[illegible] شریعت [illegible] ہے کہ اس عیب سے [illegible] کے [illegible] ہوتا ہے [illegible] عبادت کا [illegible] ہو [illegible] لیکن یہ ظاہر ہے کہ [illegible] کو [illegible] ہے کہ [illegible] حالت [illegible]

صَدَقْتَ قَالَ الْقَوْمُ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا أَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا كَأَنَّهُ يُعَلِّمُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ كُلَّ ذٰلِكَ نَقُولُ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا أَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا فَيَقُولُ صَدَقْتَ صَدَقْتَ قَالَ أَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ بِهَا مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَقَالَ صَدَقْتَ قَالَ ذٰلِكَ مِرَارًا مَا رَأَيْنَا رَجُلًا أَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا ثُمَّ وَلّٰى قَالَ سُفْيَانُ فَبَلَغَنِي أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْتَمِسُوهُ فَلَمْ يَجِدُوهُ قَالَ هٰذَا جِبْرِيلُ جَاءَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ مَا أَتَانِي فِي صُورَةٍ إِلَّا عَرَفْتُهُ غَيْرَ هٰذِهِ الصُّورَةِ ۔ وفی روایۃ ابن حبان بامارات

عرض کرتا ہر بات پر وہ بجا اور درست کہتا جاتا تھا۔ حاضرین نے کہا اس سے بڑھ کر آپ کی توقیر و تعظیم کرنے والا شخص ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ آپ کو سکھاتا جاتا تھا۔ پھر اس نے کہا یا رسول اللہ احسان کے متعلق ارشاد ہو آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں بلاشبہ دیکھ ہی رہا ہے۔ ہر مرتبہ ہم یہی کہتے کہ اس جیسا آپ کی تعظیم اور توقیر کرنے والا شخص ہم نے کوئی نہیں دیکھا بات بات پر بجا و درست ہی کہتا جاتا ہے اس کے بعد اس نے عرض کیا جناب قیامت کے متعلق فرمائیے کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا اس بارے میں تو سائل اور جس سے پوچھا جاتا ہے دونوں کا علم برابر ہے (نہ آپ کو معلوم نہ مجھ کو) سائل نے کہا آپ نے پھر وہی بجا و درست کہا۔ بار بار وہی کہتا رہا۔ ہم نے کہا اس جیسا شخص ہم نے آپ کی توقیر کرنے والا نہیں دیکھا پھر وہ پشت پھیر کر چلا گیا۔ سفیان کہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اس شخص کو تلاش کرو لوگ تلاش کرنے کے لئے گئے مگر نہ ملا آپ نے فرمایا یہ جبرئیل تھے اس لئے سے تمہارا دین تمہیں سکھانے آئے تھے اس سے قبل وہ جس صورت میں بھی میرے پاس آئے میں نے انہیں شناخت پہچان لیا ہے لیکن اس صورت میں میں ان کو پہچان نہیں سکا۔ ابن حبان نے بھی اس واقعہ کو روایت کیا ہے

---

(۲۴۳) یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سوالات کی ترتیب میں راویان کا اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ایمان کا سوال مقدم ہے اور بعض میں اسلام کا لیکن مسائل کے اول و آخر ہونے سے کہیں کوئی فرق نہیں ہے سب سوال اور اسلام کا تعلق اعمال جوارح سے مخصوص ہے اور ایمان کا اعتقادیات سے۔ الگ بات ہے کہ اعمال جوارح کی تفصیل شارحین نے اپنی اپنی نفس زکوٰۃ کی ہے۔ صوم، غسل جنابت اور وضو کی تکمیل صرف ابن حبان کی روایت میں مذکور ہے لیکن حج و عمرہ کا ذکر ہے اور غسل جنابت اور اسباغ وضو بنانے کے اس سے یہاں اختلاف کرنا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایمان کی تعریف میں بھی اسی طرح کا

فیها أن الإسلام قال وتحج وتعتمر وتغتسل من الجنابة وأن تتم الوضوء إلى آخر ما ذکر ... والتفت
نفسي بيده ما اشتبه علي منذ أتاني قبل مرتي هذه وما عرفته حتى ولى رواه صاحب العلوم والحکم (۱)
(وعنه من طريق ثان) جاء جبرئيل إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال يا محمد ما الإسلام
فقال تعبد الله لا تشرك به شيئا وتقيم الصلوٰة وتؤتي الزکوٰة وتصوم رمضان وتحج البيت
قال فإذا فعلت ذلك فأنا مسلم قال نعم صدقت قال فما الإحسان قال تخشى الله تعالى
كأنك تراه فإن لا تكن تراه فإنه يراك قال فإذا فعلت ذلك فأنا محسن قال نعم قال
صدقت قال فما الإيمان قال تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله والبعث من بعد
الموت والجنة والنار والقدر كله قال فإذا فعلت ذلك فأنا مؤمن قال نعم
قال صدقت زاد في رواية وكان جبرئيل يأتي النبي صلى الله عليه وسلم في صورة دحية

اس میں کچھ زیادتیاں اور بھی ہیں مثلاً اس میں اسلام کی تشریح میں حج و عمرہ، غسل جنابت اور پورے طور پر وضو
کرنے کا ذکر بھی ہے اور آخر میں ہے مجھ سے اپنا دین سیکھ لو۔ اس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب
کبھی میرے پاس یہ تشریف لائے ہیں کبھی مجھ پر مشتبہ نہیں ہوئے بجز اس مرتبہ کے کہ میں ان کو شناخت نہیں کر سکا
یہاں تک کہ وہ پشت پھیر کر چلے گئے) ابن عمرؓ کی روایت کے دوسرے طریقہ میں اس روایت کا مضمون یوں ہے
جبرئیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا اے محمد! اسلام کی حقیقت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ
کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ نماز ادا کرو زکوٰۃ دو۔ رمضان شریف کے روزے رکھو بیت اللہ
کا حج کرو۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ جب یہ باتیں میں کر لوں تو کیا میں مسلمان ہو جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا ضرور۔ اس نے
کہا آپ نے درست فرمایا۔ پھر پوچھا احسان کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرتا رہ گویا
اسے تو آنکھوں سے دیکھتا ہے اگر تو اسے آنکھوں سے نہیں دیکھتا تو وہ تو یقیناً تجھے دیکھتا ہے۔ اس نے کہا اگر
میں یہ صفت حاصل کر لوں تو کیا میں محسن ہو جاؤں گا آپ نے فرمایا بیشک۔ اس نے کہا آپ نے بجا فرمایا۔ پھر بولا کہ
ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں کو
اور موت کے بعد جی اٹھنے کو جنت و دوزخ اور ہر قسم کی تقدیر کو دل سے مان لے۔ اس نے کہا جب میں یہ تمام
باتیں مان لوں تو کیا میں مومن ہو جاؤں گا آپ نے فرمایا یقیناً۔ اس نے کہا ٹھیک فرمایا (ایک روایت میں یہ اور ہے

(۱) حدیث میں ذکر ہے قرآن کریم نے بھی کئی جگہ ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔
(۱) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

وعنه من طريق ثالث ان جبريل قال للنبي صلى الله عليه وسلم ما الايمان قال ان تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر والقدر خيره وشره فقال له جبريل عليه السلام صدقت قال فتعجبنا منه يسأله ويصدقه قال فقال النبي صلى الله عليه وسلم ذاك جبريل اتاكم يعلمكم معالم دينكم - وعنه من طريق رابع قال اخبرنا عمر بن الخطاب

کہ عام طور پر جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں دحیہ کلبی کی صورت میں آیا کرتے تھے)۔

ابن عمرؓ کی روایت کے تیسرے طریقے میں یہ مضمون اس طرح ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ایمان کسے کہتے ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اس کی کتابیں اور تمام رسولوں کو اور آخرت کے دن اور ہر بھلی بری چیز کو نوشتہ تقدیر مان لو جبریل علیہ السلام نے کہا آپ نے ٹھیک فرمایا۔ راوی کہتا ہے کہ ہم نے اس پر تعجب کیا کہ یہ شخص خود ہی پوچھتا ہے اور پھر خود ہی اس کی تصدیق بھی کرتا جاتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبریل علیہ السلام تھے، تمہارے پاس تمہارے دین کے اصول سکھلانے آئے تھے ــــ روایت مذکورہ کے چوتھے طریقے میں ہے۔ ابن عمرؓ نے

پہلے جزء پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کتاب کو مان لیا جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی اور دوسرے کے ساتھ (دوسرے) مومن بھی۔ وہ سب کے سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے

(۲) ولکن البر من آمن باللہ والیوم الآخر والملائکۃ والکتاب۔ بلکہ اصل بھلائی اور نیکی یہ ہے کہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔

چونکہ رسولوں پر ایمان یہ ہے کہ ان کی بیان کردہ سب باتوں کو تسلیم کیا جائے اس لئے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات، قیامت اور جنت دوزخ کی تمام تفصیلات جیسے صراط، میزان وغیرہ سب کا تسلیم کرنا ایمان بالرسل میں داخل ہے یہاں ایک بات غور طلب یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان کے مفہوم میں فرق ہے اور بعد میں آنے والی حدیث میں آپ نے اسلام کی ٹھیک وہی تفسیر بیان فرمائی ہے جو یہاں ایمان کی ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں کوئی فرق نہیں۔ علماء نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ ایمان و اسلام مصداق کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہیں یعنی اسلام کامل اور ایمان کامل جدا نہیں ہوتے اس لئے ایمان و اسلام کے اجزاء ایک دوسرے کی تعریف میں . . . ذکر کئے جاسکتے ہیں۔

حدیث جبریل میں سائل کے سوالات کی نوعیت پھر بار بار اس کی تصدیق کرنے سے یہ اندازہ کرنا بہت ہی قریب قیاس تھا کہ یہ مخاطب کوئی ذی علم اور ذی فہم شخص ہے اس لئے اس کے سامنے ہر ایک کی بہ اعتبار اصطلاح علمیہ جو حقیقت بیان کرنا اور ان دو کلمہ کو غیروں پر بھی منطبق کر دینا جس سے ایمان و اسلام کی حقیقت ممتاز ہو جائے یہی نہایت مناسب تھا۔ نیز عبد القیس میں آپ کے مخاطب چونکہ نومسلم تھے ان کے سامنے علمی تحقیقات بیان کرنا غیر ضروری تھا نیز وہ صرف ایک ایسا نظام عمل دریافت کرنے آئے تھے جو ان کی نجات کے لئے کافی ہو جائے اس لئے ان کے سامنے آپ نے ایسا ہی نظام عمل

انا عمر بينما هم جلوس او قعود عند النبي صلى الله عليه وسلم جاء رجل يمشي حسن الوجه حسن الشعر عليه ثياب بيض فنظر القوم بعضهم الى بعض ما نعرف هذا وما هذا بصاحب سفر ثم قال يا رسول الله آتيك قال نعم فجاء فوضع ركبتيه عند ركبتيه ويديه على فخذيه وساق الحديث بنحو ما تقدم وفيه ان النبي صلى الله عليه وسلم قال بعد ان ذهب السائل علي بالرجل فطلبوه فلم يروا شيئا فمكث يومين او ثلاثة ثم قال يا ابن الخطاب أتدري من السائل عن كذا وكذا قال الله ورسوله اعلم قال ذاك جبريل جاء ليعلمكم دينكم.

یہی مجھ سے حضرت عمرؓ نے بیان فرمایا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ ایک شخص نہایت حسین، خوبصورت بالوں والا، سفید لباس پہنے ہوئے آپ کے پاس ٹہلتا ہوا آیا، لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا (اور کہا) ہم اس شخص کو پہچانتے تو نہیں نہ یہ کوئی شخص مسافر تو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ بولا یا رسول اللہ میں حاضر ہو سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا خوشی سے وہ آیا اور اپنے دونوں زانو آپ کے زانو کے برابر اور دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے (اس کے بعد پھر حضرت عمرؓ کی روایت کا دوسرا مضمون بیان کیا اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے چلے جانے کے بعد فرمایا اس کو میرے پاس لاؤ، لوگوں نے اسے ڈھونڈھا تو انہیں کوئی نظر نہ آیا۔ دو تین دن کے بعد آپ نے فرمایا اے ابن الخطابؓ جانتے ہو یہ سوالات کرنے والا شخص کون تھا۔ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی واقف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیلؑ تھے تمہارا دین سکھانے کے لئے تمہارے پاس آئے تھے

لکھ دینا مناسب سمجھا۔ یہاں اسلام و ایمان کا فرق بیان کرنا بالکل غیر ضروری تھا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تعبیری فرق صرف مخاطبین کے حالات کی رعایت سے کیا گیا ہے مسئلہ کا فرق نہیں ہے۔

ابن عمرؓ کی حدیث کے دوسرے طریقہ کے آخری الفاظ سے یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ حضرت جبرئیلؑ کو نہ شناخت کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس مرتبہ وہ اپنی عام عادت کے مطابق دحیہ کلبی کی شکل میں تشریف نہ لائے تھے۔ تعجب ہے کہ نسائی شریف میں اس کے بالکل برعکس یہ بات راوی نے بیان کردی ہے "انه جبریل نزل فی صورة دحیة الکلبی" (یہ جبرئیلؑ تھے دحیہ کلبی کی صورت میں آئے تھے) حافظ ابن حجرؒ نے اس کو راوی کا وہم قرار دیا ہے اور بجا قرار دیا ہے۔

چوتھے طریقہ میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ سے آپ کا سائل کی تشخیص کے متعلق سوال کرنا اس واقعہ کے دو تین دن بعد ہوا ہے۔ ابو داؤد، نسائی اور ترمذی میں بھی نووی نے بلا تردد تین دن کا لفظ کہا ہے۔ لہذا اس کے خلاف جو روایت بھی ہو اس کی تاویل کی جائے گی۔

ارکان الاسلام ودعائمہ العظام

(۲۲۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَہَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَمُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ۔

ارکانِ اسلام

(۲۲۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کا قصر پانچ ستونوں پر قائم کیا گیا ہے۔ شہادتین۔ یعنی اس بات کا دل سے اقرار کرنا کہ سوائے ایک اللہ تعالیٰ کے کوئی اور معبود نہیں ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے رسول ہیں۔ پورے آداب و حقوق کی رعایت کرکے نماز ادا کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ حج کرنا۔ رمضان شریف کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کو بخاری و مسلم و ترمذی و نسائی نے روایت کیا ہے۔

(الف) مصنف عبدالرزاق میں یہاں خمس دعائم کا لفظ صراحۃً مذکور ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۲۰)

(ب) حدیث مذکور کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ تعلیم اور قرآن کریم کا اسلوب بیان بہت فطری ہوتا ہے یہاں روزمرہ کے معمولی مشاہدات سے آخرت کے بڑے بڑے علوم باتوں باتوں میں حل کر دیے جاتے ہیں۔ اب غور کرو کہ ایک امی قوم کو اسلام اور اعمال کا ربط پھر اعمال میں باہمی مراتب کا تفاوت سمجھانا۔ مسئلہ کس قدر مشکل ہے اور اس کے لئے تعبیر کتنی سادہ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح اپنے ماحول میں تم روزمرہ یہ مکان دیکھتے ہو ان میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں، اور ان کے مجموعہ کو تم مکان کہا کرتے ہو پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ضرور ہوتی ہے جس پر یہ مکان قائم ہوتا ہے۔ پھر عجیب بات ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان مکان تو آنکھوں سے نظر بھی آتا ہے مگر وہ بنیاد جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہوتی ہے کہیں نظر نہیں آتی وہ زمین کے نیچے ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کو سمجھو وہ بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں ....

.... ان کی بھی ایک بنیاد ہے۔ پھر اس کے اجزاء میں باہمی تفاوت ہے جیسا کہ تمہارے مکان کے اجزاء میں ہر جزء مکان کے لئے یکساں ضروری نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ مکان کی بقا کے لئے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق، روشندان اور نقش و نگار کی نہیں۔ اسی طرح یہاں ارکان خمسہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں جن کے بغیر اسلام کا بقاء قائم نہیں رہ سکتا پھر ان ارکان میں بھی باہمی فرق ہے۔ آئندہ حدیث میں ابھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان ارکان خمسہ کے ساتھ ساتھ تصدیق قلبی کا نام بھی زیر نظر ہے اسے مکان کی بنیاد کی مثال سمجھئے جس طرح وہ زیر زمین مدفون ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی دل میں پوشیدہ رہتی ہے .... ارکان خمسہ کی یہ تعمیر اسی پوشیدہ تصدیق پر قائم رہ سکتی ہے۔ ایک سرسری سی مثال سے کتنی بڑی حقیقت ذہن نشین کر دی گئی اور لطف یہ کہ سامعین کو خبر تک نہ ہوئی کہ مشکل کیا تھی اور کیونکر حل ہو گئی۔ تعلیم و تربیت گذر گئی اور جب علوم رسمیہ کی نوبت آئی تو اسی صاف بات کو جب

(بقیہ حاشیہ آئندہ)

قَلِيلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِي دِينِهِ إِمَّا قَتَلُوهُ وَإِمَّا يُعَذِّبُوهُ حَتَّى كَثُرَ الْإِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ. الحديث رواه البخاري في التفسير (ص ۶۴۸)

(۳۳۷) عَنْ أَبِي سُوَيْدٍ الْعَبْدِيِّ قَالَ أَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ فَجَلَسْنَا بِبَابِهِ لِيُؤْذَنَ لَنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ قَالَ فَقُمْتُ إِلَى جُحْرٍ فِي الْبَابِ فَجَعَلْتُ أَطَّلِعُ فِيهِ فَفَطِنَ بِي فَلَمَّا أَذِنَ لَنَا جَلَسْنَا فَقَالَ أَيُّكُمُ اطَّلَعَ آنِفًا فِي دَارِي قَالَ قُلْتُ أَنَا أَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ فَنَظَرْتُ فَلَمْ أَتَعَمَّدْ ذَلِكَ قَالَ ثُمَّ سَأَلُوهُ عَنْ أَشْيَاءَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ

انھا اس کو مار ڈالتا یا تکلیف دی جاتی یہاں تک کہ اسلام بکثرت پھیل گیا اور کوئی فتنہ باقی نہ رہا۔

(۳۳۷) ابو سوید عبدی بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دروازے پر بیٹھ گئے تاکہ اجازت مل جائے (تو اندر داخل ہوں) اجازت میں کچھ دیر ہوئی تو میں دروازے میں ایک سوراخ کے اندر سے جھانکنے لگا وہ میری اس حرکت کو تاڑ گئے جب ہمیں اجازت مل گئی اور ہم بیٹھ گئے تو انھوں نے فرمایا ابھی میرے گھر میں تم میں کس نے جھانکا تھا میں نے عرض کیا کہ اجازت ملنے میں دیر ہوگئی تھی اس لئے میں نے جھانکا تھا (تاکہ تاخیر کا سبب معلوم ہو) جھانکنا مقصود نہ تھا اس کے بعد پھر اُن سے بعض اور باتیں دریافت کیں انھوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت پر، نماز پڑھنے

ہیں، صلہ رحمی، حقوق زوجہ، حقوق اولاد وغیرہ اس شریک تقریر ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص قرابت سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں، اسی طرح شریعت کے جتنے ابواب ہیں ان کے اعمال پر نظر ڈالی جائے اور غور کریں گے اب وہ کون سے احکام ہیں جو ہر ہر فرد کے ساتھ ہر وقت ہیں اور دینی و دنیوی مصلحت پر بھی مبنی ہیں۔ اور انسان کے انفرادی ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت بھی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہی عبادات خمسہ ہیں، اسی لئے حدیث مذکور میں صرف ان پانچ ہی کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

اس حدیث میں ابن عمرؓ کو بھی جنگ کی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے وہ عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافت پر جنگ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا جواب بیان کتنا عبرت آموز اور کتنا سچا ہے کہ کفار سے جنگ فتنہ فرو کرنے کے لئے ہوتی ہے اور مسلمانوں سے جنگ فتنہ پیدا کرنے کے لئے۔ تم جس بات کو میری تردید کے لئے پڑھ رہے ہو وہ حقیقت میں میری تائید کے لئے ہے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابن عمرؓ کا اس حدیث سے یہ مقصد نہیں تھا کہ جہاد فرض عین نہیں جیسا کہ بعض شارحین کا خیال ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۴۴) بلکہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جس کو حافظ ابن تیمیہ نے مذکورہ بالا بیان میں مفصل طور پر ذکر کیا ہے۔

(۳۳۷) اسلام میں کسی غیر شخص کے گھر میں جھانکنے کی ممانعت کی گئی تھی اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے

صلى الله عليه وسلم وناقته تذهب مرة وتجيء أخرى فعثرت ناقة معاذ فكبحها بالزمام فهبت حتى نفرت منها ناقة رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كشف عنه قناعه فالتفت فإذا ليس من الجيش رجل أدنى إليه من معاذ فناداه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يا معاذ فقال لبيك يا نبي الله قال ادن دونك فدنا منه حتى لصقت راحلتاهما إحداهما بالأخرى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما كنت أحسب الناس منا كمكانهم من البعد فقال معاذ يا نبي الله نعس الناس فتفرقت بهم ركابهم ترتع وتسير فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا كنت ناعسا فلما رأى معاذ بشرى رسول الله صلى الله عليه وسلم إليه وخلوته له قال يا رسول الله ائذن لي أسألك عن كلمة قد أمرضتني وأسقمتني وأحزنتني فقال نبي الله صلى الله عليه وسلم سلني عم شئت فقال يا نبي الله حدثني

تھی وضعہ ٹھوکر کھائی۔ معاذؓ نے اس کو لگام کھینچ کر سنبھالا تو وہ اور تیز ہوگئی یہاں تک کہ اس کی وجہ سے آپ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ آپ نے اپنا نقاب اٹھا کر دیکھا تو لشکر میں معاذؓ سے زیادہ کوئی اور شخص آپ کے قریب نہ تھا آپ نے ان کو آواز دی اے معاذؓ! انہوں نے جواب دیا یا نبی اللہ میں حاضر ہوں فرمایا اور قریب آجاؤ وہ قریب آگئے اور اتنے قریب آگئے کہ دونوں کی سواریاں ایک دوسرے سے بالکل مل گئیں آپ نے فرمایا میرا یہ خیال نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اتنی دور ہوں گے۔ معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ لوگ اونگھ رہے تھے (اس لئے) ان کی سواریاں چھوٹی رہیں اور چلتی رہیں اور ادھر ادھر منتشر ہو کر متفرق ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا میں بھی اونگھ رہا تھا۔ معاذؓ نے جب دیکھا کہ آپ ان سے خوش ہیں اور موقع بھی تنہائی کا ہے تو عرض کیا یا رسول اللہ اجازت دیجئے تو ایک بات پوچھوں جس نے مجھے بیمار ڈال دیا ہے اور غمزدہ بنا رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا جو چاہتے ہو پوچھو۔ عرض کیا یا رسول کوئی ایسا کام بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لیجائے

استعمال کیا گیا ہے ترمذی کی روایت میں یہاں کچھ اور اعمال کا بھی ذکر ہے۔ ان الفاظ سے چونکہ ان عبادتوں کی حیثیتوں کی ترجمانی کے لئے موزوں ترین الفاظ میسر نہیں آسکے۔ الغرض بالا میں توحید و رسالت کو سر کہا گیا ہے۔ شہادتین کی حقیقت سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور مثال نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا سر کٹ جانے تو اس کی روح نکل جاتی ہے اور وہ صرف ڈھانچہ کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔ اسی طرح کلمۂ شہادت کو سمجھنا چاہئے اگر وہ درمیان سے ہٹ جائے تو سارا عمل بھی صرف ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس میں کوئی روح نہیں۔ نماز کو قوام اس لئے کہا گیا ہے کہ نماز دیکھنے میں گو ایک ہی عبادت ہے مگر جملہ عبادات کی روح اس میں مضمر ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا مفہوم بھی ہے اور صوم کا بھی یعنی امساک کی طرح حرم محترم کے گرد طواف بھی جس نے اس عبادت کو چھوڑا اس نے گویا سب عبادتوں کو چھوڑ دیا۔ قرآن کہتا ہے

حَتّٰى يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَيَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ مَا شَحَبَ وَجْهٌ وَلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِيْ عَمَلٍ تُبْتَغٰى فِيْهِ دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ الْمَفْرُوْضَةِ كَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا ثَقُلَ مِيْزَانُ عَبْدٍ كَدَابَّةٍ تَنْفُقُ لَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ يَحْمِلُ عَلَيْهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (رواه احمد والبزار والنسائي وابن ماجه والترمذي وقال حديث حسن صحيح وحديث الباب باسناد جيد وشهر بن حوشب وثقه ابن معين والامام احمد وغيرهما.

الارتباط بين اركان الاسلام

(۳۴۹) عَنْ زِيَادِ بْنِ نُعَيْمٍ الْحَضْرَمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ اس وقت تک برابر جاری رکھوں جب تک کہ لوگ نماز نہ پڑھیں زکوٰۃ نہ دیں اور اس بات کی شہادت نہ دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں جب یہ باتیں کر لیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا مگر ہاں جو ضابطہ میں ہو اور اس کے بعد اُن کا حساب خدا کے سپرد ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجاتِ جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا وہ جو اس نے راہِ خدا میں کسی کو دے ڈالا۔

ارکانِ اسلام کا باہمی رابطہ

(۳۴۹) زیاد بن نعیم سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، چار

---

(۳۴۹) اس حدیث میں صراحت مذکور ہے کہ سب سے پہلے [illegible] ارکان ہیں اور مجموعہ دین کا وہ رشتہ ہے جو ایک قصر اور اس کے ستونوں کا ہوتا ہے اگر ارکانِ اسلام نہ ہوں تو دین کا قصر بھی [illegible] ان ارکان کے درمیان رشتہ کیا ہے ادھر کسی کا ذہن نہ گیا۔ اس نکتہ کی طرف حافظ ابن رجب کی نظر گئی ہے وہ اس حدیث کی شرح

اَرْبَعٌ فَرَضَهُنَّ اللّٰهُ فِي الْاِسْلَامِ فَمَنْ جَاءَ بِثَلَاثٍ لَمْ يُغْنِيْنَ عَنْهُ شَيْئًا حَتّٰى يَأْتِيَ بِهِنَّ جَمِيْعًا

چار چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بیت اللہ کا

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ارکان اسلام میں باہم گہرا ربط ہے اگر ان میں ایک دو پر توجہ میں بھی ضعف نمایاں ہونے لگے
ہے کیونکہ یہ ارکان جس طرح ایک عمارت کو سنبھالے ہوئے ستون ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی سہارا دیتے ہیں اگر سب موجود
ہوں تو یہ ستون عمارت کا وزن اپنے درمیان تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اس کا وزن صرف بقیہ ارکان
پر آ جاتا ہے اور لازمی طور پر اس قصر کے لئے اور خود ان ستونوں کے لئے بھی خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ تو ارکان ظاہری کا
حال ہے۔ دینی بنیادوں کا ربط اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان میں ایسا معنوی ربط ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ
جز بن جاتا ہے ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی توفیق میسر ہوتی ہے اور ایک کے ترک کرنے سے دوسرے سے بھی محروم ہونا
پڑتا ہے۔ اسی لئے صاحب حجت کی ایک بڑا اسرار تشبیہ میں ارکان خمسہ کا ایک رشتہ میں داخل سمجھنا چاہئے۔ جواب اس
تشبیہ کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ایک قصر کے لئے ستون ضروری ہے اسی طرح اسلام کے لئے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ
کا ادا کرنا ضروری ہے اور جس طرح کسی محل کے بعض ستون گر جانے سے اس کے دوسرے ستونوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اسی طرح
کسی رکن اسلامی کے ترک سے اس کے بقیہ ارکان کو بھی نقصان ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قصر کے قائم رہنے کے لئے جتنے ستون درکار ہیں ان سب ہی کا ہونا ضروری ہے اگر ان میں ایک بھی
نہ ہو تو بقیہ وجود بھی مفید نہیں ہوتا۔ اب رہ گئی یہ بات کہ کسی تعمیر کے لئے جتنے ستون ہونے چاہئیں پھر ان کے متعلق یہی
اہمیت اور ضرورت کا تناسب کیسے قائم کیا جائے ان میں کس کو کس کی احتیاج زیادہ ہے۔ اس مرحلہ کو وہی بخوبی حل کر سکتا ہے
جس نے یہ قصر تیار کیا ہے ہر ایک کے دماغ کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد جب آپ قرآن و حدیث پر نظر ڈالیں گے تو
آپ کو نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اکثر آیات میں ایک ہی جگہ ملے گا۔ احادیث میں حیا و ایمان کا ذکر ساتھ ساتھ ملتا ہے اسی ربط
کی طرف حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں "من لم یزک فلا صلوٰۃ لہ" (جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں۔) ایک
حدیث میں مذکور ہے کہ جس نے شراب پی اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ دوسری حدیث میں ہے جو غلام
اپنے آقاؤں سے بھاگ جائے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ ان احادیث بالا سے شراب نوشی اور اپنے مالک سے
بھاگنے کا نماز سے بڑا گہرا ربط ثابت ہوتا ہے۔ اس ربط کا پورا پورا ادراک تو خدا تعالیٰ ہی کو ہے جس نے دین کا
یہ قصر تیار کیا ہے اور وہی اس کے اصول تعمیر کا واقف ہے۔ تاہم حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس طرف
توجہ فرمائی ہے اور انسانی دماغ کے رسائی کی حد تک اسے خوب ہی سمجھایا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عبادات درحقیقت عبدیت اور بندگی کی ایک عملی ٹریننگ ہے۔ عبدیت درحقیقت وہ صحیح
رشتہ ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے اور اس کے حقوق
بتلانے آئے۔ باپ بیٹے، دوست دوست، ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ امتی اور رسول کا رشتہ میں ایک مخلوق کا دوسری
مخلوق کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان رشتوں میں تعدد کی گنجائش بھی ہے لیکن عبدیت اور معبودیت کا وہ
تعلق ہے جو نہ دو مخلوقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اشتراک کی گنجائش ہے یہ صرف مخلوق
اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے۔ اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک حق یاد دلاتے ہیں ہم کو

محبت سے مراد یہی پُرخلوص محبت ہے۔ مسلمانوں کا نباہ پر عمل ان کے تمام دین کے ارکان کی وابستگی میں جیسا کہ نماز، صلوٰۃ
روزہ، حج، زکوٰۃ سے لے کر جائز معاملات سے مسائل امت و سیاست تک کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں حب فی اللہ
اور بغض فی اللہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام
صرف تنہا یہی نہیں بلکہ ہمارے روحانی، جسمانی اور اجتماعی امراض کا علاج اور محبت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب
بھی ہے۔ حدیث شریف میں مختصر مختصر ایسے اعمال بتا دیے گئے ہیں جو امت کی اجتماعی و انفرادی زندگی کی پیچیدگیوں
سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جب یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں تو پھر سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین
ادا کرنے کی فرصت میسر آجاتی ہے۔ لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ ایسا پیچیدہ ہو جاتا ہے
کہ انسان عبادت خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے مشغلہ ہی میں مصروف رہ جاتا ہے۔ یہاں اس کے
زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد و علی آل سیدنا و مولانا محمد
و اصحاب سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

اور ہم نے تم کو ایک ایسی ہی جماعت بنا دیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے

البقرۃ : ۱۴۳

علماءِ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ

کا

دینی رُخ اور مسلکی مزاج

آخری تصنیف

حکیم الاسلام حضرۃ مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہ

(مہتمم دار العلوم دیوبند)

ادارہ اسلامیات

۱۹۰ - انارکلی ○ لاہور

قَلِيلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِي دِينِهِ إِمَّا قَتَلُوهُ وَإِمَّا يُعَذِّبُوهُ حَتَّى كَثُرَ الْإِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ الحديث (رواه البخاري في التفسير ص ٦٤٨)

(٣٣٧) عَنْ أَبِي سُوَيْدٍ الْعَبْدِيِّ قَالَ أَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ فَجَلَسْنَا بِبَابِهِ لِيُؤْذَنَ لَنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ قَالَ فَقُمْتُ إِلَى جُحْرٍ فِي الْبَابِ فَجَعَلْتُ أَطَّلِعُ فِيهِ فَفَطِنَ بِي فَلَمَّا أَذِنَ لَنَا جَلَسْنَا فَقَالَ أَيُّكُمُ اطَّلَعَ آنِفًا فِي دَارِي قَالَ قُلْتُ أَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ فَنَظَرْتُ فَلَمْ أَتَعَمَّدْ ذَلِكَ قَالَ ثُمَّ سَأَلُوهُ عَنْ أَشْيَاءَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَوٰةِ

(ظلماً) اس کو مار ڈالتے یا تکلیف دی جاتی یہاں تک کہ اسلام بکثرت پھیل گیا اور کوئی فتنہ باقی نہ رہا۔

(۳۳۷) ابو سوید عبدی بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دروازے پر بیٹھ گئے تاکہ اجازت ہو جائے (تو ہم داخل ہوں) اجازت میں کچھ دیر ہوئی تو میں دروازے میں ایک سوراخ کے اندر سے جھانکنے لگا وہ میری اس حرکت کو تاڑ گئے جب ہمیں اجازت مل گئی اور ہم بیٹھ گئے تو انھوں نے فرمایا ابھی میرے گھر میں تم میں کس نے جھانکا تھا میں نے عرض کیا کہ اجازت ملنے میں دیر ہو گئی تھی اس لئے میں نے جھانکا تھا (تاکہ تاخیر کا سبب معلوم ہو) جھانکنا مقصود نہ تھا اس کے بعد پھر ان سے بعض اور باتیں دریافت کیں انھوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت پر نماز پڑھنے

ہیں۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج وغیرہ حقوق اللہ، دیت، وصیت، شرکت، نفقہ وغیرہ ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص افراد سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں۔ اسی طرح شریعت کے تمام ابواب پر ایک اجمالی نظر ڈال جائیے اور غور کیجئے کہ ان میں کون سے احکام ہیں جو ہر ہر فرد پر ہمہ وقت ... ایک وقت کے لئے بھی نہیں۔ ان کے ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت ملتی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دینی مبانی ... یہ حدیث شریف میں صرف ان پانچ کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

اس حدیث میں ابن عمرؓ کو جس جنگ کی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے وہ عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت پر جنگ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا جواب یہاں کتنا عبرت آموز ہے کہ کفار سے جنگ فتنہ فرو کرنے کے لئے ہوتی ہے اور مسلمانوں سے جنگ فتنہ پیدا کرنے کے لئے۔ تم جس آیت کو میری تردید کے لئے پڑھ رہے ہو درحقیقت وہ میری تائید کے لئے ہے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابن عمرؓ کا اس حدیث سے یہ مقصد نہیں تھا کہ جہاد قرآن میں نہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۲۲) بلکہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جس کو حافظ ابن تیمیہ نے مذکورہ بالا بیان میں مفصل طور پر ذکر کیا ہے۔

(۳۳۷) اسلام میں کسی غیر کے گھر میں جھانکنے کی مذمت کی گئی تھی اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے

حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا شَحَبَ وَجْہٌ وَّلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰی فِیْہِ دَرَجَاتُ الْجَنَّۃِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ الْمَفْرُوْضَۃِ کَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا ثَقُلَ مِیْزَانُ عَبْدٍ کَدَابَّۃٍ تُنْفَقُ لَہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ یُحْمَلُ عَلَیْھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (رواہ احمد والبزار والنسائی وابن ماجۃ والترمذی وقال حدیث حسن صحیح وحدیث الباب باسناد جید وشھر بن حوشب وثقہ ابن معین والامام احمد وغیرھما۔

الارتباط بین ارکان الاسلام

(۲۴۹) عَنْ زِیَادِ بْنِ نُعَیْمٍ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ اس وقت تک برابر جاری رکھوں جب تک کہ لوگ نماز نہ پڑھیں، زکوٰۃ نہ دیں اور اس بات کی شہادت نہ دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ جب یہ باتیں کر لیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا مگر ہاں جو حق بنتا ہو اور اس کے بعد ان کا حساب خدا کے سپرد۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا کسی ایسے عمل میں جس کا مقصود درجات جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر، اور نہ بندہ کے میزان عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنی کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا وہ جو اس نے راہ خدا میں کسی کو دے ڈالا۔

ارکان اسلام کا باہمی رابطہ

(۲۴۹) زیاد بن نعیم سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: چار

(۲۴۹) اس قسم کی حدیث مذکورہ سب سے پہلے سمجھا کہ ارکان خمسہ اور مجموعہ دین کا وہ رشتہ ہے جو ایک قصر اور اس کے ستونوں کا ہوتا ہے اگر ارکان اسلام نہ ہوں تو دین کا قصر بھی گر جائے گا مگر خود ان ارکان کے درمیان رشتہ کیا ہے، ادھر کسی کا ذہن نہ گیا۔ اس نکتہ کی طرف حافظ ابن رجب نے توجہ کی ہے وہ اس حدیث کی شرح

أَرْبَعٌ فَرَضَهُنَّ اللَّهُ فِي الْإِسْلَامِ فَمَنْ جَاءَ بِثَلَاثٍ لَمْ يُغْنِينَ عَنْهُ شَيْئًا حَتَّى يَأْتِيَ بِهِنَّ

چار چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور بیت اللہ کا

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ارکان اسلام میں باہم بھی گہرا ربط ہے اگر ان میں ایک میں بھی ضعف نمایاں ہونے لگتا
ہے کیونکہ ارکان جس طرح پورے قصر کو سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی سہارا دیتے ہیں اگر سب موجود
ہوں تو پورے قصر کا وزن اپنے درمیان تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اس کا وزن صرف بقیہ ارکان
پر آ پڑتا ہے اور وہ زیادہ طور پر اس قصر کے لئے اور خود ان ستونوں کے لئے بھی خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ تو ارکان کا ظاہری
حال ہے ارکان دین کا ربط اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان میں ایسا معنوی ربط ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ
جزو بن جاتا ہے ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی توفیق میسر ہوتی ہے اور ایک کے ترک کرنے سے دوسرے سے بھی محروم ہو جانا
پڑتا ہے۔ اس لئے صاحب نبوت کی اس مجمل ارشاد میں ارکان خمسہ کا باہمی رشتہ بھی داخل سمجھنا چاہئے اور اس امر
تشبیہ کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ایک قصر کے لئے ستون ضروری ہیں اسی طرح اسلام کے لئے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ
کا ادا کرنا ضروری ہے اور جس طرح کسی محل کے بعض ستون گر جانے سے اس کے اور ستونوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اسی طرح
کسی رکن اسلامی کے ترک سے اس کے بقیہ ارکان کو بھی نقصان ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قصر کے قائم رہنے کے لئے جتنے ستون درکار ہیں ان سب ہی کا ہونا ضروری ہے اگر ان میں ایک بھی
نہ ہو تو نتیجہ کا وجود بھی مفید نہیں ہوتا۔ اب رہ گئی یہ بات کہ کسی تعمیر کے لئے کتنے ستون ہونے چاہئیں پھر ان ستونوں میں
کیا نسبت اور کیا اہمیت کا تناسب ہونا چاہئے تو ان میں کس کو کس پر کتنی امتیازی فضیلت ہے۔ ان مراحل کو وہی بخوبی سمجھ سکتا ہے
جس نے یہ نقشہ تعمیر تیار کیا ہے ہر ایک کے ادراک کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد جب آپ قرآن و حدیث پر نظر ڈالیں گے تو
آپ کو نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ اکثر آیات میں ایک ہی جگہ ملے گا۔ احادیث میں جا بجا ایمان کا تذکرہ ساتھ ساتھ کرکے اسی ربط
کی طرف اشارہ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں "من لم یزک فلا صلوٰۃ له" (جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں)۔ ایک
حدیث میں یہ مذکور ہے کہ جس نے شراب پی اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو غلام
اپنے آقاؤں سے بھاگ جائے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔ احادیث بالا سے شراب نوشی اور اپنے مالک سے
بھاگنے کا نماز سے بڑا گہرا ربط ثابت ہوتا ہے۔ اس ربط کا ادراک بھی ایک تو خدا تعالیٰ ہی کو ہے جس نے دین کا
یہ قصر تیار کیا ہے اور یہی در اصل اس کے اصول تعمیر کا راز داں ہے۔ تاہم حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے اس طرف
توجہ فرمائی ہے اور انسانی دماغ کے رسائی کی حد تک اسے خوب ہی سمجھایا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عبادات درحقیقت عبدیت اور بندگی کی ایک عملی ترجمانی ہے۔ عبدیت درحقیقت وہ صحیح
رشتہ ہے جو عبد اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے اور اس کے حقوق
بتلانے آئے۔ باپ بیٹے، دوست دوست، ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتی کہ امتی اور رسول کا رشتہ بھی ایک مخلوق کا دوسری
مخلوق کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان رشتوں میں تعدد کی گنجائش بھی ہے لیکن عبدیت اور معبودیت کا وہ
تعلق ہے جو نہ دو مخلوقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اشتراک کی گنجائش ہے یہ صرف مخلوق
اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے۔ اس رشتہ کو صرف سمجھا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک اظہار یا اسے ہم کو

بیعت سے مراد یہی پُر خلوص بیعت ہے۔ مسلمانوں کا تنہا عمل ان سب تمام دین کے ارکان کی ادائیگی میں جتنا مضبوط
ہوگا ظاہر ہے تازے بلکہ ہر رنگ معاملات سے مسائلِ امامت و ریاست تک کوئی سا شعبہ لیجیے جن میں سب زیادہ
اور جلیل القدر کی مشروعیت ہے جو بجز اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام
صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ طریقہ تو حقیقی بیعت ہو اجتماعی امراض کا علاج اور بیعت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب
بھی ہے۔ صوفیہ میں منتشر منتشر ایسے اعمال بتائے گئے ہیں جو امت ایسے کو اجتماعی اور انفرادی زندگی کی بیماریوں
سے محفوظ رکھتے ہیں اور جب وہ بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں تو پھر سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین
ادا کرنے کی فرصت میسر آ جاتی ہے۔ لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ الجھ جاتا ہے یہاں تک
کہ انسان عبادتِ خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے شغل میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے۔ یہاں اس سے
زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اللّٰھم صل علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آل سیدنا و مولانا محمد
و اصحاب سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے

البقرۃ : ۱۴۳

علماءِ دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ
کا
دینی رُخ اور مسلکی مزاج

آخری تصنیف

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ

(مہتمم دار العلوم دیوبند)

○

ادارہ اسلامیات

۱۹۰ - انارکلی ○ لاہور

اوثق عری الایمان

(۳۵۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَدْرُوْنَ اَیُّ عُرَی الْاِیْمَانِ اَوْثَقُ قُلْنَا الصَّلٰوۃُ قَالَ الصَّلٰوۃُ حَسَنَۃٌ وَلَیْسَتْ بِذَاکَ قُلْنَا الصِّیَامُ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِکَ حَتّٰی ذَکَرْنَا الْجِہَادَ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ قَالَ اَوْثَقُ عُرَی الْاِیْمَانِ الْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْمُعَادَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔ اخرجہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس والطیالسی عن البراء۔

اسلام میں سب سے مضبوط عمل

(۳۵۰) براء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو ایمان میں سب سے مضبوط عمل کون سا ہے؟ ہم نے عرض کیا نماز۔ فرمایا بیشک نماز کا تو کیا کہنا ہے لیکن اس کا درجہ دوسرا ہے ہم نے عرض کیا تو پھر روزے۔ آپ نے اس پر بھی یہی فرمایا یہاں تک کہ ہم نے جہاد کا نام لیا تو اس پر بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اس کے بعد کہا سب سے مضبوط عمل یہ ہے کہ خدا ہی کے لئے دوستی اور خدا ہی کے لئے دشمنی، اسی کے نام پر محبت اور اسی کے نام پر بغض رکھنا۔ (طبرانی، مسند ابوداؤد طیالسی)

ایسی خصوصیت بیان ہے کہ لیلۃ القدر آں ہی میں رکھی گئی ہے۔ بہرحال جب حوادث عالم کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی کسی اندرونی نظام کے ماتحت رونما ہوتی ہیں تو پھر احکام شریعت کو اتنا بے ربط کیوں سمجھا جائے اس موضوع پر غور کرنے کے لئے بھی دلچسپی کی ضرورت ہے۔ فرصت نکالئے اور ان موتیوں کے حاصل کرنے کے لئے حدیث و قرآن کے سمندر میں غوطہ لگائیے گوہر مقصود مل جائے گا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر صرف تمسخر اور استہزاء کرنا علم کا راستہ نہیں۔

(۳۵۰) حدیث و قرآن میں فرائض و ارکان کو زیر بحث لایا ہی نہیں گیا ان کی اہمیت تو اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہاں وہ اعمال جو کسی سبب سے ارکان قرار نہیں دیئے گئے۔ لیکن وہ حقیقت رکنیت کا مقام رکھتے ہیں ان کو اس لئے ابھارا جاتا ہے کہ عام نظریں ان کا شمار ارکان اسلام میں نہ دیکھ کر کہیں ان اعمال کو نظر انداز نہ کر جائیں بجا سے خیال میں یہ اعمال کثیر وہ ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ہے۔ بعض اجتماعی عمل وہ اتنے اہم ہوتے ہیں کہ بہت سے انفرادی فرضوں کی ادائیگی ان اعمال پر موقوف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا اہتمام رکھا جائے تو اگرچہ ان کی حیثیت فرض عین کی نہیں ہوتی لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ارکان اسلام کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کا مرتبہ بھی ارکان ہی کا ہوتا ہے۔ از انجملہ خدا کے لئے محبت و عداوت کا عمل ہے۔ احادیث میں اسلام کے اس شعبہ کو کمال ایمانی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ غضب تو اسلام کی صحیح روح یہ ہے کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جنت میں جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باہمی محبت پیدا نہ ہو جائے۔ اس

محبت سے مراد یہی پُرخلوص محبت ہے۔ مسلمانوں کا تنہا یہ عمل ان کے تمام دین کے ارکان کی ادائیگی میں جو تحفظ ساوی
ہوگا ظاہر ہے نماز سے لیکر عبادت تک معاملات سے منزل امامت و ریاست تک کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں یہ حب فی اللہ
اور بغض فی اللہ کی ضرورت نہ ہو جبکہ اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام
صرف آتا ہی نہیں بلکہ یہی ہمارا روحانی حق جو محبت کو اجتماعی امراض کا علاج اور محبت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب
بھی ہے۔ حدیثوں میں مختصر مختصر ایسے اعمال بتا دیئے گئے ہیں جو امت بیکو اجتماعی اور انفرادی زندگی کی پیچیدگیوں
سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جب یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں تو پورے سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین
ادا کرنے کی فرصت میسر آجاتی ہے۔ لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ ایسا بگڑ جاتا ہے
کہ انسان عبادت خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے شغل میں ہی مشغول رہ جاتا ہے۔ یہاں اس سے
زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اللھم صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آل سیدنا ومولانا محمد
واصحاب سیدنا ومولانا محمد وبارک وسلم

۵۹۲

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

اور ہم نے تم کو ایک ایسی ہی جماعت بنا دیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے

(البقرۃ : ۱۴۳)

علماءِ دیوبند (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج

آخری تصنیف

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب نوراللہ مرقدہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

ادارہ اسلامیات

۱۹۰- انارکلی ۰ لاہور